عقاید الاسلام

یلیه:

یسألونک عن الروح

عقاید اسلام

اس کے بعد

وہ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں

سید احمد الحسن (ع)



نام کتاب	عقاید اسلام اور وہ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں
مصنف	سید احمد الحسن
مترجم	گروہ مترجمین انصار امام مہدی (ع)
پہلا ایڈیشن	اکتبر 2026 - 4 جمادی الاول 1448
ھدیہ	اللھم صلّ علی محمد و آل محمد الائمة و المھدیین و سلِّم تسلیما کثیرا

دعوت مبارک سید احمد الحسن (ع)، یمانی موعود کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے لے لیے نیچے دی گئی ویب سائٹ پر رجوع کیجیے۔

www.almahdyoon.com
www.safeerimammahdi.org
www.yamaani.org

فہرست

دین کی اصل 12

تین اصول 17

پہلا اصل: مُستخلِف (خلیفہ مقرر کرنے والا) 17

پہلا: طریق وحی 17

معرفت 18

دوسرا: طریق عقلی 24

الف: عدم خالق نہیں ہے اور ہر اثر کسی مؤثر (سبب یا خالق) کی طرف دلالت کرتا ہے. 26

ب: اثر کی خصوصیت، مؤثر کی خصوصیت پر دلالت کرتی ہے 29

*فیصلہ کن بات: "ارتقاء مقصدیت رکھتا ہے" 29

ذہانت کی مشین 31

*وہ عقلی دلائل جو قرآن اللہ کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے پیش کرتا ہے 32

خداوندِ مطلق کے وجود پر پہلی دلیل :اثر کی صفت، مؤثر کی صفت پر دلالت کرتی ہے۔ 33

جس کائنات میں ہم رہتے ہیں اس میں اثر کی صفت مؤثر کی صفت پر دلالت کرتی ہے 34

زمینی حیات میں، اثر کی صفت مؤثر کی صفت پر دلالت کرتی ہے 36

*وہ اعتراضات جو خدا کے منکرین گھڑتے ہیں 39

اگر خدا مطلق رحیم ہے، تو وہ آگ کے ذریعے عذاب کیوں دیتا ہے؟ 39

اعتراض کا جواب 40

کمزوری اور بیماری 42

اشکال کا رد..... 43
اشکال: حضرت نوح نبی (ع) کی عمر..... 47
اشکال کا رد..... 47
دوسرا اصل: خلیفہ..... 50
رسول بھیجنے کا ہمیشہ کا اور ہر حال میں پورا ہونے والا سبب، حجت قائم کرنا ہے۔..... 56
استخلاف، خدا کی سنت ہے..... 57
اوّل: قرآن:..... 57
دوسرا. روایات خلیفۃُاللہ المہدی کے بارے میں..... 62
تیسرا. وہ بات جو عہدِ قدیم (تورات) میں نقل ہوئی ہے:..... 70
چوتھا. وہ بات جو عہدِ جدید (انجیل) میں نقل ہوئی ہے:..... 72
استخلاف (جانشین مقرر کرنا) ایک مستقل سنت (روایت) ہے جس کی بیرونی دنیا میں اس کی خلاف ورزی نہیں ہوئی ہے۔..... 73
قانون سازی اور نفاذ کی صلاحیت میں حاکمیت اللہ کی ہے۔..... 73
فترت کے زمانے..... 75
ظہور مہدی (ع) سے پہلے کا زمانۂ فترت..... 84
امام منتظِر ہے، نہ کہ منتظَر..... 84
گزشتہ بیان سے ہم نے جان لیا:..... 89
آیہ اکمال الدین..... 91
زمین پر خدا کا خلیفہ کیسے جانا جاتا ہے؟..... 97
معرفت حجت کا قانون اور اس کے تین ستون..... 98
پہلا: نص..... 99

1. خدا سبحان کی طرف سے نص..... 101
1. یہ احتمال کہ جو کہے کہ میں نے خواب دیکھا ہے، وہ جھوٹ بول رہا ہو:..... 109
2. یہ احتمال کہ خواب شیطان کی طرف سے ہو:..... 110
3. یہ احتمال کہ خواب نفس کی تلقین اور خواہش سے ہو:..... 115
عاجزانہ کوشش..... 116
حکیموں کے خواب کو کم عقلوں کے ذریعے حقیر جاننا..... 119
خواب کے مسئلے کا خلاصہ..... 125
دوسرا: نص شدہ منتخب شخص پر ماضی کے خلیفہ کی طرف سے براہ راست نص..... 126
تیسرا: پچھلے خلیفہ کی طرف سے منتخب منصوص علیہ شخص کے لیے بالواسطہ نص..... 127
دوسرا: علم..... 134
تیسرا: خدا کی حاکمیت کی طرف بلانا..... 144
مادی جسمانی معجزہ اور اس کا مقام دینِ خدا میں..... 144
قرآن میں..... 145
انجیل میں..... 154
معجزہ کے بارے میں بعض اقوال پر مبنی ایک بحث..... 158
خلافت محمد (ص)..... 160
پہلا: نص..... 160
دوسرا: علم اور حکمت..... 168
تیسرا: حاکمیتِ خداوند..... 173
محمد رسولِ خدا (ص) کے بعد زمین میں اللہ تعالیٰ کی خلافت کا تسلسل..... 175
ختمِ نبوت..... 175
اصل خلافتِ الٰہی ہے..... 178

محمد رسول اللہ (ص) کے لیے علی (ع) کی جانشینی کے بارے میں احادیث: 179
حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ() 182
تمہارا میرے ساتھ وہی تعلق ہے جو ہارون کا موسی کے ساتھ تھا۔() 188
محمد رسولِ خدا (ص) کے اہلِ بیت کے ائمہ کی خلافت سے متعلق احادیث 191
قریش میں سے خلفاء کے بارے میں احادیث 193
خلفائے راشدین سے متعلق احادیث 194
وہ تجدید کرنے والا فرد جو دین کو تحریف سے محفوظ رکھتا ہے() 196
اللہ تعالیٰ کا خلیفہ، مہدی 197
شیعہ کی کتابوں میں 197
محمد رسول اللہ (ص) کی وصیت 198
محمد رسول اللہ (ص) کے بعد بارہ ائمہ یا ان میں سے بعض کے بارے میں نص پر مشتمل روایات..200
رسول اللہ (ص) اور علی (ع) و فاطمہ (س) کی اولاد میں سے بارہ ائمہ پر نص کی روایات 201
بارہ امام اور بارہ مہدیوں پر نص والی روایات.....203
مہدیین پر نص والی روایات سے علم اور اعتقاد حاصل ہوتا ہے 204
محمد رسول اللہ (ص) کی وفات کے وقت لکھی جانے والی وصیت کے لکھے جانے کا اثبات، جو گمراہی سے روکنے والی ہے 205
آخر میں: 214
خلاصہ: 215
تیسرا اصل 217
رسالت 217
تشریع 217
کیا حُسن اور قُبح عقلی ہیں؟ 221

الٰہی عقیدہ آدم سے لے کر قیامت کے قائم ہونے تک 222

خداوند سبحان کی صفات کے بارے میں عقیدہ 229

صفاتِ لاہوت کی تقسیم 239

لاہوت کی ذاتی صفات کی عینیت 241

علم کی صفت اور بداء 241

ارادہ کی صفت اور جبر اور تفویض 242

ارادہ کی صفت 242

انسان اور اس کے اعمال کے ساتھ ارادۂ الٰہی کا تعلق 243

زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کی صفات 246

زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کا علم 248

اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اور معجزانہ صفات() 252

زمین میں اللہ کا خلیفہ اور زبانیں 258

معصوم کا سہو اور نسیان 268

سہو کیا ہے اور نسیان کیا ہے؟ 268

سہو اور نسیان 270

نسیان اور فراموشی 272

خداوند کے خلیفہ اور یادآوری، سَہو اور نسیان 277

پہلا فرض 278

دوسرا فرض 278

تیسرا فرض 279
چوتھا فرض 281
کیا معصوم کے بارے میں سہو اور نسیان ممنوع ہے؟ 285
پہلا: آیاتِ قرآن 286
لاتُؤاخِذنی بِما نَسیتُ 286
سَنُقْرِئُکَ فَلا تَنْسَی 289
دوسرا: روایات 291
وہ روایات جو معصوم کے سَہو اور نسیان کو بیان کرتی ہیں 292
وہ روایات جو نبی اکرم (ص) کے سَہو کا ذکر کرتی ہیں 292
وہ روایات جو ائمہ (ع) کے سَہو کا ذکر کرتی ہیں 296
کیا ایسی روایات موجود ہیں جو معصوم سے سہو اور نسیان کی نفی کرتی ہوں؟ 299
تیسرا: عقلی اشکالات 301
پہلا: شیخ مفید کے اشکالات 301
شیخ مفید کے پہلے اشکال کی وضاحت 302
شیخ مفید کے دوسرے اشکال کی وضاحت 303
شیخ مفید کے تیسرے اشکال کی وضاحت 304
دیگر عقلی اشکالات 307
پہلا اشکال 307
دوسرا اشکال 307
تیسرا اشکال 308

رجعت 310
رجعت کیوں؟ 311
رجعت کیسے ہو گی؟ 313
قرآن 316
وہ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ 322
انسانی نفس کی تخلیق 324
انسان کی تخلیق اور جسم میں نفس کا پھونکا جانا 328
نفس، روح اور عقل 336
نفس 337
روح 340
روح ایمان اور روحُ القدس 341
اصحابِ یمین اور مقربین 343
ملحقات 346
پہلا ملحقہ: زید بن علی (ع) کے بارے میں ایک وضاحت 346
دوسرا ملحقہ: خداوند کے خلیفہ کی صفات کے بارے میں بعض باطل عقائد کے فساد کا بیان 350
معصوم کا سایہ نہیں ہوتا 351
معصوم کے قدموں کے نشانات پتھر پر باقی رہ جاتے ہیں 352
درندے زمین میں خلیفۂ خدا کے جسد کو نہیں کھاتے 354
تیسرا ملحقہ: شمعون، یا سمعان، عیسی (ع) کے وصی 360

چوتھا ملحقہ: 313 افراد کی تیاری.....365

پانچواں ملحقہ: فقہائے آخر الزمان.....368

کون لوگ مہدی (ع) کی مدد کریں گے؟.....375

انتساب:

امام مہدی (ع) کے انصار کی طرف

آپ سب کا شکریہ. . .

آپ میرے لیے بہترین بھائی، بہترین بہنیں. . . اور بہترین خاندان تھے۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کی حفاظت فرمائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰالَمِينَ

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ الْأَئِمَّةِ وَالْمَهْدِيِّينَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا

دین کی اصل

اس زمین پر استخلاف (خلیفہ کو مقرر کرنا) دین یا عقیدہ الٰہی کی اصل ہے۔ جب سے اللہ تعالیٰ نے زمین پر رہنے والے پہلے انسان آدم کو بنایا تو اسے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر فرمایا۔

(وَ إِذْ قالَ رَبُّكَ لِلْمَلائِكَةِ إِنِّي جاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قالُوا أَ تَجْعَلُ فِيها مَنْ يُفْسِدُ فِيها وَ يَسْفِكُ الدِّماءَ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ قالَ إِنِّي أَعْلَمُ ما لا تَعْلَمُون)[1]

(جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ رکھنے والا ہوں تو انہوں نے کہا "کیا تو زمین میں ایسے کو رکھو گے جو اس میں فساد کرے گا اور خون بہائے گا؟! حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں؟" تو ارشاد ہوا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو).

(وَ عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْماءَ كُلَّها ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلائِكَةِ فَقالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْماءِ هؤُلاءِ إِنْ كُنْتُمْ صادِقِين)[2]

(اور اس نے آدم کو تمام اسماء کی تعلیم دی اور پھر ان سب کو ملائکہ کے سامنے پیش کر کے فرمایا: اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ)

(قالُوا سُبْحانَكَ لا عِلْمَ لَنا إِلاَّ ما عَلَّمْتَنا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيم)[3]

(ملائکہ نے کہا: تُو پاک ہے ہمیں کوئی علم نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں سکھایا، بے شک تُو ہی علم والا، حکمت والا ہے)

---

1. قرآن پاک، سورہ بقرہ، آیت 30۔
2. قرآن پاک، سورہ بقرہ، آیت 31۔
3. قرآن پاک، سورہ بقرہ، آیت 32۔

(قالَ يا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمائِهِمْ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمائِهِمْ قالَ أَ لَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّماواتِ وَ الْأَرْضِ وَ أَعْلَمُ ما تُبْدُونَ وَ ما كُنْتُمْ تَكْتُمُون)[1]

(ارشاد ہوا کہ اے آدم، اب تم ان کے اسماء سے انہیں باخبر کردو تو جب آدم نے باخبر کردیا تو خدا نے فرمایا کہ میں نے تم سے نہیں کہا تھا میں آسمان اور زمین کے غیب کو جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو یا چھپاتے ہو سب کو جانتا ہوں؟)

یہی وہ چیز تھی جو آدم (ع)، فرشتوں اور جنّات کے درمیان واقع ہوئی؛ کیونکہ فرشتے اور جنّات خود بخود اس معرفت کے حاصل کرنے پر قادر نہ تھے جو آدم نے حاصل کی؛ اس لیے آدم (ع) کا خلیفہ بننا حتمی تھا؛ کیونکہ وہ اس بات پر قدرت رکھتا تھا کہ وہ انہیں انجان باتوں کے بارے میں آشنا۔ انسان بونے کا بہلو سے آدم میں جو کچھ صلاحیت ہنر ودیعت کیے گئے ان کو عمل میں بجالایا ۔ چونکہ وہ انسان تھا اور انسان کی صلاحیت وسیع تر اور عظیم تر ہے؛ اس لیے وہ خدا کی صورت پر بنایا گیا ہے، یعنی وہ اللہ کے اسماء کی معرفت کے ساتھ تخلیق ہوا، اور مخلوق کے لیے خدا کے ناموں کو ظاہر کرنے کی صلاحیت اس کے سپرد کی گئی ہے۔(الله خَلَقَ آدَمَ عَلَى صُورته)[2] (خدا نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا)۔

لیکن لوگوں میں یا خود بنی آدم (ع) میں، وہ یقیناً عمل اور اخلاص میں ایک جیسے نہیں ہیں، اس کے علاوہ ان میں سے اکثر عمل سے غافل ہیں؛ نتیجتاً یہ بات حتمی ہوگئی ہے کہ جو شخص خدا کا علم اور معرفت رکھتا ہے وہ اس شخص پر خلیفہ ہو جو اس سے ناواقف ہے۔ لہٰذا۔ عوالم بالا میں پہلا حقیقی خلیفہ محمد (ص) ہے، پھر آل محمد (ع)، پھر وہ جو ان کے بعد سب سے بہتر ہیں پھر باقی میں سے بہتر ہیں؟ اس جسمانی دنیا میں، ہر دور میں محمد (ص) سب سے زیادہ عالم اور سب سے زیادہ خدا کو جاننے والے ہیں۔

لہٰذا یہاں تین امور زیرِ بحث آتے ہیں: مُستخلِف (خلیفہ مقرر کرنے والا)، مُستخلَف (وہ شخص جسے خدا کی خلافت کے لیے منتخب کیا گیا ہے) اور وہ علم جو خلیفہ کو سپرد کیا جاتا ہے ۔ خلیفہ کی صفات اور اس کے عمل کی شایستگی، یا اللہ کی طرف سے اس پر عائد کی گئی ذمہ داری کے لحاظ سے ہم اسے اور مستخلِف کی طرف سے جو اس

---

1. قرآن پاک، سورہ بقرہ، آیت 33۔
2. الکافی، ج1، ص134؛ التوحید (صدوق)، ص103۔

کو ذمہ داری دی جاتی ہے گ اس لحاظ سے اس کو بھی، اس کے ذمہ داری کو اور اس کے مستخلِف کی صفت بیان کر سکتے ہیں، یعنی ہم کہہ سکتے ہیں: کہ وہ نبی ہیں اس لیے کہ اسے غیبی خبریں ملتی ہیں۔، یعنی وہ خبریں حاصل کرتا ہے، اور بنیادی طور پر جو اسے وحی کرتا ہے، وہ اسے مطلع کرتا ہے، اور چونکہ وہ ایک مشن (رسالت) کا علمبر دار ہے، تو وہ ایک رسول (پیغام اٹھانے والا) جو اپنے بھیجنے والے مرسِل کی رسالت لے آتا ہے۔۔ نتیجے کے طور پر، دین کی بنیاد (استخلاف) میں تین اصول شامل ہیں: مستخلِف، خلیفہ اور علم؛ دوسرے لفظوں میں: مُنبِئ، (خبر دہندہ)، نبی (جنہیں غیب کی خبریں دی جاتی ہیں) اور انباء (غیبی اخبار)؛ یا دوسرے لفظوں میں: بھیجنے والا (مرسِل)، رسول (جسے بھیجا گیا)، اور رسالت (پیغام)؛ اور اگر اس خلیفے کو امام بھی کہہ سکتے ہیں جب اس کے پاس امامت کا مقام حاصل ہو۔

یہ اصل (استخلاف)، دین کا اصل اور اس کا ستون اور محور ہے، جس نے اس کو توڑا اس نے دین الٰہی کو توڑ دیا، اور اس سے کچھ نہیں چھوڑا۔ اسی وجہ سے ائمہ اطہار (ع) اور امام صادق (ع) نے تاکید کی ہے کہ امیر المومنین (ع) کے حقوق غصب کرنے والوں کا اسلام کو توڑنے میں سب سے بڑا حصہ ہے، نہ صرف اس وجہ سے کہ امیر المومنین (ع) کا حق غصب کیا، بلکہ اس لیے کہ اس غصب کا مطلب اسی اصول کو توڑنا ہے جس پر دین الٰہی مبنی ہے،-اور وہ استخلاف ہے (خلیفہ کو مقرر کرنا)، اور وہاں سے لوگوں کو اس اصل سے منحرف کیا جو کہ الف سے یاء تک دین الٰہی ہے۔

امام جعفر بن محمد صادق (ع) نے فرمایا: (إن الدين وأصل الدِّينِ هُوَ رَجُلٌ وَ ذَلِكَ الرَّجُلُ هُوَ الْيَقِينُ وَهُوَ الْإِيمَانُ وَ هُوَ إِمَامُ أُمَّتِهِ وَ أَهْلِ زَمَانِهِ فَمَنْ عَرَفَهُ عَرَفَ اللهَ وَ مَنْ أَنْكَرَهُ أَنْكَرَ اللهَ وَ دِينَهُ وَ مَنْ جَهِلَهُ جَهِلَ اللَّهَ وَ دِينَهُ وَ حُدُودَهُ وَ شَرَائِعَهُ بِغَيْرِ ذَلِكَ الْإِمَامِ كَذَلِكَ جَرَى بِأَنَّ مَعْرِفَةَ الرِّجَالِ دِينُ اللهِ وَ الْمَعْرِفَةُ عَلَى وَجْهِهِ مَعْرِفَةٌ ثَابِتَةٌ عَلَى بَصِيرَةٍ يُعْرَفُ بها دين اللهِ وَيُوصَلُ بِهَا إِلَى مَعْرِفَةِ الله)[1]

(بے شک دین، اور دین کی اصل، ایک شخص ہے، اور وہ شخص یقین ہے، اور وہی ایمان ہے، اور وہی اپنی امت اور اپنے زمانے کا امام ہے۔ پس جس نے اس کو پہچان لیا، اس نے اللہ کو پہچان لیا؛ اور جس نے اس کا انکار کیا، اس نے اللہ اور اس کے دین کا انکار کیا؛ اور جس نے اسے نہ پہچانا، اس نے اللہ، اس کے دین، اس کی حدود اور

1. بصائر الدرجات (محمد بن حسن صفار)، ص 549؛ مختصر بصائر الدرجات (حسن بن سلیمان حلی، ص 82؛ خاتمۃ المستدرک (میرزای نوری)، ج 4 ص 118؛ بحار الأنوار، ج 42، ص 290۔

اس کے شرائع کو نہ پہچانا۔ اس امام کے بغیر ایسا ہی جاری ہے کہ مردوں (اہلِ حق) کی معرفت ہی اللہ کا دین ہے، اور صحیح طریقے پر معرفت ایک ثابت شدہ معرفت ہے جو بصیرت پر قائم ہوتی ہے، اسی کے ذریعے دینِ خدا پہچانا جاتا ہے اور اسی کے ذریعے اللہ کی معرفت تک پہنچا جاتا ہے)۔

رسول اللہ (ص) نے اسی امر پر حدیث فرقہ ناجیہ میں تاکید فرمائی، جو اہل سنت کی کتابوں میں مشہور ہے:

(تَفْتَرِقُ هٰذِهِ الْأُمَّةُ عَلَى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ فِرْقَةً، كُلُّهَا فِي النَّارِ إِلَّا فِرْقَةً وَاحِدَةً۔ قِيلَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، مَا هٰذِهِ الْفِرْقَةُ؟ قَالَ: مَنْ كَانَ عَلَى مَا أَنَا عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَأَصْحَابِي)

(یہ امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، جن میں سے سب آگ میں ہوں گے سوائے ایک فرقے کے۔ پوچھا گیا: اے رسول خدا! وہ فرقہ کون سا گروہ ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ جو اس راستے پر ہوں گے جس پر آج میں اور میرے اصحاب ہیں).

(تَفْتَرِقُ أُمَّتِي عَلَى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ فِرْقَةً، كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً۔ قِيلَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، وَمَنْ هِيَ؟ قَالَ: مَنْ كَانَ عَلَى مِثْلِ مَا أَنَا عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَأَصْحَابِي)[1]

(میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، جن میں سے سب آگ میں ہوں گے سوائے ایک کے۔ پوچھا گیا: اے رسول خدا! وہ کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ جو اس طریقے پر ہوں گے جس پر آج میں اور میرے اصحاب ہیں).

لہٰذا، در حقیقت رسول اللہ (ص) نے فرقہ ناجیہ (نجات یافتہ فرقے) کی صفت اس طرح معین کی ہے کہ یہ فرقہ وہی گروہ ہے جو اللہ کی طرف سے منتخب کردہ قیادت رکھتا ہو، جیسے رسول اللہ (ص) کی قیادت تھی، اور اس الٰہی قیادت پر ایمان رکھے جو اللہ کی معرفت اور اس کی حکمرانی سے آشنا کرتی ہے، بالکل ویسے ہی جیسے رسول اللہ (ص) کے اصحاب تھے.

لہٰذا حق، جیسا کہ رسول اللہ (ص) نے بیان فرمایا، وہی فرقہ ہے جس میں ویسا ہی تعلق موجود ہو جیسا نبی (ص) اور ان کے اصحاب کے درمیان تھا، یعنی استخلاف پر ایمان۔ در حقیقت، وہاں ایک ایسا خلیفہ ہوتا

---

1. یہ عبارت ابن تیمیہ نے اپنی کتاب «مجموع الفتاوی»، جلد 24، ص 171 - 172 میں ذکر کی ہے اور اسے مشہور قرار دیا ہے۔

ہے جو خدا کی طرف سے مقرر کیا گیا ہو، اور ایسے مؤمنین ہوتے ہیں جو اس خلیفہ اور اصل پر ایمان رکھتے ہوں، جو کہ دینِ الٰہی کا اصل ہے۔

شیخ صدوق نے بھی تقریباً اسی مفہوم کو اس طرح روایت کیا ہے۔:

(حَدَّثَنَا أَبُو نَصْرٍ مُحَمَّدُ بْنُ أَحْمَدَ بْنِ تَمِيمٍ السَّرَخْسِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو لَبِيدٍ مُحَمَّدُ بْنُ إِدْرِيسَ الشَّامِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ إِسْرَائِيلَ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْمُحَارِبِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا الْإِفْرِيقِيُّ عَنْ عبدالله بْنِ يَزِيدَ عَنْ عبدالله بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رسول‌الله (ص) سَيَأْتِي عَلَى أُمَّتِي مَا أَتَى عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ مِثْلٌ بِمِثْلٍ وَ إِنَّهُمْ تَفَرَّقُوا عَلَى اثْنَتَيْنِ وَ سَبْعِينَ مِلَّةً وَ سَتُفَرَّقُ أُمَّتِي عَلَى ثَلَاثٍ وَ سَبْعِينَ مِلَّةً تَزِيدُ عَلَيْهِمْ وَاحِدَةً كُلُّهَا فِي النَّارِ غَيْرَ وَاحِدَةٍ قَالَ قِيلَ يَا رسول‌الله وَ مَا تِلْكَ الْوَاحِدَةُ قَالَ هُوَ مَا نَحْنُ عَلَيْهِ الْيَوْمَ أَنَا وَ أَصْحَابِي)[1]

(ہم سے ابو نصر محمد بن احمد بن تمیم السرخسی نے روایت کی، انہوں نے کہا: ہم سے ابو لبید محمد بن ادریس الشامی نے بیان کیا، انہوں نے کہا: ہم سے اسحاق بن اسرائیل نے بیان کیا، انہوں نے کہا: ہم سے عبد الرحمٰن بن محمد المحاربی نے بیان کیا، انہوں نے کہا: ہم سے الافریقی نے، انہوں نے عبداللہ بن یزید سے، انہوں نے عبداللہ بن عمر سے روایت کی کہ رسول اللہ (ص) نے فرمایا:

"میری امت پر بھی وہی کچھ آئے گا جو بنی اسرائیل پر آیا، بالکل ایک جیسا۔ وہ بہتر (۷۲) ملتوں میں بٹ گئے تھے، اور میری امت تہتر (۷۳) ملتوں میں بٹ جائے گی، جو ان سے ایک زیادہ ہوں گی۔ ان سب کا ٹھکانا آگ ہے سوائے ایک کے۔" پوچھا گیا: یا رسول اللہ! وہ ایک کون سی ہے؟ آپ (ص) نے فرمایا: "وہی ہے جس پر آج میں ہوں اور میرے اصحاب ہیں).

1. معانی الأخبار (صدوق)، ص323۔

تین اصول

پہلا اصل: مُستخلِف (خلیفہ مقرر کرنے والا)

جانشین مقرر کرنے والا، خدائے سبحان یا وہی حقیقت ہے۔

اس غائب و حاضر حقیقت –جو اس عالم کو وجود میں لانے والا ہے– کے وجود کی تصدیق کے دو طریقے ہیں:

پہلا: طریق وحی

(قُلْ إِنَّما أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحى إِلَيَّ أَنَّما إِلهُكُمْ إِلهٌ واحِدٌ فَمَنْ كانَ يَرْجُوا لِقاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صالِحاً وَ لا يُشْرِكْ بِعِبادَةِ رَبِّهِ أَحَداً)[1]

(کہہ دو: میں تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں، میری طرف وحی آتی ہے کہ تمہارا الٰہ صرف ایک ہی الٰہ ہے، تو جو اپنے رب سے ملاقات کی امید رکھتا ہے، اسے چاہیے نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے).

ہر انسان کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ یہ عقل و منطق کے خلاف ہے کہ وہ اپنے کان دیوار کے پیچھے کی آواز سننے سے بند کر لے، اور پھر ضد اور ہٹ دھرمی سے اُن لوگوں سے جو سن رہے ہیں، یہ کہے: دیوار کے پیچھے کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے تو سے چاہیے تھا کہ میں خود اپنے کان کھولوں اور سننے کی کوشش کروں، اور اگر اُس وقت بھی وہ آواز نہ سن سکوں جو اُنھوں نے سنی ہے، تب میں یہ حکم دے سکتا ہوں کہ دیوار کے پیچھے کچھ موجود نہیں.

در حقیقت، طریقِ وحی ایک بلند تر اور اشرف راستہ ہے، اور اس کا آغاز اُس حقیقت (یعنی خداوندِ سبحان) کے وجود کی تصدیق سے ہوتا ہے، لیکن یہ راستہ محض تصدیق پر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کے بعد کے مراحل، یعنی معرفت-جو کہ اصل تخلیق کا سبب ہے- تک پہنچتا ہے.[2] اس راستے کی ابتدا اس آمادگی سے ہوتی ہے کہ انسان

---

1. سورہ کہف، آیت 110۔
2. (وَ ما خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْإِنْسَ إِلاَّ لِيَعْبُدُون) (ذاریات، 56) (اور میں نے جنّ اور انسان کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں)، یعنی مجھے پہچانیں۔

حقیقت کو سننے کے لیے تیار ہو جائے، پھر اس کائنات کو وجود میں لانے والی حقیقت کے لیے تجرد اور اخلاص کے ذریعے – یہ سلسلہ وہاں تک جا پہنچتا ہے کہ انسان کی روح براہِ راست اُس حکیم حقیقت سے سننے لگتی ہے، اور اس کے لیے اُس حقیقت کا وجود اور حکمت ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد، انسان اپنی سیر و سلوک کا سفر معرفت کی طرف شروع کرتا ہے؛ یہاں تک کہ وہ خدا اور اُس کے رسولوں کی باتیں، خواب اور کشف میں وحی کے ذریعے سننے لگتا ہے، بلکہ یہ مقام بھی آ جاتا ہے کہ وہ انسان جمادات کی آواز تک سننے لگتا ہے.[1] یہی طریق انبیاء اور اولیاءِ الٰہی کا راستہ ہے؛ اور ہونا یہ چاہیے تھا کہ حضرت آدمؑ کی تمام اولاد کو بھی اسی راستے پر چلنا چاہیے۔ لیکن افسوس کہ وہ خدا کی طرف سے رُو گردان ہو جاتے ہیں، اور جب خدا اُنہیں اپنی طرف بلاتا ہے، تو وہ دنیا میں مشغول ہو کر غفلت میں پڑ جاتے ہیں؛ اور بسا اوقات ایسے ناپاک اعمال انجام دیتے ہیں، جیسے کہ اولیاءِ الٰہی سے دشمنی، یہاں تک کہ دل پر زنگ چھا جاتا ہے اور نتیجتاً وہ نہ کچھ سن پاتے ہیں اور نہ ہی کچھ سمجھ پاتے ہیں۔: (كَلاَّ بَلْ رانَ عَلى قُلُوبِهِمْ ما كانُوا يَكْسِبُونَ)[2] (ایسا نہیں ہے، بلکہ جو وہ کرتے رہے ہیں اُس نے ان کے دلوں کو زنگ آلود کر دیا ہے).

چونکہ یہ راستہ، جیسا کہ بیان ہوا، تصدیق کے بعد کے مراحل تک بھی پہنچتا ہے، پس کوئی مسئلہ نہیں کہ معرفت کے بارے میں- جو انسان کی تخلیق کا سبب ہے- کچھ زیادہ جان لیں۔.

معرفت

(وَما خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْإِنْسَ إِلاَّ لِيَعْبُدُون)[3]

(اور میں نے جنّ اور انسان کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں).

---

1. جمادات یا عمومی طور پر تمام مادّے، بیکٹیریائی، نباتی اور حیوانی حیات کے منبع ہیں۔ اسی طرح حیات کی تمام تجلیات (نسخ [مٹانا]، نمو اور حرکت) اگر انہیں اسی مادی عالم کی حدود میں دیکھا جائے تو محض کیمیائی عمل ہیں، اور نتیجتاً نبات، حیوان، بیکٹیریا اور جماد کے درمیان کوئی حقیقی فرق موجود نہیں؛ فرق صرف ان مادّوں کی ترکیب کی نوعیت میں ہے، اس طرح کہ وہ مادہ تولیدِ نسل (تبدل و تغیر) کے عمل اور ارتقائی نتائج کے لائق ہو جاتا ہے۔
2. قرآن کریم، سورہ مطفّفین، آیت 4۔
3. قرآن کریم، سورہ ذاریات، آیت 56۔

انسان بنیادی طور پر اللہ کی معرفت پر فطری طور پر قائم ہے، کیونکہ وہ اللہ کی صورت پر بنایا گیا ہے؛ یعنی انسان، عالمِ آفرینش میں تجلّیٔ الٰہی ہے۔ جیسے کہ ہم جانتے ہیں، کسی چیز کی صورت کسی حد تک اس کی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے، لیکن جب اکثر لوگ راہِ خدا سے منہ موڑ لیتے ہیں، اور دنیا میں مشغول ہو جاتے ہیں، اور اپنے پروردگار سے غافل ہو جاتے ہیں، اور متذکّرین ایک مخصوص اور قلیل گروہ میں محدود رہ جاتے ہیں، جو تاریک آسمان میں ستاروں کی طرح چمکتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت پر مبنی مشیّت اور ارادہ اس پر قرار پایا کہ انہی منتخب، سننے والے اور یاد کرنے والے لوگوں میں سے رسولوں کو چُن لے اور انہیں بھیجے تاکہ وہ غافلوں اور دنیا میں کھوئے ہوؤں کو یاد دلائیں، انہیں راہ دکھائیں، اور اللہ کی طرف لے کر چلیں؛ تاکہ ان غافلوں میں سے کچھ نجات پا سکیں، متذکّر ہو جائیں اور اللہ کے فضل و کرم اور ان پہلے نجات یافتہ افراد کی فضیلت کو پہچان سکیں۔

لہٰذا اصل یہ ہے کہ تمام لوگ خود ہی متذکّر ہوں اور کسی کے محتاج نہ ہوں جو اُنہیں اللہ کی یاد دلائے؛ اگر اللہ کسی رسول کو مبعوث کرے، تو ہونا یہ چاہیے کہ وہ رسول خود کو رسول کے طور پر متعارف نہ کرائے، تب بھی لوگ اُسے پہچان لیں۔

(وَ اتَّقُوا اللَّهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ وَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَليمٌ)[1]

(اور اللہ سے پرہیز کرو، اللہ تمہیں سکھائے گا، اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے).

(قُلْ إِنَّما أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحى إِلَيَّ أَنَّما إِلهُكُمْ إِلهٌ واحِدٌ فَمَنْ كانَ يَرْجُوا لِقاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صالِحاً وَ لا يُشْرِكْ بِعِبادَةِ رَبِّهِ أَحَداً)[2]

(کہہ دو: میں فقط ایک انسان ہوں تمہاری طرح، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا الٰہ ایک ہی الٰہ ہے۔ پس جو اپنے رب سے ملاقات کی امید رکھتا ہے، تو چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے).

حتی اگر لوگ غافل بھی ہو جائیں، تب بھی ایسا چاہیے تھا کہ وہ متذکّر (رسول) – جسے اللہ نے ان کی طرف بھیجا ہے اُس راستے پر انہیں لے جانے کیلیے جسے انہوں نے اپنی غفلت کے سبب ضائع کر دیا ہے – انہیں اپنی رسالت کے یاد دلانے کے لیے کسی بڑی چیز کا محتاج نہ ہوتا۔

---

1. قرآن کریم، سورہ بقرہ، آیت 282۔
2. قرآن کریم، سورہ کہف، آیت 110۔

بلکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ خلیفۂ خدا کو اپنا تعارف کروانے کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت نہ ہو؛ اور ہونا یہ چاہیے کہ لوگ اس بات کو پہچاننے کی قدرت رکھتے ہوں کہ وہ ان کے الٰہ اور پروردگار کا خلیفہ ہے، اور یہ کہ وہ خود اس (اللہ) سے متصل ہو سکتے ہیں اور اس شخص (رسول) کے بارے میں اس (اللہ) سے سوال کر سکتے ہیں ۔ اگر وہ لوگ اپنی فطرت اور انسانیت کی اصل کی نگہبان ہیں تو یہی اصل ہے، اگرچہ وہ غفلت میں پڑ چکی ہو۔

اسی لیے قرآن کریم نے بیان کیا ہے کہ انبیاء اور حضرت ابراہیم (ع) کو اپنی رسالت کے اعلان اور دعوت سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہ تھی اور یہی اذان ہے۔

(وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجالاً وَعَلى كُلِّ ضامِرٍ يَأْتينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَميقٍ)[1]

(اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو، وہ تیرے پاس آئیں گے پیادہ اور ہر ہلکی تیز رفتار سواری پر، آئیں گے ہر دور دراز راستے سے).

یہ آیت بالکل واضح ہے، یعنی: اے ابراہیم، اعلان کرو، اور لوگ تیزی سے آپ کی طرف آئیں گے، صرف آپ کے اُس دعوتِ الٰہی کے اعلان سے آشنا ہونے کی وجہ سے جسے آپ حامل ہیں،[2] کیونکہ وہ متذکر

---

1. قرآن کریم، سورہ حج، آیت 27۔

2. یہی وہ بات ہے جو ابراہیم (ع) کے وارثوں نے کہی تھی، یعنی ابراہیم (ع) کی ذریت کا وہ خاص گروہ جو اللہ کے لیے خالص کیے گئے تھے، کیونکہ ابراہیم (ع) نے اللہ کے حکم سے انہیں بیت الحرام کے قریب بسایا تھا تاکہ وہ لوگوں کے امام ہوں؛ وہی امام جو لوگوں کو حج اور نماز قائم کرنے کی ندا دیتے ہیں، یعنی اپنے باپ ابراہیم (ع) کے بعد دینِ خدا کو قائم رکھتے ہیں؛ لہٰذا لوگوں پر واجب ہے کہ ان کے پاس آئیں، جس طرح ماضی میں ان کے باپ ابراہیم (ع) کے پاس آنا واجب تھا: (رَبَّنا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوادٍ غَيْرِ ذي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنا لِيُقيمُوا الصَّلاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَراتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ) (ابراہیم/37) (اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد میں سے کچھ کو بسایا ہے ایک ایسی وادی میں جو کھیتی والی نہیں، تیرے محترم گھر کے پاس۔ اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم کریں، تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے اور انہیں پھلوں میں سے رزق عطا کر، شاید کہ وہ شکر گزار ہوں) ۔

کافی، کلینی، جلد 1، ص 392 - 393 میں روایت کیا گیا ہے:

(عَلِيُّ بْنُ إِبْرَاهِيمَ عَنْ أَبِيهِ عَنِ ابْنِ أَبِي عُمَيْرٍ عَنِ ابْنِ أُذَيْنَةَ عَنِ الْفُضَيْلِ عَنْ أَبِي جَعْفَرٍ (ع) قَالَ: نَظَرَ إِلَى النَّاسِ يَطُوفُونَ حَوْلَ الْكَعْبَةِ فَقَالَ هَكَذَا كَانُوا يَطُوفُونَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ إِنَّمَا أُمِرُوا أَنْ يَطُوفُوا بِهَا ثُمَّ يَنْفِرُوا إِلَيْنَا فَيُعْلِمُونَا وَلَايَتَهُمْ وَ مَوَدَّتَهُمْ وَ يَعْرِضُوا عَلَيْنَا نُصْرَتَهُمْ ثُمَّ قَرَأَ هَذِهِ الْآيَةَ (فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ)) ۔

امام باقر (ع) نے لوگوں کی طرف دیکھا جو خانۂ کعبہ کا طواف کر رہے تھے اور فضیل سے فرمایا: (زمانِ جاہلیت میں بھی وہ اسی طرح طواف کرتے تھے۔ اُنہیں صرف اس کعبہ کے طواف کا حکم دیا گیا تاکہ وہ ہماری طرف کوچ کریں اور ہمیں اپنی ولایت مداری اور اپنی محبت سے آگاہ کریں اور اپنی نصرت ہم پر پیش کریں). پھر یہ آیت تلاوت کی: (فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ)

ہوں گے اور اپنے پروردگار سے متصل ہو جائیں گے اور اس سے اُس رسول کا معاملہ اور اس کی حقانیت کو پالیں گے؛ بلکہ یہ چاہیے تھا کہ وہ بھی آپ کی طرح متذکر ہوتے اور آپ کے اس اعلان سے پہلے ہی پہچان لیتے، مگر افسوس سے وہ دنیا میں مشغول ہو گئے یہاں تک آپ نے اُنہیں یاد دہانی کرادی پھر وہ بیدار ہو گئے۔

لہٰذا، جیسے ہی آپ رسالت کا اعلان کریں لوگ آپ کے پاس آجائیں گے؛ لیکن انسان کے علاوہ مخلوقات یا وہ لوگ جنہوں نے اپنی فطرت کو الٹ پلٹ کر دیا ہے اور اُسے اس حد تک آلودہ کر دیا ہے کہ اب وہ انسان کہنے کے بھی لائق نہیں رہے، انہیں تو یقیناً نہ اس اعلان کا اور نہ ہی اور کوئی دوسری بات سے کوئی فائدہ ہوگا۔ انسانوں میں اور اُن افراد میں جن کی فطرتیں بگڑ چکی ہیں، ایسے بہت سے لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی جان اور

(الْحُسَيْنُ بْنُ مُحَمَّدٍ عَنْ مُعَلَّى بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَسْبَاطٍ عَنْ دَاوُدَ بْنِ النُّعْمَانِ عَنْ أَبِي عُبَيْدَةَ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا جَعْفَرٍ وَ رَأَى النَّاسَ بِمَكَّةَ وَ مَا يَعْمَلُونَ قَالَ فَقَالَ فِعَالٌ كَفِعَالِ الْجَاهِلِيَّةِ أَمَا وَ اللَّهِ مَا أُمِرُوا بِهَذَا وَ مَا أُمِرُوا إِلَّا أَنْ يَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَ لْيُوفُوا نُذُورَهُمْ فَيَمُرُّوا بِنَا فَيُخْبِرُونَا بِوَلَايَتِهِمْ وَ يَعْرِضُوا عَلَيْنَا نُصْرَتَهُمْ).

ابو عبیدہ کہتے ہیں: میں نے امام باقر(ع) سے سنا، جب وہ مکہ اور لوگوں کے اعمال کو دیکھ رہے تھے، تو فرمایا: (یہ اعمال جاہلیت کے اعمال کی مانند ہیں۔ آگاہ رہو! خدا کی قسم اُنہیں اس کام کا حکم نہیں دیا گیا، اور حکم نہیں دیا گیا مگر اس لیے کہ وہ اپنی گندگی اور فضولیات کو دور کریں، اپنے نذر کو پورا کریں، ہمارے پاس سے گزریں اور ہمیں اپنی اطاعت و وفاداری سے باخبر کریں اور اپنی نصرت و یاری ہم اہل بیت پر پیش کریں).

(عَلِيُّ بْنُ إِبْرَاهِيمَ عَنْ صَالِحِ بْنِ السِّنْدِيِّ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ بَشِيرٍ وَ مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى عَنْ أَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عِيسَى عَنِ ابْنِ فَضَّالٍ جَمِيعاً عَنْ أَبِي جَمِيلَةَ عَنْ خَالِدِ بْنِ عَمَّارٍ عَنْ سَدِيرٍ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا جَعْفَرٍ (ع) وَ هُوَ دَاخِلٌ وَ أَنَا خَارِجٌ وَ أَخَذَ بِيَدِي ثُم اسْتَقْبَلَ الْبَيْتَ فَقَالَ يَا سَدِيرُ إِنَّمَا أُمِرَ النَّاسُ أَنْ يَأْتُوا هَذِهِ الْأَحْجَارَ فَيَطُوفُوا بِهَا ثُمَّ يَأْتُونَا فَيُعْلِمُونَا وَلَايَتَهُمْ لَنَا وَ هُوَ قَوْلُ اللَّهِ (وَ إِنِّي لَغَفَّارٌ لِمَنْ تابَ وَ آمَنَ وَ عَمِلَ صالِحاً ثُمَّ اهْتَدى). ثُمَّ أَوْمَأَ بِيَدِهِ إِلَى صَدْرِهِ إِلَى وَلَايَتِنَا ثُمَّ قَالَ يَا سَدِيرُ فَأُرِيكَ الصَّادِّينَ عَنْ دِينِ اللَّهِ ثُمَّ نَظَرَ إِلَى أَبِي حَنِيفَةَ وَ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ فِي ذَلِكَ الزَّمَانِ وَ هُمْ حَلَقٌ فِي الْمَسْجِدِ فَقَالَ هَؤُلَاءِ الصَّادُّونَ عَنْ دِينِ اللَّهِ بِلَا هُدًى مِنَ اللَّهِ وَ لَا كِتَابٍ مُبِينٍ إِنَّ هَؤُلَاءِ ... لَوْ جَلَسُوا فِي بُيُوتِهِمْ فَجَالَ النَّاسُ فَلَمْ يَجِدُوا أَحَداً يُخْبِرُهُمْ عَنِ اللَّهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى وَ عَنْ رَسُولِهِ (ص) حَتَّى يَأْتُونَا فَنُخْبِرَهُمْ عَنِ اللَّهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى وَ عَنْ رَسُولِهِ).

سدیر کہتے ہیں: میں نے امام باقر(ع) کو سنا، جب وہ بیت اللہ الحرام میں داخل ہوئے اور میں باہر نکل رہا تھا، تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور پھر خانۂ خدا کی طرف رُخ کر کے فرمایا: (اے سدیر! لوگوں کو صرف اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان پتھروں کے پاس آئیں، اُن کا طواف کریں اور پھر ہمارے پاس آئیں اور اپنی اطاعت و وفاداری ہم سے بیان کریں۔ یہ وہی آیتِ قرآن ہے۔: (وَ إِنِّي لَغَفَّارٌ لِمَنْ تابَ وَ آمَنَ وَ عَمِلَ صالِحاً ثُمَّ اهْتَدى) (طٰہٰ/82)، (اور بے شک میں ضرور بخشنے والا ہوں اس کے لیے جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پھر سیدھی راہ پر چلتا رہے۔) پھر امام (ع) نے اپنے مبارک سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: یعنی ہماری ولایت کی طرف رہنمائی پائے۔ پھر فرمایا: اے سدیر! کیا میں تجھے وہ لوگ دکھاؤں جو دینِ خدا سے روکنے والے ہیں؟ پھر اُس وقت ابو حنیفہ اور سفیان ثوری کی طرف دیکھا جو مسجد میں ایک حلقہ جمائے بیٹھے تھے، اور فرمایا: یہ وہی دینِ خدا کی رکاوٹ ہیں جو ہدایتِ الٰہی اور روشن کتاب سے محروم ہیں۔ کاش۔۔۔ یہ اپنے گھروں میں بیٹھ جائیں تاکہ لوگ یہاں ادھر اُدھر پھریں اور گھومیں اور کسی کو نہ پائیں جو انہیں خدا اور اُس کے رسول (ص) کے بارے میں سکھائے، تاکہ لوگ ہمارے پاس آئیں اور ہم انہیں خدا اور اُس کے رسول (ص) کے بارے میں تعلیم دیں) ۔

فطرت کو کسی حد تک آلودہ کر لیا ہوتا ہے؛ اس لیے وہ محض اعلان اور اذان سے متنبہ نہیں ہوتے، بلکہ اُنہیں اضافی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے؛ اور یہی وہ چیز ہے جسے ہم "اللہ کے خلیفہ کی معرفت کے دلائل" یا "قانونِ معرفتِ حجت" کہتے ہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے باعث صرف رسولوں کو بھیجنے پر اکتفا نہیں کیا، اگرچہ یہی ارسال (رسولوں کا بھیجا جانا) بھی اللہ کا فضل ہے؛ بلکہ اپنے رسولوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنی دعوت کا اعلان کریں، اس کے باوجود کہ رسولوں اور اولیائے خدا کو، اللہ کے دشمنوں کی طرف سے اسی دعوے کے سبب جو کچھ برداشت کرتے ہیں؛ بلکہ اپنی وسیع رحمت کے باعث اللہ نے اسی پر بھی اکتفانہ کیا، یہاں تک کہ اپنے رسولوں کے ساتھ آیات اور بیّنات (یعنی ہر حق کے طالب کیلیے روشن اور واضح دلائل) بھی بھیجے، تاکہ کسی کے لیے کوئی عذر یا حجت باقی نہ رہ جائے، وہ عذر کتنا ہی بے بنیاد اور وہ حجت کتنا ہے پختا ہو۔

(رُسُلاً مُبَشِّرِينَ وَ مُنْذِرِينَ لِئَلاَّ يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكانَ اللَّهُ عَزِيزاً حَكِيماً)[1]

((اللہ نے) رسول بھیجے، خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے، تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے خلاف کوئی حجّت باقی نہ رہے، اور اللہ غالب، حکمت والا ہے).

اس کے باوجود کے - جیسا کہ ہم نے بیان کیا - لوگوں کے لیے کوئی حقیقی حجت موجود نہیں ہے، تب بھی اللہ کریم و مہربان نے، اپنی عظیم کرامت کی بنا پر، ان (باطل اور بے بنیاد بہانوں) کو بھی حجت شمار فرمایا؛ چنانچہ رسولوں کو آیات اور بیّنات کے ساتھ بھیجا تاکہ ان جھوٹے عذر اور وہمی حجتوں کی جڑ کاٹ دی جائے ۔ اس سب کے باوجود بھی، افسوس کہ یہ سرکش اور نافرمان، بے شرمی کے ساتھ پھر بھی ایک اور موقع چاہتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بارہا بغیر کسی استحقاق اور شایستگی کے مہلت عطا فرمائی

(قالُوا رَبَّنا أَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ أَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنا بِذُنُوبِنا فَهَلْ إِلى خُرُوجٍ مِنْ سَبِيلٍ)[2]

(وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو بار موت دی اور دو بار زندہ کیا، تو ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا۔ تو کیا (اب) نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟).

---

1. قرآن کریم، سورہ نساء، آیت 165۔
2. قرآن کریم، سورہ غافر، آیت 11۔

تاکہ ہم اس مسئلے کو زیادہ واضح طریقے سے تصور کر سکیں، میں یہ مثال ذکر کرتا ہوں: اگر آپ کے پاس کوئی کام ہو اور آپ کسی مخصوص شخص کو اس کام کو انجام دینے کا مکلّف بنائیں، لیکن وہ شخص سستی اور غفلت کی وجہ سے وہ کام انجام نہ دے اور جب آپ اُس سے پوچھیں کہ تم نے اپنا کام کیوں نہیں کیا؟ تو وہ آپ کے سامنے جھوٹے اور بے بنیاد بہانے پیش کرے، مثلاً کہے: "مجھے اس کام کے لیے فلاں اور فلاں چیز کی ضرورت ہے"؛ اور پھر آپ، اُس کے ان جھوٹے بہانوں کی جڑ کاٹنے کے لیے (باوجود اس کے کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ بہانے جھوٹے ہیں) اُس کی یہ ضروریات پوری کر دیں، ایسے جیسے آپ نے ان جھوٹے بہانوں کو ایک حقیقی عذر تسلیم کر لیا ہو؛ جیسے کہ مشہور عربی کہاوت میں کہا گیا ہے:

"اِتَّبِعِ الْکَذَّابَ إِلَی عَتَبَةِ الْبَاب"

یعنی: "جھوٹ بولنے والے کا دروازے کے پیچھے تک پیچھا کرو"

(وَ لَوْ أَنَّا أَهْلَكْناهُمْ بِعَذابٍ مِنْ قَبْلِهِ لَقالُوا رَبَّنا لَوْ لا أَرْسَلْتَ إِلَيْنا رَسُولاً فَنَتَّبِعَ آياتِكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَذِلَّ وَ نَخْزى)[1]

(اور اگر ہم انہیں اس (قرآن) سے پہلے کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے، تو وہ ضرور کہتے: اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے، اس سے پہلے کہ ہم ذلیل اور رسوا ہو جائیں؟).

لہٰذا، مسئلہ اسی پہلو سے ہے، اور کوئی یہ گمان نہ کرے کہ لوگوں کے پاس واقعی اللہ پر کوئی حقیقی حجت ہے، چاہے اللہ نے رسول بھیجے ہوں یا نہ بھیجے ہوں اور چاہے ان رسولوں کے پاس آیات، بیّنات اور دلائل ہوں یا اُن کے پاس اللہ کی یاد کے سوا کچھ نہ ہو۔

لہٰذا، مطلوب یہ ہے کہ ہر انسان خود ہی متذکّر ہو، اور مخلص ہو، تاکہ وہ ایک ایسا نبی بنے جس پر وحی نازل ہو، اور وہ حقیقت کو پہچانے اور یہ سمجھے کہ اللہ اس سے کیا چاہتا ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُسے اسی صفت پر پیدا کیا ہے، اس کیلئے بنایا اور اُسے اسی بات کے لیے آزماتا ہے تاکہ وہ یہی بن جائے:

(وَ ما خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْإِنْسَ إِلاَّ لِيَعْبُدُونِ)[2]

---

1. قرآن کریم، سورہ طہٰ، آیت 134۔
2. قرآن کریم، سورہ ذاریات، آیت 56۔

(اور میں نے جنّات اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر تاکہ وہ میری عبادت کریں).

(وَ اتَّقُوا اللَّهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ وَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَليمٌ)[1]

(اور اللہ سے پرہیز کرو، اللہ تمہیں سکھائے گا، اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے).

(قُلْ إِنَّما أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحى إِلَيَّ أَنَّما إِلهُكُمْ إِلهٌ واحِدٌ فَمَنْ كانَ يَرْجُوا لِقاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صالِحاً وَ لا يُشْرِكْ بِعِبادَةِ رَبِّهِ أَحَداً)[2]

(کہہ دو: میں فقط ایک انسان ہوں تمہاری طرح، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا الٰہ ایک ہی الٰہ ہے۔ لہٰذا جو اپنے رب سے ملاقات کی امید رکھتا ہے، تو چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے).

لیکن افسوس کہ اکثر لوگ اس جسمانی دنیا کی تاریکی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور اپنے پروردگار سے غفلت برتتے ہیں؛ نتیجتاً اس راستے کو (یعنی وحیِ الٰہی کے راستے کو) سوائے ایک قلیل گروہ کے، جیسے انبیاء اور اولیاء الٰہی، کوئی طے نہیں کرتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے باقی بنی آدم کے لیے ایک واسطہ، یعنی ایک خلیفہ، کے ذریعے راستہ کھولا، جو اُنہیں پہنچائے اور معرفت عطا کرے – جب یہ واسطے اور خلیفہ کا راستہ کھولا گیا، تو اس کے ساتھ دو اور اصول بھی ظاہر ہو گئے اس مُستخلِف (خلیفہ مقرر کرنے والا) سے متعلق جسے پہچاننا ضروری ہے؛ اور وہ دو اصول یہ ہیں: خلیفہ، اور وہ رسالت جو وہ خلیفہ اللہ کی پہچان کے لیے اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے –

دوسرا: طریق عقلی

یہ ایک ایسا طریقہ ہے جو اللہ کے وجود یا حقیقت اور اس کی صفات کے اثبات کا جائزہ لیتا ہے، لیکن وہ حقیقی معرفت جو علتِ آفرینش ہے، اسے محقق نہیں کرتا۔

قرآنِ کریم بعض دلائلِ عقلی کو بیان کرتا ہے، جیسے نظام کا دلیل اور وہ حکمت جو انسان کائنات میں دیکھتا ہے، نیز یہ دلیل کہ "عدم، خالق نہیں ہو سکتا"۔ ہم ان میں سے بعض دلائل کو بیان کریں گے، تاکہ وہ ان لوگوں پر حجت ہوں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ استدلال کی راہ میں عقل کے پابند ہیں.

---

1. قرآن کریم، سورہ بقرہ، آیت 282۔
2. قرآن کریم، سورہ کہف، آیت 110۔

ابتدا ہمیں ایک اہم امر کو واضح اور محدود کرنا ہوگا تاکہ جب بھی ہم کسی بحث میں عقل کو زبردستی شامل کرنا چاہتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ عقل ایک میزان اور ترازو ہے، نہ کہ تولنے کیلئے اوزان! عقل صرف اُن معلومات کو پرکھتا ہے جو اسے دی جاتی ہیں، ان کے اندر کی چیزیں، اُن کا وزن، ان کا ہلکا پن یا حتیٰ کہ عدمِ قدر و قیمت کو بیان کرتا ہے ۔ لہٰذا اور تاکہ عقل کا فریضہ درست طریقے سے وجود میں آئے، ایسے اوزان کی ضرورت ہے جو قیاسی، حقیقی، ثابت اور یقینی ہوں، تاکہ وہ عقل کے لیے موازنہ کا حوالہ بنیں ۔ ورنہ جو کچھ عقل یا ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے گا، وہ محض ایک وہم ہوگا جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، اور نتیجتاً ہم غلطی کا شکار ہو جائیں گے۔ افسوس سے، یہ ایک واقعی امر ہے جو عقائد اور تشریع کے میدان میں وسیع پیمانے پر پھیل چکا ہے۔

چونکہ ہماری گفتگو اس حقیقتِ خالقِ جہان یعنی مستخلِف (اللہ) کے وجود کے اثبات کے بارے میں ہے، لہٰذا عقلی ترازو شرعی یا دینی نہیں ہو سکتے، کیونکہ یہاں ہم اُس اصل کو ثابت کرنے کے درپے ہیں جس پر دین خود قائم ہے۔ نیز لازم ہے کہ یہ اوزان ایسے ثابت شدہ اور بدیہی امور پر مبنی ہوں جس میں غور و فکر کی ضرورت نہ ہوں، مثلاً یہ بات کہ کوئی چیز ایک ہی وقت میں موجود بھی ہو اور معدوم بھی[1] یہ محال ہے؛ یا یہ کہ

1. یہ اصل منطق اور فلسفہ میں سب سے واضح ابتدائی عقلی بدیہات میں شمار ہوتی ہے: (النقیضان او المتناقضان لا یجتمعان و لا یرتفعان)۔ دو نقیض آپس میں نہ جمع ہو سکتے ہیں اور نہ ہی دونوں یکجا اٹھائے جا سکتے ہیں؛ مثلاً کوئی چیز ایک ہی وقت میں موجود بھی ہو اور معدوم بھی (دو نقیض کا اجتماع)، یا یہ کہ نہ موجود ہو اور نہ معدوم (دو نقیض کا ارتفاع). (مترجم) ۔

متناہی موجودات کا سلسلہ ہر لحاظ سے [1] ایک لامتناہی ترتیب میں چلے، اور اس بات کا محال ہونا کہ عدم (نیستی) پیدا کرنے والا ہو [2]؛ اور اسی طرح کی دیگر ثابت شدہ عقلی بدیہیات۔

قرآنِ مجید [3] میں خداوند سبحان نے جن بعض عقلی دلائل کے ذریعے ملحدین (خدا کے منکرین) پر استدلال فرمایا ہے، ان میں سے چند یہ ہیں:

الف: عدم خالق نہیں ہے اور ہر اثر کسی مؤثر (سبب یا خالق) کی طرف دلالت کرتا ہے.

اللہ تعالی فرماتا ہے:

(أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخالِقُونَ) [4]

---

1. یہ اصل فلسفے کی ثانوی بدیہیات میں سے ہے جس پر تمام فلاسفہ کا اتفاق ہے؛ مثال کے طور پر اگر "الف" کی علت "ب" ہو، اور "ب" کی علت "ج" ہو، اور "ج" کی علت "د" ہو، اور "د" کی بھی کوئی اور علت ہو اور یہ سلسلہ لامحدود تک چلتا رہے اور کبھی بھی ایسی علت تک نہ پہنچے جو خود کسی دوسری علت کی معلول نہ ہو، تو تسلسل محال اور باطل ہو جاتا ہے۔ فلاسفہ کہتے ہیں کہ لامحدود تسلسل کے باطل اور محال ہونے کی علت یہ ہے کہ تسلسل کو فرض کرنا، علیّت کو فرض نہ کرنے کے مترادف ہے؛ یعنی پہلے حلقے میں کوئی حقیقی علت موجود نہیں کہ یہ سلسلہ اس تک پہنچے۔ اور نتیجتًا یہ تمام سلسلۂ معلولات آخرکار کسی "لا شیء"، "ناچیز" اور "عدمِ مطلق" سے وجود میں آیا ہوگا، جبکہ "لا شیء" اور "عدمِ مطلق" کسی چیز کا منتج اور علتِ وجود نہیں ہو سکتے، کیونکہ عدمِ مطلق خود کوئی وجود نہیں رکھتا کہ وہ کسی اور کو وجود بخش سکے (کسی بھی فرض کیے جانے والے معنی میں). (مترجم) ۔

2. فلسفے کے امورِ عامہ کی مباحث میں ایک بحث عنوان «لا شيئية للعدم من حيث العدم» کے تحت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ "ناچیز" اور "لا شیء مطلق" کوئی چیز نہیں ہے اور اس کا ہستی میں کوئی حصہ یا نصیب نہیں، تاکہ وہ کسی اور کو ہستی عطا کر سکے. اسی طرح ایک اور اصل، جو معنی میں اسی کے مشابہ ہے، یہ ہے: «فاقد الشيء لا يعطي الشيء»، یعنی جو شخص خود کسی چیز کا مالک نہ ہو وہ بدرجۂ اولیٰ وہ چیز کسی اور کو نہیں دے سکتا۔ مثلًا اگر آپ کے پاس علمِ حدیث نہ ہو تو آپ کسی اور کو علمِ حدیث نہیں سکھا سکتے؛ اسی طرح اگر علت کسی کمال اور خاصیتِ وجودی سے محروم ہو (خواہ وہ کمال زیادہ مکمل، زیادہ کامل، اعلیٰ اور اشرف درجے میں کیوں نہ ہو) تو وہ اسے اپنے معلول کو عطا نہیں کر سکتی. ایک اور اصل جو اسی عقلی اصل کے مشابہ ہے، وہ ہے اصل «علت اور معلول کے درمیان ہم جنس ہونے کی ضرورت»؛ یعنی ہر علت کسی بھی معلول کو پیدا کرنے والی اور موجب نہیں بنتی، بلکہ معلول اور علت کے درمیان کسی نہ کسی درجے کی ہم جنسی، ہم آہنگی اور مطابقت ہونا ضروری ہے، اور ہر معلول ہر علت سے پیدا نہیں ہو سکتا. (مترجم) ۔

3. جب ہم یہاں قرآن کی آیات کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے یہ مراد نہیں کہ عقلی دلائل میں قرآن کی آیات حجت ہیں؛ بلکہ ہم ان آیات کو اس اعتبار سے پیش کرتے ہیں کہ یہ آیات عقلی دلائل کو سامنے لاتی ہیں۔ لہٰذا مخالفین کو بھی یہ حق نہیں کہ ان دلائل کو محض اس وجہ سے رد کر دیں کہ یہ قرآن سے آئے ہیں اور وہ دین اور قرآن کو نہیں مانتے۔ ہم بھی اُنہیں اس لیے مجبور نہیں کرتے کہ یہ دلائل قرآنی ہیں تو وہ انہیں مانیں؛ بلکہ اس لیے کہ ہم نے اُن کے سامنے عقلی دلیل پیش کی ہے۔ لہٰذا اگر وہ اس عقلی دلیل کو قبول نہیں کرتے تو انہیں چاہیے کہ اسے عقلی دلائل کے ذریعے رد کریں۔

4. قرآن کریم، سورہ طور، آیت 35۔

(کیا وہ بغیر کسی چیز (لا شیء وعدم) کے بنائے گئے، یا وہ خود تخلیق کرنے والے ہیں؟!).

یہ عالَم (یا عوالم) ازلی نہیں ہے بلکہ حادث ہے، کیونکہ یہ متغیّر ہے، اور ہر حادث چیز سے پہلے عدم (نیستی) تھا؛ لہٰذا لازمی ہے کہ اس کا کوئی مُحدث (پیدا کرنے والا) ہو، کیونکہ عدمِ مطلق میں کوئی شیئیت نہیں ہوتی، اور نتیجتاً کچھ پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ محال ہے کہ کوئی چیز محض نیستی اور مطلق عدم سے وجود میں آ جائے۔ ہستی یا ہستیاں یا حادث وجود[1]، ایک چیز ہے؛ لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ وہ مطلق عدم سے پیدا ہوئی ہوں ۔ چنانچہ حادث وجود اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ وہ کسی ازلی وجود سے پیدا ہوا ہے جو اس سے اور اس کے علاوہ ہر چیز سے بے نیاز ہے۔

نتیجتاً اگر ہم یہ کہیں کہ اُس کا مُحدِث قدیم اور ازلی ہے اور اس سے پہلے عدم نہ تھا (کبھی معدوم نہیں تھا)، تو ہم نے خداوندِ سبحان کے وجود کو ثابت کر لیا.[2]

اور اگر ہم کہیں کہ وہ حادث ہے، تو اس کے لیے بھی ایک مُحدِث کا ہونا لازم ہوگا، اور وہ خود اوّل نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک ہی چیز بیک وقت موجود بھی ہو اور معدوم بھی۔ اور اگر اس کا سبب کوئی اور ہو تو اس سے تسلسل لازم آتا ہے، اور یہ سلسلہ ہر جہت اور ہر اعتبار سے غیر متناہی نہیں ہو سکتا؛ کیونکہ عالم حادث، متناہی اور آغاز رکھتا ہے۔ اور جب یہ سلسلہ کم از کم اس اعتبار سے متناہی ہے کہ اس کا ایک آغاز ہے، تو ضروری ہے کہ وہ ایک ازلی اور قدیم مُحدِث پر ختم ہو، اور اسی طرح اس کی ذاتِ اقدس ـــ سبحانہ ـــ کا وجود ثابت ہو جاتا ہے۔

---

1. یعنی وہ وجود جو کسی وقت وجود میں آئی تھی۔

2. اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(وَكَذلِكَ نُري إبْراهيمَ مَلَكُوتَ السَّماواتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ * فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأى كَوْكَباً قالَ هذا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قالَ لا أُحِبُّ الْآفِلِينَ * فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بازِغاً قالَ هذا رَبِّي فَلَمَّا أَفَلَ قالَ لَئِنْ لَمْ يَهْدِني رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ * فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بازِغَةً قالَ هذا رَبِّي هذا أَكْبَرُ فَلَمَّا أَفَلَتْ قالَ يا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِمَّا تُشْرِكُونَ * إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذي فَطَرَ السَّماواتِ وَالْأَرْضَ حَنيفاً وَما أَنَا مِنَ الْمُشْرِكينَ) (انعام/75 - 79) ۔

(اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی دکھائی تاکہ وہ یقین رکھنے والوں میں سے ہو جائے۔ پھر جب رات اس پر چھا گئی تو اس نے ایک ستارہ دیکھا، کہا: یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا تو کہا: میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر جب اس نے چاند کو چمکتا دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا تو کہا: اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ دے تو میں ضرور گمراہ قوم میں سے ہو جاؤں گا۔ پھر جب اس نے سورج کو چمکتا دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے، یہ بڑا ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا تو کہا: اے میری قوم! میں بیزار ہوں اس سے جو تم شریک کرتے ہو۔ بے شک میں نے اپنا رخ یکسوئی سے اس کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں) ۔

ہمارا مقصود ازلِ زمانی نہیں ہے، بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ وہ وجود جس سے پہلے عدم نہیں تھا (یعنی ایسا وجود جو کبھی معدوم نہ تھا) -اور اس مفہوم میں ہم زمان کے پہلو اور اس کے عدم سے وجود میں آنے کو نظرانداز کر رہے ہیں[1]

نامتناہی مطلق: وہ ہے جو ہر لحاظ اور ہر جہت سے غیر محدود ہو، یعنی نہ اس کی کوئی ابتدا ہو اور نہ کوئی انتہا اور یہ زمان و مکان کے پہلو اور ان دونوں کی عدم سے وجود میں آنے سے قطع نظر ہے۔

ہمارا مطلب وہ لامحدود نہیں ہے جو بعض ریاضیاتی معادلات (equation) میں آتا ہے، مثال کے طور پر:

$$1+\frac{1}{2}+\frac{1}{4}+\frac{1}{8}+\frac{1}{16}\ldots\ldots\ldots\ldots=2$$

لہٰذا اگرچہ معادلے کا بایاں طرف نامتناہی طور پر جاری رہتا ہے، لیکن اس کی ایک واضح اور معیّن ابتدا موجود ہے؛ اسی طرح وہ فلیٹ یونیورس (ہموار کائنات) بھی ہے جس کے بارے میں فرض کیا گیا ہے کہ اس کی وسعت کی کوئی انتہا یا خاتمہ نہیں، تب بھی ایک آغاز رکھتی ہے جس سے اُس کا سلسلہ شروع ہوا ہے.

اس مادی عالَمِ ہستی، یا جسمانی جہان - جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں - کا حادث ہونا (یعنی قدیم و ازلی نہ ہونا) جدید اور پیش رفتہ طبیعیاتی (فزیکل) مباحث کی بنیاد پر بھی ثابت ہو چکا ہے۔ اگر یہ جسمانی کائنات ازلی ہوتی، تو اسے استقرار اور توازن کی حالت میں ہونا چاہیے تھا، نہ کہ موجودہ حالت کی طرح مضطرب، متغیر اور مسلسل حرکت میں۔ آج کے دور کے ملحدین (خدا کے منکرین) بھی کائنات کے حادث ہونے اور ازلی نہ ہونے کو ماننا چاہیے تھا؛ کیونکہ وہ اپنی دعوے کے مطابق "اہلِ تطبیق" (یعنی سائنسی تطبیق کے قائل) ہیں اور ان باتوں کا اعتراف کرتے ہیں جنہیں طبیعی علوم اور ان کے قوانین تسلیم کرتے ہیں.

میں یہ بات ملحدین پر حجّت قائم کرنے کے لیے کہتا ہوں، کیونکہ وہ صرف جسمانی عالم ہی کو مانتے ہیں؛ حالانکہ ہماری گفتگو صرف عالمِ جسمانی تک محدود نہیں ہے (عالم کے حادث ہونے کے اثبات کے باب میں دیگر عوالم بھی شامل ہے).

---

[1]. یہ فلسفی ایک مستقل بحث کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس میں وجود میں آنے کی علت کو وجوب کی پہلو سے ہر چیز کو دیکھتے ہیں۔

ب: اثر کی خصوصیت، مؤثر[1] کی خصوصیت پر دلالت کرتی ہے

اس دلیل کو بیان کرنے کے لیے، میں یہاں کتاب "وہم الإلحاد[2]" کے ایک حصے کو نقل کر رہا ہوں، اور جو حضرات اس کی تفصیلات کے خواہاں ہوں، انہیں چاہیے کہ مذکورہ کتاب کی طرف رجوع کریں.

*فیصلہ کن بات: "ارتقاء مقصدیت رکھتا ہے"

ہمارے پاس جینز، جینیاتی تغیر (mutation)، اور برتر جین کی بقا کا قانون یا دوسرے الفاظ میں، برتر مخلوق (کا قانون) موجود ہے۔ جین اور جاندار کے درمیان فرق ایسا ہی ہے جیسے تعمیراتی نقشہ اور خود عمارت کے درمیان فرق ۔ پسندیدہ جین کے بقا کا قانون، ان جینز کو نکھارتا اور صیقل کرتا ہے ۔ اب ہم مکمل یقین سے جانتے ہیں کہ زمینی حیات میں زندہ رہنے کے اہل ترین وجود کی بقا کا ذریعہ مجموعی طور پر اس کی ذہانت کا آلہ یا اس کا دماغ ہے۔ اگرچہ ذہانت کا آلہ یعنی دماغ جاندار کے لیے معاشی لحاظ سے مہنگا ہے کیونکہ اسے زیادہ خوراک درکار ہوتی ہے ۔ پھر بھی ارتقاء مجبور ہے کہ اسی راستے پر چلے، یعنی ذہانت کے آلے کو ترقی دینے کے عمل کو آگے بڑھائے.

چونکہ جینیاتی تغیر (میوٹیشن) ابتدا ہی سے موجود ہے، تو یہ لازمی ہے کہ ذہانت کے آلے (مثلاً دماغ) کو تشکیل دینے والے جینز کبھی نہ کبھی وجود میں آئیں؛ اگرچہ جینیاتی تغیر کو بالکل بے مقصد ہی کیوں نہ تصور کیا جائے.

اور چونکہ ارتقائی عمل میں برتر جینز کی بقا کا قانون یا برتر جاندار کی بقا[(3)] (Survival of the Fittest) نافذ ہوتا ہے، اس لیے ہم پوری قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ارتقاء کی حرکت کی سمت اور رخ ابتدا ہی سے متعین تھا، اور اس کا مقصد بھی ذہانت کے آلہ (جیسے دماغ) کے جینز یا ایک باشعور اور ذہین مخلوق کی تخلیق تھا؛ لہٰذا ارتقاء ایک بامقصد عمل ہے.

---

1. مؤثر اس کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز میں اثر ڈالتی ہے۔

2. عربی کا لنک (https://almahdyoon.com/arabic/documents/live/wahmilhad/mobile/index.html#p=28) اور انگلش کا لنک (https://www.saviorofmankind.com/wp-content/uploads/2019/01/Atheism-Delusion-v01.pdf)

3. جینز کا جاندار سے تعلق ایسا ہے جیسے نقشہ کا عمارت سے۔ جینز نقشہ ہیں اور جاندار اُس نقشے کے نفاذ کا حاصل ہے۔

میرے نزدیک یہ مکمل استدلال ڈاکٹر ڈاکنز کے الحادی نظریے کو رد کرنے کے لیے کافی ہے، خصوصاً اُس مقام پر جہاں وہ کہتا ہے کہ ارتقاء کی بنیاد پر قائم زمینی زندگی بالآخر بے مقصد ہے.

در حقیقت اگر ہم پچھلے حکم کو مزید وسعت دیں اور اسے ہر ممکنہ قسم کی زندگی پر لاگو کریں، تو ہم قانونِ ارتقاء کی بنیاد پر جو ہم صورت سازوں (replicators) یا نقل بنانے والے آلات کی جینیاتی جہش اور ان میں سے بہترین کے انتخاب پر قائم ہے، اپنی رائے کو پورے یقین کے ساتھ یوں بیان کر سکتے ہیں: ہر قسم کی زندگی چاہے وہ ہماری زمینی زندگی ہو (جو پانی، کاربن، نائٹروجن اور دیگر کیمیائی عناصر پر قائم ہے)، یا کسی دوسرے سیارے یا کائنات کی زندگی ہو (جو مثلاً پانی کے بجائے امونیا یا کاربن کے بجائے سیلیکون پر مبنی ہو، کیونکہ سیلیکون بھی کاربن کی طرح لمبے سلسلوں کی تشکیل کی صلاحیت رکھتا ہے) اس کا یقینی نتیجہ یہ ہوگا کہ ذہانت کا آلہ پیدا ہوگا اور اُس قانون کے مطابق جسے ہم اب پہچان چکے ہیں، یہی ارتقاء کا حتمی مقصد ہے اور کوئی بھی زندگی یا صورت ساز یا نقل بنانے والا آلہ اور ارتقائی عمل جلد یا دیر سے اس نتیجے تک پہنچنے سے باز نہیں رہ سکتا.

ہم جانتے ہیں کہ یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہمارے کائنات میں ہر قسم کی زندگی لازمی طور پر پانی اور کاربن پر قائم ہو، کیونکہ پانی ایک ایسا مائع ہے جو زندگی کی میزبانی کے لیے انتہائی موزوں ہے؛ اس لیے کہ جب پانی جم جاتا ہے تو اس کا کثافت (جرمِ حجمی، Density) کم ہو جاتی ہے، اور برف پانی کی سطح پر تیرنے لگتی ہے، جس کے نتیجے میں برف، نیچے بہتے پانی میں زندگی کے جاری رہنے کا امکان فراہم کرتی ہے ۔ یہ چار عناصر ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن اور کاربن کائنات میں سب سے زیادہ پائے جانے والے عناصر میں شمار ہوتے ہیں — اور کاربن بذاتِ خود ایسے سلسلے بنا سکتا ہے جو نسبتاً کمزور ہوتی ہیں، جو کہ سیلیکون کی سلسلوں کے برعکس نسبتاً آسانی سے ٹوٹ جاتی ہیں، اور یہی انہیں میٹابولزم (جسمانی کیمیائی عمل) اور زندگی کے لیے موزوں بناتی ہیں.

یوں ہم نظریۂ ارتقاء کی بنیاد پر اُس آخری بات اور اختلاف کے حل تک پہنچتے ہیں جو خدا یا پروردگار کے وجود کے امکانِ اثبات سے متعلق ہے ۔ ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ زندگی با مقصد ہے اور مقصد کے تحت ہے، اور ارتقائی عمل بھی اسی طرح با مقصد ہے — چونکہ اثر کی صفت و خصوصیت، اُس کے مؤثر (یعنی پیدا کرنے والے) کی صفت پر دلالت کرتی ہے، نتیجے کے طور پر مؤثر کے لیے یہ صفت ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ مقصد رکھنے والا، عاقل اور دانا ہے؛ اور اسی طرح سے ہم نے ایک مقصد رکھنے والے، عاقل اور دانا مؤثر کے وجود کو ثابت کر دیا۔

نتیجتاً پروردگار یا الہ کا وجود ثابت ہوتا ہے، خواہ وہ براہِ راست مؤثر ہو، یا اُس کے آثار میں سے کوئی اثر اس پر دلالت کرتی ہو – یعنی با مقصد ہونا۔ یہ استدلال بذاتِ خود نئے الحادی نظریے کو رد کرنے کے لیے کافی ہے، یعنی اُس نظریے کو جو یہ کہتا ہے کہ ارتقاء ایک طویل المیعاد مقصد سے خالی ہے.

ذہانت کی مشین

میں نے کہا کہ ارتقا کا مقصد "ذہانت کی مشین" تک پہنچنا ہے، کیونکہ ذہانت کی مشین ہی وہ آلہ ہے جس کے ذریعہ جینز کے درمیان بقا کی شدید مسابقت میں بقا کو زیادہ ممکن بناتے ہیں – آج زمین پر سات ارب انسانوں کا وجود اس حقیقت کے اثبات کے لیے کافی ہے، لیکن اس بات کو تھوڑا سا مزید بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر ہم فرض کر لیں کہ جینیاتی تغیر (mutation) ابتدا سے ہی اتفاقی رہا ہو، تب بھی ایسا جین مہیا کرنا لازم ہوگا جو ایسا جین دے جس سے ذہانت کی مشین پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہاں ذہانت کی مشین سے مراد موجودہ انسانی یا حیوانی دماغ نہیں، بلکہ کوئی بھی ایسی چیز جس کو تصور کر سکیں کہ وہ عنصر ہے جسے دماغ کا وجود شروع ہوا، جیسے کہ ایک عصبی خلیہ (cell nerve)۔ یقیناً وہ جاندار جو ذہانت کی مشین سے بہرہ مند ہیں، بقا کی کشمکش میں کامیاب ہوتے ہیں، اور ان کی بقا کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر مقابلہ ایسے موجودات کے درمیان چلی جائے جو سبھی ذہانت کی مشین کے حامل ہوں، تو وہ جو زیادہ ذہانت رکھتے ہیں، اس پیکار میں زیادہ کامیاب ہوں گے؛ اور یہ سلسلہ یوں ہی آگے بڑھتا رہے گا۔ لہٰذا ارتقا میں ذہانت کی مشین کا آغاز ہونا ایک یقینی امر ہے؛ اسی طرح وقت کے ساتھ ساتھ ان آلات کا بہتر ہونا وقت کے ساتھ ساتھ اور ترقی بھی ایک یقینی بات ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذہانت کی مشین تک پہنچنا ارتقا کا ایک حتمی ہدف ہے؛ یعنی اگر خلاصے میں کہا جائے، تو تکامل کا مقصد "ذہانت" تک پہنچنا ہے.

میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ میرا مطلب یہ نہیں کہ ہر وہ مقابلہ جو افراد کے درمیان پیدا ہوتا ہے، اُس کا نتیجہ لازماً ایک ذہین فرد کے حق میں نکلتا ہے۔ حتیٰ کہ میں اُن تنازعات کے بارے میں بھی ایسا نہیں کہتا جو انواع کے درمیان پیش آتے ہیں۔ میرا کہنا صرف یہ ہے: وہ جین جو ذہانت کی مشین پیدا کرنے والا ہے، اس مقابلہ میں پسندیدہ ہے اور یقیناً اس مسابقت میں کامیاب ہوتا ہے.

کبھی زیادہ ذہین یا اعلیٰ ذہانت کی مشین رکھنے والا بھی کم ذہین، یا حتیٰ کہ بغیر ذہانت کی مشین والے سے ہار جاتا ہے، اور یہ نتیجہ مقابلے کے وقت موجود حالات اور خصوصیات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کبھی تنازعِ بقا میں برتر

ذہانتی آلے سے بہرہ مند نوع، کمزور ذہانتی آلہ رکھنے والی نوع کے مقابلے میں اپنی مخصوص خصوصیات اور حالات کی وجہ سے شکست کھا جاتی ہے۔

لیکن ذہانت کی مشین بنانے والا جین، جب ایک بار جینیاتی نظام میں شامل ہو جائے جس پر جانداروں کا وجود قائم ہے، تو وہ نہ دوسرے جینز سے مغلوب ہوتا ہے اور نہ ہی اس نظام سے خارج ہو سکتا ہے — بلکہ وہ آگے بڑھتا رہے گا، اور وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن رہے گا ۔ کیونکہ اس جین اور دیگر جینز کے درمیان تنازعِ بقا، ترقی یا اولیت حاصل کرنے کے میدان میں بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے.

اور جینز کے درمیان مسابقت صرف بقا کی مسابقت تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ جینز کے درمیان اس جینیاتی مجموعے میں مقام حاصل کرنے کی مسابقت بھی ہوتی ہے جس پر جاندار اجسام کی ساخت قائم ہے۔ چنانچہ وہ جینز جو تعداد میں زیادہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں—اگرچہ ان کی مسابقت غیر شعوری اور غیر ارادی ہوتی ہے— درحقیقت ایک ایسی مسابقت سے گزرتے ہیں جو عمومی قانونِ ارتقاء کے تحت اور اسی کے تابع ہوتی ہے۔

*وہ عقلی دلائل جو قرآن اللہ کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے پیش کرتا ہے

جو کچھ اس باب میں پیش کیا گیا ہے، وہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ارتقاء با مقصد ہے، اور نتیجتاً اس بات کے اثبات کے لیے بھی کافی ہے کہ اس کے پیچھے کوئی ہستی موجود ہے جو اس مقصد تک پہنچنا چاہتی ہے۔ ہم نے "اثر کی صفت، مؤثر کی صفت پر دلالت کرتی ہے" کے قانون کے تحت الہ کے وجود کو ثابت کر لیا، اور یہ بھی ثابت کیا کہ اثر یعنی یہی زمینی زندگی، با مقصد ہے؛ اور اس طرح ہم نے واضح کیا کہ اس کا مؤثر ایک باشعور ہستی ہے جو کسی مقصد کو چاہتی ہے اور اس کے پاس قوت ادراک بھی ہے۔ اسی بنیاد پر ہم نے ایک مدرک اور علم والا الہ کے وجود کو ثابت کیا ۔ اس کے باوجود، میں اس باب کے آگے چل کر اس امر کا جائزہ لوں گا اور اس پر زور دوں گا کہ ارتقاء، اُس زاویے سے بھی جس میں اسے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے دیکھا جاتا ہے، با مقصد ہی ہے، کیونکہ اگرچہ بایولوجسٹ[1] ارتقاء کو اجزاء میں بانٹ کر دیکھنے پر اعتماد کرتے ہیں، اور ان میں سے ملحد بایولوجسٹ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ اسے صرف جزئیاتی زاویۂ نظر سے ہی دیکھا جائے، تاہم میں اس زاویۂ نظر کو "ایک آنکھ سے دیکھنے" کے مترادف سمجھتا ہوں.

---

1. "علماء الأحیاء" کا ترجمہ حیاتیات دان بھی ہو سکتا ہے اور جدید اصطلاح میں بایولوجسٹ کہتے ہیں۔

استدلال «عدم پیدا کرنے والا نہیں ہوتا» کے بارے میں اس امر پر توجہ دینا ضروری ہے کہ وہ اثر، جو اللہ کو مؤثر کے طور پر ثابت کرنے کے لیے زیرِ بحث آنا چاہیے، درحقیقت یہی مبدا اور اصلِ عالمِ مادّی اور اس کے ماوراء کا وجود ہے۔ اس ضمن میں گفتگو صرف نظریۂ ڈارون یا بایولوجی تک محدود نہیں رہتی، بلکہ اس مسئلے کو سائنسی انداز میں اُن فزیکی مباحث اور نظریات کے دائرے میں بھی زیرِ بحث لایا جا سکتا ہے جو کائنات اور اس کی کیفیتِ پیدائش سے مختص ہیں ۔ ہم اس بحث کو چھٹے باب میں تفصیل سے بیان کریں گے.

خداوندِ مطلق کے وجود پر پہلی دلیل :اثر کی صفت، مؤثر کی صفت پر دلالت کرتی ہے۔

ان استدلالوں میں سے ایک ضابطہ بندی کی دلیل ہے۔اثر میں قوانین کا پایا جانا، اس کے مؤثر میں قانون ساز ہونے کی دلالت کرتا ہے، اور نتیجتاً مؤثر کے عالم و دانا ہونے پر رہنمائی کرتا ہے، جو کہ ہمارے اثبات کا مقصود ہے۔

اسی طرح ان استدلالوں میں سے ایک نظم کی دلیل ہے۔ اثر میں پائے جانے والا نظم، اس کے مؤثر کی نظم دہندہ ہستی ہونے پر دلالت کرتا ہے، اور یوں وہ بھی مؤثر کے عالم ہونے پر دلیل بنتا ہے، جو کہ ہمارے اثبات کا مقصود ہے.

ان استدلالوں میں سے ایک مقصد (ہدف) کی دلیل ہے۔ کسی اثر کے لیے مقصد کا پایا جانا، اس کے مؤثر کے مقصد رکھنے پر دلالت کرتا ہے، اور نتیجتاً مؤثر کے عالم و دانا ہونے کا پتہ دیتا ہے، جو ہمارے اثبات کا مقصود ہے۔

اسی طرح ان استدلالوں میں سے ایک حکمت کی دلیل ہے۔ اگر کوئی اثر حکمت سے متصف ہو، چاہے وہ قول یا فعل میں ہو تو وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا مؤثر حکیم اور دانا ہے، جو کہ ہمارے اثبات کا مقصود ہے۔

ان تمام دلائل کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

جب ہم کسی منظّم شے کو دیکھتے ہیں تو سمجھ جاتے ہیں کہ اس کا مؤثر (یعنی اسے وجود میں لانے والا) دانا اور نظم دینے کی صلاحیت رکھنے والا ہے۔ نتیجتاً، ایک نظم دہندہ اور دانا مؤثر کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح جب ہم کسی حکیمانہ قول یا فعل سے روبرو ہوتے ہیں تو جان لیتے ہیں کہ وہ کسی حکیم فرد سے صادر ہوا ہے، اور یوں ایک حکیم مؤثر کے وجود کا اثبات ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، جب ہم پھل دار درختوں کے ایک مجموعے کو دیکھتے ہیں جو کسی خاص نظم و ترتیب سے لگائے گئے ہوں، تو ہم یہ حکم لگاتے ہیں کہ جس نے یہ درخت لگائے، وہ لازماً نظم

دینے والا اور مقصد رکھنے والا تھا، اور اسی بناپر ہم کہتے ہیں کہ وہ اپنے فعل کے بارے میں دانا اور باخبر تھا، اور مثلاً یہ کہیں گے کہ وہ ایک انسان تھا۔ لیکن جب ہم ایک ایسے جنگل سے روبرو ہوں جو درختوں سے بھرا ہو مگر بے ترتیب اور غیر منظّم ہو، تو درختوں کی یہ بے نظمی ہمیں اس بات کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ یہ درخت انسان نے نہیں لگائے۔

یہ دلیل عمومی طور پر زمینی زندگی کے دائرے میں قابلِ انطباق ہے، اور اس کی مثالیں خصوصاً انسان کے بارے میں کثرت سے پائی جاتی ہیں، کیونکہ انسان بعض مخصوص صفات سے متصف ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس کا اصل مؤثر اور پیدا کرنے والا ایک دانا، نظم دینے والا اور مقصد رکھنے والا ہے۔ اسی سبب سے، یہ دلیل نظریۂ ارتقاء سے مربوط ہو جاتی ہے۔

جس کائنات میں ہم رہتے ہیں اس میں اثر کی صفت مؤثر کی صفت پر دلالت کرتی ہے

بلا شبہ اس جہان پر قوانینِ طبیعی (فزیکی) کا ایک مجموعہ حاکم ہے، اور قانون کا ہونا، ایک قانون ساز کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔ نیز، قانون یقینی طور پر نظام کو جنم دیتا ہے، اور نظام کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نظم دینے والا موجود ہے۔

مزید وضاحت کے لیے، میں ایک مثال پیش کرتا ہوں:

جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی چوراہے پر گاڑیوں کی آمد و رفت کو منظّم کرنے کے لیے ٹریفک لائٹ کا استعمال کیا گیا ہے، تو ہم جان لیتے ہیں کہ کوئی باشعور، دانا اور نظم بخشنے والی قوت اس نظام کے پیچھے موجود ہے، اور وہی ہے جس نے یہ چراغ نصب کیا ہے۔ اسی قیاس پر ہم کہتے ہیں: قانونِ کشش (gravity) اس کے وضع کرنے والے پر دلالت کرتا ہے، اور اسی طرح برقی-مقناطیسی قوتیں اور کمزور اور مضبوط نیوکلیائی قوّت بھی اپنی سطحِ وجود اور اپنی مؤثریت کے مطابق اپنے مقرر کرنے والے کے وجود پر دلیل بن جاتی ہیں۔ یہ تمام قوانین، کائناتی ٹریفک کے قوانین پیش کرتے ہیں جیسے کہ ہم نے مذکورہ چوراہے میں دیکھا ۔ اگر یہ (قوانین) ان مخصوص پیمانوں اور مقامات پر نہ ہوتیں، تو کوئی مادہ وجود میں نہ آتا اور ہم اس دنیا میں وجود نہ پاتے ۔ تو کیا یہ عقلاً درست ہوگا کہ ہم ایک سادہ سے ٹریفک سگنل کو دیکھ کر یہ حکم لگائیں کہ کوئی ٹریفک پولیس یا بلدیاتی نظام (مثلاً میونسپلٹی) ہے جس نے ان اشاروں کو چوراہے پر ترتیبِ عبور و مرور کے لیے نصب کیا ہے، اور یہ بھی کہیں کہ اس پولیس کے پیچھے ایک حکومت موجود ہے جو اس کے عمل کو منظّم کرتی ہے لیکن ہم یہ حکم نہ لگائیں کہ کوئی

حکیم و دانا قوت موجود ہے جو کائنات کے قوانین بنانے والا ہے (وہی قوانین جن کے مشاہدے ہم کرتے ہیں اور جنہیں سائنس نے ہمارے لیے ثابت کیا ہے) اور کیا یہ کہنا لازم نہیں کہ وہی ذات ہے جو ساری کائنات میں حرکت اور آمد و رفت کو منظّم اور معین کر رہی ہے؟!

بلا شبہ ایک صاحبِ عقل شخص، نظم دینے والے کے وجود کا حکم لگاتا ہے، جس نے اس کائنات کے نظم بخش قوانین کو وضع کیا ہے؛ لیکن جو شخص ایک حکیم و دانا نظم دینے والے کے انکار پر اصرار کرتا ہے، اس کا یہ اصرار محض عناد اور جانبدارانہ ہٹ دھرمی سے پیدا ہوتا ہے، جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کا حال اُن لوگوں سے کچھ مختلف نہیں جو زمین کے گردش نہ کرنے پر اصرار کرتے تھے.

کیا یہ پوری کائناتی نظام بغیر کسی نظم دینے والے کے ہے؟! خدا کی قسم! میں اُس شخص پر تعجب کرتا ہوں جو ایسے عقیدے پر یقین رکھتا ہے، اور اس کے باوجود وہ یہ کہتا ہے کہ ٹریفک سگنل کو نصب کرنے والا ٹریفک پولیس یا سڑکوں کا نظم و نسق چلانے والا کوئی مرکز ہے۔ایسے شخص کو اپنے آپ سے انصاف کرنا چاہیے، اور اپنے نظم کے انکار کو یہاں بھی ظاہر کرنا چاہیے، اور یہ کہنا چاہیے: "ٹریفک سگنل خود بخود بن گیا اور خود بخود چوراہے پر آ موجود ہوا۔" کیا یہ عقل مندی ہے کہ ہم کسی جگہ پر نظام اور قوانین کو دیکھیں تو کہیں کہ وہاں کوئی نظم دینے والا موجود ہے، لیکن کسی دوسری جگہ پر انہی جیسے نظام اور قوانین کو دیکھ کر یہ کہیں کہ ان کو کسی دانا نظم دینے والے نے وضع نہیں کیا؟!

اگر ہم استدلال "اثر کی صفت، مؤثر کی صفت پر دلالت کرتی ہے" کو، اور نتیجتًا ایسے مؤثر کے وجود پر دلالت کو جو اس صفت سے متصف ہو، خلاصہ کریں تو ہم کہیں گے:

جب ہم اور ملحد، عقلِ انسانی کی عدالت میں رجوع کرتے ہیں، تو درج ذیل حقائق سامنے آتے ہیں:

اثر = عالمِ ہستی

صفتِ اثر (عالَم) = قانون مندی اور نظام

صفتِ مؤثر = نظم دینے والا اور دانا

مؤثر = نامعلوم ہستی.

ہم نے کائنات (عالَم) کا جدید علوم کے ذریعے جائزہ لیا، اور اس کی صفت کو پہچانا، اور یہی صفت ہمیں اُس موصوف کی صفت کی طرف رہنمائی کرتی ہے جس کا وجود بالکل ظاہر و آشکار ہے۔ اس کی صفت سے ظاہر ہے کہ وہ نظم دینے والا (قانون ساز) ہے، اور اسی کے نتیجے میں وہ مدرک اور عالم بھی ہے۔

اب یہ ثابت ہو چکا کہ ایک ایسا مؤثر موجود ہے جو نظم دہندگی، مدرک اور علم کی صفات سے متصف ہے۔ لہٰذا ہم نے ایک نظم دہند عالم کے وجود کو ثابت کر دیا ہے، جو کائنات (عالَمِ وجود) کے قوانین کو وضع کیا ہے (اور یہی وہ امر ہے جس کا اثبات ہمارا مقصود تھا)۔

زمینی حیات میں، اثر کی صفت مؤثر کی صفت پر دلالت کرتی ہے

بے شک، عالمِ وجود کے فزیکی قوانین کا ایک مجموعہ زمین اور زمین پر موجود تمام اشیاء پر بھی حاکم ہے؛ اور اسی بناپر یہ امر بھی بطورِ دلیل واستدلال پیش کیا جاسکتا ہے۔ قوانین ہی اس نتیجہ خیز نظام کے وجود میں آنے کی دلیل ہیں، اور وہ فطرت (کائناتی نظام) جو انتخاب کرتی ہے، درحقیقت انہی قوانین کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا یہ فطرت (کائناتی نظام)، یقینی قوانین پر مبنی ہے اور قانو نمند ہے؛ اسے تصادفی اور بے قانون شمار نہیں کیا جا سکتا۔ نتیجتاً، فطرت کی جانب سے موزوں یا زیادہ موزوں اشکال کا انتخاب، دراصل باقاعدہ یا قوانین پر مبنی ہے۔ جب تک کہ فزیکی قوانین جو کم از کم ہمارے لیے ظاہر ہیں اور ایک قابلِ توجہ حد تک، سطحِ اتمی اور غیر اتمی پر موجود ہیں اور زندگی انہی سطوح پر قائم ہے اور زمین پر زندگی کو تشکیل دیتے ہیں، تو قانون سازی بھی موجود ہے؛ اور یہی وہ امر ہے جس کی ہم تلاش کر رہے ہیں.

یہ موضوع بالکل صاف ظاہر ہے؛ لہٰذا یہاں اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں، اور کسی اور مقام پر اس کی تفصیل بیان کریں گے ۔ اب آگے ہم تین ایسے موضوعات کی طرف بڑھتے ہیں جو بطورِ خاص زمینی حیات سے متعلق ہیں:

جینیاتی نقشہ (جینوم)

قانونِ ارتقاء یا ترقی، جو قدرتی انتخاب کے ذریعے وقوع پذیر ہوتا ہے.

ارتقاء یا ترقی کا مقصد، جو قدرتی انتخاب کے ذریعے حاصل ہوتا ہے.[1]

---

1. وہم الالحاد، ص 194۔

یہاں خدا کے منکرین اس طرح کا ایک اعتراض پیش کرتے ہیں: زمین پر زلزلوں کا وقوع، اور ماضی میں بعض پتھروں یا شہابِ ثاقب کا زمین سے ٹکرانا... یہ سب اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جو کچھ موجود ہے وہ کوئی منظّم نظام نہیں، بلکہ ایک تصادفی (اتفاقی) واقعہ ہے.

یہ بات درحقیقت صرف ایک نادان شخص کے اعتراض کی مانند ہے جو کسی ایسی چیز پر اعتراض کرتا ہے جس کی حقیقت سے وہ آگاہ نہیں؛ کیونکہ ایک وسیع اور جامع پیداواری نظام کا وجود، اس کا ثبوت، اور اس کا با مقصد ہونا، ان واقعات کے وجود سے کسی طور متضاد نہیں جو بظاہر اُس جامع نظام کے ساتھ ہم آہنگ نظر نہیں آتے۔ مزید وضاحت کے لیے اس مثال پر توجہ فرمائیں:

اگر کوئی منظّم باغ موجود ہو، جس کے درخت نہایت ترتیب، دقّت اور تناسب کے ساتھ اقسام اور فاصلوں کے اعتبار سے لگائے گئے ہوں، اور ہم اسی باغ کے درمیان ایک ایسی زمین کا ٹکڑا دیکھیں جس کے درخت اکھاڑے جا چکے ہوں اور جس کی مٹی بہہ گئی ہو، تو کیا یہ واقعہ، اور ہماری لاعلمی اس کی شایستگیوں (اہلیت و حکمت) سے، ہمیں یہ حکم لگانے کا جواز دیتی ہے کہ یہ پورا باغ دراصل ایک جنگل ہے یا ایک بے ترتیب باغ ہے، جبکہ ہم چاروں طرف سے ایسے واضح نظم و ترتیب کو دیکھ رہے ہیں جو اس ایک خراب قطعے کو گھیرے ہوئے ہے؟!

حقیقت یہ ہے کہ ہم فکری گمراہی کی آخری چوٹی پر ہوں گے اگر ہم یہ حکم لگائیں کہ یہ باغ دراصل ایک جنگل ہے، صرف اس بنیاد پر کہ ہم نے اس کے وسط میں ایک خراب قطعۂ زمین دیکھا، حالانکہ ہمیں اس کی وجہ معلوم نہیں، اور ممکن ہے اس کی علت باغ کے وسط میں کوئی رہائشی مکان بنانا ہو، یا مچھلیوں کی پرورش کے لیے کوئی تالاب، یا کوئی مویشی فارم، یا کھلا چراگاہ، یا درجنوں دیگر ممکنہ اسباب میں سے کوئی ایک ہو.

یہی بات اُن واقعات پر بھی صادق آتی ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ زمین اور عالمِ آفرینش میں نظم کی دلیل کو باطل کرتے ہیں؛ یعنی چونکہ کائنات کی نظام مندی واضح ہے اور دلائل کے ذریعے ثابت ہو چکی ہے، لہٰذا وہ چند جزوی واقعات جن کی علت ہمیں مکمل طور پر معلوم نہیں، اس نظم کے لیے نقض نہیں بن سکتے اور ہو سکتا ہے کہ اگر ہمیں ان واقعات کی علت معلوم ہوتی، تو ہم یہ کہتے کہ یہی تو کمالِ نظم اور حکمت ہے.[1]

---

1. خلا میں کوانٹمی ناپائیداریوں کا وجود اس تصور کو رد کرنے کے لیے کافی ہے کہ: انسان اسباب و علل پر مکمل احاطہ کر سکتا ہے۔

اس سے بڑی جہالت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک ایسا وجود (جیسے انسان) جس کی عمر بہترین صورت میں بھی سو سال سے آگے نہیں بڑھتی، ایسے واقعے کے بارے میں حکم لگائے جس کے اثرات اس کے بعد ہزاروں، لاکھوں، بلکہ کئی ملین سال تک باقی رہ سکتے ہیں۔ کیا یہ بالکل ویسا ہی نہیں جیسے ایک اندھا زمین دوز چوہا، جو اپنی ساری زندگی زمین کے اندر ایک بل میں گزارتا ہے، اُن لوگوں کے بارے میں حکم لگائے جو زمین میں فلک بوس عمارتوں کی بنیادیں کھود رہے ہیں اور وہ کہے کہ اُن کا کام تباہی، بے معنی، اور ایک بے عقل و بے نظم قوت کا مظہر ہے، صرف اس لیے کہ اُن کی کھدائی سے اُس کا بل تباہ ہو گیا ہے؟

کون کہتا ہے کہ ہر وہ واقعہ جو بعض موجودات کے مادی و جسمانی مفادات کے خلاف کسی خاص وقت میں پیش آئے، ایک بے معنی اور غیر عقلی عمل ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس کا مقصد بعض نفوس کی اصلاح ہو یا تمام کے لیے کسی بڑی مصلحت کا تحقق؟ کیا وہ عادلانہ قوانین جن کا سب اعتراف کرتے ہیں اور جو مجرم (مثلاً قاتل یا چور) کو سزا دینے کی صراحت رکھتے ہیں، محض اس وجہ سے پوچ، بے نظم اور غیر عقلی قرار دیے جا سکتے ہیں کہ وہ بعض انسانوں کو نقصان پہنچاتے ہیں؟! یا یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ یہی سزا، در حقیقت کمالِ حکمت، نظام اور عقلانیت کی علامت ہے، اگرچہ وہ بعض کی جان یا مال کے زیاں پر مشتمل ہو، اور کچھ افراد کو تکلیف پہنچائے؟!

در حقیقت، نظم ایک ثابت شدہ امر ہے، اور نتیجتاً ایک حکیم نظم دینے والے کا وجود حق کے تلاش کرنے والے کے لیے، نہایت واضح اور ثابت ہے؛ اور اس قسم کے اعتراضات کبھی بھی نظم کے ثبوت کو باطل نہیں کرتے، بلکہ بالآخر یہ محض ایسے اشکالات ہوتے ہیں جو خود معترض کی اپنے عقائد کے اثبات میں ناکامی کو ظاہر کرتے ہیں؛ اور اسی وجہ سے، جب وہ دلیل کا مقابلہ کرنے میں اپنی ناتوانی کا اعتراف کر لیتا ہے، تو اعتراض و اشکال کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔[1]

---

1. ہم دیکھتے ہیں کہ ہر وہ ناتوان شخص، جس کے سامنے اس کے عقیدے کے خلاف کوئی نظریہ پیش کیا جائے، اسی طرح عمل کرتا ہے؛ یعنی شبہات سے چمٹ جاتا ہے، بلکہ اپنے نفس کو اس پر راضی کر لیتا ہے کہ وہ اپنے باطل عقیدے سے چمٹا رہے۔

*وہ اعتراضات جو خدا کے منکرین گھڑتے ہیں

اگر خدا مطلق رحیم ہے، تو وہ آگ کے ذریعے عذاب کیوں دیتا ہے؟

سب سے پہلے اس نکتے پر توجہ دینا ضروری ہے کہ حقیقی مالک کو، اپنی ہی ملکیت اور اپنے ہی مال میں تصرف کرنے پر ہر گز ظالم قرار نہیں دیا جا سکتا؛ لہٰذا عذاب یا دوزخ کی آگ کا تصور عدل کے مفہوم سے کسی طرح متعارض نہیں.

جی ہاں، ممکن ہے کوئی شخص عذاب یا آگ کے مفہوم کو غلط سمجھتے ہوئے یہ اعتراض کرے کہ یہ چیز اللہ کی رحمت سے متعارض ہے؛ یا یہ اشکال کرے کہ یہ امر بے معنی، بے فائدہ اور ایک قسم کا کھیل ہے کیونکہ اس میں کوئی حکمت یا رحمت نظر نہیں آتی کہ خدا پہلے اپنے بندوں کو پیدا کرے اور پھر انہیں عذاب دے؛ لہٰذا بہتر یہ ہی تھا کہ خدا انہیں سرے سے پیدا ہی نہ کرتا.

اعتراض کا جواب

دراصل عذاب یا دوزخ کی آگ تو صرف ان لوگوں سے دنیوی حقیقتوں سے پردہ اٹھانے کا نام ہے جنہوں نے دنیاوی زندگی کو چُنا اور اس سے دل لگا لیا – لہٰذا یہ امر (یعنی عذاب و جہنم) محض یہ ہے کہ انسان کو وہی چیز دے دی جائے جسے اُس نے خود اپنے لیے چنا (یعنی دنیا کی زندگی میں باقی رہنے کی تمنا کرنا) مگر فرق یہ ہے کہ اب اس انتخاب کی اصل حقیقت سے پردہ اٹھا دیا گیا ہے – نتیجتاً، یہی تو عدل، رحمت اور احسان ہے – کیونکہ اُس نے خود دنیا کی زندگی کو چُنا، اور خدا نے بھی اُسے وہی کچھ عطا کیا جسے اُس نے چاہا اور اختیار کیا –تو اس میں ظلم اور قساوت (سنگ دلی) کہاں ہے؟

اللہ تعالی نے فرمایا:

(لا تَرْكُضُوا وَ ارْجِعُوا إِلى ما أُتْرِفْتُمْ فيهِ وَ مَساكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُون)[1]

(نہ بھاگو! اور پلٹ جاؤ اُس عیش و آرام کی طرف جس میں تم تھے، اور اپنے گھروں کو، شاید کہ تم سے پوچھا جائے).

(يَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذابِ وَ إِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحيطَةٌ بِالْكافِرين)[2]

(وہ تجھ سے عذاب کے آنے میں جلدی کرتے ہیں، حالانکہ جہنم کافروں کو گھیرے ہوئے ہے).

(قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِنْ ذلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللَّهِ مَنْ لَعَنَهُ اللَّهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنازيرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوتَ أُولئِكَ شَرٌّ مَكاناً وَ أَضَلُّ عَنْ سَواءِ السَّبيلِ)[3]

(کہہ دو: کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اللہ کے نزدیک بدلے میں اس سے بھی بدتر کون ہیں؟ وہ جن پر اللہ نے لعنت کی، جن پر وہ غضبناک ہوا، اور جن میں سے بعض کو اس نے بندر اور خنزیر بنا دیا، اور جنہوں نے طاغوت کی پرستش کی – یہی لوگ ہیں جو سب سے بُری جگہ والے ہیں اور سیدھے راستے سے سب سے زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں).

---

1. قرآن کریم، سورہ انبیاء، آیت 13۔
2. قرآن کریم، سورہ عنکبوت، آیت 54۔
3. قرآن کریم، سورہ مائدہ، آیت 60۔

یہی در حقیقت اصل بات ہے؛ اللہ نے ہر انسان کو ایک شاہ کلید (Key Master) عطا کی ہے، جو تمام دروازوں کو کھول سکتی ہے اور اس کی انسانیت کو ثابت کرتی ہے ۔ لہٰذا وہ اسی شاہ کلید کے ذریعے تمام دروازوں کو ایک ایک کر کے کھول سکتا ہے، تاکہ ایک نور سے زیادہ عظیم نور کی طرف منتقل ہوتا جائے، یہاں تک کہ اُس مطلق نور سے روبرو ہو جائے جس میں ذرہ برابر بھی تاریکی نہیں اور وہ (انسان) بآسانی اسی کلید کو زمین پر پھینک سکتا ہے، اور اپنی حیوانیت کی طرف لوٹ سکتا ہے، اور بندر کے مانند ہو جائے، جیسا کہ قرآن کی ایک آیت میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے:

(وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ)

اللہ کے ہاں کوئی ظلم نہیں ہے؛ جو دنیا کو چاہتے ہیں اور اس میں ہمیشہ رہنا چاہتے ہیں وہی تو آگ بنے گی: ان کی آنکھوں سے پردہ ہٹے گا اور وہ اسے اپنے اعمال، ظلم اور فساد سے اس کو بڑھکتے ہوئے پائیں گے، اور وہ ان کے **حسد کے بچھووں** سے اور اُن کی **وحشی سوچیں**، اور **جرائم**، اور اُن کی **بہیمانہ حیوانی حقیقتوں** سے (دوزخ) بھری ہوئی ہو گی، جو اُن پر پوری وضاحت کے ساتھ آشکار ہو جائے گا اور جب یہ پردہ ہٹایا جائے گا، تو ان میں سے بعض، بعض کے ذریعے اور انہی خبیث حقیقتوں کے سبب عذاب میں مبتلا ہوں گے ۔اللہ کے ہاں کوئی ظلم نہیں ہے۔ جو بھی دنیا میں باقی رہنے کا خواہاں ہو، وہ جلد ہی اپنی آرزو کو پالے گا، اور وہیں باقی رہے گا جہاں وہ رہنا چاہتا تھا۔ بس اُس کی آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا جائے گا تاکہ وہ حقائق کو ویسے ہی دیکھے جیسے وہ ہیں:

(لا تَرْكُضُوا وَ ارْجِعُوا إِلى ما أُتْرِفْتُمْ فيهِ وَ مَساكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُونَ)[1]

(نہ بھاگو! اور پلٹ جاؤ اُس عیش و آرام کی طرف جس میں تم تھے، اور اپنے گھروں کو، شاید کہ تم سے سوال کیا جائے).

اللہ ہر شے میں عادل ہے؛ بلکہ وہ صاحبِ احسان و کرامت بھی ہے اس درجے تک کہ ہم اُس کے کرم و احسان کو سمجھ ہی نہیں سکتے اور وہ محض عادل ہی نہیں ہے۔ اسی لیے وہ کسی کو اذیت یا عذاب نہیں دیتا، بلکہ اُس کی سب سے شدید سزا یہی ہے کہ وہ انسان کو اُس کا اپنا اختیار اور اپنا کیا ہوا انتخاب واپس دے دیتا ہے؛ اور عام طور پر انسان کی ابدی ہلاکت اُسی انتخاب میں پوشیدہ ہوتی ہے.

---

1. قرآن کریم، سورہ انبیاء، آیت 13۔

لہٰذا، آیت کا مفہوم یہ ہے: (وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خاسِئينَ)[1] اور اسی طرح اللہ تعالی کا ارشاد: (قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِنْ ذلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللَّهِ مَنْ لَعَنَهُ اللَّهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنازيرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوتَ أُولئِكَ شَرٌّ مَكاناً وَ أَضَلُّ عَنْ سَواءِ السَّبيلِ)[2] اور اسی طرح (فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ ما نُهُوا عَنْهُ قُلْنا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خاسِئينَ)[3]

یعنی یہ کہ انہوں نے خود ہی اپنی شاہ کلیدیں اپنے ہاتھوں سے گرادیں، اور اُس روح انسانی کو جسے اللہ نے ان کے جدّ حضرت آدم (ع) میں پھونکا تھا اور جن کے حاصل کرنے کی طرف اُنہیں ترغیب دی گئی تھی، زمین پر پھینک دیا؛ اور اُن کے لیے کچھ باقی نہ رہا سوائے حیوانی روح کے۔ لہٰذا وہ اپنے اس فطری اصل کی طرف پلٹ گئے، یعنی حیوانات اور بے شعور مخلوقات کی طرف، جو کبھی بھی کسی بات کو سمجھنے کے قابل نہیں ہوتیں.[4]

اور ممکن ہے یہاں ایک اشکال اس طرح پیش کیا جائے:

یہ انسان اپنے (ناکام) اختیار کی حقیقت سے ناواقف ہے، اور نتیجتاً فریب کا شکار ہو جاتا ہے؛ یعنی وہ نہیں جانتا کہ اُن ظاہری صورتوں کے پیچھے، جو دنیا میں نظر آتی ہیں، ایک چھپی ہوئی حقیقت موجود ہے اور اُسے یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ حقائق نہایت بد صورت ہیں، اور اُن میں زندگی اُن چیزوں کو دیکھنے اور محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم عذاب کی صورت ہیں جو قابلِ برداشت نہیں ہیں۔ لہٰذا اگر وہ اس انجام کو جانتا، تو کبھی ایسا اختیار نہ کرتا.

یہ اشکال اس بنیاد پر قائم ہے کہ انسان کو اپنے اختیار کے نتیجے کا کوئی علم نہیں ہے؛ اور اس وجہ سے یہ اشکال درست نہیں ہے۔ ہاں، اگر اللہ نے اُسے اُس کے اختیار کی حقیقت سے آگاہ نہ کیا ہوتا، تو شاید یہ اشکال قابلِ قبول ہوتا؛ لیکن اللہ نے اُسے پہلے باخبر کیا اور تنبیہ بھی کی تھی.

کمزوری اور بیماری

خدا کے منکرین کی طرف سے ایک اعتراض:

---

1. قرآن کریم، سورہ بقرہ، آیت 65۔
2. قرآن کریم، سورہ مائدہ، آیت 60۔
3. قرآن کریم، سورہ اعراف، آیت 166۔
4. وہم الإلحاد، ص 142۔

معذور پیدا ہونے والا کا کیا گناہ تھا؟ اگر واقعی کوئی خدا ہوتا تو وہ ظالم ہے، کیونکہ اُس نے اس مخلوق کو معذور پیدا کیا ہے، جو اپنی زمینی زندگی میں شدید تکلیف کا سامنا کرتا ہے؛ حتیٰ کہ ان میں سے بعض، ایسی زندگی کے مقابلے میں موت کو اپنے لیے بہتر سمجھتے ہیں۔

اشکال کا رد

صحت اور طبّی مشکلات ایک قدرتی نتیجہ ہیں، کیونکہ انسان کا جسم زمین پر صرف ایک ارتقا یافتہ حیوانی جسم ہے، اور یہ نہ تو مثالی ہے اور نہ ہی محفوظ۔ بلکہ وہ بھی زمین پر موجود ہر دوسرے جاندار حیوانی یا نباتاتی جسم کی طرح، کیمیائی مواد سے تشکیل پایا ہے؛اور اپنی تشکیل کے دوران مثلاً کسی جینیاتی نقص کے نتیجے میں یا اپنی تشکیل کے بعد کسی حادثے کے باعث، نقص یا خلل کا شکار ہو سکتا ہے۔ لہٰذا، یہ اعتراض کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مگر یہ کہ کہا جائے: "اللہ نے یہ عالَم مثالی کیوں پیدا نہیں کیا تاکہ ہر لحاظ سے ایک کامل و بے عیب حالت قائم ہوتی؟" اس اشکال کا جواب نہایت سادہ ہے: عالمِ آفرینش ظلمت اور تاریکی پر مشتمل ہے، اور نورِ مطلق نہیں ہے؛ نقص اور خلل، ظلمت کے لوازم میں سے ہیں، اور یہ ایک حتمی اور نا گزیر امکان ہے؛ لہٰذا یہ بات بذاتِ خود محال ہے، اور اسی وجہ سے کبھی بھی اللہ کی طرف سے صادر نہیں ہو سکتی۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی عالم مخلوق ہو، اور ساتھ ہی ایسا نور ہو جس میں بالکل ظلمت نہ ہو؛ کیونکہ نورِ مطلق صرف لاہوتِ مطلق (یعنی اللہ کی غیر محدود اور مطلق الوہیت) ہے؛ اور اس کے نتیجے میں، کائنات تخلیق کے لحاظ سے نور اور ظلمت کے سوا کچھ نہیں ہے اور یہ ظلمت ہمیشہ سے اس میں موجود رہی ہے۔ لہٰذا ناگزیر ہے کہ ہم اس ظلمت کے اثر کو ایک تاریکی کی طرح دیکھیں اور محسوس کریں؛ اور یہی ظلمت دراصل وہ نقص، عجز، مخالفت اور باہمی تضاد ہے جو ہر مخلوقی عالم کے ساتھ لازم و ملزوم ہے.

لیکن یہ اعتراض کہ حتیٰ اگر ہم اس عالم میں موجود نقص کی حدود کو نظرانداز بھی کر دیں، تب بھی جینیاتی ساخت میں واضح اور قابلِ توجہ خرابیاں اور خلل موجود ہیں،اس کا جواب یہ ہے کہ:

آفرینش کا عامل لاہوتِ مطلق نہیں ہے، بلکہ ان اجسام کی تخلیق کا عامل وہ مخلوق ہیں جنہیں خود لاہوتِ مطلق نے پیدا کیا ہے:

(وَ السَّماءَ بَنَيْناها بِأَيْدٍ وَ إِنَّا لَمُوسِعُون)[1]

(اور ہم نے آسمان کو بنایا، اور بے شک ہم وسعت دینے والے ہیں).

(أَ وَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنا لَهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ أَيْدينا أَنْعاماً فَهُمْ لَها مالِكُون)[2]

(کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لیے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی چیزوں میں سے چوپائے پیدا کیے، پھر وہ ان کے مالک بن گئے؟).

یہ ممکن نہیں کہ لاہوتِ مطلق کے لیے ہاتھ ہوں جو اس کا کوئی جزو ہوں؛ کیونکہ اگر ایسا ہو تو اس کا لاہوت (مطلق الوہیت) باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا، اللہ کے "ہاتھ" درحقیقت وہ مخلوقات ہیں جنہیں اللہ نے پیدا کیا، اور وہی مخلوقات، اپنے سے نچلی سطح کی خلقت - جیسے کہ عالمِ جسمانی، جو موجودہ اشکال کا موضوع ہے - کی تخلیق میں مشغول ہوئیں۔ یہ تعبیر بہت معروف اور رائج ہے؛ چنانچہ عمومی طور پر ایسے شخص کو، جو کسی دوسرے کی طرف سے کوئی کام انجام دیتا ہے، "اس کا ہاتھ" کہا جاتا ہے؛ جیسے کہ کوئی کسی سے کہے: "اِنتَ یدی التی اِصولُ بہا" یعنی: "تو میرا وہ ہاتھ ہے جس کے ذریعے میں کچھ حاصل کرتا ہوں".

دوسرا نقطۂ نظر: نظریۂ "ذہین ڈیزائن" کو ارتقاء کے ساتھ ہم آہنگ طور پر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر، یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ زندہ اجسام کے نظام، اعضا، اور مختلف حصوں میں پائی جانے والی ترکیب، پیچیدگی اور دقّت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ جاندار با مقصد طریقے سے ڈیزائن اور ارتقاء یافتہ ہیں اور یوں، ان سب کے پیچھے ایک خدا موجود ہے جو انہیں ایک معین ہدف تک پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

ڈیزائن میں پائے جانے والے نقائص، ایک ایسا اعتراض ہے جو دونوں نقطۂ نظر پر وارد ہوتا ہے؛ کیونکہ جس ڈیزائنر (یعنی خدا) کی بات کی جا رہی ہے، وہ علم اور قدرتِ مطلق کا حامل ہے اور جو کوئی ایسی (صفات کا حامل) ہو، اُس کا ڈیزائن یقینی طور پر کامل، مضبوط اور ہر بڑے نقص سے پاک ہونا چاہیے، جیسے کہ انسان میں ریڑھ کی ہڈی کی کمزوری۔ اس کمزوری کی وجہ یہ ہے کہ متعلقہ عضو ایسے بدن کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہے جو جھکا ہوا ہے، اور جب اُسے ایک سیدھے قامت والے جسم، جیسے کہ انسانی جسم، میں استعمال کیا جائے تو وہ ناکامل اور ناقص شمار ہوتا ہے؛ اسی وجہ سے، کرۂ ارض پر موجود بہت سے انسان - کم از کم اپنی زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے میں - کمر

---

1. قرآن کریم، سورہ ذاریات، آیت 47۔
2. قرآن کریم، سورہ یس، آیت 71۔

کے درد کا شکار ہوتے ہیں۔ اسی طرح حنجرہ کی عصب (Laryngeal Nerve) اور اُس کی کھنچاؤ، جسے بعض ماہرینِ تطبیقی تشریح الاعضا (comparative anatomy) ڈیزائن کی خطا قرار دیتے ہیں، بھی اسی قبیل سے ہے؛ کیونکہ اسے تمام انواع (مخلوقات) کے لیے ایک باقاعدہ ڈیزائن شدہ ساخت قرار نہیں دیا جا سکتا؛ کیونکہ حنجرہ کی عصب کی لمبائی نہ صرف یہ کہ کوئی حقیقی فائدہ نہیں رکھتی، بلکہ جاندار کے لیے نقصان دہ بھی ہے کیونکہ اس زیادہ لمبائی کے باعث، جاندار کے نقصان کا شکار ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے، جبکہ اگر یہ عصب چھوٹی ہوتی اور اس کی لمبائی صرف ضرورت کے مطابق رکھی جاتی، تو یہ خطرہ کہیں کم ہو جاتا.

وہ لوگ جو یک دم تخلیق کے قائل ہیں، اس اعتراض کو عقلی اور منطقی طور پر رفع نہیں کر سکتے؛ کیونکہ حنجرہ کی عصَب میں پایا جانے والا نقص ایک بڑا نقص ہے اور اسی وجہ سے یہ "ذہین ڈیزائن" کو تمام اعضا اور جسم کے تمام حصوں اور تمام انواع کے لیے رد کرنے کے لیے کافی ہے۔ ایسا خلل -اور وہ بھی اس سطح کی ذہین ڈیزائن سے دُوری کے ساتھ- کسی اور طرح قابلِ توجیہ نہیں، مگر یہ کہ اسے ایک ارتقائی وراثت (evolutionary inheritance) قرار دیا جائے.

لیکن وہ لوگ جو ارتقاء کے قائل ہیں اور ساتھ ہی ذہین ڈیزائن کو بھی قبول کرتے ہیں، اگر یہ کہیں کہ ڈیزائنر، لاہوتِ مطلق ہے اور وہ علم و قدرتِ مطلق کا مالک ہے تو مذکورہ اعتراض بدستور باقی رہے گا اور قابلِ طرح ہوگا، کیونکہ زندہ مخلوقات کی تخلیق میں نقص اور خامی کا پایا جانا، درحقیقت ڈیزائنر کے علمِ مطلق کی نفی کے مترادف سمجھا جاتا ہے؛ لیکن اگر وہی بات کہی جائے جو خود اللہ نے قرآن میں فرمائی ہے، یعنی یہ کہ آفرینش یا ڈیزائن اور تخلیق کا عمل، اللہ کے ہاتھوں کے ذریعے، یعنی اللہ سبحان کی مخلوقات کے واسطے سے، تو اس صورت میں تخلیق میں پائے جانے والے نقص پر دلیل قائم کی جاسکتی ہے اور یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ تکامل کے ابتدائی مرحلے میں ایک چھوٹی سی خطا واقع ہوئی ہو، جو ارتقاء کے عمل کے ذریعے آگے بڑھتی گئی یہاں تک کہ تدریجی ارتقائی وراثت کے تسلسل نے اس خطا کو ایک نمایاں ڈیزائن کی خامی میں تبدیل کر دیا.

یہ بات خود اس امر کی مکمل وضاحت کرتی ہے کہ حقیقی اور اصلی خالق، وہی اللہ، خداوندِ مطلق ہے؛ لیکن براہِ راست خالق، خداوندِ سبحان نہیں ہے، بلکہ ایسا خالق وہ مخلوقاتِ شایستہ ہیں جنہوں نے خدا کے حکم سے تخلیق کی ذمہ داری قبول کی، اور اپنی ہی نقص کو اس آفرینش میں منعکس کر دیا کیونکہ وہ خود نورانی مخلوقات ہیں، مگر ان میں ظلمت بھی موجود ہے۔ وہ واحد نور جس میں کوئی بھی ظلمت نہیں، وہی خداوندِ سبحان اِحسن الخالقین (سب

سے بہترین خالق) ہے۔ اسی نے عقلِ اول یعنی حضرت محمد (ص) کو پیدا فرمایا، اور اُن ہی سے پھر پہلے انوار خلق کئے؛ پھر اُس نے اپنی ہی قوت وطاقت سے، اُنہیں ویسے ہی تخلیق کا حکم دیا، جیسا کہ اُس نے ارادہ فرمایا تھا۔ اسی بناپر اس نے فرمایا ہے:

(وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسانَ مِنْ سُلالَةٍ مِنْ طِينٍ * ثُمَّ جَعَلْناهُ نُطْفَةً فِي قَرارٍ مَكِين * ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظاماً فَكَسَوْنَا الْعِظامَ لَحْماً ثُمَّ أَنْشَأْناهُ خَلْقاً آخَرَ فَتَبارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخالِقِينَ)[1]

(اور بے شک ہم نے انسان کو مٹی کے نچوڑ سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے نطفہ بنا کر ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا۔ پھر نطفے کو جمے ہوئے خون کی شکل دی، پھر اس لوتھڑے کو گوشت کے ٹکڑے کی صورت بنایا، پھر اس گوشت کے ٹکڑے سے ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں کو گوشت سے ڈھانپ دیا۔ پھر ہم نے اسے تخلیق کی دوسری صورت میں (بدل کر تدریجاً) نشو ونما دی۔ تو بڑی برکت والا ہے اللہ، سب سے بہترین خالق).

آیتِ مذکور میں واحد اور جمع کے صیغوں پر غور کیجیے: (خلقنا، جعلناه، خلقنا، فخلقنا، فخلقنا، فكسونا، أنشأناه) پھر آیت اس بیان پر ختم ہوتی ہے کہ وہ خالقین جن کے ذریعے اللہ نے تخلیق کا آغاز فرمایا، ان ہی پر اللہ سبحان ہی مہیمن (غالب) ہے: (فَتَبارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخالِقِينَ) (تو بڑی برکت والا ہے اللہ، سب سے بہترین خالق).

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان آفرینندوں (تخلیق کرنے والوں) کی حیثیت کو بھی بیان فرمایا ہے، اور فرمایا ہے کہ یہ اللہ کے ہاتھ ہیں؛ یعنی وہ ہستیاں جن کے ذریعے اللہ، جو کہ بہترین خالق ہے (اِحسن الخالقین)، تخلیق کا عمل انجام دیتا ہے: (وَ السَّماءَ بَنَيْناها بِأَيْدٍ وَ إِنَّا لَمُوسِعُونَ)[2]

(اور آسمان کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے، اور بے شک ہم وسعت دینے والے ہیں).

شاید بعض لوگ یہ کہیں کہ: انسان میں ریڑھ کی ہڈی کی یہ خاص ساخت، یا بدن میں حنجرے کے عصب کی یہ ترتیب، ممکن ہے کہ ارتقائی عمل کے دوران یا عمر کے کسی خاص مرحلے میں مخصوص فوائد رکھتی ہو۔ لیکن

---

1. قرآن کریم، سورہ مؤمنون، آیات 12 - 14۔
2. قرآن کریم، سورہ ذاریات، آیت 47۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ بات بالکل درست بھی ہو، اور اس میں کسی قسم کا شک نہ بھی ہو، تب بھی یہ اس حقیقت کو رد نہیں کرتی کہ یہ چیزیں ارتقائی تاریخ کا موروثہ ہیں اور یک دم تخلیق کے نظریے کی نفی کرتی ہیں.

اسی طرح یہ بات بھی رد نہیں ہوتی کہ "ایسا ڈیزائن (ترتیب) کسی عالِم و قادرِ مطلق کی طرف سے صادر نہیں ہوا"؛ کیونکہ یہ تصور ممکن ہے کہ اس سے بہتر کوئی اور منصوبہ (ڈیزائن) بھی موجود ہو سکتا تھا اور یہی بات خود اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ موجودہ ترتیب سب سے برتر، مثالی اور کامل ترین نہیں ہے؛ لہٰذا قرآن میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا اقرار ناگزیر ہے کہ تخلیق میں اللہ کے ہاتھوں کا کردار ہے.

اشکال: حضرت نوح نبی (ع) کی عمر

اعتراض کا مفہوم یہ ہے کہ: انسانی جسم کی زندگی، جینیاتی اعتبار سے متعین اور معلوم ہوتی ہے؛ تو پھر حضرت نوح (ع) کا جسم، اس مادی دنیوی حیات میں وہ طویل مدت کیسے زندہ رہا جسے قرآن یا دیگر دینی نصوص بیان کرتے ہیں؟

اشکال کا رد

چونکہ ہم نے علمی دلائل کے ذریعے خدا کے وجود کی ضرورت کو ثابت کیا ہے، اور سائنسی الحاد کو بھی علم کے دائرے میں چیلنج کیا ہے، لہٰذا ہر اُس مُلحد کے لیے لازم ہے جس نے الحاد کو اختیار کیا ہے اور علمی استدلال کو بنیاد بنا کر خدا کے وجود کا انکار کیا ہے، وہ علمی مناقشے اور استدلال کا جواب دے، اور علمی، درست اور باریک بین انداز میں جواب دے یا پھر اس بات کا اقرار کرے جو میں نے ثابت کیا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے، تو وہ ایک ضدی اور ستیزہ جو شخص شمار ہوگا جو حقیقت کو پہچاننے کا خواہاں نہیں، بلکہ وہ صرف اور صرف ایک پوچ گر (nihilist) شخص ہے اور.

لیکن انسان کی عمر ماضی میں علمی طور پر اور نہایت دقّت کے ساتھ معلوم ہے: چونکہ آج کے دور میں انسانی جینز ایک قابلِ قبول حد تک شناخت ہو چکے ہیں اور سائنس دان جانتے ہیں کہ جینیاتی اسباب کیا ہیں، کیوں اور کب خلیے بوڑھے ہو جاتے ہیں، اور انسانی جسم تحلیل (تجزیہ) ہو جاتا ہے۔ یہی سائنس دان انسان کی عمر کو طول دینے کے لیے جینیاتی تغیر (mutation) پیدا کرنے کی تحقیق کر رہے ہیں اور ممکن ہے کہ ایک دن وہ اس مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔ سائنس دان بھی یقینی طور پر جانتے ہیں کہ انسان نے حضرت نوح (ع) کے

زمانے میں یا اس سے پہلے نہ کبھی ہزار سال کی عمر پائی ہے اور نہ ہی اس کے قریب قریب، بالکل اسی طرح جیسے تم اپنے ہاتھ میں موجود اسکیل کی لمبائی کو نہایت درستگی سے جانتے ہو.

لیکن نوح (ع) کی عمر کا مسئلہ، اور دیگر ایسے امور جو موجودہ سائنسی حقائق سے متصادم دکھائی دیتے ہیں، ہماری اس بات پر — جو ہم نے ثابت کی ہے یعنی خدا کے وجود — کو کوئی اشکال نہیں پہنچا سکتے؛ کیونکہ ہم نہایت اختصار کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں: اس میں کوئی اشکال نہیں کہ خداوند معجزات انجام دے سکتا ہے، چاہے ان میں سے بعض موجودہ سائنسی حقائق کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں، کیونکہ وہ معجزات غیر معمولی حالات ہیں، جن کا مقصد یہ ہے کہ ابتدائی انسان کو اُس راہ پر ڈالا جائے جو اُسے خالقِ کائنات پر ایمان کی طرف لے جائے۔ اور ظاہر ہے کہ ان میں سے بعض امور اصل میں معجزہ نہیں ہوتے، بلکہ ایسے بیانات ہوتے ہیں جن کا فہم اُن لوگوں کے لیے مشکل ہوتا ہے جو متکلّم (کلام کرنے والے) کی زبان سے واقف نہیں ہوتے؛ کیونکہ جو لوگ اُن بلند مراتبِ وجودی (عالمِ بالا) کو نہیں جانتے جہاں سے قرآن نازل ہوا ہے، وہ قرآن کی زبان کو بھی نہیں سمجھ سکتے.

علمی مسئلے کی وضاحت کے لیے میں یہاں پر مختصراً کہتا ہوں: جو شخص اس فزیکی منظومے کو باہر سے دیکھ رہا ہے، وہ اُس نظام کے اندر کی طرف سے دیکھنے والے سے مختلف دکھائی دیتا۔ نتیجتاً مثلاً جب فزیکی منظومے میں وسعت یا سکڑاؤ ہو، تو اندر سے دیکھنے والے کے قیاسات باہر سے دیکھنے والے کے قیاسات سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ اندر سے دیکھنے والا خود اس منظومے کا جزو ہے اور اس طرح وہ منظومے کی وسعت اور سکڑاؤ کے تابع ہے؛ لہٰذا اس کے قیاس کے اسباب و عوامل بھی اسی کھنچاؤ اور سکڑاؤ کے تابع ہوتے ہیں ۔ یہ عمل اسے اس بات سے عاجز بنا دیتا ہے کہ وہ اُس کلی تبدیلی کو پہچان سکے یا اس کا قیاس کر سکے جو پورے منظومے کو شامل ہو۔

یہ امر اس بات کو روکتے نہیں کہ وہ روحانی لحاظ سے - اگر وہ ہماری طرح نفسانی زندگی رکھتا ہو - یہ احساس کرے کہ منظومے میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے، یا کوئی رفتار تیز یا کم ہوئی ہے؛ بالکل ویسے ہی جیسے آج بہت سے لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وقت تیز ہو گیا ہے، حالانکہ جب وہ وقت کو ناپتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ کچھ بھی نہیں بدلا.

اس بات کی مزید وضاحت کیلئے ایک مثال: فرض کریں کہ ایک انسان ایک کمرے میں رہتا اور اس کے پاس لمبائی ناپنے کا ایک آلہ (مثلاً اسکیل) موجود ہے ۔ ہم اُس سے کہتے ہیں کہ وہ کمرے میں موجود ایک میز کی لمبائی

ناپے اور اپنے قد کا اس میز کی لمبائی اور اونچائی سے موازنہ کرے۔ اس کے بعد اگر ہم فرض کریں کہ کمرہ اور اس میں موجود ہر چیز ہر سمت میں یکساں طور پر پھیل جائے، یعنی تمام جہات میں برابر تناسب سے کشیدہ ہو جائے، اب اگر ہم اُس سے کہیں کہ وہ دوبارہ اُس میز کو ناپے اور اس کا موازنہ کرے، تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اس کا سائز تبدیل نہیں ہوا۔ اور اگر ہم اُس سے کہیں کہ اپنے قد کو اُس میز کی لمبائی اور اونچائی سے موازنہ کرے، تو تب بھی وہ کسی قسم کی تبدیلی محسوس نہیں کرے گا، کیونکہ وہ خود اور اس کا اسکیل بھی بالکل اُسی تناسب سے کھنچ چکے ہیں جس تناسب سے میز کھنچی ہے.

اگر یہ بات واضح ہو جائے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ کوئی ایسا نگران جو کونیاتی نظام سے باہر سے نگرانی کر سکتا ہو، اس کی پیائشیں اُن پیائشوں سے مختلف ہوں گی جن کے ساتھ ہم رہتے ہیں جو اس نظام کے اندر زندگی بسر کرتے ہیں۔ کیونکہ مادی کائنات کا رویّہ کسی نہ کسی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے؛ چنانچہ اگر زمانہ ایک کونیاتی بُعد کے طور پر پھیل جائے یا سکڑ جائے — یا بہت ہی معمولی انداز میں سست یا تیز ہو جائے —تو پورے نظام میں ہم نہ اس کی پیائش کر سکیں گے اور نہ ہی اس تبدیلی کو پہچان سکیں گے۔ لیکن ایک ایسا نگران جو کونیاتی نظام سے باہر سے نگرانی کر سکتا ہو، وہ اس تبدیلی کی پیائش کر سکتا ہے، اور جب وہ ہم سے بات کرے گا تو ہمیں ایسے اعداد دے گا جو ہماری پیائشوں سے مختلف ہوں گے۔

مختصراً، یہ بات واضح کرتی ہے کہ اگر نظام کے باہر سے کوئی نگران (مثلاً اللہ سبحانہ و تعالیٰ یا فرشتے) ہمیں کچھ بیان کرے، جیسے وہ نوح (ع) کی عمر اور ان کی قوم کے بارے میں بتائے، تو وہ تمہیں ایسا عدد دے گا جو اس عدد سے مختلف ہو گا جو تم، جو اس نظام کے اندر زندگی بسر کر رہے ہو، ناپتے ہو۔ اور جب تم اس سے آج کے انسان کی عمر کا پندرہ ہزار سال پہلے کے انسان کی عمر سے موازنہ پوچھو گے تو وہ تمہیں مختلف اعداد دے گا، حالانکہ تم مادی حدود کے اندر، جن میں تم رہتے ہو، کسی قابلِ محسوس فرق کو نہیں پاؤ گے جسے ناپا جا سکے۔

دوسرا اصل: خلیفہ

یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر زمانے میں ایک خلیفہ یا رسول کو چن لیتا ہے[1]، اور یہ کہ وہ سب لوگوں میں سب سے زیادہ جاننے والا ہوتا ہے اور تمام مکلّف افراد اُس کی اطاعت کے پابند ہوتے ہیں، ایک قطعی اور یقینی امر ہے جو ہر زمانے میں جاری ہے؛ لہٰذا ہر زمانے میں خلیفہ کا چُنا جانا ضروری ہے۔

اس بات کو ثابت کرنے والے دلائل درج ذیل ہیں:

پہلی: خلقت کا مقصد درحقیقت معرفت ہے [2] اور یہ مقصد اس عالم میں اکثر مخلوقات کے لیے ہرگز پورا نہیں ہوتا، جب تک کہ ایک علم کا حامل منتخب نہ کیا جائے، جس کی ذمہ داری لوگوں کو اس مقصد سے آشنا کرنا ہو۔ اُس چیز کو انجام نہ دینا جو مقصد کو پورا کرتی ہے، حالانکہ اس پر قدرت بھی موجود ہو، نقضِ غرض (مقصد کی خلاف ورزی) کے مترادف ہے؛ اور ایسی خلاف ورزی حکیمِ مطلق سے صادر نہیں ہوتی؛ لہٰذا چونکہ اللہ کے خلیفہ کو چُننا- جو اللہ، اُس کے دین اور اُس کی مرضی کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے- غرضِ خلقت کو پورا کرنے والا ہے، اس لیے اس کا چُنا جانا ناگزیر ہے.

قابل اور پذیرندہ کے موجود ہونے کے باوجود، زمانے کا خلیفہ سے خالی ہونا صحیح نہیں ہے، کیونکہ ایسی صورت میں مخلوقات نہ دینِ خدا اور نہ ارادۂ خدا کو پہچانیں گی، نہ جانیں گی، اور نہ عبادت کریں گی اور نہ معرفت حاصل کریں گی، اور یوں آفرینش کا مقصد نقض ہو جائے گا۔ جیسا کہ آئندہ مباحث میں آئے گا؛ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ زمانہ خلیفۂ خدا سے خالی ہو، چاہے قابل اور پذیرندہ موجود نہ ہوں، کیونکہ اُس کے ذریعے منکرین کے عذر اور بہانے کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے. یہ برگزیدہ ہونا اور اس کی ضرورت، وہ تمام لوگ عملاً تسلیم کرتے ہیں

---

1. اللہ کے بھیجے ہوئے رسول صرف عام انسانوں کی مانند ہیں، لیکن وہ اللہ کے لیے مخلص ہیں اور اس کا کلام سنا اور اس کی پکار پر لبیک کہا۔ نتیجتاً اللہ سبحان نے ان پر فضل فرمایا اور انہیں زمین میں اپنا جانشین بنایا اور اپنی مخلوق کی طرف بھیجا تاکہ وہ اُنہیں اُس حق سے آشنا کریں جسے وہ خود پہچان چکے اور جس تک وہ خود پہنچے ہیں۔

2. (وَ ما خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْإِنْسَ إِلاَّ لِيَعْبُدُون) (ذاریات/56)، (اور میں نے جنّات اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا، مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں)، یعنی علم حاصل کریں، پھر عبادت کریں، پھر عارف بن جائیں۔

جنہوں نے ایسے فقہاء یا وصی مقرر کیے ہیں جو اُن کے لیے دین میں قانون سازی کریں، اگرچہ زبان سے اس کا انکار کریں؛ اُس وقت جب وہ نصبِ الٰہی اور اُس ہستی کے منکر ہو گئے جو دینِ خدا کو اُن تک پہنچاتی ہے، اور خود ایسے افراد کو مقرر کر لیا جو ظن، گمان اور نفسانی خواہشات کی بنیاد پر-ان معاملات میں جن میں خدا کی طرف سے کوئی صریح نص موجود نہیں- تشریع اور قانون سازی کرتے ہیں۔ اسی طرزِ عمل کے ذریعے وہ اللہ کے خلیفہ کے تقرر کی ضرورت کا اقرار بھی کرتے ہیں، اور ہر مسئلے میں علمِ الٰہی اور حکمِ حقیقیِ خدا کو نقل کرنے والے خلیفہ کی اپنی ضرورت کا اعلان بھی کرتے ہیں.

دوسری: عالم کے مطلق مالک کو لازم ہے کہ وہ مکلفوں کو، جو اُس کی بادشاہت میں کام کرتے ہیں، اپنی ارادہ کی تکمیل کا حکم دے، کیونکہ وہ اپنے ملک اور اپنی رعایا کی مصلحت و بھلائی کو بہتر جانتا ہے،[1] ورنہ وہ لوگ خدا کی سلطنت میں اپنی نادانی پر عمل کرنے میں معذور شمار ہوں گے، اور ایسی صورت میں حکمت، نادانی میں بدل جائے گی، اور یہ فرض حکیمِ مطلق کے بارے میں درست نہیں ہے۔ اس مقصد کے تحقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے امر اور ارادہ کو اپنی سلطنت کے مکلفین تک پہنچائے تاکہ وہ اسی کی بنیاد پر عمل کریں.

ملک کے ہوتے ہوئے اور اُس کے مکلفان[2] کے درمیان سے غیبت کے باوجود، جو اُس کے ملک میں عمل

---

1. حتی خود مکلّف عمل کرنے والے بھی خدا کی ملک میں خود اُس کی ملکیت کا ایک حصہ ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن کا خالق اور حقیقی مالک ہے۔ لہٰذا اُن کا اپنی جان میں تصرف کرنا بھی اللہ کے حکم کے مطابق ہونا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن کا مالک ہے اور اُن کے تمام امور کا مالک ہے جو اُن کے اختیار میں ہیں، بطور حقیقی ملکیت۔

2. اللہ تعالیٰ کی غیبت حقیقی نہیں ہے، بلکہ یہ خود انسانوں سے متعلق ہے جو اپنی تقصیر اور غفلت کے سبب اللہ سے دُور ہو گئے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ غائب گواہ ہے۔ اور ہر انسان اپنے آپ کو خالص کر کے اپنے پروردگار سے جُڑ سکتا ہے اور اُس کی ارادہ کو سمجھ سکتا ہے؛ اس طریقے سے کہ اللہ اُسے غیب پر مطلع کرے۔ یعنی یا تو وہ خود زمین پر اللہ کا خلیفہ بنے کہ اللہ اُس کو اور دوسروں کو درکار تمام چیزیں اُس کے حال اور مقام کے مطابق عطا کرے، یا وہ اُن خاص بندوں میں شامل ہو جنہیں اللہ غیب کے کسی حصے سے آگاہ فرماتا ہے۔ اور اُن پر یہ فرض ہے کہ اسی حصے کو زمین پر اللہ کے خلیفہ کو پہچاننے اور اُس کی اطاعت کے لیے استعمال کریں، کیونکہ یہ اہلِ غیب بندے بھی غیب کا محض ایک تھوڑا سا حصہ ہی جانتے ہیں اور اپنے کمال کے لیے ہمیشہ اللہ کے خلیفہ کے محتاج رہتے ہیں: (عالِمُ الْغَيْبِ فَلا يُظْهِرُ عَلى غَيْبِهِ أَحَدا * إِلاَّ مَنِ ارْتَضى مِنْ رَسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهِ رَصَداً * لِيَعْلَمَ أَنْ قَدْ أَبْلَغُوا رِسالاتِ رَبِّهِمْ وَ أَحاطَ بِما لَدَيْهِمْ وَ أَحْصى كُلَّ شَيْءٍ عَدَداً)(جن/26-28)، (وہ غیب کا جاننے والا ہے، اور اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ سوائے اس رسول کے جسے وہ پسند کرے، تو وہ اس کے آگے اور پیچھے نگہبان مقرر کر دیتا ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے ہیں، اور وہ ان کے پاس جو کچھ ہے اس پر پوری طرح احاطہ کیے ہوئے ہے، اور ہر چیز کو شمار کر کے رکھا ہے) ۔

کرنے والے ہیں[1] مالک کی ارادہ کو پورا کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، سوائے اُس کے ذریعے جو مالک کے حضور موجود ہو (یعنی وہ شخص جس پر مالک وحی کرتا ہے، جس سے وہ رابطے میں ہے اور جو مالک کے ارادے کو جانتا ہے). لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ مالک، ایسے جانشین کے تقرر کو ترک کر دے جو اُس اور اُس کے ملک میں عمل کرنے والے مکلفین کے درمیان واسطہ ہو؛ جب کہ وہ ایسے جانشین کو مقرر کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ کیونکہ ایسا کرنا اُس مقصد کی خلاف ورزی ہے جس کا ارادہ مالک نے کیا ہے، اور وہ مقصد اُس کے ارادے کا اُس کی ملک و سلطنت میں نافذ ہونا ہے.

لہٰذا جب عالم کے مالکِ حکیم مطلق نے اپنی سلطنت میں اپنے لیے ایسا جانشین منتخب کیا جو اس سے رابطے میں ہو اور مالک کی ارادہ کو جانتا ہو اور دوسرے مکلفین کو بھی مالک کی ارادہ سے باخبر کر سکتا ہو، تو اس وقت ممکن ہے کہ ہر ایک مکلّف مالک کے ارادے کو بجالائے، اور غافلوں پر حجت قائم ہو جائے اور منکروں اور متکبروں کا عذر و بہانہ ختم ہو جائے۔ خداوند سبحان نے قرآنِ کریم میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا ہے:

(رُسُلاً مُبَشِّرِينَ وَ مُنْذِرِينَ لِئَلاَّ يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكانَ اللَّهُ عَزِيزاً حَكِيما)[2]

(ہم نے رسولوں کو خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی دلیل نہ رہے، اور اللہ سب پر غالب ہے اور بڑی حکمت والا ہے).

اسی طرح آیہ شریفہ:

(وَ لَوْ أَنَّا أَهْلَكْناهُمْ بِعَذابٍ مِنْ قَبْلِهِ لَقالُوا رَبَّنا لَوْ لا أَرْسَلْتَ إِلَيْنا رَسُولاً فَنَتَّبِعَ آياتِكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَذِلَّ وَ نَخْزى)[3]

---

1. اس امر کو واضح کرنے کے لیے ہم کشتی اور اُس کے مالک کی مثال دیتے ہیں۔ اگر کشتی کا مالک یہ چاہے کہ سمندروں کو کسی کام کے لیے عبور کرے تو حکمت کا تقاضا ہے کہ پہلا: سب سے زیادہ جاننے والے اور حکیم شخص کو بطور کشتی بان (ملّاح) منتخب کرے، دوسرا: اس ملّاح کو خدمے میں سے ایسے شخص میں سے چُنے جو کام سے واقف ہو، تیسرا: تمام کارکنوں کو اس منتخب ملّاح کی اطاعت کا حکم دے۔ اگر ان تینوں میں سے کسی ایک امر میں بھی کوتاہی کرے تو وہ حکمت سے دُور اور بے خردی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

2. قرآن کریم، سورہ نساء، آیت 165۔

3. قرآن کریم، سورہ طہٰ، آیت 134۔

(اور اگر ہم اس سے پہلے انہیں کسی عذاب کے ذریعے ہلاک کر دیتے تو وہ ضرور کہتے: اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے، اس سے پہلے کہ ہم ذلیل اور رسوا ہو جائیں).

لہٰذا مالک کے ارادے کو پہچاننے والے کو منتخب نہ کرنا، باوجود اس کے کہ وہ مکلفوں سے غائب ہو، اور باوجود اس کے کہ مکلفوں میں صلاحیت موجود ہو یا باوجود اس کے کہ یہ انتخاب مکلفوں پر حجت قائم کرنے اور منکروں کے عذر و بہانہ کو جڑ سے ختم کرنے کا باعث بنتا ہو، ایک قسم کی حکمت سے دوری اور مقصد کی خلاف ورزی ہوگی، جو حکیمِ مطلق کی طرف منسوب کرنا درست نہیں،[1] جس طرح یہ رحمت اور مہربانی سے دوری ہوگی جو یقیناً رحیمِ مطلق سے صادر نہیں ہوتی.[2]

لیکن لوگوں میں خلیفہ کے اعلم ہونے کا مسئلہ،[3] چونکہ اعلم اور زیادہ جاننے والے شخص کی موجودگی میں کم علم رکھنے والے کو منتخب کرنا اس علم کے ایک حصے کو ضائع کرنے کے مترادف ہے جو اعلم شخص کے پاس موجود ہے، اور نتیجتاً مکلفین اس حصے کے علم تک نہیں پہنچ پاتے جو اعلم کے پاس ہے، اور یہ امر حکمت کے خلاف ہے، لہٰذا مالک لازمی طور پر اپنی رسالت کی ادائیگی کے لیے ضروری تمام علوم اپنے خلیفہ کو عطا فرماتا ہے؛ اور عام طور پر خلیفہ ہمیشہ سب سے زیادہ جاننے والا ہوتا ہے، کیونکہ وہ مالک کی ارادہ کو جانتا ہے، نہ کہ کوئی اور؛ اور اسی امتیاز

---

1. کیونکہ نقض غرض (مقصد کی خلاف ورزی) حکمت سے دُوری کے مترادف ہے، اور ایسا کام اللہ کی مطلق حکمت کو باطل کرنے والا اور نتیجتاً لاہوت مطلق (مطلق الوہیت) کو ناقص قرار دینے والا ہے، اور یہ لاہوت مطلق کی محتاجی اور فقر کو ثابت کرتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ ایسے امور سے برتر اور منزّہ ہے۔

2. چونکہ رحمت کے جاری نہ ہونے کی صورت میں، جبکہ اس رحمت کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہو اور اس کے قابل ہونے کی صلاحیت موجود ہو (جب اُن کے لیے اللہ کا ایک خلیفہ بھیجا جاتا ہے تو وہ قابل لوگ، اللہ کو یاد کرتے ہیں)، یہ بات اللہ رحیم کی رحمت کے نقض اور اُس رحمت کے کامل نہ ہونے کو ثابت کرتی ہے۔ نتیجتاً یہ اللہ کی رحمت کے مطلق ہونے اور اس کے ساتھ ہی اُس کی مطلق الوہیت کو باطل کر دیتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ ان عیوب سے بلند و برتر ہے۔ قرآن کریم میں آیا ہے: (قُلْ لِمَنْ ما فِي السَّماواتِ وَ الْأَرْضِ قُلْ لِلَّهِ كَتَبَ عَلى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلى يَوْمِ الْقِيامَةِ لا رَيْبَ فيهِ الَّذينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لا يُؤْمِنُونَ) (انعام/12) (کہہ دو: آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ کہہ دو: اللہ کا ہے۔ اس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔ وہ تمہیں روزِ قیامت جس میں کوئی شک نہیں ضرور جمع فرمائے گا۔ جنہوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈال دیا وہ ایمان نہیں لاتے) ۔

3. بہت جلد اُس علم کے بارے میں مفصل بحث آئے گی جو زمین پر اللہ کا خلیفہ کے پاس ہونا چاہیے۔

(علم) کے ذریعے خلیفۂ خدا راستے کو بہتر جانتا ہے اور اپنے فریضے کی ادائیگی، مقصد تک پہنچنے، مقصود کو پورا کرنے اور غرض کو عملی جامہ پہنانے میں زیادہ توانا ہوتا ہے.

لیکن خلیفہ کی اطاعت کرنے والوں کے عمل کے حتمی ہونے کا مسئلہ - باوجود اس کے کہ قبول کرنے والا موجود ہو - اس وجہ سے ہے کہ اس امر کو ترک کرنا اس کام اور ذمہ داری کو معطل کرنے کے مترادف ہے جو خدا کے خلیفہ سے طلب کی گئی ہے[1] اور ایسی چیز حکیمِ مطلق سے صادر نہیں ہوتی.

اگر قابل موجود نہ ہو تو بھی ممکن ہے کہ کوئی خلیفہ یا رسول موجود ہو جو خدا کی طرف سے منتخب کیا گیا ہو اور حق تعالیٰ نے اسے علم سے آراستہ کیا ہو، مگر اسے تبلیغ کا حکم نہ دیا ہو، یعنی وہ ایک گوشہ نشین خلیفہ ہو۔ ایسی حالت میں ایسے خلیفہ کا وجود یقیناً پروردگار کی حکمت کے مطابق ہے، کیونکہ اس میں لوگوں پر حجت قائم ہونا اور منکروں کے عذر و بہانے کا ازالہ ہونا پایا جاتا ہے، اور ایسے رسول کی موجودگی میں لوگوں کے پاس پروردگار کے سامنے کوئی حجت نہیں رہتی:

(لِئَلاَّ يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ)[2]

(تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی دلیل نہ رہے)، یہ زمانہ، زمانۂ فترت (وقفہ) ہے کہ اس میں رسول اور فرستادہ موجود ہوتا ہے جو خدا کا خلیفہ زمین پر اور اس کی بندوں پر حجت ہوتا ہے، مگر اسے تبلیغ کا حکم نہیں ہوتا، یعنی وہ گوشہ نشین ہوتا ہے، چاہے یہ فترت طویل ہو اور اس زمانے میں متعدد رسول آئیں۔ اللہ تعالی نے اسی امر کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:

---

1. کیونکہ خلیفہ کے نصب کا مقصد حجت قائم کرنا اور عذر و بہانہ ختم کرنا ہے، اور یہ مسئلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے، خواہ اہل موجود ہوں یا نہ ہوں۔ اسی طرح خلیفہ کے نصب کا مقصد مکلفوں کو اُن کی غفلت سے نجات دینا ہے، اُنہیں یاد دہانی کے ذریعے تاکہ وہ اللہ کی اُس ارادہ کو قبول کریں جو زمین پر اللہ کے خلیفہ کے ذریعے اُن تک پہنچتا ہے۔ اور یہ امر اہل کے موجود ہونے کے بغیر محقق نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے جب اہل موجود نہ ہوں، تو قانون کے آخری حصے (یعنی مکلفوں کو زمین پر اللہ کے خلیفہ کی اطاعت کی طرف بلانے) سے انحراف میں کوئی اشکال نہیں رہتا؛ چاہے یہ دعوت خود خلیفۂ خدا کی طرف سے ہو جب وہ اللہ کی حاکمیت قائم کرنے کا مطالبہ کرے، یا اللہ اور اُس کے رسولوں کی طرف سے براہِ راست مکلفوں کو ہو، جیسا کہ خواب میں ظاہر ہوتا ہے، یا سابق خلیفۂ خدا کی طرف سے براہِ راست یا بالواسطہ ہو (خواہ پچھلے اور موجودہ خلیفہ کے درمیان فاصلہ موجود ہو)۔

2. قرآن کریم، سورہ نساء، آیت 165۔

(يا أَهْلَ الْكِتابِ قَدْ جاءَكُمْ رَسُولُنا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلى فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ أَنْ تَقُولُوا ما جاءَنا مِنْ بَشيرٍ وَ لا نَذيرٍ فَقَدْ جاءَكُمْ بَشيرٌ وَ نَذيرٌ وَ اللَّهُ عَلى كُلِّ شَيْءٍ قَديرٌ)[1]

(اے اہلِ کتاب! یقیناً تمہارے پاس ہمارے رسول آ گئے ہیں جو تمہیں واضح کر کے بتاتے ہیں ایک ایسے فترت (وقفے) کے بعد (جب رسول نہیں آئے تھے)، تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس نہ کوئی خوشخبری دینے والا آیا اور نہ ڈرانے والا۔ تو دیکھو! تمہارے پاس خوشخبری دینے والا بھی آ گیا اور ڈرانے والا بھی، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے).

قابل کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے مقامات اور علاقے موجود ہوں جن کے لیے کوئی رسول نہ بھیجا گیا ہو، اور ایسے قومیں بھی موجود ہوں جن تک سرے سے آسمانی رسالتیں پہنچی ہی نہ ہوں:

(إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ * وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَأَسْمَعَهُمْ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُعْرِضُونَ)[2]

(بے شک اللہ کے نزدیک سب سے بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو بہرے ہیں، گونگے ہیں اور عقل استعمال نہیں کرتے۔ ور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو ضرور انہیں سنوا دیتا، اور اگر وہ انہیں سنوا بھی دیتا تو وہ پھر بھی منہ پھیر لیتے اور وہ رو گردانی کرنے والے ہیں).

زمین پر خدا کے خلیفہ کی موجودگی کے ساتھ، ان سب لوگوں پر حجت قائم ہو چکی ہے اور وہ اور دوسرے لوگ خدا کے خلیفہ کی موجودگی میں خدا پر کوئی حجت نہیں رکھتے، چاہے وہ خلیفہ قابل کے نہ ہونے کی وجہ سے ان میں تبلیغ پر مامور نہ کیا گیا ہو؛ خداوند ان کے حال کو جانتا ہے اور ان جیسے لوگوں کے لیے رسول بھیجے ہیں، اور ان کا جواب ہمیشہ یہی تکذیب اور جبری معجزات کا مطالبہ رہا ہے جو انہیں ایمان لانے پر مجبور کرے، وہ بھی ایک محض مادی دلیل کے ساتھ جو غیب کے لیے کوئی حصہ اور فائدہ باقی نہ چھوڑے:

---

1. قرآن کریم، سورہ مائدہ، آیت 19۔
2. قرآن کریم، سورہ انفال، آیات 22 - 23۔

(وَلَوْلَا أَنْ تُصِيبَهُمْ مُصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ فَيَقُولُوا رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَنَتَّبِعَ آيَاتِكَ وَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ * فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا لَوْلَا أُوتِيَ مِثْلَ مَا أُوتِيَ مُوسَى أَوَلَمْ يَكْفُرُوا بِمَا أُوتِيَ مُوسَى مِنْ قَبْلُ قَالُوا سِحْرَانِ تَظَاهَرَا وَقَالُوا إِنَّا بِكُلٍّ كَافِرُونَ)[1]

(اگر ان پر ان کے اپنے کیے کی وجہ سے کوئی مصیبت آ جاتی تو وہ کہتے: اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور ایمان والوں میں شامل ہوتے۔ پھر جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آ گیا تو انہوں نے کہا: کیوں نہ اسے بھی وہی کچھ دیا گیا جو موسیٰ کو دیا گیا تھا؟ کیا انہوں نے اس سے پہلے موسیٰ کو دی گئی چیز کا انکار نہیں کیا تھا؟ انہوں نے کہا: یہ دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کے مددگار ہیں، اور ہم تو سب کے سب کے منکر ہیں؟!).

رسول بھیجنے کا ہمیشہ کا اور ہر حال میں پورا ہونے والا سبب، حجت قائم کرنا ہے۔

گزشتہ بیان سے واضح ہو گیا کہ ہر زمانے میں رسول بھیجنا حتمی ہے؛ کیونکہ خلقت کا مقصد (معرفت) اسی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور حقیقی مالک کی ارادہ کا نفاذ اس کی سلطنت میں اسی کے ذریعے ممکن ہوتا ہے، کیونکہ رسول یا خلیفہ اس اہم کام اور ذمہ داری کو انجام دیتا ہے؛ نیز ہم نے جان لیا کہ صرف ایک رسول بھیجنے سے ہی حجت قائم ہو جاتی ہے اور عذر و بہانہ جڑ سے ختم ہو جاتا ہے؛ حتیٰ کہ اگر بعض زمانوں میں رسول اور خلیفہ گوشہ نشین ہوں اور قابل کے نہ ہونے کی وجہ سے تبلیغ پر مامور نہ ہوں؛ لہٰذا رسول بھیجنے کا ہمیشہ کا اور ہر حال میں پورا ہونے والا سبب، عذر و بہانے کا خاتمہ ہے، کیونکہ یہ سبب ہمیشہ موجود رہتا ہے، چاہے رسول کی دعوت قبول کرنے والے موجود ہوں یا نہ ہوں:

(لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا)[2]

(تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی دلیل نہ رہے، اور اللہ سب پر غالب ہے اور بڑی حکمت والا ہے).

---

1. قرآن کریم، سورہ قصص، آیات 47 - 48۔
2. قرآن کریم، سورہ نساء، آیت 165۔

بلکہ حتیٰ ایسی حالت میں بھی کہ سب لوگ رسول پر ایمان لے آئیں، یہی حجت قائم کرنا اور عذر و بہانے کو ختم کرنا، بدستور رسول بھیجنے کا سبب رہتا ہے، کیونکہ ان کی معرفت اور عمل ان کی اپنی کوتاہی اور قصور کی وجہ سے پھر بھی نقص کا شکار ہوتا ہے، اور اسی سبب رسول کی موجودگی ان پر حجت ہے.

استخلاف، خدا کی سنت ہے

عقلی اعتبار سے ہم نے واضح کیا کہ خلیفہ کا انتخاب حکمت اور رحمت کے موافق ہے اور اس کام سے روگردانی کبھی بھی رحیم و حکیم مطلق (خدائے سبحان) سے صادر نہیں ہوتی۔ اب ہم نصوص اور دینی متون کی طرف آتے ہیں تاکہ دیکھیں عالم واقع میں کیا چیز محقق ہوئی اور آسمانی کتابیں اس بارے میں کیا کہتی ہیں:

اوّل: قرآن:

ہم دیکھتے ہیں کہ خداوند نے اس زمین پر زندگی گزارنے والے پہلے انسان[1] (حضرت آدم ع) کو زمین میں اپنا خلیفہ منتخب کیا اور فرشتوں کو اس کی اطاعت اور اس سے علم حاصل کرنے کا حکم دیا:

(وَإِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلائِکَةِ إِنِّی جَاعِلٌ فِی الأَرْضِ خَلِیفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِیهَا مَنْ یُفْسِدُ فِیهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ قَالَ إِنِّی أَعْلَمُ مَا لا تَعْلَمُونَ * وَعَلَّمَ آدَمَ الأَسْمَاءَ کُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلائِکَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِی بِأَسْمَاءِ هَؤُلاءِ إِنْ کُنْتُمْ صَادِقِینَ * قَالُوا سُبْحَانَکَ لا عِلْمَ لَنَا إِلا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّکَ أَنْتَ الْعَلِیمُ الْحَکِیمُ * قَالَ یَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَکُمْ إِنِّی أَعْلَمُ غَیْبَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا کُنْتُمْ تَکْتُمُونَ * وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلائِکَةِ اسْجُدُوا لآدَمَ فَسَجَدُوا إِلا إِبْلِیسَ أَبَی وَاسْتَکْبَرَوَکَانَ مِنَ الْکَافِرِینَ)[2]

(اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا: میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ انہوں نے کہا: کیا تو اس میں ایسے کو بنائے گا جو اس میں فساد کرے گا اور خون بہائے گا، حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں؟ اللہ نے فرمایا: بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور اس نے آدم کو سب کے سب نام سکھا دیے، پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا: اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ۔ انہوں نے کہا: تو پاک ہے، ہمیں کوئی علم نہیں مگر جو تو نے ہمیں سکھایا ہے، بے شک تو ہی سب کچھ جاننے والا، حکمت

---

1. مراد موجودہ قسم سے ہے، نفس کے اعتبار سے؛ کیونکہ جسمانی نوع یا ہومو سیپینس کے لحاظ سے آدم اس نوع کا پہلا فرد نہیں ہے۔
2. قرآن کریم، سورہ بقرہ، آیات 30 - 34۔

والا ہے۔اللہ نے فرمایا: اے آدم! انہیں ان کے نام بتادو۔ پھر جب آدم نے انہیں ان کے نام بتادیے تو اللہ نے فرمایا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو اسے بھی جانتا ہوں۔اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافروں میں سے ہو گیا).

آیات بالکل واضح ہیں؛ خداوند نے ابتدا سے، پہلے ہی دن، آدم (ع) کو زمین میں اپنا جانشین منتخب کیا اور فرشتوں کو ابلاغ کیا کہ اس کی اطاعت کریں؛ جب انہوں نے اعتراض اور بحث کی، تو خداوند نے ان کے لیے بیان کیا کہ وہ اس چیز کے بارے میں جس کے بارے میں سوال کر رہے ہیں، نادان ہیں، اور یہی وہ موقع تھا جب خدا نے آدم (ع) کا وہ علم ظاہر کیا جو اس نے اس میں ودیعت رکھا تھا (سونپا گیا تھا)، نتیجتاً انہوں نے آدم (ع) کی شایستگی کو پہچانا اور حق کے سامنے جھک گئے۔ پھر خداوند نے سب کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔فرشتوں نے بھی اسے امام، معلم اور خدا کی طرف قبلہ کے طور پر اختیار کیا، جو انہیں خدا سے متعارف کراتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک روایت وارد ہوئی ہے:

(الْحُسَيْنُ بْنُ مُحَمَّدٍ عَنْ مُعَلَّى بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ أَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عبدالله عَنِ الْحَسَنِ عَنِ ابْنِ أَبِي عُمَيْرٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ إِسْحَاقَ بْنِ عمار قَالَ: قُلْتُ لِأَبِي الْحَسَنِ الْأَوَّلِ (ع) أَ لَا تَدُلُّنِي إِلَى مَنْ آخُذُ عَنْهُ دِينِي فَقَالَ هَذَا ابْنِي عَلِيٌّ إِنَّ أَبِي أَخَذَ بِيَدِي فَأَدْخَلَنِي إِلَى قَبْرِ رسول‌الله (ص) فَقَالَ يَا بُنَيَّ إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَ جَلَّ قَالَ (إِنِّي جاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً)وَ إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَ جَلَّ إِذَا قَالَ قَوْلًا وَفَى بِهِ).[1]

(محمد بن اسحاق بن عمار کہتے ہیں کہ میں نے امام کاظم (ع) سے عرض کیا: کیا آپ مجھے رہنمائی نہیں فرمائیں گے کہ میں اپنا دین کس سے لوں؟ آپ (ع) نے فرمایا: (یہ میرا بیٹا علی۔بے شک میرے والد نے میرا ہاتھ پکڑا اور رسول اللہ (ص) کی قبر پر لے گئے اور فرمایا: بیٹے! خدا نے فرمایا ہے کہ میں زمین میں خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں، اور جب خدا کوئی بات کہتا ہے تو اسے پورا کرتا ہے).

2. خداوند نے ابراہیم کو سلطنت اور حکومتِ الٰہی عطا کی اور اسے زمین میں اپنا خلیفہ مقرر کیا:

---

1. الکافی، ج1، ص312۔

(أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ)[1]

(کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا کہ جب اللہ نے اسے بادشاہی دی تھی تو وہ ابراہیم کے ساتھ اس کے پروردگار کے بارے میں جھگڑنے اور تکرار کرنے لگا؟ جب ابراہیم نے کہا: میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، تو اس نے کہا: میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا: تو دیکھ، اللہ سورج کو مشرق سے لاتا ہے، تو اسے مغرب سے لے آ۔ تو وہ کافر حیران رہ گیا، اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا).

3. خداوند نے نبی اللہ داؤد (ع) کو زمین میں اپنا خلیفہ منتخب کیا:

(يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ)[2]

(اے داؤد! بے شک ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے، تو پھر لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بہکا دے۔ بے شک جو لوگ اللہ کے راستے سے بہکتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اس وجہ سے کہ انہوں نے یومِ حساب کو بھلا دیا).

اسی طرح ایک اور آیت میں فرمایا:

(فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ وَلَوْلا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ)[3]

(تو وہ اللہ کے حکم سے ان پر غالب آ گئے، اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا، اور اللہ نے اسے بادشاہی اور حکمت عطا کی اور جو چاہا اسے سکھایا۔ اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض کے ذریعے دفع نہ کرتا تو زمین ضرور بگڑ جاتی، لیکن اللہ تو تمام جہانوں پر بڑے فضل والا ہے).

4. قرآنِ کریم ایک اور مقام پر فرماتا ہے:

---

1. قرآن کریم، سورہ بقرہ، آیت 258۔
2. قرآن کریم، سورہ ص، آیت 26۔
3. قرآن کریم، سورہ بقرہ، آیت 251۔

(وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ)[1]

(اور کافر کہتے ہیں: اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی؟ (اے نبی!) آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں، اور ہر قوم کے لیے ایک ہدایت کرنے والا ہے).

یہ آیۂ کریمہ واضح طور پر بیان کرتی ہے کہ ہر قوم، خواہ ماضی میں یعنی رسول اللہ محمد (ص) سے پہلے ہو یا مستقبل میں ان کے بعد، ایک ہدایت دینے والا رکھتی ہے۔

رسول خدا (ص) نے ان احادیث میں، جو اہلِ سنت نے اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں، اس ہدایت دینے والے کو بنی ہاشم کے ایک معین شخص کے طور پر بیان کیا ہے اور ایک روایت میں اس کی ایک مثال امام علی (ع) کو قرار دیا ہے:

- ابن جریر طبری نے اپنی کتاب جامع البیان (ج 13، ص 142) میں اپنی سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ (ص) نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا اور فرمایا: (میں وہی ڈرانے والا ہوں، اور ہر قوم کا ایک ہدایت دینے والا ہوتا ہے اور اپنے ہاتھ سے علی (ع) کے کندھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اے علی! میرے بعد ہدایت پانے والے تمہارے ذریعے ہدایت پائیں گے).[2]

- ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر (ج 7، ص 2225، روایت نمبر 12152) میں امام علی (ع) سے نقل کیا ہے کہ آپ (ع) نے فرمایا: (ہر قوم کا ایک ہدایت دینے والا ہوتا ہے، یعنی ان کا ہدایت دینے والا بنی ہاشم کا ایک شخص ہوتا ہے. ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ ابن الجنید نے کہا: وہ بنی ہاشم کا شخص علی بن ابی طالب (ع) ہی ہیں).[3]

---

1. قرآن کریم، سورہ رعد، آیت 7۔
2. ابن حجر عسقلانی اپنی کتاب فتح الباری، جلد 8، ص 285 میں کہتے ہیں کہ یہ حدیث اچھے سند کے ساتھ روایت ہوئی ہے۔
3. ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر کے مقدمے (جلد 1، ص 14) میں تصریح کی ہے کہ: اس کتاب میں میں نے سب سے صحیح روایات جمع کی ہیں: (کچھ بھائیوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں قرآن کی ایسی تفسیر لکھوں جو مختصر ہو اور جس میں سب سے زیادہ صحیح سندیں ہوں... پس میں نے ان کی درخواست قبول کی، اور توفیق اللہ کی طرف سے ہے، ہم اسی سے مدد چاہتے ہیں اور کوئی طاقت و قوت نہیں مگر اللہ سے۔ چنانچہ میں نے مناسب سمجھا کہ ایسی تفسیر مرتب کروں جو سند کے اعتبار سے صحیح ترین اخبار پر مشتمل ہو اور متن کے اعتبار سے سب سے زیادہ حق کے قریب ہو۔ پس جب مجھے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی تفسیر ملی تو میں نے اُس کے ساتھ کسی صحابی کی روایت ذکر نہ کی (اگرچہ اُس نے بھی وہی بات نقل کی ہو)؛ اور جب مجھے کوئی حدیث صحابہ سے ملی اور سب اس کے نقل کرنے میں متفق تھے، تو میں نے اسے اُن میں سب سے بلند مرتبہ صحابی سے صحیح ترین سند کے ساتھ روایت کیا اور باقی موافقین و دیگر راوی اور صحابہ کا صرف نام ذکر کیا؛ اور اگر ان میں اختلاف ہوتا تو میں نے اُن کا اختلاف بھی ذکر کیا اور ہر ایک کے لیے الگ سند بیان کی اور ان کے موافقین کا نام بلا سند ذکر کیا۔ پھر اگر مجھے کوئی حدیث صحابہ سے نہ ملتی اور

حاکم نیشابوری اپنی کتاب المستدرک الصحیحین (ج 3، ص 130) میں اپنی سند کے ساتھ علی بن ابی طالب(ع) سے روایت کرتے ہیں کہ آیتِ محلِ بحث کے بارے میں آپ(ع) نے فرمایا: (رسول اللہ(ص) منذر (ڈرانے والے) تھے اور میں ہدایت دینے والا ہوں).

حاکم نیشابوری اس روایت کے ذیل میں لکھتے ہیں: یہ حدیث صحیح السند ہے، لیکن ان دونوں (بخاری اور مسلم) نے اسے نقل نہیں کیا!

5. قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

(قل لِّمَن مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ قُل لِلّهِ كَتَبَ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لاَ رَيْبَ فِيهِ الَّذِينَ خَسِرُواْ أَنفُسَهُمْ فَهُمْ لاَ يُؤْمِنُونَ)[1]

(کہہ دو: آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ کہہ دو: اللہ کا ہے۔ اس نے اپنی ذات پر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔ وہ تمہیں روزِ قیامت جس میں کوئی شک نہیں ضرور جمع فرمائے گا۔ جنہوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈالا، وہی ایمان نہیں لاتے).

تابعین سے آتی تو ان احادیث میں بھی وہی طریقہ اپنایا جو صحابہ کے ساتھ اپنایا تھا؛ اور اسی طرح تابعین کے شاگردوں اور اُن کے بعد والوں کے بارے میں بھی...)۔

یہ عبارت اُن کی جانب سے اس بات کی گواہی ہے کہ اُنہوں نے اپنی تفسیر میں جو بھی روایات اور اخبار جمع کیے ہیں وہ سب صحیح ہیں، اور یہی گواہی اس مذکورہ روایت کی توثیق کے لیے کافی ہے۔

اس کے علاوہ دیگر محدثین اور اہل سنت کے علما نے بھی اس حدیث کو اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے؛ مثلاً: طبرانی نے المعجم الاوسط میں ج 2 ص 94 و ج 5 ص 153 - 154۔

مسند احمد بن حنبل، جلد 1، ص 126۔ احمد محمد شاکر نے اپنی تعلیق اور حاشیہ میں مسند احمد (جلد 2، صفحات 48 - 49) پر اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے اور کہا ہے: (اس کی سند صحیح ہے۔ مطلب بن زیاد بن ابی زہیر ثقفی کوفی ثقہ ہے، کیونکہ احمد، ابن معین اور دیگر علما نے اس کی توثیق کی ہے، اور بخاری نے کتاب الکبیر (4/2/8) میں اس کے حالات ذکر کیے ہیں اور اس کے بارے میں کوئی مذمت یا عیب نہیں کہا...؛ اور یہ حدیث عبداللہ بن احمد کی اضافات میں سے ہے)۔

ہیثمی نے مجمع الزوائد، جلد 7، ص 41 میں اس روایت کے بارے میں کہا ہے: (عبداللہ بن احمد اور طبرانی نے اسے المعجم الصغیر اور المعجم الاوسط میں نقل کیا ہے، اور مسند احمد کے تمام رجال و راوی سب کے سب ثقہ (معتبر اور قابل اعتماد) ہیں)۔

1. قرآن کریم، سورہ انعام، آیت 12۔

خداوند نے رحمت کو اپنے اوپر لازم قرار دیا ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ ایسا خلیفہ اور جانشین مقرر کرنا جو زمین میں حدودِ الٰہی کو نافذ کرے، رحمتِ الٰہی میں سے ہے؛ لہٰذا خداوند نے خلیفہ کا مقرر کرنا اپنے اوپر فرض کر لیا ہے۔ اس قرآنی استدلال کو ہم پہلے عقلی دلیل کی صورت میں بھی بیان کر چکے ہیں.

دوسرا. روایات خلیفۃُاللہ المہدی کے بارے میں

رسولِ خدا (ص) نے خبر دی ہے کہ مہدی، خلیفۃُاللہ ہیں، اور یہ ایسا امر ہے جس میں شیعوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں اور اس بارے میں روایات بہت زیادہ ہیں۔ مکتبِ تشیع کا اصل عقیدہ یہ ہے کہ زمین کبھی بھی حجت (خلیفۂ خدا) سے خالی نہیں رہتی۔

لیکن اہلِ سنت کی کتابوں میں بھی یہ بات واضح طور پر روایت ہوئی ہے، اور نتیجتاً وہ بھی اس کو ماننے کے پابند ہیں:

* سنن ابن ماجہ میں، محمد بن یحییٰ اور احمد بن یوسف بیان کرتے ہیں کہ عبدالرزاق نے سفیان الثوری سے، انہوں نے خالد الحذاء سے، انہوں نے ابی قلابہ سے، انہوں نے ابی اسماء رحبی سے، اور انہوں نے ثوبان سے نقل کیا کہ رسول اللہ (ص) نے فرمایا:

(يَقْتَتِلُ عِنْدَ كَنْزِكُمْ ثَلَاثَةٌ، كُلُّهُمُ ابْنُ خَلِيفَةٍ، ثُمَّ لَا يَصِيرُ إِلَى وَاحِدٍ مِنْهُمْ، ثُمَّ تَطْلُعُ الرَّايَاتُ السُّودُ مِنْ قِبَلِ الْمَشْرِقِ، فَيَقْتُلُونَكُمْ قَتْلًا لَمْ يَقْتُلْهُ قَوْمٌ، ثُمَّ ذَكَرَ شَيْئًا لَا أَحْفَظُهُ، فَقَالَ: فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَبَايِعُوهُ وَلَوْ حَبْوًا عَلَى الثَّلْجِ، فَإِنَّهُ خَلِيفَةُ اللَّهِ، الْمَهْدِيُّ).

(تمہارے خزانے پر تین آدمی آپس میں قتل ہوں گے جو سب کے سب خلیفہ کے بیٹے ہوں گے، پھر ان تینوں میں سے کسی کو بھی خلافت نہیں ملے گی۔ اس کے بعد مشرق سے سیاہ پرچم نکلیں گے اور تمہیں اس انداز سے قتل کریں گے جس طرح کبھی کسی گروہ نے نہیں کیا۔ پھر رسولِ خدا (ص) نے کچھ فرمایا جو مجھے یاد نہیں رہا، اس کے بعد فرمایا: پھر جب تم اسے دیکھو تو اس کے ساتھ بیعت کر لو، چاہے برف پر گھسٹتے ہوئے جانا پڑے، کیونکہ وہ اللہ کا خلیفہ، مہدی ہے).[1]

---

1. سنن ابن ماجہ، تالیف محمد بن یزید قزوینی (متوفی 273 ہجری قمری)، تحقیق، نمبرنگ اور حاشیہ نویسی: محمد فؤاد عبدالباقی، مطبوعہ دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع: ج - 2 ص 1367 ح 4084؛

المستدرک علی الصحیحین، تالیف حاکم نیشابوری (متوفی 405 ہجری قمری)، زیر نگرانی یوسف عبد الرحمٰن المرعشلی: ج 4 ص 463 – 464؛

البحر الزخار، المعروف بمسند البزاز، تالیف ابو بکر احمد بن عمرو بن عبدالخالق العتیکی البزاز (متوفی 292 ہجری قمری)، تحقیق: عادل بن سعد، مطبوعہ مکتبۃ العلوم والحکم، مدینہ منورہ، پہلی اشاعت سنہ 1424 ہ - 2003 م، (1367/2/ح 4084)؛

السنن الواردۃ فی الفتن وغوائلہا والساعۃ واشراطہا، تالیف اِبی عمرو عثمان بن سعید المقریٔ الدانی متوفی 444 ہ.ق تحقیق: دکتور رضاء الدین بن محمد بن ادریس المبارکفوری، مطبوعہ دار العاصمۃ للنشر والتوزیع: ج - 5 ص 1032 ح 548؛

دلائل النبوۃ، تالیف بیہقی متوفی 458 ہ.ق تحقیق: دکتر عبد المعطی قلعجی، مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ، بیروت لبنان، پہلی اشاعت - 1405 ہ: ج 6 ص 515 - 516؛

تاریخ مدیۃ دمشق، تالیف ابن عساکر، متوفی 571 ہ.ق. ج 32 ص 280 - 281؛

کتاب التذکرۃ بأحوال الموتی واِمور الآخرۃ، تالیف اِبی عبد اللہ محمد بن اِحمد بن اِبی بکر الأنصاری الخزرجی الأندلسی القرطبّی متوفی 671 ہ.ق تحقیق: دکتر الصادق بن محمد بن إبراہیم، مطبوعہ مکتبہ دار المنہاج بالریاض، پہلی اشاعت، 1425 ہ.ق: ج 3 ص 1201، باب فی المہدی وذکر من یمہد لہ ملکہ، ح 1؛

النہایۃ فی الفتن والملاحم، تالیف اِبی الفداء عماد الدین إسماعیل بن عمر بن کثیر القرشی الدمشقی متوفی 774 ہ.ق تحقیق: عصام الدین الصبابطی، اشاعت دار الحدیث، القاہرۃ: ج 1 ص 48؛

البدایۃ والنہایۃ، تالیف ابن کثیر، تحقیق علی شیری، اشاعت دار احیاء التراث العربی، بیروت لبنان، پہلی اشاعت، 1408 ہ - 1988 م: ج 6 ص 275 - 276؛

زوائد ابن ماجہ علی الکتب الخمسۃ، تالیف احمد بن ابی بکر بن اسماعیل البوصیری (متوفی 840ھ)، تصحیح وتعلیق: شیخ محمد مختار حسین، گیارہویں ایڈیشن (1414ھ/1993ء)، مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ، بیروت-لبنان: ص 527 - 528 شمارہ حدیث 1370؛

جمع الجوامع، تالیف جلال الدین السیوطی، مطبوعہ الأزہر الشریف، 1426 ہ - 2005 م: ج 13 ص 257 حدیث نمبر 1459 / 28086؛

الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور، تالیف جلال الدین السیوطی: ج 6 ص 58؛

الأربعون حدیثا فی المہدی، تالیف اِبی نعیم الأصبہانی (ت 430 ہ)، تحقیق علی جلال باقر: حدیث 32. سیوطی نے بھی اپنی کتاب الحاوی للفتاوی میں اس حدیث کو ابو نعیم کی طرف منسوب کیا ہے؛ ملاحظہ کیجیے: الحاوی للفتاوی، تالیف سیوطی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت لبنان، - 1403 ہ - 1983 م: ج 2 ص 60؛

مسند الرویانی، تالیف ابو بکر محمد بن ہارون الرویانی (متوفی 307ھ)، ضبط و تعلیق: ایمن علی ابو یمانی، مؤسسہ قرطبہ، پہلی اشاعت 1416ھ / 1995ء، جلد 1، صفحات 417 - 418، حدیث نمبر 637؛

کنز العمال، تالیف متقی ہندی (ت 975 ہ): ج 14 ص - 263 حدیث نمبر 38658؛

البرہان فی علامات مہدی آخر الزمان، تالیف متقی ہندی، ص 47؛

إمتاع الأسماع، تالیف تقی الدین احمد بن علی بن عبد القادر المقریزی (متوفی 845ھ)، تحقیق: محمد عبد الحمید النمیسی، مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، پہلی اشاعت، 1420 ہ - 1999 م: ج 12 ص 296 - 297؛

ینابیع المودۃ لذوی القربی، تالیف شیخ سلیمان بن إبراہیم القندوزی الحنفی (ت 1294 ہ)، تحقیق سید علی جمال اِشرف الحسینی، دار الأسوۃ، پہلی اشاعت، 1416 ہ: ج 3 ص 391؛

* حاکم نیشابوری المستدرک میں ایک اور سند کے ساتھ سفیان ثوری سے روایت کرتے ہیں:

ابو عبداللہ صفار نے محمد بن ابراہیم بن ارومہ سے، انہوں نے حسین بن حفص سے، انہوں نے سفیان سے، انہوں نے خالد حذاء سے، انہوں نے ابی قلابہ سے، انہوں نے ابی اسماء سے، اور انہوں نے ثوبان سے روایت کی کہ رسولِ خدا (ص) نے فرمایا:

(يقتتل عند كنزكم ثلاثة كلهم ابن خليفة ثم لا يصير إلى واحد منهم ثم تطلع الرايات السود من قبل المشرق فيقاتلونكم قتالا لم يقاتله قوم ثم ذكر شيئا فقال إذا رأيتموه فبايعوه ولو حبوا على الثلج فإنه خليفة الله المهدي). هذا حديث صحيح على شرط الشيخين)[1]

(تمہارے خزانے پر تین آدمی قتل ہوں گے جو سب کے سب خلیفہ کے بیٹے ہوں گے؛ پھر خلافت ان میں سے کسی کو نہیں ملے گی؛ اس کے بعد مشرق کی طرف سے سیاہ پرچم نکلیں گے؛ پھر وہ تم سے اس انداز میں جنگ کریں

عقد الدرر فی إخبار المنتظر، تالیف یوسف بن یحیٰ المقدسی الشافعی السلمی؛ ساتویں صدی ہجری کے علما میں سے، تحقیق دکتر عبد الفتاح محمد الحلو، مکتبۃ عالم الفکر القاہرۃ، چاپ اول، 1399 ہ - 1979 م: ص 57.

کچھ اہل سنت علما جنہوں نے اس حدیث کی تصحیح کی ہے:

إ. بزاز فی البحر الزخار: ج 2 ص 1367 ح 4084 حدیث کو نقل کیا اور اس کی تصحیح میں کہا: (... ہم نے اس حدیث کو اختیار کیا کیونکہ یہ صحیح ہے اور ثوبان جلیل القدر ہیں اور ان کی اسناد صحیح ہے).

ب. حاکم نیشابوری نے المستدرک، جلد 4، صفحات 463 - 464 میں اس حدیث کو ایک اور سند کے ساتھ سفیان ثوری کی طرف منسوب کیا ہے اور کہا ہے: (یہ حدیث شیخین [بخاری و مسلم] کے معیار کے مطابق صحیح ہے).

ج. قرطبی نے التذکرۃ بأحوال الموتی وامور الآخرۃ، جلد 3، ص 1201، باب المہدی وذکر من یمہد لہ ملکہ، حدیث 1 کو ابن ماجہ سے نقل کیا ہے اور کہا ہے: (اس کی سند صحیح ہے).

د. ابن کثیر نے ابن ماجہ سے النہایۃ فی الفتن والملحم، جلد 1، ص 48 میں یہی حدیث نقل کی ہے اور کہا ہے: (یہ حدیث اس طریق سے صرف ابن ماجہ نے ہی نقل کی ہے اور یہ سند قوی اور صحیح ہے).

ہ. بوصیری نے زوائد ابن ماجہ علی الکتب الخمسۃ، صفحات 527 - 528، حدیث نمبر 1370 میں یہی حدیث نقل کی ہے اور کہا ہے: یہ سند صحیح ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ حاکم نیشابوری نے المستدرک میں حسین بن حفص کے واسطے سے سفیان سے یہ حدیث نقل کی ہے اور کہا ہے: (یہ حدیث شیخین [مسلم و بخاری] کے معیار کے مطابق صحیح ہے).

و. سیوطی نے الجامع الصغیر، جلد 1، حدیث نمبر 648 میں بھی اس حدیث کی تصحیح کی ہے.

ز. ذہبی نے بھی حاکم نیشابوری سے کتاب تلخیص المستدرک میں اتفاق کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ برحق ہیں، یعنی یہ حدیث شیخین کے معیار کے مطابق صحیح ہے۔

1. المستدرک علی الصحیحین، تالیف حاکم نیشابوری (متوفی 405 ھ)، زیر نگرانی یوسف عبد الرحمٰن المرعشلی: ج 4 ص 463 – 464۔

گے جس طرح کسی گروہ نے اس طرح جنگ نہیں کی ہو گی۔ پھر آپ (ص) نے کچھ فرمایا اور پھر کہا: جب تم اسے دیکھو تو اس کے ساتھ بیعت کر لو، چاہے برف پر گھسٹتے ہوئے جانا پڑے، بے شک وہ اللہ کا خلیفہ مہدی ہے).

حاکم نیشابوری کہتے ہیں: یہ حدیث شیخین کے معیار کے مطابق صحیح ہے.

* حاکم نیشابوری المستدرک الصحیحین میں روایت کرتے ہیں: حسین بن یعقوب بن یوسف عدل نے یحیٰی بن ابی طالب سے، انہوں نے عبد الوہاب بن عطا سے نقل کیا کہ خالد الحذاء نے ابی قلابہ سے، انہوں نے ابی اسماء سے، اور انہوں نے ثوبان سے خبر دی، وہ کہتے ہیں:

(إِذَا رَأَيْتُمُ الرَّايَاتِ السُّودَ خَرَجَتْ مِنْ قِبَلِ خُرَاسَانَ فَأْتُوهَا وَلَوْ حَبْوًا، فَإِنَّ فِيهَا خَلِيفَةَ اللَّهِ الْمَهْدِيَّ. هَذَا حَدِيثٌ صَحِيحٌ عَلَى شَرْطِ الشَّيْخَيْنِ وَلَمْ يُخَرِّجَاهُ.)[1].

(جب تم سیاہ پرچموں کو دیکھو کہ وہ خراسان کی طرف سے نکلے ہیں تو ان کے پاس پہنچو، چاہے گھسٹتے ہوئے جانا پڑے، کیونکہ ان میں اللہ کا خلیفہ مہدی ہے۔ یہ حدیث شیخین کے معیار کے مطابق صحیح ہے، لیکن انہوں نے اسے روایت نہیں کیا).

---

1. المستدرک علی الصحیحین، حاکم النیسابوری: ج 4 ص 502؛ مسند اِحمد بن حنبل، اِحمد بن حنبل (ت 241 ہ): ج 5 ص 277؛ الفتن، نعیم بن حماد المروزی (ت 229): ص 188؛ دلائل النبوۃ، بیہقی (ت 458 ہ)، تحقیق: د. عبد المعطی قلعجی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت لبنان، الطبعۃ الأولی -1405 ہ: ج 6 ص 515 – 516؛ البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر، تحقیق علی شیری، دار إحیاء التراث العربی، بیروت لبنان، ط - 1، 1408 ہ - 1988 م: ج 6 ص 275 - 276؛ مشکاۃ المصابیح، محمد بن عبد اللہ الخطیب التبریزی (ت 741 ہ)، تحقیق محمد ناصر الدین الألبانی، المکتب الإسلامی للطباعۃ والنشر: ج 3 کتاب الفتن ص 1503 حدیث نمبر 5461؛ ہدایۃ الرواۃ إلی تخریج اِحادیث المصابیح والمشکاۃ، ابن حجر العسقلانی (ت 852 ہ)، تحقیق علی بن حسن عبد الحمید الحلبی، دار ابن القیم دار ابن عفان، ط - 1، 1422 ہ - 2001 م: ج 5 ص 123 حدیث نمبر 5389؛ جمع الجوامع، جلال الدین سیوطی: ج 1 ص 392 حدیث نمبر 972 / 1887؛ الجامع الصغیر فی إحادیث البشیر النذیر، جلال الدین عبد الرحمٰن بن اِبی بکر السیوطی (ت 911 ہ): ج 1 ص 100 حدیث نمبر 648؛ الأربعون حدیثا فی المہدی، اِبی نعیم الأصبہانی: حدیث 26. سیوطی فی الحاوی یہی حدیث ابو نعیم کی طرف منسوب کی ہے؛ ملاحظہ کریں: الحاوی للفتاوی، سیوطی: ج 2 ص 63؛ کنز العمال، متقی ہندی: ج 14 ص 261 حدیث نمبر 38651؛ البرہان فی علامات مہدی آخر الزمان، متقی ہندی، تحقیق ودراسۃ قسم التحقیق بالدار، دار الصحابۃ للتراث بطنطا، ط 1، 1412 ہ - 1992 م: ص 76؛ سبل الہدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد، محمد بن یوسف الصالحی الشامی (ت 942 ہ)، تحقیق شیخ عادل احمد عبد الموجود و شیخ علی محمد معوض، دار الکتب العلمیۃ، بیروت لبنان، ط - 1، 1414 ہ - 1993 م: ج 10 ص 171؛ ینابیع المودۃ لذوی القربی، قندوزی: ج 3 ص 259؛ البدء والتاریخ، اِحمد بن سہل البلخی (507 ہ): ج 2 ص 174؛ عقد الدرر فی إخبار المنتظر، یوسف بن یحیٰی مقدسی: ص 125؛ و....

حاکم نیشابوری کہتے ہیں کہ یہ حدیث شیخین کے معیار کے مطابق صحیح ہے، لیکن انہوں نے اسے بیان نہیں کیا!

* مسند احمد بن حنبل میں، عبداللہ ابی ثناوکیع سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے شریک سے، انہوں نے علی بن زید سے، انہوں نے ابی قلابہ سے، اور انہوں نے ثوبان سے، کہ رسولِ خدا (ص) نے فرمایا:

(إِذَا رَأَيْتُمُ الرَّايَاتِ السُّودَ قَدْ جَاءَتْ مِنْ قِبَلِ خُرَاسَانَ فَائْتُوهَا فَإِنَّ فِيهَا خَلِيفَةَ اللَّهِ الْمَهْدِيَّ).[1]

(جب تم دیکھو کہ سیاہ پرچم خراسان کی طرف سے آ چکے ہیں تو ان کے پاس پہنچو، کیونکہ ان میں اللہ کا خلیفہ مہدی ہے).

* ابن حجر عسقلانی اپنی کتاب القول المسدّد میں عبداللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا (ص) نے فرمایا:

(إِذَا أَقْبَلَتِ الرَّايَاتُ السُّودُ مِنْ خُرَاسَانَ فَائْتُوهَا فَإِنَّ فِيهَا خَلِيفَةَ اللَّهِ الْمَهْدِيَّ).[2]

(جب سیاہ پرچم خراسان سے آئیں تو ان کے پاس پہنچو، کیونکہ ان میں اللہ کا خلیفہ مہدی ہے).

ابو نعیم الاصبھانی اپنی کتاب الأربعین الحدیث فی المہدی میں، حدیث نمبر 16 میں، عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا (ص) نے فرمایا:

(يَخْرُجُ الْمَهْدِيُّ وَعَلَى رَأْسِهِ عِمَامَةٌ، فِيهَا مُنَادٍ يُنَادِي: هَذَا الْمَهْدِيُّ خَلِيفَةُ اللَّهِ فَاتَّبِعُوهُ).[3]

(مہدی نکلیں گے اور ان کے سر پر ایک عمامہ ہوگا، جس میں سے ایک منادی ندا دے گا: یہ مہدی، اللہ کا خلیفہ ہے، اس کی پیروی کرو).

لہٰذا قرآن اور سنتِ نبوی (ص) سے مجموعی نتیجہ یہ ہے:

اس زمین پر بشر کے پہلے ہی دن سے، خدا کی طرف سے مقرر کردہ ایک خلیفہ موجود تھا، اور وہی آدم (ع) تھے، اور داؤد (ع) تھے جو آدم (ع) کے طویل عرصے بعد آئے اور جنہیں قرآنِ کریم میں خدا کا خلیفہ کہا گیا ہے؛

---

1. مسند اِحمد بن حنبل، اِحمد بن حنبل (ت 241 ہ): ج 5 ص 277۔
2. القول المسدد فی الذب عن مسند اِحمد، ابن حجر: ص 69۔
3. الحاوی للفتاوی، سیوطی: ج - 2 ص 61. عقد الدرر فی إخبار المنتظر، تحقیق الشیخ مہیب بن صالح البوریني، ب 6 ح 212 ص 205. نور الأبصار، شبلنجی، المطبعۃ المحمودیۃ بمصر سنۃ - 1313 ہ، ط 1، ص 158، اسی طرح وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ابو نعیم، طبرانی اور دیگر علما نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص جو انبیاء پر ایمان رکھتا ہو، زمین میں ان کے خلیفہ خدا ہونے، جیسے آدم (ع)، پر اعتراض کر سکتا ہے؛ اور مہدی (ع)، جو آخر میں آئیں گے، بھی زمین میں خدا کے خلیفہ ہوں گے.

لہٰذا اگر ہم دینِ خدا کو ایک کتاب کی شکل میں تصور کریں اور اس کا پہلا صفحہ کھولیں اور دیکھیں کہ اس میں لکھا ہے: "آدم خدا کا خلیفہ ہے"؛ اگر اس کا درمیانی صفحہ کھولیں اور دیکھیں کہ اس میں لکھا ہے: "داؤد خدا کا خلیفہ ہے"؛ اور اگر اس کا آخری صفحہ کھولیں اور دیکھیں کہ اس میں لکھا ہے: "مہدی خدا کا خلیفہ ہے"؛ تو اس کتاب سے، جس کے آغاز، درمیان اور آخر میں خدا کا خلیفہ نظر آتا ہے، ہم کیا سمجھ سکتے ہیں؟ یہ کتاب کس چیز کے بارے میں بات کر رہی ہے؟ کیا واقعی یہ واضح نہیں کہ پوری کتاب خدا کے خلیفہ کے بارے میں ہے؟ کیا اب یہ واضح نہیں ہو گیا کہ زمین پر خدا کے خلیفہ کی تقرری ایک ہمیشہ قائم رہنے والی الٰہی سنت رہی ہے اور ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ خدا کی سنت میں نہ تبدیلی آتی ہے اور نہ ہی اس کا بدلنا ممکن ہے، اور یہ ممکن ہی نہیں کہ زمانہ، زمین میں اللہ کے خلیفہ سے خالی ہو۔ اب، جو شخص حق کا طالب ہو، کیا اس کے لیے یہ بات پوری طرح واضح نہیں کہ دینِ خدا دراصل خدا کا خلیفہ ہے؟

جیسے کہ امام صادق (ع) نے فرمایا:

(اِنَّ الدِّينِ وَ أَصْلَ الدِّينِ هُوَ رَجُلٌ وَ ذَلِكَ الرَّجُلُ هُوَ الْيَقِينُ وَ هُوَ الْإِيمَانُ وَ هُوَ إِمَامُ أُمَّتِهِ وَ أَهْلِ زَمَانِهِ فَمَنْ عَرَفَهُ عَرَفَ اللَّهَ وَ مَنْ أَنْكَرَهُ أَنْكَرَ اللَّهَ وَ دِينَهُ وَ مَنْ جَهِلَهُ جَهِلَ اللَّهَ وَ دِينَهُ وَ حُدُودَهُ وَ شَرَائِعَهُ بِغَيْرِ ذَلِكَ الْإِمَامِ كَذَلِكَ جَرَى بِأَنَّ مَعْرِفَةَ الرِّجَالِ دِينُ اللَّهِ وَ الْمَعْرِفَةُ عَلَى وَجْهِهِ مَعْرِفَةٌ ثَابِتَةٌ عَلَى بَصِيرَةٍ يُعْرَفُ بِهَا دِينُ اللَّهِ وَ يُوصَلُ بِهَا إِلَى مَعْرِفَةِ اللَّهِ).[1]

(بیشک دین اور اصلِ دین ایک مرد ہے، اور وہ مرد یقین ہے، اور وہ ایمان ہے، اور وہ اپنی امت اور اپنے زمانے کا امام ہے۔ پس جس نے اسے پہچانا اس نے اللہ کو پہچانا، اور جس نے اس کا انکار کیا اس نے اللہ اور اس کے دین کا انکار کیا، اور جس نے اسے نہیں پہچانا -اس امام کے بغیر- اس نے اللہ، اس کے دین، اس کی حدود اور اس کی شریعت کو نہیں پہچانا۔ اسی طرح طے پایا کہ مردوں کی معرفت ہی دینِ خدا ہے، اور یہ پہچان ایک ثابت اور

1. بصائر الدرجات محمد بن الحسن الصفار: ص 549؛ مختصر بصائر الدرجات، حسن بن سلیمان الحلی: ص 82؛ خاتمۃ المستدرک، میرزا نوری: ج 4 ص 118؛ بحار الانوار المجلسی: ج 42 ص 290۔

بصیرت والی پہچان ہے، جس کے ذریعے دینِ خدا کو پہچانا جاتا ہے اور اسی کے ذریعے اللہ کی معرفت تک پہنچا جاتا ہے).

اہلِ سنت نے بھی صحیح مسلم میں روایت کیا ہے کہ محمد رسول اللہ (ص) نے فرمایا:

(مَنْ خَلَعَ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللَّهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا حُجَّةَ لَهُ، وَمَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً)[1]

(جس نے اطاعت سے ہاتھ کھینچا، وہ قیامت کے دن اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی حجت نہ ہو گی، اور جو شخص اس حال میں مرے کہ اس کی گردن میں بیعت نہ ہو، وہ جاہلیت (کفر) کی موت مرا).

یہ بالکل واضح ہے کہ بیعت خاص امام اور خلیفہ کے لیے ہوتی ہے؛ لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ: جو بیعت نہ کرے وہ جاہلیت کی موت مر کر دنیا سے گیا، یعنی اس کے روزے، نماز، عبادت اور حتیٰ کہ محمد رسول اللہ (ص) پر ایمان بھی کوئی فائدہ نہیں دے گا، اگر اس کی گردن میں کسی معین شخص کی بیعت نہ ہو۔

لہٰذا صحیح مسلم کے مطابق پورا دین ہر زمانے میں ایک مرد کے ساتھ بیعت اور اس کی اطاعت کے گرد گھومتا ہے؛ کیونکہ یہ حدیث قیامت تک ہر مسلمان کو خطاب کر رہی ہے اور تمام لوگوں پر یہ لازم کرتی ہے کہ وہ کسی معین شخص سے بیعت کریں یا کفر اور جاہلیت کی موت مریں۔

ہم جانتے ہیں کہ مخلوق پر ولایت اور حاکمیت، حقیقی طور پر خدا ہی کے لیے مختص اور محدود ہے:

(فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَى إِلَيْكَ وَحْيُهُ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا)[2]

(تو بلند مرتبہ ہے اللہ، وہ حقیقی بادشاہ ہے؛ اور اس سے پہلے کہ قرآن کی وحی تم پر مکمل ہو جائے، اس کی تلاوت میں جلدی نہ کرو، اور کہو: اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما).

(فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لا إِلهَ إِلاَّ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ)[3]

(لہٰذا اللہ بلند و برتر ہے، حقیقی بادشاہ؛ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی عزت والے عرش کا رب ہے).

---

1. صحیح مسلم: ج 6 ص 22۔
2. قرآن کریم، سورہ طہٰ، آیت 114۔
3. قرآن کریم، سورہ مؤمنون، آیت 116۔

لہٰذا فرمانروائی اور حاکمیت کو اُس کے سوا کسی اور کی طرف منتقل کرنا اور کسی کو خلیفہ قرار دینا بھی قطعی تعیینی دلیل کا محتاج ہے۔

اسی وجہ سے ہمیں تلاش کرنا چاہیے کہ ولایتِ الٰہی کس کو منتقل ہوئی ہے اور خداوند نے کسے خلیفہ و امام کے طور پر منتخب کیا ہے تاکہ ہم اس سے بیعت کریں اور موتِ جاہلیت و کفر سے بچیں.

لیکن اپنے طور پر یا عوام کی طرف سے ـــ چاہے وہ کوئی بھی ہو ـــ کسی اور کو منتخب کرنا، خدا کی طرف سے اجازت کے بغیر، اس کی فرمانروائی اور حاکمیت کے دائرے میں بلاوجہ مداخلت اور تجاوز کے سوا کچھ نہیں۔ اس طرح ہر وہ مذہب جو خدا کی طرف سے مقرر کردہ شخص کے علاوہ کسی اور کی تقرری یا خلافت، اس سے بیعت، اور اس کی اطاعت کو واجب سمجھے، باطل ہو جاتا ہے.

لیکن یہی حدیثِ محلِ بحث کو کسی غیر مقرر کردہ شخص کی بیعت اور اطاعت کے وجوب کی دلیل کے طور پر لینا، اور یہ کہنا کہ ایسی بیعت کے بغیر (یعنی اس شخص سے بیعت جو خدا کی طرف سے مقرر نہیں کیا گیا) انسان موتِ جاہلیت کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گا، ایسا دعویٰ ہے جسے ثابت کرنے سے کانٹوں بھری شاخ پکڑنا آسان ہے۔

کیونکہ یہی حدیث ظاہر کرتی ہے کہ اطاعت اور خلافت صرف اسی کے لیے ہو گی جو جانشین کے طور پر مقرر کیا گیا ہو؛ لہٰذا یہ حدیث ابتدائی طور پر سب سے پہلے، اور اس حالات اور شرایط کے مطابق جن میں یہ حدیث بیان ہوئی، رسول اللہ محمد (ص) کے زمانے پر صادق آتی ہے، اور اس وقت بیعت خاص رسول اللہ (ص) کے لیے تھی، جو خدا کی طرف سے منتخب کیے گئے تھے:

(إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ فَمَنْ نَكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلَى نَفْسِهِ وَمَنْ أَوْفَى بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ... لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَ أَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا)[1]

(یقیناً جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ دراصل اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔ پھر جس نے عہد توڑا تو وہ اپنے ہی خلاف عہد توڑتا ہے، اور جس نے اس بات پر وفا کی جس پر اس نے اللہ سے عہد کیا تھا تو اللہ عنقریب اسے بڑا اجر عطا کرے گا۔۔۔ بے شک اللہ ایمان والوں سے راضی ہو گیا جب وہ

1. قرآن کریم، سورہ فتح، آیات 10 - 18۔

درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔ پس اللہ نے جان لیا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا، چنانچہ ان پر اطمینان نازل کیا اور انہیں قریب کی فتح کا انعام دیا).

یہاں بیعت ہونے والا شخص خداوند سبحان کی طرف سے منتخب کیا گیا ہے؛ لہٰذا اگر کوئی بیعت ہونے والے کی شرائط اور اس کی حیثیت کو اس کی اصل سے بدلنا چاہے تو اسے قطعی دلیل پیش کرنی ہوگی۔ اہلِ سنت نے بیعت ہونے والے کی شرائط کو بغیر کسی دلیل کے بدل دیا اور تبدیل کر دیا؛ لیکن وہ لوگ جو اسی ابتدائی اصل پر قائم رہے، ان کا استدلال یہ ہے کہ یہ بیعت اسی ابتدائی اصل پر باقی ہے جس کے بارے میں حدیث بیان ہوئی تھی، اور وہ اصل یہ ہے کہ بیعت صرف اس خلیفہ کے لیے ہے جو خدا کی طرف سے منتخب کیا گیا ہو، جیسے کہ ابتدا میں یہ بیعت اس پہلے شخص کے لیے تھی جس پر یہ حدیث صادق آتی تھی، اور وہی رسول اللہ محمد (ص) تھے جو خدا کی طرف سے منتخب کیے گئے تھے۔ یہی ہمارا عقیدہ ہے جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں، اور یہی فیصلہ کن اور آخری بات ہے.

تیسرا. وہ بات جو عہدِ قدیم (تورات) میں نقل ہوئی ہے:

ہم دیکھتے ہیں کہ یہی سنتِ الٰہی جسے قرآن اور دینِ اسلام نے بیان کیا ہے، عہدِ قدیم میں بھی واضح طور پر اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بطورِ مثال بعض ان متون پر توجہ کیجیے:

*(پروردگار نے موسیٰ سے فرمایا: بے شک تیرا وقت قریب آ چکا ہے کہ تو وفات پائے۔ یشوع (یوشع بن نون) کو خیمۂ اجتماع میں بلاؤ تاکہ میں اسے وصیت کروں۔ پس موسیٰ اور یشوع گئے اور خیمۂ اجتماع میں کھڑے ہوئے۔ * پھر پروردگار خیمہ میں بادل کے ستون میں ظاہر ہوا، اور بادل کا ستون خیمہ کے دروازے پر ٹھہر گیا).[1]

یہ بات اس لحاظ سے واضح ہے کہ یشوع یا یوشع، موسی (ع) کے وصی تھے.

* (اور یہی وہ برکت ہے جو موسیٰ مردِ خدا نے اپنی وفات سے قبل بنی اسرائیل کو عطا کی * پھر فرمایا: پروردگار سیناء سے آیا، اور ساعیر سے اُن پر نور پھیلایا، اور کوہِ فاران سے چمکا، اور قدس کے سرزمینوں سے آیا، جب کہ اُس کے دائیں طرف سے اُن کے لیے احکام اور شریعت کی آگ اور شعلہ تھا* پھر میں لوگوں سے محبت

1. تورات، سفر تثنیہ، اصحاح 32۔

رکھتا ہوں، اُس کے تمام مقدس لوگ تیرے ہاتھ میں ہیں، اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں اور تیرے کلام کو قبول کرتے ہیں).[1]

یہ عبارت موسی (ع)، عیسی (ع) اور محمد (ص) کا ذکر کرتی ہے۔آپ میرے بیان کردہ تفسیر دعائے سمات کی طرف رجوع کر سکتے ہیں.

❊ (فرمانروا داؤد نے کہا: صادوق کاہن، ناثان نبی، اور بنایاہو بن یھویاداع کو میرے پاس بلاؤ۔ پس وہ فرمانروا کے حضور حاضر ہوئے *فرمانروا نے اُن سے کہا کہ اپنے آقا کے خادموں کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور میرے بیٹے سلیمان کو میری خچر پر سوار کرو اور اُسے جیحون میں ٹھہراؤ* وہاں صادوق کاہن اور ناتان نبی کو چاہیے کہ بنی اسرائیل کے لیے اُس کو بطور بادشاہ مسح کریں؛ اور (آپ لوگ) نرسنگا پھونکیں؛ اور کہہ دیں کہ سلطنت سلیمان کی ہے *اور اُس کے پیچھے پیچھے اوپر چڑھو؛ پھر وہ آئے گا اور میرے تخت پر بیٹھے گا اور میری جگہ فرمانروا بنے گا، اور میں نے صرف اُسی کو بنی اسرائیل اور یہوداہ پر حکمرانی کی وصیت کی ہے * تب بنایاہو بن یھویاداع نے بادشاہ کو جواب دیا اور کہا: آمین۔ پروردگار، میرے آقا اور فرمانروا کا خدا، اسی طرح فرماتا ہے * جیسے پروردگار میرے آقا فرمانروا (داؤد) کے ساتھ تھا، اُسی طرح سلیمان کے ساتھ بھی ہو، اور اُس کا تخت میرے آقا فرمانروا داؤد کے تخت سے بھی زیادہ عظمت والا ہو).[2]

❊ (اور جب داؤد کی وفات کا وقت آیا، اُس نے اپنے بیٹے سلیمان کو وصیت کی اور کہا ☆ میں زمین کے تمام راستوں پر چلا ہوں، پھر مضبوط ہو اور مرد بن ☆ اپنے پروردگار اور اپنے خدا کے احکام کی نگہبانی کر، جب تُو اُس کی راہوں پر چلتا ہے، اور اُس کے فرائض، وصیتیں، احکام اور شہادتوں کی پاسداری کرتا ہے، جیسا کہ موسیٰ کی شریعت میں لکھا گیا ہے، تاکہ تُو ہر اُس کام میں جسے تُو انجام دے، اور ہر اُس راہ میں جس کی طرف تُو رُخ کرے، کامیاب اور کامران ہو ☆ تاکہ پروردگار اپنے اُس کلام کو قائم کرے جس کے ساتھ اُس نے میرے بارے میں

---

1. تورات، سفر تثنیہ، اصحاح 33۔
2. سفر پادشاہان، اول، اصحاح 1۔

فرمایا تھا، جب اُس نے فرمایا: اگر تیرے بیٹے اپنی راہ کی نگہبانی کریں، اور میرے سامنے امانت کے ساتھ اپنے دل کی گہرائی اور جان کی سچائی سے سلوک کریں، تو تیرے لیے اسرائیل کے تخت سے کوئی مرد ضائع نہ ہوگا).[1]

اوپر کے دونوں متن واضح طور پر بیان کرتے ہیں کہ نبیِ خدا سلیمان (ع)، نبیِ خدا فرمانروا داؤد (ع) کے وصی تھے، اور وہ تمام باتیں جو داؤد (ع) نے سلیمان (ع) کو وصیت کیں، مکمل طور پر خدای سبحان کے حکم سے تھیں.

چوتھا. وہ بات جو عہدِ جدید (انجیل) میں نقل ہوئی ہے:

* (21: 15 لہٰذا جب وہ کھانے سے فارغ ہوئے، یسوع (عیسیٰ) نے شمعون پطرس سے فرمایا: اے سمعان بن یونا، کیا تُو مجھ سے ان سب سے زیادہ محبت کرتا ہے؟ پطرس نے عرض کیا: ہاں، اے پروردگار، تُو جانتا ہے کہ میں تجھ سے محبت رکھتا ہوں۔ عیسیٰ نے اس سے فرمایا: میری بھیڑوں کی چرواہی کر.

21: 16 دوسری بار عیسیٰ نے سمعان سے کہا: اے سمعان بن یونا، کیا تُو مجھ سے محبت کرتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں، اے پروردگار، تُو جانتا ہے کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ عیسیٰ نے اس سے کہا: میری بھیڑوں کی چرواہی کر.

21:17 تیسری بار اُس سے کہا: اے سمعان بن یونا، کیا تُو مجھ سے محبت کرتا ہے؟ پھر پطرس غمگیں ہوا، کیونکہ عیسیٰ نے تین بار اُس سے کہا تھا: کیا تُو مجھ سے محبت کرتا ہے؟ اُس نے کہا: ہاں، اے پروردگار، تُو سب کچھ جانتا ہے، تُو جانتا ہے کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ عیسیٰ نے اُس سے کہا: میری بھیڑوں کی چرواہی کر).[2]

یہ بات واضح ہے کہ سمعان پطرس (شمعون الصفا) ہی عیسی (ع) کے بعد کے وصی ہیں.[3]

پس عیسی (ع) یا یسوع کے پاس کوئی بھیڑ یا ریوڑ نہیں تھا، اور ان عبارات سے مراد اُس کی رعیت اور مؤمنین ہیں، جن کی نگہبانی کا شمعون کو حکم دیا گیا.

---

1. سفر پادشاہان، اول، اصحاح 2۔
2. إنجیل یوحنا۔
3. وہ روایات جو بیان کرتی ہیں کہ پطرس حضرت عیسیٰ (ع) کے وصی تھے، ضمیمہ نمبر 4 میں آئی ہیں۔

استخلاف (جانشین مقرر کرنا) ایک مستقل سنت (روایت) ہے جس کی بیرونی دنیا میں اس کی خلاف ورزی نہیں ہوئی ہے۔

خدا سبحان زمین اور اس کے لوگوں کا مالک ہے اور اپنی ملکیت میں مطلق حاکمیت رکھتا ہے اور اس کی ملکیت کی یہ حاکمیت کسی اور کو منتقل کرنے کے لیے، خود خدا (اصل اور حقیقی مالک) کو ایک مخصوص شخص کو خلیفہ اور جانشین کے طور پر مقرر کرنا ہوگا اور اس کی رہنمائی کرنا ہے؛ لہٰذا، جو غیر ضروری طور پر مداخلت کرتا ہے اور خدا کی ملکیت میں اپنے آپ کو یا کسی دوسرے کو رہنما منتخب کرتا ہے، خلافت الٰہی کو غصب کرنے والا ظالم اور خدا کی حاکمیت اور بادشاہی پر حملہ آور سمجھا جاتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کی سنت یہ تھی کہ رسول اللہ (ص) سے پہلے اپنی زمین میں خلیفوں کا انتخاب کر چکے تھے اور رسول خدا محمد (ص) کا انتخاب بھی کیا اور بلا شبہ آپ (ص) کے بعد لوگوں کو خلیفہ منتخب کیے بغیر نہیں چھوڑا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

(وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ)[1]

(اور کافر کہتے ہیں: اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی؟ (اے نبی!) آپ تو بس ڈرانے والے ہیں، اور ہر قوم کے لیے ایک ہدایت کرنے والا ہے).

لیکن جو شخص رسول اللہ (ص) کے بعد متواتر الٰہی سنت کی خلاف ورزی پر یقین رکھتا ہے، اسے اس دلیل کو رد کرنا چاہیے جس کی بنیاد ہے کہ "ملک و حکومت خدا کی ہے اور اس کی اجازت اور تشخیصی نص کے بغیر اس پر قبضہ کرنا جائز نہیں ہے"۔ پھر اسے اس الٰہی سنت کی خلاف ورزی کا قطعی ثبوت پیش کرنا ہوگا جو آدم سے لے کر محمد (ص) تک الٰہی دین کے راستے میں جاری ہے۔

قانون سازی اور نفاذ کی صلاحیت میں حاکمیت اللہ کی ہے۔

ان تمام باتوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ زمین میں خدا کی خلافت کا عقیدہ ہی عقیدۂ حق ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر زمانے میں اپنے خلفاء کو بھیجتا ہے، چاہے وہ ظاہر اور اعلان کرنے والے ہوں کہ کچھ لوگ (اگر قابل ہوں) اُن کی مدد کریں، یا چاہے وہ قابل کے نہ ہونے کی صورت میں پوشیدہ اور گوشہ نشین ہوں؛ پس ہر حال میں انہی

1- قرآن کریم، سورہ رعد، آیت 7

خلفائے الٰہی کے ذریعے لوگوں پر حجت قائم ہو چکی ہے اور اُن کا عذر ختم ہو جاتا ہے: (لِئَلاَّ یَکونَ للنّاس علی الله حُجَّةٌ بَعدَ الرُّسُل).[1]

یہ خلفائے الٰہی ہی سببِ آفرینش یعنی معرفت کو محقق کرتے ہیں، اور انہی کے ذریعے خدا کی مرضی اُس کی حکومت اور سلطنت میں نافذ ہوتی ہے، کیونکہ وہی اس مقصد تک پہنچنے کا واحد راستہ ہیں، چونکہ دوسرے لوگ خدا کے ارادے کو پہچاننے سے عاجز ہیں؛ تو پھر وہ اُس ارادے کو خدا کی سلطنت کے دائرے میں کیسے نافذ کر سکتے ہیں؟!

یہاں ذکر کرنا ضروری ہے کہ وہ عقیدۂ حق جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اُس اصل کے ساتھ ہم آہنگ ہے جسے ہر عقلمند مؤمن درک کرتا ہے۔ اور وہ اصل یہ ہے کہ: زمین اور اُس کے باشندوں کا حقیقی مالک صرف خدا ہے، اور کوئی بھی شخص خدا کی ملکیت میں اُس کی اجازت کے بغیر نہ ولایت رکھتا ہے اور نہ تصرف کا حق۔ جبکہ لوگوں کی حاکمیت کا عقیدہ - چاہے وہ تشریع و قانون گذاری کے مقام پر ہو یا اجرا و عمل کے میدان میں - اس کلی اور عقلی قاعدۂ استخلاف سے انحراف کے امکان کے مترادف ہے؛ یعنی خدا کے سوا بھی لوگ اُس کی ملکیت میں، اُس کی اجازت کے بغیر، ولایت، حاکمیت اور حقِ تصرف رکھتے ہیں؛ اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ عقیدہ باطل ہے، اور بسا اوقات یہ عقیدہ خداوند کے لاہوت مطلق (مطلق الوہیت) کے انکار کا سبب بن سکتا ہے.

اسی ذریعے سے اہل سنت اور دیگر لوگوں کا یہ قول باطل ہو جاتا ہے کہ خلیفہ اور امام کا تقرر لوگوں کے ہاتھ میں ہے (خواہ وہ شوریٰ کے ذریعے ہو، یا اہل حل و عقد کی بیعت سے یا تسلط اور غلبے اور بالادستی سے، یا دیگر وسائل اور طریقوں کے ذریعے...).

زمین اور اس کے باشندے، آسمانیں اور جو کچھ ان میں ہے یہ سب خداوند کی مخلوق ہیں، اور وہی ان سب کا مالک ہے۔ پس مُلک، خدا کا مُلک ہے، اور بدیہی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ ہر مُلک میں تصرف کا حق صرف اُس کے حقیقی مالک کو حاصل ہوتا ہے، اور کوئی بھی کسی دوسرے کی ملکیت میں تصرف کا حق نہیں رکھتا، مگر اُس کی اجازت سے.

یہ کہ اہل سنت نے خدا کی ملکیت میں تصرف کا حق لوگوں کو تفویض کر دیا، اور خدا کی زمین میں حاکمیت کو عوام کے ہاتھ میں دے دیا، اور یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ لوگ جسے چاہیں - بغیر کسی نص اور قطعی دلیل کے - زمین

---

1. قرآن کریم، سورہ نساء، آیت 165۔

پر بطور حاکم مقرر کر سکتے ہیں، در حقیقت یہ خدا کے حق پر غصب اور خدای سبحان پر تعدّی ہے؛ اور اُن کے پاس کوئی راہِ فرار نہیں سوائے اس کے کہ وہ اقرار کریں کہ حاکمیت خاص خدا کے لیے ہے، اور امام و خلیفہ کا تقرر صرف اور صرف خدای سبحان کے ہاتھ میں ہے.

اسی طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حق آل محمدؐ کے ساتھ ہے، مگر یہ کہ اہل سنت کے نظریہ پرداز کوئی قطعی دلیل پیش کریں کہ خداوند نے لوگوں کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ جسے چاہیں بطور امام اور رہبر مقرر کریں، حالانکہ ایسی کوئی دلیل موجود نہیں ہے؛ عقائد ہمیشہ قطعی دلائل سے اخذ کیے جاتے ہیں، اور اُن کے پاس اپنے نظریے کی صحت پر کوئی قطعی دلیل موجود نہیں.

یہ مناسب ہوگا کہ اس بات کو ایک اور انداز سے بیان کریں:

اصل یہ ہے کہ لوگوں پر ولایت خاص خدا کے لیے ہے، اور استخلاف (یعنی جانشینی) اسی اصل کی ایک شاخ ہے۔ لہٰذا خدا کا خلیفہ، اس کی ولایت، خدا کی ولایت ہی کی فرع ہے، اور کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ خدا کی ولایت کسی اور کو منتقل کرے، مگر یہ کہ اس کے لیے قطعی شرعی دلیل موجود ہو۔

لہٰذا اصل یہ ہے کہ لوگوں پر ولایت صرف خدا کے لیے ثابت ہے، اور کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر- سوائے قطعی دلیل کے- ولایت نہیں رکھتا اور اگر وہ کہیں کہ حاکم (یعنی ان کے خلفاء میں سے کوئی بھی) لوگوں پر ولایت نہیں رکھتا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس کی حکومت اور حاکمیت کی بنیاد ہی منہدم ہو گئی اور وہ باطل ہو جائے گی اور اگر وہ کہیں کہ اُس کی ولایت لوگوں پر ویسی ہی ہے جیسے کسی ایسے شخص کی جسے خدا کی طرف سے مقرر کیا گیا ہو، تو پھر اُن پر لازم ہے کہ وہ ہر اُس فرد کے لیے جو خلافت اور اپنی ولایت کا دعویٰ کرے، خدا کی طرف سے قطعی دلیل اور نص تشخیصی (صریح اور معین نص) پیش کریں۔

فترت کے زمانے

وہ مکلفین جو ایسے فرستادے (خلیفہ) سے روبرو ہوتے ہیں جس سے پہلے فترت کا زمانہ گزرا ہو، اس بات کے پابند نہیں کہ وہ گذشتہ لوگوں کے حالات کو جانیں- یعنی اُن لوگوں کی حالت جو اس مرسل خلیفہ سے پہلے فترت کے زمانے میں زندہ تھے، یا یہ کہ اُن کا انجام کیا ہوا، آیا وہ جنتی ہوئے یا جہنمی، اور نہ یہ کہ اُنہیں کیا سیکھنا چاہیے تھا؛ کیونکہ وہ زمانہ گزر چکا ہے اور وہ لوگ ایک ایسی قوم تھے جو دنیا سے جا چکے، اور اُن کا وقتِ تکلیف ختم ہو چکا۔ جن لوگوں کو خدا کے فرستادے کا سامنا ہوتا ہے، اُن کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اُس کے دعوے کی دلیل کے بارے

میں تحقیق کریں، نہ یہ کہ گذشتہ اقوام کی حالت، انجام، یا اُن کے سیکھنے کے امور کے بارے میں سوالات میں مشغول ہوں، اور نہ یہ کہ وہ مقصر تھے یا نہیں، یا اُن کی کوتاہی نے اُنہیں اہلِ جہنم بنایا یا نہیں؟

فرعون، جب اُس نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت سنی، تو اس طرح کا سوال اور اشکال پیش کیا:

(قالَ فَما بالُ الْقُرُونِ الْأُولى) [1]

(اس نے کہا: تو پہلی نسلوں کا کیا حال ہے؟).

جواب جو خداوند نے موسی (ع) کی زبان سے جاری فرمایا، یہ تھا کہ:

(قالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَا يَضِلُّ رَبِّي وَ لَا يَنْسَى) [2]

(موسیٰ نے کہا: ان کا علم میرے رب کے پاس ایک کتاب میں ہے۔ میرا رب نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے).

یہ خدائی جواب جو موسیٰ (ع) کی زبان سے فرعون کو جاری ہوا، اس کا مطلب یہ ہے کہ تُو اپنی قوم کو کمتر شمار کرنے کے ارادے سے، اس اشکال کے ذریعے گذشتہ امتوں کے بارے میں سوال نہ کر، کیونکہ فی الحال اُن اقوام کے بارے میں سوال کرنا، اس وقت کے موجودہ موضوع یعنی موسی (ع) کی بعثت کی صحت اور فرعون و قومِ فرعون کے عقیدے کے باطل ہونے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا.

سوال (کہ پچھلی امتوں کی تکلیف کا کیا ہوگا؟ یا یہ کہ تیرے آنے سے پہلے لوگوں کو کیا کرنا چاہیے تھا؟) ایک ایسا سوال یا اشکال ہے جسے گمراہ علما ہمیشہ اپنی باطل روش کی تائید کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں، تاکہ یہ ظاہر کریں کہ دین کا معاملہ صرف اُن کے طریقے تک محدود ہے اور بس، اس طرح کہ گویا بعثتِ رسول سے پہلے خدا کی طرف سے کوئی متبادل موجود نہیں تھا؛ اور اگر اس دوران کوئی خطا یا گمراہی ہوئی، تو کیوں خدا نے تجھ سے پہلے ایسے رسولوں کو نہیں بھیجا جو اس خطا یا گمراہی کو درست کرتے؟

کیوں اس پورے عرصے میں دینی اصلاح میں تاخیر ہوئی، اور گذشتہ لوگوں کا گناہ کیا تھا کہ وہ اس دینی اصلاح سے محروم رہے؟

---

1. قرآن کریم، سورہ طہٰ، آیت 51۔
2. قرآن کریم، سورہ طہٰ، آیت 52۔

احناف، یہودیوں اور عیسائیوں نے بھی بالکل اسی طریقے اور اسی اشکال کے ساتھ محمد (ص) سے مخالفت کی؛ یعنی اگر علما کی مرجعیت کا طریقہ باطل تھا، تو پھر ماضی کے زمانوں میں الٰہی متبادل کیا تھا؟ کیوں تم سے پہلے اس طویل مدت میں کوئی رسول نہیں بھیجا گیا؟ اور اصل میں، زمانۂ فترت کیوں وجود میں آیا؟

(يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَى فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ أَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ)[1]

(اے اہلِ کتاب! بے شک ہمارا رسول رسولوں کے فترت اور خلا کے زمانے کے بعد تمہاری طرف آیا ہے، وہ تمہارے لیے بیان کرتا ہے تاکہ تم یہ نہ کہو: ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ یقیناً خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا تمہاری طرف آگیا ہے، اور اللہ ہر کام پر پوری طرح قادر ہے).

(لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَا أُنْذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ)[2]

(تاکہ آپ اس قوم کو خبردار کریں جن کے باپ دادا کو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا، اس لیے وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں).

یہی اشکالات آج بھی دہرائے جارہے ہیں۔

لہٰذا اس بات کے باوجود، کوئی حرج نہیں کہ ہم فترت کے معنی، اس کا سبب، اور اُن لوگوں کی حالت کو بیان کریں جو رسولوں کے بھیجے جانے سے پہلے زمانۂ فترت میں زندگی گزار رہے تھے۔

فترت: اُس وقت کو کہتے ہیں جب کوئی ایسا فرستادہ موجود نہ ہو جو لوگوں کو اللہ کی رسالت پہنچانے پر مامور ہو۔ زمانۂ فترت میں ممکن ہے کہ کوئی رسول، جو خدا کی طرف سے مقرر کیا گیا ہو، موجود ہو اور خدا نے اسے علم کے ذریعے تیار کیا ہو، لیکن چونکہ کوئی قابل (یعنی قبول کرنے والا) موجود نہیں ہوتا، اس لیے خدا اُسے تبلیغِ دعوت کا حکم نہیں دیتا۔:

(لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَا أُنْذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ... وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ)[3]

---

1. قرآن کریم، سورہ مائدہ، آیت 19۔
2. قرآن کریم، سورہ یس، آیت 6۔
3. قرآن کریم، سورہ یس، آیات 6 سے 10 تک۔

(تاکہ آپ اس قوم کو خبردار کریں جن کے باپ دادا کو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا، اس لیے وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔۔۔اور ان کے لیے برابر ہے، آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے!).

ایسے لوگوں کے درمیان تبلیغ کرنا، جن میں کوئی قابل (قبول کرنے والا) موجود نہ ہو اور جن کی تبلیغ سے کوئی امید بخش نتیجہ حاصل نہ ہو، حکیمانہ نہیں ہے۔ایسے حال میں رسول کا موجود ہونا حکمت کے موافق ہے، کیونکہ رسول کو بھیجنے کا مقصد لوگوں پر حجت قائم کرنا ہے، اور جب رسول موجود ہو تو لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہیں رہتی۔اس زمان کو زمانۂ فترت کہا جاتا ہے، جس میں رسول موجود ہوتا ہے، اور وہی خدا کا خلیفہ ہے زمین میں اور اُس کی حجت ہے لوگوں پر، یا وہ شخص جو اُس کی طرف سے زمانۂ غیبت یا رفع (اٹھائے جانے) کے وقت مقرر کیا گیا ہو،[1] لیکن اُسے تبلیغ کا حکم نہیں دیا گیا ہوتا، چاہے یہ فترت بہت طویل ہو اور اُس زمانے میں ایک سے زیادہ رسول موجود ہوں۔ خدای سبحان نے اسی زمانۂ فترت کی طرف اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے:

(يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَى فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ أَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ) [2]

(اے اہلِ کتاب! بے شک ہمارا رسول رسولوں کے فترت اور خلا کے زمانے کے بعد تمہاری طرف آیا ہے، وہ تمہارے لیے بیان کرتا ہے تاکہ تم یہ نہ کہو: ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ یقیناً خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا تمہاری طرف آگیا ہے، اور اللہ ہر کام پر پوری طرح قادر ہے).

کلمۂ فترت اس آیت میں کامل انقطاع کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی کمزوری اور سستی کے ہیں؛ یعنی رسولان زمانۂ فترت میں موجود ہوتے ہیں، لیکن اُن کی رسالت کے فریضے میں ایک طرح کی فترت و سکون ہوتا ہے، جو اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں تبلیغِ رسالتِ الٰہی کا حکم نہیں دیا گیا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کم از کم یہ واضح ہو جائے کہ یہ رسولان خدا کی طرف سے باقی لوگوں پر حجت ہیں اور خداوند متعال کی ارادے کو بیان کرنے والے ہیں۔ان کے تبلیغ کے مکلّف نہ ہونے کی سبب اور علت، قابل کے نہ ہونے کے علاوہ، لوگوں پر رحمت اور ترس بھی رہی ہے۔یعنی یہ کہ مؤمنین حق کو زیادہ قبول کرتے ہیں اور صرف تھوڑا سا باطل کی طرف مائل ہوتے ہیں، اور افسوس کہ انہوں نے غیب سے آنے والے فرستادوں کے استقبال میں بھی کوتاہی کی، لیکن

---

1. جس طرح عیسیٰ (ع)، الیاس (ع) اور حضرت محمد بن الحسن (ع) کو اٹھالیا گیا۔
2. قرآن کریم، سورہ مائدہ، آیت 19۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ لازماً ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ میں رہیں گے۔ بلکہ ماضی میں رحمتِ الٰہی کا تقاضا یہ رہا ہے کہ چونکہ رسالت اور دعوتِ رسول کے لیے کوئی قابل موجود نہیں تھا، اس لیے خداوند نے اُن پر رحم فرمایا اور تیار رسول کو اُن کی تبلیغ پر مامور نہیں کیا، اور اُسے اجازت نہیں دی کہ اپنی دعوت کو عام لوگوں کے سامنے علنی کرے۔ کیونکہ اگر اُنہیں تبلیغ کی جاتی اور وہ قبول نہ کرتے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ جہنم کے مستحق ٹھہرتے؛ اور اسی وجہ سے خداوند نے اپنی رحمت کے باعث اُنہیں چھوڑ دیا اور اپنے رسول کو تبلیغ کا حکم نہیں دیا، اور لوگ بھی اسی سبب، زمانۂ فترت میں خدا کے حکم کے منتظر اور اُس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں.

(وَ آخَرُونَ مُرْجَوْنَ لِأَمْرِ اللَّهِ إِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ إِمَّا يَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَ اللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ)[1]

(اور کچھ دوسرے ہیں جن کا معاملہ اللہ کے حکم پر مؤخر کیا گیا ہے، یا تو وہ انہیں عذاب دے گا یا تو ان کی توبہ قبول کرے گا۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے).

یعنی فترت کا سبب اور علت در حقیقت قابل (قبول کرنے والے) کے نہ ہونے کا مسئلہ تھا، اور ساتھ ہی یہ فترت اللہ تعالیٰ کی جانب سے لوگوں پر اُس کی رحمت اور شفقت کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ خدای سبحان نے نہایت وضاحت کے ساتھ قرآنِ کریم میں ایک اور مقام پر، فترت کے مسئلے، اُس زمانے میں لوگوں کی حالت، اور یہ کہ اُن کی طرف رسول کیوں نہیں بھیجے گئے، اور یہ کہ اگر رسول بھیجے جاتے تو اُن کا انجام کیا ہوتا، سب کو بیان فرمایا ہے.

(لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَا أُنْذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ * لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَى أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ * إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُمْ مُقْمَحُونَ * وَ جَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ * وَ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ * إِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمَنَ بِالْغَيْبِ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَ أَجْرٍ كَرِيمٍ * إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَى وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَ آثَارَهُمْ وَ كُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ)[2]

(تاکہ آپ اس قوم کو خبردار کریں جن کے باپ دادا کو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا، اس لیے وہ غفلت میں ہیں۔ یقیناً ان میں سے اکثر پر بات ثابت ہو چکی ہے، پھر وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں جو ٹھوڑیوں تک ہیں، تو وہ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ اور ہم نے ان کے آگے ایک دیوار اور پیچھے

---

1. قرآن کریم، سورہ مائدہ، آیت 106۔
2. قرآن کریم، سورہ یس، آیات 6 - 10۔

ایک دیوار بنادی ہے اور انہیں ڈھانپ دیا ہے، سو وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ اور ان کے لیے برابر ہے، آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ آپ تو صرف اسی کو خبردار کر سکتے ہیں جو قرآن کی پیروی کرے اور رحمٰن سے غیب میں ڈرے، تو اسے بخشش اور بڑے اجر کی خوشخبری دے دیں۔ بے شک ہم ہی مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو وہ آگے بھیج چکے اور جو آثار وہ پیچھے چھوڑ گئے ہم سب لکھتے ہیں، اور ہم نے ہر چیز کو ایک واضح امام (یعنی روشن کتاب) میں شمار کر رکھا ہے).

یہ آیات جس طرح فترت، اُس کی علت، اور قابل کے نہ ہونے کو بیان کرتی ہیں، اُسی طرح یہ بھی وضاحت سے بیان کرتی ہیں کہ اب، اُس گزری ہوئی فترت کے بعد، رسول کو مأمور کرنا اور اُن کی طرف بھیجنا اس وجہ سے ہے کہ اب رسولِ الٰہی کی دعوت کو قبول کرنے کے لیے قابل موجود ہے: (إِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَ خَشِيَ الرَّحْمَنَ بِالْغَيْبِ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَ أَجْرٍ كَرِيمٍ)

دونوں حالتوں میں - چاہے ارسال و تبلیغ ہو یا نہ ہو- اصل سبب، خداوند کی مطلق رحمت اور اُس کا اپنے بندوں کے حال پر علم ہی تھا:

(إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا و آثَارَهُمْ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ).

اسی وجہ سے، رحمتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ جب کوئی قابل موجود نہ ہو، تو وہ اپنے فرستادے کو ڈرانے اور تبلیغ کرنے کا حکم نہ دے، بلکہ اپنی رحمت کے سبب اپنے بندوں کو چھوڑ دے تاکہ وہ خدا کے حکم کے منتظر رہیں؛ اور جب قابل پیدا ہو جائے، تو وہ ایک ڈرانے والا اور مبلغ بھیجتا ہے تاکہ اُس کے اولیاء اعلیٰ ترین درجات حاصل کریں اور رسولوں، امرِ خدا اور حاکمیتِ خدا کی مدد کریں۔

ایک طرف، قرآنِ کریم یہ بیان کرتا ہے کہ وہ رسول جنہوں نے اپنی دعوت کو تبلیغ اور اعلان کے ساتھ پہنچایا، وہ تمام رسولوں میں سے برگزیدہ افراد تھے.

(مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّى يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَ مَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَ إِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ) [1]

(اللہ ہرگز ایسا نہیں کہ ایمان والوں کو اسی حالت پر چھوڑ دے جس پر تم ہو [کہ منافق مؤمن سے اور اچھا برے سے جدا اور پہچانا نہ ہو]، بلکہ وہ اس پر ہے کہ ناپاک کو پاک سے [مختلف آزمائشوں کے ذریعے] الگ کر

1. قرآن کریم، سورہ آل عمران، آیت 179۔

دے۔ اور اللہ تمہیں غیب پر مطلع کرنے والا نہیں، لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔ لہٰذا اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ، اور اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو تمہارے لیے بڑا اجر ہے).

یہ مسئلہ کہ لوگوں کو مرجون لأمر اللہ (یعنی خدا کے حکم و فیصلے کے منتظر) کی حالت میں چھوڑ دینا، صرف اُس زمانۂ فترت سے مخصوص نہیں ہے جس میں رسول نے اپنی رسالت کے بارے میں لوگوں کے لیے کوئی اعلان نہ کیا ہو، بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی رسول کچھ لوگوں کو اپنی رسالت سے باخبر کرتا ہے، لیکن وہ اپنی رسالت کو بعض لوگوں کے لیے کسی مصلحت یا کسی بڑے فائدے، جیسے تقیہ، اُن کی جان کی حفاظت، یا کسی اور امر کے سبب جسے خدا نے ارادہ فرمایا ہو، ظاہر نہیں کرتا؛ اور یہ امر حتیٰ کہ بعض ائمہ (ع) کے فرزندوں کے ساتھ بھی واقع ہوا ہے.[1]

ذیل میں ایک روایت[2] پیش کی جا رہی ہے، جو زید بن علی اور مؤمن الطاق کے درمیان مناقشے اور امام صادق (ع) کی مؤمن الطاق کے حق میں اقرار سے متعلق ہے؛ اس میں بیان ہوا ہے کہ امام سجاد (ع) نے اپنے بیٹے زید کو خدا کے حکم کا منتظر چھوڑ دیا اور اُس کے لیے شفاعتِ امام سے بہرہ مندی کا امکان باقی رکھا:

عن مُؤْمِن الطَّاق وَ اسْمُهُ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيّ بْنِ النُّعْمَانِ أَبُو جَعْفَرٍ الْأَحْوَلُ، (قَالَ: كُنْتُ عِنْدَ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ(ع) فَدَخَلَ زَيْدُ بْنُ عَلِيٍّ فَقَالَ لِي يَا مُحَمَّدَ بْنَ عَلِيٍّ أَنْتَ الَّذِي تَزْعُمُ أَنَّ فِي آلِ مُحَمَّدٍ إِمَاماً مُفْتَرَضَ الطَّاعَةِ مَعْرُوفاً بِعَيْنِهِ قَالَ قُلْتُ نَعَمْ كَانَ أَبُوكَ أَحَدَهُمْ، قَالَ وَيْحَكَ فَمَا كَانَ يَمْنَعُهُ مِنْ أَنْ يَقُولَ لِي؟ فَوَ اللَّهِ لَقَدْ كَانَ يُؤْتَى بِالطَّعَامِ الْحَارِّ فَيُقْعِدُنِي عَلَى فَخِذِهِ وَ يَتَنَاوَلُ الْبَضْعَةَ فَيُبَرِّدُهَا ثُمَّ يُلْقِمُنِيهَا، أَ فَتَرَاهُ كَانَ يُشْفِقُ عَلَيَّ مِنْ حَرِّ الطَّعَامِ وَ لَا يُشْفِقُ عَلَيَّ مِنْ حَرِّ النَّارِ قَالَ قُلْتُ كَرِهَ أَنْ يَقُولَ لَكَ فَتَكْفُرَ فَيَجِبَ مِنَ اللَّهِ عَلَيْكَ الْوَعِيدُ وَ لَا يَكُونَ لَهُ فِيكَ شَفَاعَةٌ، فَتَرَكَكَ مُرْجِئٌ لِلَّهِ فِيكَ الْمَشِيئَةُ وَ لَهُ فِيكَ الشَّفَاعَةُ).[3]

مؤمن الطاق (جس کا نام ابو جعفر احول، محمد بن علی بن نعمان تھا) کہتا ہے: (میں امام صادق (ع) کی خدمت میں حاضر تھا؛ پس زید بن علی، حضرت کے پاس آیا اور مجھ سے کہا: اے محمد بن علی، کیا تم وہی شخص ہو جو یہ گمان رکھتا ہے کہ آلِ محمد میں ایک معروف اور معین امام ہے جس کی اطاعت واجب ہے؟ میں نے کہا: ہاں؛

---

1. جب کوئی مصلحت تقاضا کرے تو اس میں کوئی اشکال نہیں کہ امام اپنے بعض فرزندوں کو اپنی امامت سے بے خبر رکھے، اور کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ مصلحت کو اپنے امام سے بہتر جانتا ہے، کیونکہ امام اللہ سے متصل ہے اور اللہ کی طرف سے اس پر وحی کی جاتی ہے۔
2. ملاحظہ کریں: ملحقہ 1۔
3. رجال کشی، ص 187۔

تمہارے والد اُن میں سے ایک تھے۔ زید نے کہا: افسوس تم پر۔ پھر کیا چیز اُنہیں روکتی تھی کہ وہ یہ حقیقت مجھ سے بیان کرتے؟ پھر خدا کی قسم، جب گرم کھانا لایا جاتا تو وہ مجھے اپنی ران پر بٹھاتے اور ایک لقمہ لیتے، پھر اسے ٹھنڈا کرتے اور مجھے کھلاتے۔ کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ وہ میرے لیے گرم کھانے پر مہربانی کرتا تھا، لیکن دوزخ کی آگ کی تپش کے بارے میں میرے لیے کوئی عنایت نہیں رکھتا تھا؟ مؤمن الطاق کہتا ہے: میں نے اُس سے کہا: تمہارے والد یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ یہ بات تم سے کہیں، کہیں تم کافر نہ ہو جاؤ اور تم پر عذابِ خدا واجب نہ ہو جائے، اور وہ پھر تمہاری شفاعت نہ کر سکیں۔ اسی لیے انہوں نے تمہیں خدا کے حکم اور فیصلے کا منتظر چھوڑ دیا، تاکہ وہ تمہاری شفاعت کر سکیں)۔

اسی طرح مؤمن الطاق سے یہ روایت بھی منقول ہے کہ اُس نے کہا:

(قَالَ زَيْدُ بْنُ عَلِيٍّ يَا مُحَمَّدَ بْنَ عَلِيٍّ بَلَغَنِي أَنَّكَ تَزْعُمُ أَنَّ فِي آلِ مُحَمَّدٍ إِمَاماً مُفْتَرَضَ الطَّاعَةِ قَالَ قُلْتُ نَعَمْ وَ كَانَ أَبُوكَ عَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ أَحَدَهُمْ، فَقَالَ وَ كَيْفَ وَ قَدْ كَانَ يُؤْتَى بِلُقْمَةٍ وَ هِيَ حَارَّةٌ فَيُبَرِّدُهَا بِيَدِهِ ثُمَّ يُلْقِمُنِيهَا، أَفَتَرَى أَنَّهُ كَانَ يُشْفِقُ عَلَيَّ مِنْ حَرِّ اللُّقْمَةِ وَ لَا يُشْفِقُ عَلَيَّ مِنْ حَرِّ النَّارِ قَالَ قُلْتُ لَهُ كَرِهَ أَنْ يُخْبِرَكَ فَتَكْفُرَ فَلَا يَكُونَ لَهُ فِيكَ الشَّفَاعَةُ لَا وَ اللَّهِ فِيكَ الْمَشِيئَةُ، فَقَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ(ع) أَخَذْتَهُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهِ فَمَا تَرَكْتَ لَهُ مَخْرَجاً).[1]

زید بن علی نے مجھ سے کہا: (اے محمد بن علی، مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تُو گمان کرتا ہے کہ آلِ محمد میں ایک ایسا امام موجود ہے جس کی اطاعت واجب ہے؟ میں نے کہا: ہاں، اور تمہارے والد علی بن الحسین (ع) اُن میں سے ایک تھے. زید نے کہا: پھر یہ کیسے ممکن ہے، جبکہ وہ خود گرم کھانے کے لقمے کو ٹھنڈا کرتا اور پھر میرے منہ میں رکھتا تھا؟ کیا تُو یہ گمان کرتا ہے کہ وہ میرے لیے گرم لقمے کی تپش پر شفقت رکھتا تھا، لیکن دوزخ کی آگ کی تپش کے بارے میں میرے لیے کوئی شفقت نہ رکھتا تھا؟ مؤمن الطاق کہتا ہے: میں نے اُس سے کہا: تمہارے والد یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ تمہیں اس بات کی خبر دیں، کہیں تم کفر نہ اختیار کرو اور وہ تمہاری شفاعت نہ کر سکیں۔ نہیں، خدا کی قسم، تم صرف خدا کی مشیّت کے سپرد کیے گئے ہو۔ امام صادق (ع) نے فرمایا: (تُو نے ہر طرف سے اُس کا راستہ بند کر دیا اور اُس کے لیے کوئی راہِ فرار باقی نہ چھوڑی).

اسی طرح ایک اور روایت میں آیا ہے:

عِدَّةٌ مِنْ أَصْحَابِنَا عَنْ أَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عِيسَى عَنْ عَلِيِّ بْنِ الْحَكَمِ عَنْ أَبَانٍ قَالَ:

---

1. رجال کشی، ص 187۔

(أَخْبَرَنِي الْأَحْوَلُ أَنَّ زَيْدَ بْنَ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ(ع) بَعَثَ إِلَيْهِ وَ هُوَ مُسْتَخْفٍ قَالَ فَأَتَيْتُهُ فَقَالَ لِي يَا أَبَا جَعْفَرٍ مَا تَقُولُ إِنْ طَرَقَكَ طَارِقٌ مِنَّا أَ تَخْرُجُ مَعَهُ قَالَ فَقُلْتُ لَهُ إِنْ كَانَ أَبَاكَ أَوْ أَخَاكَ خَرَجْتُ مَعَهُ قَالَ فَقَالَ لِي فَأَنَا أُرِيدُ أَنْ أَخْرُجَ أُجَاهِدُ هَؤُلَاءِ الْقَوْمَ فَاخْرُجْ مَعِي قَالَ قُلْتُ لَا مَا أَفْعَلُ جُعِلْتُ فِدَاكَ قَالَ فَقَالَ لِي أَ تَرْغَبُ بِنَفْسِكَ عَنِّي قَالَ قُلْتُ لَهُ إِنَّمَا هِيَ نَفْسٌ وَاحِدَةٌ فَإِنْ كَانَ لِلَّهِ فِي الْأَرْضِ حُجَّةٌ فَالْمُتَخَلِّفُ عَنْكَ نَاجٍ وَ الْخَارِجُ مَعَكَ هَالِكٌ وَ إِنْ لَا تَكُنْ لِلَّهِ حُجَّةٌ فِي الْأَرْضِ فَالْمُتَخَلِّفُ عَنْكَ وَ الْخَارِجُ مَعَكَ سَوَاءٌ قَالَ فَقَالَ لِي يَا أَبَا جَعْفَرٍ كُنْتُ أَجْلِسُ مَعَ أَبِي عَلَى الْخِوَانِ فَيُلْقِمُنِي الْبَضْعَةَ السَّمِينَةَ وَ يُبَرِّدُ لِيَ اللُّقْمَةَ الْحَارَّةَ حَتَّى تَبْرُدَ شَفَقَةً عَلَيَّ وَ لَمْ يُشْفِقْ عَلَيَّ مِنْ حَرِّ النَّارِ إِذاً أَخْبَرَكَ بِالدِّينِ وَ لَمْ يُخْبِرْنِي بِهِ فَقُلْتُ لَهُ جُعِلْتُ فِدَاكَ مِنْ شَفَقَتِهِ عَلَيْكَ مِنْ حَرِّ النَّارِ لَمْ يُخْبِرْكَ خَافَ عَلَيْكَ أَنْ لَا تَقْبَلَهُ فَتَدْخُلَ النَّارَ وَ أَخْبَرَنِي أَنَا فَإِنْ قَبِلْتُ نَجَوْتُ وَ إِنْ لَمْ أَقْبَلْ لَمْ يُبَالِ أَنْ أَدْخُلَ النَّارَ ثُمَّ قُلْتُ لَهُ جُعِلْتُ فِدَاكَ أَنْتُمْ أَفْضَلُ أَمِ الْأَنْبِيَاءُ قَالَ بَلِ الْأَنْبِيَاءُ قُلْتُ يَقُولُ يَعْقُوبُ لِيُوسُفَ (يا بُنَيَّ لا تَقْصُصْ رُؤْياكَ عَلى إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْداً) لِمَ لَمْ يُخْبِرْهُمْ حَتَّى كَانُوا لَا يَكِيدُونَهُ وَ لَكِنْ كَتَمَهُمْ ذَلِكَ فَكَذَا أَبُوكَ كَتَمَكَ لِأَنَّهُ خَافَ عَلَيْكَ قَالَ فَقَالَ أَمَا وَ اللَّهِ لَئِنْ قُلْتَ ذَلِكَ لَقَدْ حَدَّثَنِي صَاحِبُكَ بِالْمَدِينَةِ أَنِّي أُقْتَلُ وَ أُصْلَبُ بِالْكُنَاسَةِ وَ إِنَّ عِنْدَهُ لَصَحِيفَةً فِيهَا قَتْلِي وَ صَلْبِي فَحَجَجْتُ فَحَدَّثْتُ أَبَا عَبْدِ اللَّهِ(ع) بِمَقَالَةِ زَيْدٍ وَ مَا قُلْتُ لَهُ فَقَالَ لِي أَخَذْتَهُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهِ وَ عَنْ يَمِينِهِ وَ عَنْ شِمَالِهِ وَ مِنْ فَوْقِ رَأْسِهِ وَ مِنْ تَحْتِ قَدَمَيْهِ وَ لَمْ تَتْرُكْ لَهُ مَسْلَكاً يَسْلُكُهُ).[1]

ابان بن تغلب روایت کرتا ہے: (مؤمن الطاق نے مجھے خبر دی کہ زید بن علی (ع) نے کسی کو اُس کی طرف بھیجا جبکہ وہ خود مخفی تھا۔ مؤمن الطاق کہتا ہے: میں زید کے پاس گیا؛ تو اُس نے مجھ سے کہا: اے ابا جعفر، تم کیا کہتے ہو اگر ہم آل محمد (ص) میں سے کوئی تمہارے دروازے کو کھٹکھٹائے اور تم سے مدد طلب کرے، تو کیا تم اُس کے ساتھ قیام کرو گے؟ اس نے کہا: میں نے اُس سے کہا: اگر وہ تمہارے والد (امام سجاد ع) یا تمہارے بھائی (امام باقرع) ہوں، تو ہاں، میں اُن کے ساتھ قیام کروں گا. زید نے کہا: پس میں چاہتا ہوں کہ قیام کروں اور اس جماعت سے جنگ کروں۔ کیا تم میرے ساتھ قیام کرو گے؟ مؤمن الطاق کہتا ہے: میں نے کہا: نہیں، فدا ہو جاؤں تم پر، میں ایسا کام نہیں کروں گا۔ زید نے کہا: کیا تم اپنی جان کو مجھ پر ترجیح دیتے ہو؟ میں نے کہا: میرے پاس صرف ایک جان ہے؛ پھر اگر زمین میں اللہ کا کوئی خلیفہ ہو، تو جو تیری نافرمانی کرے وہ نجات پائے گا اور جو تیرے ساتھ نکلے وہ ہلاک ہوگا۔ لیکن اگر زمین میں کوئی حجت نہ ہو، تو پھر جو تیری نافرمانی کرے اور جو تیرے ساتھ نکلے، دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ زید نے کہا: اے ابا جعفر، میں اپنے والد کے ساتھ

---

1. الکافی، ج1، ص174۔

دستر خوان پر بیٹھا کرتا تھا؛ تو وہ اپنی محبت اور شفقت کی وجہ سے مرغن لقمے مجھے دیتا اور گرم لقمے کو میرے لیے سرد کرتا تھا تاکہ ٹھنڈا ہو جائے، لیکن اگر اُس نے تجھے دین کے امر سے باخبر کیا ہو اور مجھے باخبر نہ کیا ہو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے دوزخ کی آگ کی تپش کے بارے میں مجھ پر شفقت اور مہربانی نہیں کی۔ مؤمن الطاق کہتا ہے: میں نے زید سے کہا: فدا ہو جاؤں تم پر، یہی تو اُن کی تم پر جہنم کی آگ سے شفقت تھی کہ اُنھوں نے تمہیں خبر نہیں دی، کیونکہ وہ ڈرتے تھے کہ تم قبول نہ کرو، تو پھر جہنم میں داخل ہو جاؤ. تمہارے والد نے یہ امر مجھے بتایا، حالانکہ اگر میں قبول کرتا تو نجات پالیتا، اور اگر قبول نہ کرتا تو انہیں اس کی پروانہ تھی کہ میں جہنم میں چلا جاؤں۔ پھر میں نے زید سے کہا: فدا ہو جاؤں تم پر، کیا آپ برتر ہیں یا انبیاء؟ زید نے کہا: بلکہ انبیاء برتر ہیں۔ میں نے کہا: یعقوب (ع) نے اپنے بیٹے یوسف (ع) سے کہا: (یا بُنَيَّ لا تَقْصُصْ رُؤْياكَ عَلى إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْداً)[1] (اے میرے بیٹے! اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا، ورنہ وہ تیرے خلاف کوئی سازش کر بیٹھیں گے). یعقوب (ع) نے اپنے بیٹوں کو کیوں باخبر نہ کیا تاکہ وہ یوسف کے ساتھ مکر نہ کریں، بلکہ اس امر کو اُن سے چھپا لیا؟ تو تمہارے والد نے بھی اسی طرح امام باقر (ع) کی امامت کے امر کو تم سے پوشیدہ رکھا، کیونکہ وہ تم پر خوفزدہ تھے۔ زید نے کہا: اگر تُو یہ بات مجھ سے کہہ رہا ہے، تو خدا کی قسم، تمہارے صاحب (امام باقر ع) نے مدینہ میں مجھ سے کہا تھا کہ میں قتل کیا جاؤں گا اور کنّاسہ میں سولی پر لٹکایا جاؤں گا، اور اُن کے پاس ایک صحیفہ ہے جس میں میرا قتل اور سولی دیے جانے کی خبر لکھی ہوئی ہے۔ مؤمن الطاق کہتا ہے: پھر میں حج پر گیا اور امام صادق (ع) سے اپنی گفتگو جو میں نے زید سے کی تھی، بیان کی۔ حضرت (ع) نے فرمایا: (تُو نے ہر طرف سے اُس کا راستہ بند کر دیا اور اُس کے لیے کوئی راستہ باقی نہ چھوڑا).

ظہور مہدی (ع) سے پہلے کا زمانہ فترت

امام منتظِر ہے، نہ کہ منتظَر

یہی وہ حقیقت ہے جس کا تمام مؤمنین، جو محمد (ص) اور آلِ محمد (ص) کی روایات پر ایمان رکھتے ہیں، کسی نہ کسی شکل میں اقرار کرتے ہیں؛ اور کم از کم جب وہ یہ کہتے ہیں کہ امام، 313 مردوں کے تیار ہونے کا انتظار کر رہا ہے تاکہ قیام کرے، تو دراصل وہ اسی بات کا اقرار کر رہے ہوتے ہیں اور اس بیان کو قبول کر چکے ہوتے ہیں،

---

1. قرآن کریم، سورہ یوسف، آیت 5۔

چاہے اس سے پہلے اس بات کا مطلب نہ سمجھے ہوں۔ بلکہ ہر وہ شخص جو یہ کہتا ہے کہ کچھ افراد منجی کی نصرت کے لیے منتخب کیے گئے ہیں (جیسا کہ انجیل میں بھی آیا ہے)[1] وہ بھی اس حقیقت کا اقرار کرتا ہے.

نتیجتاً وہ بار بار کیا جانے والا سوال، ماضی و حال میں، اور غلط و انحرافی راستے کے تسلسل کو درست اور پاک ظاہر کرنے کی کوشش،[2] یہ کہہ کر کہ "پرانے لوگوں یا ہمارے گزرے ہوئے لوگ کا کیا حال اور کیا حکم تھا" یا "وہ

---

1. (پھر جب تم اُس ویرانگر زلزلے کو دیکھو جس کے بارے میں دانیال نبی نے کہا تھا کہ وہ مقامِ مقدس میں واقع ہوگا (16) تو اُس وقت یہودی پہاڑوں کی طرف بھاگ جائیں گے (17) اور جو شخص چھت پر ہوگا وہ نیچے نہ اُترے تاکہ اپنے گھر سے کچھ لے سکے (18) اور جو کھیت میں ہوگا وہ پیچھے نہ پلٹے تاکہ اپنا کپڑا لے سکے (19) اور اُن دنوں حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں پر افسوس (20) اور نماز پڑھو تاکہ تمہارا فرار سردیوں میں یا چھٹی (ہفتہ کے دن) نہ ہو (21) کیونکہ اُس وقت ایک بڑی تنگی ہوگی جیسی نہ تو آغازِ عالم سے اب تک ہوئی ہے اور نہ کبھی ہوگی (22) اور اگر وہ دن چھوٹے نہ ہوں تو کوئی جسم نجات نہ پائے گا، لیکن اُن برگزیدوں کی خاطر وہ دن کم کیے جائیں گے (23) اُس وقت اگر کوئی تم سے کہے کہ مسیح یہاں ہے یا وہاں ہے تو اُس کی تصدیق نہ کرنا (24) کیونکہ اُس وقت جھوٹے مسیح اور جھوٹے نبی اٹھ کھڑے ہوں گے اور بڑے بڑے نشان اور عجائبات دکھائیں گے تاکہ سب کو گمراہ کریں، اور اگر ممکن ہوتا تو ان برگزیدوں کو بھی گمراہ کر دیتے). (إنجیل متی، اصحاح 24)۔

(پھر جب تم وہ ویرانگر زلزلہ دیکھو جس کے بارے میں دانیال نبی نے کہا تھا کہ وہ ایسی جگہ پر واقع ہوگا جو شایستہ نہیں، تو اُس وقت یہود کو چاہیے کہ پہاڑوں کی طرف بھاگ جائیں (15) اور جو چھت پر ہے وہ اپنے گھر کی طرف نیچے نہ اُترے اور اپنے گھر سے کچھ نہ لے (16) اور جو کھیت میں ہے وہ پیچھے نہ پلٹے تاکہ اپنا کپڑا لے (17) اور افسوس ہے اُن دنوں کی حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں پر (18) اور نماز پڑھو تاکہ تمہارا فرار سردیوں میں نہ ہو (19) کیونکہ اُن دنوں ایک ایسی تنگی ہوگی جیسی کبھی بھی خدا کی تخلیق کے آغاز سے آج تک نہ ہوئی اور نہ ہوگی (20) اور اگر پروردگار اُن دنوں کو کم نہ کرے تو کوئی جسم نجات نہ پائے گا، لیکن اُن برگزیدوں کی خاطر جنہیں اللہ نے چُنا ہے وہ دن کم کرے گا (21) اُس وقت اگر کوئی تم سے کہے کہ مسیح یہاں ہے یا وہاں ہے تو اُس کی تصدیق نہ کرنا (22) کیونکہ بہت جلد جھوٹے مسیح اور جھوٹے نبی اٹھ کھڑے ہوں گے اور نشانیاں اور عجائبات دکھائیں گے تاکہ اگر ممکن ہو تو ان برگزیدوں کو بھی گمراہ کر دیں). (إنجیل مرقس، اصحاح 13)۔

2. حقیقت یہ ہے کہ آج غیر معصوم کی تقلید کے وجوب کے عقیدے کے پرچار کرنے والوں کا حال مصیبت بار ہے؛ پھر جب غیر معصوم کی تقلید کے وجوب کے اس مسلک کا علمی زوال ہوا، جسے وہ پھیلاتے اور لوگوں پر فرض کرتے تھے، اور جب اُنہوں نے جان لیا کہ یہ عقیدہ محض وہم ہے جس کی کوئی دلیل نہیں سوائے اُن کی خواہشِ نفس کے، تو انہوں نے شبہات سے چمٹنا شروع کر دیا۔ اور انہی شبہات میں سے ایک یہ ہے کہ اگر ہمارا مسلک غلط تھا تو پھر ماضی میں لوگوں کو کیا کرنا چاہیے تھا؟

لہٰذا خدا کی قسم وہ بدعت گزار ہیں اور بدعت کے پیروکار ہیں۔ اگر وہ ماضی میں اس عقیدے کے باطل ہونے کو نہیں جانتے تھے، تو آج حقِ دعوت مہدوی کی برکت سے سمجھ چکے ہیں کہ اُن کا عقیدہ محض ایک بدعت تھا۔ وہ غیر معصوم کی تقلید کے وجوب کو عقائد میں شمار کرتے ہیں، جیسا کہ شیخ محمد رضا مظفر نے اپنی کتاب «عقائد الإمامیة» میں صراحت کی ہے، جو اس وقت دینی مدرسے کی درسی اور رسمی کتاب ہے. دوسری طرف وہ کہتے ہیں کہ عقیدہ قطعی دلیل کا محتاج ہے؛ یعنی ایک واحد روایت، خواہ وہ صحیح السند ہی کیوں نہ ہو (ان کے مسلک کے مطابق)، کافی نہیں ہے اور اسی طرح قرآن کی غیر محکم اور غیر واضح الدلالہ آیت بھی عقیدہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں۔ بلکہ اگر وہ غیر معصوم کی تقلید کے وجوب کو عقائد میں بدعت شمار کرنے سے انکار بھی کریں، تب بھی یہ مسئلہ کم از کم اُن کے نزدیک ایک شرعی اصل ہے، اور شرعی اصول (جیسے نماز اور روزے کا وجوب) میں تقلید جائز نہیں، لہٰذا اس پر قطعی دلیل قائم کرنا لازم ہے اور محض گمان اور وہم اس شرعی اصل کو ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اس کے باوجود بھی وہ خالی ہاتھ آتے ہیں، کیونکہ اپنے دعوے کے اثبات کے لیے نہ کوئی محکم اور واضح الدلالہ آیت موجود ہے اور نہ ہی کوئی واحد مسند

روایت جو صحیح السند اور محکم المعنی ہو؛ حالانکہ اُن کے اپنے مسلک کے مطابق انہیں ایسی متعدد روایات کی ضرورت ہے جو تواتر یا قطعیت کا فائدہ دیں. وہ محض وہم و خیال پیش کرتے ہیں، اور اگر نرم روی اختیار کریں تو کہنا پڑے گا کہ بس ظن اور گمان ہی لاتے ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں؛ تو پھر اُن کے دعوے کی قطعیت کہاں ہے؟ اور یہ قطعیت اس عقیدے کے بارے میں وہ کہاں سے لائے ہیں کہ مستضعف اور عام لوگوں سے کہتے ہیں: عامی شخص کا عمل بغیر تقلید کے باطل ہے، اور اگر کوئی اُن کی تقلید نہ کرے تو اُس کے اعمال، نماز اور روزہ سب باطل ہو جائیں گے؟

اس کے علاوہ، بنیادی طور پر جو کچھ اہل بیت (ع) سے روایت ہوا ہے، وہ نہ صرف اُن کے باطل عقیدے کی تائید نہیں کرتا بلکہ صریح طور پر اُن کے وہم و خیال کے معارض ہے۔ مثال کے طور پر امام صادق (ع) نے فرمایا:

(إياكم والتقليد فإنه من قلد في دينه هلك، إن الله تعالى يقول:(اتَّخَذُوا أَحْبارَهُمْ وَ رُهْبانَهُمْ أَرْبابا مِنْ دُونِ اللهَّ). فلا و الله ما صلوا لهم و لا صاموا ولكنهم أحلوا لهم حراما وحرموا عليهم حلالاً، فقلدوهم في ذلك فعبدوهم وهم لا يشعرون) (تصحیح اعتقادات الامامیۃ، شیخ مفید، ص 73)

(تقلید سے بچو، کیونکہ جو اپنے دین میں تقلید کرتا ہے وہ ہلاکت میں پڑ جاتا ہے. اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے علما اور راہبوں کو اللہ کے بجائے رب بنا لیا". خدا کی قسم! انہوں نے اپنے علما کے لیے نہ نمازیں پڑھیں اور نہ روزے رکھے، بلکہ ان علما نے ان کے لیے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا، تو عوام نے بھی ان معاملات میں ان کی تقلید کی اور نتیجتاً وہ بنا سمجھے بوجھے، اُن کی پرستش کرنے لگے).

لیکن جو عقلی دلیل وہ وجوبِ تقلید کے اثبات کے لیے پیش کرتے ہیں، وہ اصل یہ ہے کہ جاہل کو عالم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ یہ عقلی اصل درست ہے، لیکن یہ غیر معصوم فقہا پر منطبق نہیں ہوتی، کیونکہ اصل بحث لفظ "عالم" میں ہے؛ یعنی عالم کون ہے؟ اور کیا یہ لفظ فقہا یا مراجع پر منطبق ہوتا ہے؟ جبکہ اُن کے اپنے اصطلاح کے مطابق مراجع اور فقہا صرف "گمان کرنے والے" ہیں، اور جو کچھ وہ لوگوں کو پیش کرتے ہیں وہ محض ظن، گمان اور اندازہ ہے۔ خود مراجع کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں وہ ظن ہے، علم نہیں، بلکہ احکامِ ظنی ہیں۔ تو کیا عقل یہ کہتی ہے کہ جاہل کو گمان کرنے والے کی طرف رجوع کرنا چاہیے؟

وہ عالم جس پر قاعدہ "جاہل کا عالم کی طرف رجوع کرنے کا وجوب" منطبق ہوتا ہے صرف حجتِ خدا ہے، وہی حجت جو علم اور یقین کی بنیاد پر فتویٰ دیتا ہے، نہ کہ ان فقہا کی طرح جو ظن و گمان پر اعتماد کرتے ہیں.

مصیبت یہ ہے کہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ مسکین اور مستضعف لوگوں کو بیمار کے ڈاکٹر کے پاس جانے کی مثال دے کر دھوکا دیں، اس حال میں کہ وہ خود کو غفلت میں ڈال لیتے ہیں کہ اس مثال میں مریض ایک ظانّ اور گمان کرنے والے طبیب کے پاس جاتا ہے، نہ کہ ایک عالم کے پاس۔ پھر طبیب یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ عالم ہے اور اپنی نسخے پر سو فیصد یقین رکھتا ہے؛ یعنی وہ اپنے حکم اور نسخے کے بارے میں سو فیصد موافقت کی ضمانت نہیں دیتا اور نتیجتاً یہ عقلی قاعدہ "جاہل کا عالم کی طرف رجوع کرنے کا وجوب" اس مثال پر منطبق نہیں ہوتا۔ لہٰذا تم پر لازم ہے کہ کہو: وہ عقلی قاعدہ جو تمہارے معاملے پر منطبق ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ "جاہل کا گمان کرنے والے کی طرف رجوع کرنا"؛ حالانکہ یہ نیا قاعدہ محض وہم ہے۔ تو پھر تم نے کہاں سے یہ دریافت کیا کہ لوگ دینِ خدای سبحان میں اہلِ ظن، حدس، گمان اور ظنون کی طرف رجوع کریں؟

یہ اس صورت میں ہے کہ اگر ہم اُن کے بارے میں نرم روی اختیار کریں اور کہیں کہ وہ شرعی مسائل میں صرف ظن رکھتے ہیں؛ لیکن اگر ہم اُن کے علمی اندوختہ اور دلائل پر باریک بینی سے مناقشہ کریں تو واضح ہوگا کہ وہ ظانّ بھی نہیں ہیں، بلکہ اپنی بہت سی فتاویٰ میں - جیسے مسئلہ مصنوعی تلقیح، کلوننگ، اور قطب و اس کے نزدیک علاقوں میں اوقاتِ نماز - محض متوہم ہیں اور بس۔ لیکن بعض جاہلوں کی یہ کوشش کہ غیر معصوم کی تقلید کے وجوب کو کسی دوسرے نظریے یعنی غیر معصوم کی تقلید کے جواز یا غیر معصوم سے حکمِ شرعی لینے کے ساتھ خلط ملط کریں، اور یہ کوشش کہ غیر معصوم کی تقلید کے جواز کو بھی غیر معصوم کی تقلید کے وجوب کے عین برابر شمار کریں، تو یہ محض ایک مغالطہ ہے جس کے ذریعے وہ بعض اوقات اپنے آپ کو بہانہ تراشی کے ساتھ مطمئن کرنا چاہتے ہیں، اور حقیقت میں یہ محض فرار اور گریز کی ایک کوشش ہے جو صرف اُن کی رسوائی

اقوام جو ہم سے پہلے رہ رہی ہیں، ان کا حال کیا ہے اور انہیں دین پر کس طرح عمل کرنا چاہیے تھا"، سب اسی مغالطے پر مبنی ہیں کہ وہ گمان کرتے ہیں کہ پچھلے لوگ کسی بھی تقصیر کے مرتکب نہیں تھے اور نتیجتاً وہ راستہ جس پر وہ تھے، سراسر حق اور مطلق حقیقت تھا، لیکن جیسا کہ بیان ہوا، یہ بات درست نہیں ہے. یہ مسئلہ جو روایات میں آیا ہے، یعنی یہ کہ فرج 313 مردوں کی تیاری پر موقوف ہے، اسی انتظارِ امام مہدی (ع) کو بیان کرتا ہے، یعنی یہ روایات بتاتی ہیں کہ قائم (ع) کے قیام سے پہلے کا فترت کا زمانہ وہ ہے جب 313 ایسے افراد موجود نہ ہوں جو مہدی (ع) کے استقبال کے لیے تیار ہوں،[1] یعنی اللہ کے خلیفہ کے لیے زمین میں کوئی قبول کرنے والا اور نہ ہی اُس کی اصلاحی رسالت کو سنبھالنے والا موجود ہے، اور اسی سبب غیبتِ کبریٰ واقع ہوئی ہے؛ اور جیسا کہ روایت میں بیان ہوا ہے، ان کی تقصیر کی وجہ سے خدا کی حجت ان سے لے لی گئی،[2] اور مہدیِ اوّل کا اس مادی دنیا میں آنا قابل کے تیار ہونے تک مؤخر کر دیا گیا.

یہ روایت واضح طور پر بیان کرتی ہے کہ غیبت کا زمانہ (اور امام مہدی ع کا رفع -اٹھالیا جانا-) زمانۂ فترت کے سوا کچھ نہیں؛ بالکل اسی فترت کے زمانے کی طرح جو رسولِ خدا محمد (ص) کی بعثت سے پہلے موجود تھا اور اس وقت عیسی (ع) اٹھا لیے گئے تھے؛ بلکہ یہ صراحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ وہ مہدی جو زمین کو عدل سے بھر دے گا، وہی مہدیِ اوّل (ع) ہے جو ائمہ (ع) کے ایک فترت کے بعد مبعوث ہوگا، کیونکہ امام مہدی محمد بن

اور نقصان میں اضافہ کرتی ہے، اور ہمارے پاس ایسا جواب ہے جو غیر معصوم کی تقلید کے جواز کے مسئلے کو بھی باطل کرنے کے لیے کافی ہے، لیکن فی الحال ہم وہ جواب پیش نہیں کرتے کیونکہ وہ فی الوقت اس کے قائل نہیں ہیں، بلکہ غیر معصوم کی تقلید کے وجوب کے قائل ہیں.

عام طور پر جب بھی وہ اس قول سے پیچھے ہٹ کر غیر معصوم کی تقلید کے جواز کے قائل ہو جائیں، تو اُس وقت ہم اُن کے ساتھ اُن کے اس نئے نظریے پر بحث کریں گے، بشرطیکہ وہ اس پر صراحت کریں، جیسے کہ انہوں نے اپنی پہلی بدعتی اور باطل رائے پر فقہی اور اعتقادی کتابوں میں صراحت کی تھی.

یہ بھی افسوس ناک ہے کہ کچھ ایسے لوگ ہیں جو اس بات کے درمیان فرق نہیں کرتے کہ غیر معصوم کی تقلید کا وجوب بدعت ہے اور اس بات کے درمیان کہ غیر معصوم کا فتویٰ دینا جائز ہے یا حرام؛ بلکہ وہ غیر معصوم کے اُس فتویٰ میں بھی فرق نہیں کرتے جو معصوم کے قول کے حوالہ سے دیا گیا ہو اور اُس فتویٰ میں جو اجماع اور عقل کے حوالہ سے دیا گیا ہو اور اس کے باوجود فقاہت کا دعویٰ کرتے ہیں اور دوسروں کو اپنی تقلید اور اطاعت کی طرف بلاتے ہیں۔

1. بعض ان روایات میں سے متعلقہ نمبر 4 میں آئیں گی۔

2. امام باقر (ع) نے فرمایا: (إِنَّ اللَّهَ إِذَا كَرِهَ لَنَا جِوَارَ قَوْمٍ نَزَعَنَا مِنْ بَيْنِ أَظْهُرِهِمْ)، (جب اللہ پسند نہیں کرتا کہ ہم کسی قوم کے پڑوسی ہوں تو وہ ہمیں اُن کے درمیان سے ہٹا دیتا ہے اور لے جاتا ہے) (علل الشرایع، ج 1، ص 244)۔

الحسن (ع) ائمہ (ع) کے ایک فترت کے بعد مبعوث نہیں ہوئے، بلکہ ان کی بعثت، بھیجنا اور اپنی رسالت کا اعلان براہِ راست اپنے والد امام حسن عسکری (ع) کی شہادت کے فوراً بعد ہوا تھا:

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَعْقُوبَ الْكُلَيْنِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى عَنْ أَحْمَدَ بْنِ إِدْرِيسَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ أَحْمَدَ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ الْقَاسِمِ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْوَلِيدِ الْخَزَّازِ عَنِ الْوَلِيدِ بْنِ عُقْبَةَ عَنِ الْحَارِثِ بْنِ زِيَادٍ عَنْ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِي حَمْزَةَ قَالَ: (دَخَلْتُ عَلَى أَبِي عَبْدِ اللَّهِ (ع) فَقُلْتُ لَهُ أَنْتَ صَاحِبُ هَذَا الأَمْرِ؟ فَقَالَ: لَا. فَقُلْتُ فَوَلَدُكَ؟ فَقَالَ: لَا. فَقُلْتُ فَوَلَدُ وَلَدِكَ؟ فَقَالَ: لَا. قُلْتُ فَوَلَدُ وَلَدِ وَلَدِكَ؟ قَالَ: لَا. قُلْتُ فَمَنْ هُوَ؟ قَالَ: الَّذِي يَمْلَأُهَا عَدْلًا كَمَا مُلِئَتْ ظُلْماً وَ جَوْراً لَعَلَى فَتْرَةٍ مِنَ الْأَئِمَّةِ يَأْتِي كَمَا أَنَّ النَّبِيَّ(ص) بُعِثَ عَلى فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ).[1]

ابو حمزہ کہتے ہیں: میں امام صادق (ع) کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "کیا آپ اس امر (یعنی قائم موعود) کے صاحب ہیں؟" فرمایا: "نہیں۔" عرض کیا: "کیا آپ کا بیٹا ہے؟" فرمایا: "نہیں۔" عرض کیا: "کیا آپ کے بیٹے کا بیٹا ہے؟" فرمایا: "نہیں۔" عرض کیا: "کیا آپ کے بیٹے کے بیٹے کا بیٹا ہے؟" فرمایا: "نہیں۔" عرض کیا: "تو پھر وہ کون ہے؟" فرمایا: (وہ جو زمین کو عدل سے بھر دے گا جیسے کہ وہ ظلم و ستم سے بھر گئی ہو، وہ ائمہ کے ایک فترت کے بعد آئے گا، جیسے نبی (ص) رسولوں کے ایک فترت کے بعد مبعوث ہوئے تھے۔ شد).

لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مہدی صرف وہی ہیں جو آخرالزمان میں پیدا ہوں گے اور امام مہدی محمد بن الحسن (ع) اور ان کی غیبت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کے بارے میں بھی وہی پچھلی علت صادق آتی ہے، یعنی ہم ان سے کہتے ہیں کہ مہدیِ موعود (ع) کی ولادت کو آخرالزمان تک مؤخر کرنے کی وجہ ماضی کے زمانوں میں قابل کا نہ ہونا ہے۔ اگر قابل موجود ہوتا تو خداوند اس مہدی کو اس سے پہلے اس مادی دنیا میں پیدا کرتا اور اسے بھیجتا تاکہ عدل و قسط کو پھیلائے اور رسولِ خدا (ص) کی سنت کو، جیسا کہ رسول اللہ (ص) نے بشارت دی تھی، دوبارہ زندہ کرے۔

---

1. غیبت نعمانی، ص186۔

بلکہ حتیٰ اگر مہدی (ع) کا فریضہ - باوجود اس کے کہ انہی اہلِ سنت کے نزدیک بھی مہدی (ع)، خدا کے خلیفہ ہیں[1] - صرف خلافتِ راشدہ قائم کرنا ہی مانا جائے، تب بھی وہی پچھلی علت جاری ہے، کیونکہ اہلِ سنت کے نزدیک خلافتِ راشدہ، علی (ع) یا حسن (ع) کی خلافت کے ساتھ، ایک ہزار سال سے بھی زیادہ پہلے ختم ہو چکی ہے۔ تو اگر یہ معاملہ، جیسا کہ میں نے بیان کیا، قابل سے متعلق نہ تھا، تو خدا کے خلیفہ مہدی (ع) کا ظہور اس قدر کیوں مؤخر ہوا ہے؟!

گزشتہ بیان سے ہم نے جان لیا:

ہم نے واضح طور پر سمجھ لیا کہ امام مہدی محمد بن الحسن (ع) کے رفع -اٹھا لیے جانے- اور مہدیِ اوّل یا یمانی (ع) کے آنے کے درمیان کا زمانہ فترت شمار ہوتا ہے، جیسے عیسی (ع) کے اٹھا لیے جانے اور محمد (ص)[2] کی بعثت کے درمیان کا زمانہ رسولوں کا فترت تھا، اور فترت کی علت، جیسا کہ میں نے بیان کیا، قابل کا نہ ہونا ہے، اور خداوند کی لوگوں پر رحمت کی شدت کے سبب، اس نے انہیں اپنے حکم اور فیصلے کے انتظار میں چھوڑ دیا تاکہ اس کی رحمت ان پر شامل ہو.

اسی طرح یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ غیبت کی علت بلکہ حتیٰ مہدیِ اوّل (ع) کی ولادت اور ان کی اس مادی دنیا میں تخلیق کے مؤخر ہونے اور تاخیر کی علت بھی روشن ہو گئی۔

---

1. سنن ابن ماجہ میں ثوبان سے روایت ہے کہ رسول اللہ (ص) نے فرمایا: (تمہارے خزانے کے قریب تین آدمی قتل کیے جائیں گے جو سب کے سب خلیفہ کے بیٹے ہوں گے، پھر خلافت اُن میں سے کسی ایک کو بھی نہیں ملے گی۔ اس کے بعد مشرق کی طرف سے سیاہ پرچم نکلیں گے؛ تو وہ تمہیں ایسے انداز سے قتل کریں گے جیسا کسی قوم نے کبھی نہیں کیا؛ ثوبان کہتے ہیں: پھر آپ (ص) نے کوئی بات فرمائی جو مجھے یاد نہیں رہی، اور پھر فرمایا: جب تم اُسے دیکھو تو اُس کے ساتھ بیعت کر لینا، کیونکہ وہ اللہ کا خلیفہ مہدی ہے).
کتاب المستدرک علی الصحیحین میں ثوبان کہتے ہیں: (جب تم سیاہ پرچموں کو دیکھو جو خراسان کی طرف سے نکل رہے ہوں، تو خواہ سینہ کے بل برف پر رینگتے ہوئے ہی جانا پڑے، ان کی طرف بڑھو، کیونکہ اُن کے درمیان اللہ کا خلیفہ مہدی ہے). حاکم کہتے ہیں: یہ حدیث شیخین (مسلم و بخاری) کے معیار کے مطابق صحیح ہے، لیکن انہوں نے اسے ذکر نہیں کیا!
کتاب مسند احمد بن حنبل میں بھی ثوبان، رسول اللہ (ص) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: (جب تم دیکھو کہ سیاہ پرچم خراسان کی طرف سے آ رہے ہیں تو ان کی طرف فوراً بڑھو، کیونکہ اُن میں اللہ کا خلیفہ مہدی ہے).
اسی طرح ابن حجر کی تصنیف کتاب «القول المسدّد» میں، عبد اللہ بن مسعود، نبی اکرم (ص) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: (جب سیاہ پرچم خراسان سے نمودار ہوں تو اُن کی طرف فوراً بڑھو، کیونکہ اُن میں اللہ کا خلیفہ مہدی ہے).

2. زمانۂ فترت میں بھی فترت کے حالات کے مطابق رسول موجود رہا ہے، یعنی رسول اللہ محمد (ص) سے پہلے ایک رسول جو تبلیغ کے لیے تیار تھا وہ اللہ کا بھیجا ہوا تھا، لیکن امام مہدی (ع) کی غیبت میں وہ تیار فرستادہ، امام مہدی (ع) کی طرف سے ہوتا ہے۔

اسی طرح جو کچھ ہم نے بیان کیا، اس میں اس شبہے کا جواب بھی آ گیا کہ غیبت یا حجت کا رفع -اٹھا لیا جانا- باوجود اس کے کہ لوگوں کو اس کی ضرورت ہے، عدل اور حکمتِ الٰہی کے خلاف ہے، جیسا کہ وہابیت یا سلفی لوگ دعویٰ کرتے ہیں.

اسی طرح پچھلی مباحث میں ان روایات کا مطلب بھی واضح ہو گیا جو کہتی ہیں کہ قائمؑ سے پہلے ہر پرچم، طاغوت کا پرچم ہے،[1] کیونکہ وہ پرچم ظہور سے پہلے کے زمانۂ فترت میں ہوتے ہیں اور نتیجتاً باطل کے کسی حصے کو لیے ہوتے ہیں، اگرچہ ان کے ساتھ حق کا کوئی حصہ بھی شامل ہو.

لہٰذا امام مہدی (ع) قابل کے نہ ہونے کی وجہ سے درحقیقت غائب (غیبت میں بھیجے گئے) اور چھوڑے گئے ہیں۔ امام باقر (ع) نے فرمایا: (إِنَّ اللَّهَ إِذَا كَرِهَ لَنَا جِوَارَ قَوْمٍ نَزَعَنَا مِنْ بَيْنِ أَظْهُرِهِمْ)[2] (جب خدا یہ پسند نہیں کرتا کہ ہم اہلِ بیت کسی قوم کے ہمسایہ اور پڑوسی ہوں، تو وہ ہمیں ان کے درمیان سے اٹھا لیتا ہے).

---

1. امام صادق (ع) نے فرمایا: (كل راية ترفع قبل قيام القائم (ع) فصاحبها طاغوت يعبد من دون الله عز و جل)، (ہر وہ پرچم جو قائم (ع) کے قیام سے پہلے بلند کیا جائے، اس کا علمبردار طاغوت ہے جس کی بندگی اللہ عزوجل کے بجائے کی جاتی ہے). (الکافی، ج 8 ص 295؛ وسائل الشیعۃ، الحر العاملی: ج 15 ص 52)۔

امام باقر (ع) نے فرمایا: (كل راية ترفع قبل راية القائم (ع) صاحبها طاغوت)، (ہر پرچم جو قائم (ع) کے پرچم سے پہلے بلند کیا جائے، اُس پرچم کا حامل طاغوت ہے). (الغیبۃ للنعمانی، ص 115؛ مستدرک الوسائل، ج 11 ص 34)۔

مالک بن اعین جہنی کہتے ہیں: میں نے امام باقر (ع) سے سنا کہ آپ نے فرمایا: (كل راية ترفع قبل قيام القائم (ع) صاحبها طاغوت)، (ہر پرچم جو قائم (ع) کے قیام سے پہلے بلند ہو یا نکلے، اُس کا صاحب طاغوت ہے). الغیبۃ للنعمانی، ص 115۔

مالک بن اعین جہنی کہتے ہیں: میں نے امام باقر (ع) سے سنا کہ آپ نے فرمایا: (كل راية ترفع أو تخرج قبل قيام القائم (ع) صاحبها طاغوت»، (ہر پرچم جو قائم (ع) کے قیام سے پہلے بلند کیا جائے یا نکلے، اُس کا صاحب طاغوت ہے). (الغیبۃ للنعمانی، ص 115)۔

امام سجاد (ع) نے فرمایا: «و الله لا يخرج واحد منا قبل خروج القائم صلوات الله وسلمه عليه إلاّ كان مثله مثل فرخ طار من وكره قبل أن يستوى جناحاه فأخذه الصبيان فعبثوا به»، (خدا کی قسم! ہم میں سے کوئی بھی قائم (ع) کے خروج سے پہلے خروج نہیں کرتا، مگر اس کی مثال اُس چڑیا کی طرح ہے جو اُڑنا سیکھنے سے پہلے گھونسلے سے باہر کود پڑے؛ تو بچے اُس کے ساتھ کھیلنے لگتے ہیں). (الکافی، ج 8 ص 264 ح 382؛ وسائل الشیعۃ، ج 15 ص 51)۔

امام باقر (ع) نے فرمایا: «مثل خروج القائم منا كخروج رسول الله (ص) و مثل من خرج منا أهل البيت قبل قيام القائم (ع) مثل فرخ طار و وقع من وكره فتلعب به الصبيان»، (ہمارے قائم (ع) کا خروج رسول اللہ (ص) کے خروج کی مانند ہے، اور جو کوئی ہم اہل بیت میں سے قائم (ع) کے قیام سے پہلے خروج کرے، اُس کی مثال اُس بچہ چڑیا کی سی ہے جو بلوغ اور اُڑنا سیکھنے سے پہلے اپنے گھونسلے سے باہر نکل پڑے اور نتیجتاً بچے اُس کے ساتھ کھیلنے لگیں). (الغیبۃ للنعمانی، ص 206؛ شرح الأخبار القاضی المغربی، ج 3 ص 56)۔

2. علل الشرایع، ج 1، ص 244۔

لہٰذا کوئی بھی غیبت کے زمانے یا قیام اور زمین پر عدل کے قیام سے پہلے قابل کے نہ ہونے کا انکار نہیں کر سکتا، کیونکہ روایات میں ظہور اور قیامِ قائم (ع) کے لیے جو کم از کم قابل ذکر ہوا ہے وہ یہی 313 افراد ہیں؛ لہٰذا فترتِ غیبت کے دوران قابل موجود نہیں رہا [1] اور امام مہدی (ع) غائب نہیں بلکہ غیبت میں بھیجے گئے تھے.

آیہ اکمال الدین

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَ مَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوذَةُ وَ الْمُتَرَدِّيَةُ وَ النَّطِيحَةُ وَ مَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَ أَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذَلِكُمْ فِسْقٌ الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ أَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ) [2]

(تم پر مردار (یعنی بغیر شرعی ذبح کے مرنے والا جانور) حرام کر دیا گیا ہے اور (بہایا ہوا) خون اور سؤر کا گوشت اور وہ (جانور) جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو اور گلا گھٹ کر مرا ہوا (جانور) اور (دھار دار آلے کے بغیر کسی چیز کی) ضرب سے مرا ہوا اور اوپر سے گر کر مرا ہوا اور (کسی جانور کے) سینگ مارنے سے مرا ہوا اور وہ (جانور) جسے درندے نے پھاڑ کھایا ہو سوائے اس کے جسے (مرنے سے پہلے) تم نے ذبح کر لیا، اور (وہ جانور بھی حرام ہے) جو باطل معبودوں کے تھانوں (یعنی بتوں کے لئے مخصوص کی گئی قربان گاہوں) پر ذبح کیا گیا ہو اور اسی طرح جانور کا گوشت پانسوں (یعنی فال کے تیروں) کے ذریعے تقسیم کرنا جو قسمت کا حال معلوم

---

1. یہی قابل (اہل) وہ لوگ ہیں جو مہدی (ع) کی رسالت کو قبول کریں گے، جو دینی، اعتقادی، شرعی، سماجی، سیاسی اور معاشی تصحیح واصلاح پر مشتمل ہے، جس رسالت کو مہدی (ع) اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اُن کے پچھلے قواعد اور اندوختہ کے مخالف ہے؛ اور یہ قبولیت اُن پر آسان اور خوشگوار نہیں ہوگی، کیونکہ یہ اصلاحات زمانۂ ظہور میں فاسد دینی ورثے اور مہدی (ع) کے ظہور کے وقت قائم تمام دینی مرجعیتوں کی مخالفت کے مترادف ہوں گی۔

یہ وہ قوم ہے جو یہ قبول کرے گی کہ وہ اُس متعفن جگہ سے نکل آئیں جو گندگی کی بُو سے بھری ہوئی ہے اور جسے سونگھنے کے وہ دوسرے لوگوں کی طرح عادی ہو چکے تھے، اور آزاد فضا میں آئیں تاکہ پاکیزہ خوشبو کو سونگھ سکیں، اور پھر جس ہوا کو وہ سونگھتے رہے تھے اُس کی انتہائے گندگی، تعفن اور نجاست کو تحقیق، تبیین اور تمیز کا موضوع بنائیں۔ یہ کام ایک ساتھ آسان بھی ہے اور بہت مشکل بھی؛ آسان اس لحاظ سے کہ انسان چند قدم چلے اور پاکیزہ ہوا میں سانس لے؛ اور مشکل اس لحاظ سے کہ وہ یہ اعتراف کرے کہ پہلے وہ ایک گندی، متعفن اور نجس بدبو سے بھری جگہ میں زندگی بسر کرتا رہا، بغیر اس کے کہ خود سمجھ پاتا، تاکہ اب وہ صحیح راستہ (پاکیزہ فضا) کو اختیار کرے۔

2. قرآن کریم، سورہ مائدہ، آیت 3۔

کرنے کے لیے ہوتے ہیں، یہ سب کام گناہ ہیں۔ آج کافر تمہارے دین سے مایوس ہو گئے ہیں، لہٰذا ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کیا ہے۔ پھر اگر کوئی بھوک کی شدت سے مجبور ہو جائے (کوئی حرج نہیں کہ وہ ممنوع گوشتوں میں سے کھالیں)، بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف جھکے، تو یقیناً اللہ بخشنے والا، نہایت مہربان ہے).

اس آیت کے مطابق جو چیز کامل ہوئی ہے، وہ دین ہے، اور دین ہی شریعت اور عقیدہ ہے؛ اور ان دونوں میں سے کسی کے بھی کامل نہ ہونے کا قائل ہونا، آیت کے ظاہر کے ساتھ تعارض رکھتا ہے، جس طرح ان دونوں میں سے کسی کے بھی کامل نہ ہونے کا مطلب درحقیقت اور ہر ایک اسلامی فرقے کی نگاہ میں یہ ہے کہ وہ فرقہ برحق نہیں ہے، کیونکہ ان کا حقیقی موقف قرآن کے ظاہرِ روشن کے مخالف ہے.

سلفی یا وہابی اور بالعموم اہلِ سنت ماضی و حال میں، معصوم سے نص کے بغیر، زندگی کے بہت سے نئے واقعات و حادثات میں، جنہیں حکمِ تعبدی (ایسا شرعی حکم جس کی بنیاد محض عبادت اور اطاعت پر ہو، نہ کہ عقل یا ظاہری علت پر) کی ضرورت ہوتی ہے، خود سے شرعی حکم جاری کرتے ہیں، جیسے قطب کے قریب علاقوں میں نماز۔ بالآخر ان کے احوال کی حقیقت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان کے نزدیک دین کامل نہیں ہے اور اسی سبب وہ مجبور ہوئے کہ نص کے نہ ہونے پر اپنی آراء و نظریات کے مطابق تشریع کریں، جیسے کہ وہ اپنے عقیدے میں بھی آپس میں بہت اختلاف رکھتے ہیں؛ مثلاً سلفی یا وہابی خداوند کے لیے حقیقی دو آنکھوں، دو ہاتھوں اور انگلی کے وجود کے قائل ہیں، اور اشاعرہ، جیسے ازہر کے اشاعرہ، اس کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ مانتے ہیں کہ سلفی یا وہابیوں کے اعتقادات باطل ہیں.

لیکن آلِ محمد (ع) کے نزدیک دین خلیفۂ الٰہی کی تقرری کے ساتھ کامل ہوتا ہے؛ چونکہ رسولِ خدا (ص) خدا کے حکم سے درست عقیدہ بیان کرنے اور تشریع کے مکلّف تھے، نتیجتاً اس عقیدے اور آیتِ اِکمالِ دین کے ظاہر کے درمیان کوئی شکاف اور تضاد نظر نہیں آتا.

لہٰذا دین، خدا کی طرف سے ناطق یا رسول اللہ (ص) کے بعد خدا کے خلیفہ کی تقرری کے ساتھ کامل ہوتا ہے، اور اس وسیلے سے دین عقیدے اور تشریع کے لحاظ سے کامل ہو جاتا ہے، اور ایسے دین میں کوئی خلا نہیں پایا

جاتا کہ غیر معصوم فقہا اپنی آراء اور خواہشات سے اسے مکمل کریں؛ بالکل اسی طرح جیسے اہلِ سنت کی اعتقادی حالت آیت کے ظاہر کے ساتھ تعارض رکھتی ہے.

لیکن معصوم کی غیبت کے مسئلے کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ : غیبتِ معصوم کا مطلب ہے اسے غائب کر دینا، اور وہ بھی امام مہدی (ع) کے حوالے سے قابل کے نہ ہونے کی وجہ سے؛ اور الٰہی منصوبہ ویسا ہی ہے جیسا کہ ہے، نہ ویسا جیسا کہ انتظار کرنے والے نظریہ پرداز اسے فرض کرتے ہیں اور اپنے خیال میں پروان چڑھاتے ہیں؛ اور نتیجتاً اس عقیدے اور آیتِ اِکمالِ دین کے ظاہر کے درمیان کوئی تعارض موجود نہیں ہے.

ہاں، دین کی تکمیل والی آیت کے ساتھ تعارض ان لوگوں کے نزدیک ہے جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ معصوم غائب ہو گیا ہے اور تشریع کو چھوڑ دیا ہے تاکہ غیر معصوم فقہا آگے بڑھیں اور اپنی آراء سے دینِ الٰہی اور زمانے کے حوادث و واقعات میں شرعی حکم جاری کریں، پھر مشکلات کو دوچندان کر کے غیر معصوم کی تقلید کے وجوب اور معصوم کی نیابت کے عقیدے کو مؤمنوں پر مسلط کریں.

درحقیقت آیتِ اکمالِ دین کے ظاہر کے ساتھ تعارض سے بچنے کی کوئی راہ نہیں ہے، سوائے اس کے جس کے ہم قائل اور معتقد ہیں کہ دین رسول اللہ (ص) کے بعد اللہ کے خلفاء کی تنصیب کے ذریعے کامل ہوا، اور اُن کے ذریعے جو تشریع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی طرف سے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ اور یہ کہ امام نے قابل کے نہ ہونے کی وجہ سے غیبت اختیار کی، اور یہ کہ امام مہدیِ اوّل (ع) کے ظہور سے پہلے کا زمانہ، جس کا ذکر وصیتِ رسول اللہ (ص) میں آیا ہے، وہی زمانہ ہے جس میں لوگوں کو خدا کے حکم پر ٹھہرا دیا گیا ہے اور ثواب پانے کے مستحق نہیں ہیں، بلکہ خدا کی رحمت کے سبب اجر پاتے ہیں.

لہٰذا آیتِ اِکمالِ دین یہ ثابت کرتی ہے کہ ہر وہ راستہ اور طرزِ فکر باطل ہے، جیسے سنی یا سلفی و وہابی طرزِ فکر جو اس کے قائل ہیں کہ زمانہ خدا کے خلیفہ سے خالی رہ سکتا ہے؛ اور اسی طرح یہ ثابت کرتی ہے کہ ہر وہ راستہ اور طرزِ فکر بھی باطل ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ معصوم کی غیبت امت کی کوتاہی اور تقصیر اور قابل کے نہ ہونے کے بغیر ہے۔ لہٰذا یہ آیت ان طریقوں کے ساتھ بُنیادی طور پر تعارض رکھتی ہے.

حقیقت میں، ان کے نزدیک اور ان کی عملی حقیقت کے مطابق، دین خدا کے اس خلیفہ کی تقرری کے ساتھ جو خدا کی طرف سے منتخب کیا جاتا ہے یا ان افراد جیسے سفیروں کے ساتھ جو لوگوں سے رابطے کے لیے چنے جاتے ہیں، کامل نہیں ہوا ہے؛ بلکہ ان کے نزدیک دین کو مکمل کرنے والے وہ غیر معصوم فقہا ہیں جو کسی زمانے میں اپنی

مرضی اور اندھاپن سے، ظن و گمان کے ساتھ تشریع میں لگ جاتے ہیں اور ایسے احکام پیش کرتے ہیں جن کے بارے میں وہ خود ہی اس بات کے قائل ہوتے ہیں کہ یہ اللہ کے حقیقی احکام کے مطابق نہیں ہیں.

اور باآخر، وہ نادانستہ اقرار کر لیتے ہیں کہ ان کے نزدیک دین اور ان کے عقائد کے مطابق دین ناقص رہا ہے اور کامل نہیں ہوا۔ اور نتیجتاً وہ خود ہی، بے سمجھے، اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ان کے اعتقادی نظریات آیتِ اِکمالِ دین کے ساتھ تعارض رکھتے ہیں.

یہاں ایک نہایت اہم نکتہ پر توجہ دینی چاہیے اور وہ یہ کہ دونوں راستے اور طریقے قصور کو خدا اور اس کے خلیفہ یا امامِ معصوم کی طرف منسوب کرتے ہیں، کیونکہ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالی نے دین کو ان کے سپرد کر دیا ہے تاکہ وہ ہر اس واقعے میں جس کی انہیں ضرورت اور احتیاج ہو، شرعی احکام جاری کریں؛ پھر بجائے اس کے کہ وہ اپنے قصور کا اقرار کریں - کیونکہ وہ خدا کے خلیفہ یا (ان کے نائب) کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں - انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ خداوند متعال نے دین کو غیر معصوم اور معصوم کی طرف سے غیر مقرر افراد کے سپرد کر دیا ہے تاکہ وہ ہر ایک اپنی رائے اور نظر سے، بغیر کسی شرعی حکم کے، تشریع کریں.

یہ امر درحقیقت الٰہی حکمت پر کھلا طعن ہے؛ اس کے علاوہ، جیسا کہ بیان ہوا، خداوند سبحان کے اس فرمان کے بھی خلاف ہے کہ دین کامل ہو چکا ہے۔

لہٰذا، اس مختصر بحث میں ہم اس نتیجے تک پہنچے کہ:

اس دوران ایک ایسا راستہ اور طریقہ موجود ہے جو زمین کے حجتِ الٰہی سے خالی ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے؛ جیسے سنی یا سلفی طریقہ، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، یہ راستہ اور طریقہ نصِ قرآنی کے ظاہر اور خصوصاً آیتِ اِکمالِ دین کے ساتھ تعارض رکھتا ہے.

لیکن دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس بات کو تو مانتا ہے کہ زمانہ حجّت سے خالی نہیں ہوتا، لیکن یہ کہتا ہے کہ قابل (یعنی جس میں قبول کرنے کی صلاحیت ہو) کے موجود ہونے کے باوجود بھی حجّت غائب ہو سکتی ہے؛ بغیر اس کے کہ کسی کو مقرر اور معین کرے جو بعینہٖ اس کی جگہ ہو اور یہ نائب خدا کے حقیقی حکم کو لوگوں تک پہنچائے؛ اور نتیجتاً اس کمی کو ایسے فقہا پورا کرتے ہیں جو خدا کے حجت کی طرف سے مقرر نہیں کیے گئے بلکہ خود ہی آگے بڑھے ہیں، اور اس طریقے کا آیتِ اِکمالِ دین کے ساتھ تعارض بالکل واضح ہے؛ اور ان کے حالات کی حقیقت کے مطابق، خدا نے دین کو کامل نہیں کیا. اسی وجہ سے ان کے نزدیک حل یہ ہے کہ فقہا ناحق طور پر،

جن کے بارے میں کوئی نصِ صریح موجود نہیں ہے، اس کمی کو پُر کرنے کے لیے ایسے احکام اور فتوے دینے کے لیے آگے بڑھیں جن کا خدا کے حقیقی حکم سے کوئی تعلق نہیں؛ اور حقیقت میں یہ طریقہ پچھلے طریقے (سلفیوں کے طریقے) سے زیادہ مختلف نہیں ہے، اور دونوں ہی آیتِ اِکمالِ دین کے ساتھ تعارض رکھتے ہیں.

لیکن تیسرا طریقہ، جو ہم نے پیش کیا ہے، یہ ہے کہ زمانہ حجتِ الٰہی سے خالی نہیں ہوتا اور یہ درست نہیں کہ حجت اس طرح غائب ہو جائے کہ کسی فرد کو نیابت کے لیے مقرر نہ کرے؛ اور جب وہ کسی فرد کو علناً (کھلے عام) مقرر کیے بغیر غائب ہو جائے، تو اس حال میں ساری امت قصوروار ہو گی اور حق سے منحرف ہو چکی ہو گی، اور ایسا کوئی فرد موجود نہ ہو گا جو صحیح الٰہی طریق کو قبول کرنے کی قابلیت رکھتا ہو۔ اس حال میں کسی فرستادہ یا نائب کے تعین کے ذریعے حجت قائم ہو جاتی ہے، لیکن قابل کے نہ ہونے کی وجہ سے اس سے یہ مطالبہ نہیں کیا جاتا کہ وہ لوگوں کو مطلع کرے اور ان سے رابطہ قائم کرے.

اس حالت میں، امت خدا کے خلفا پر ایمان رکھنے والی، زمانۂ فترت میں ہو گی:

(يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَى فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ أَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ) [1]

(اے اہلِ کتاب! بے شک ہمارا رسول رسولوں کی فترت اور خلا کے زمانے کے بعد تمہاری طرف آیا ہے جو تمہیں واضح طور پر سمجھاتے ہیں، تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس نہ کوئی خوشخبری دینے والا آیا اور نہ ڈرانے والا۔ یقیناً تمہارے پاس خوشخبری دینے والا بھی آ گیا اور ڈرانے والا بھی، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے).

فترت کے زمانے میں لوگوں کی حالت اس طرح ہوتی ہے کہ وہ خدا کے حکم اور فیصلے پر رکا ہوا اور منتظر ہوتے ہیں:

(وَآخَرُونَ مُرْجَوْنَ لِأَمْرِ اللَّهِ إِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَإِمَّا يَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ) [2]

(اور کچھ دوسرے ہیں جن کا معاملہ اللہ کے حکم پر چھوڑ دیا گیا ہے، وہ چاہے تو انہیں عذاب دے اور چاہے تو ان کی توبہ قبول کرے، اور اللہ سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے).

---

1. قرآن کریم، سورہ مائدہ، آیت 19۔
2. قرآن کریم، سورہ توبہ، آیت 16۔

احناف کی حالت کی طرح [1] رسول اللہ محمد (ص) کی بعثت سے پہلے اور شیعوں کی حالت، مہدیِ اوّل (ع) کی بعثت سے پہلے کی، جس کا ذکر وصیتِ رسول اللہ (ص) میں آیا ہے۔

کتاب غیبتِ نعمانی میں روایت ہوا ہے:

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَعْقُوبَ الْكُلَيْنِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى عَنْ أَحْمَدَ بْنِ إِدْرِيسَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ أَحْمَدَ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ الْقَاسِمِ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْوَلِيدِ الْخَزَّازِ عَنِ الْوَلِيدِ بْنِ عُقْبَةَ عَنِ الْحَارِثِ بْنِ زِيَادٍ عَنْ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِي حَمْزَةَ قَالَ: (دَخَلْتُ عَلَى أَبِي عَبْدِ اللَّهِ(ع) فَقُلْتُ لَهُ أَنْتَ صَاحِبُ هَذَا الأَمْرِ؟ فَقَالَ لَا. فَقُلْتُ فَوَلَدُكَ؟ فَقَالَ لَا. فَقُلْتُ فَوَلَدُ وَلَدِكَ؟ فَقَالَ لَا. قُلْتُ فَوَلَدُ وَلَدِ وَلَدِكَ؟ قَالَ لَا. قُلْتُ فَمَنْ هُوَ؟ قَالَ الَّذِي يَمْلَأُهَا عَدْلًا كَمَا مُلِئَتْ ظُلْماً وَ جَوْراً لَعَلَى فَتْرَةٍ مِنَ الْأَئِمَّةِ يَأْتِي كَمَا أَنَّ النَّبِيَّ(ص) بُعِثَ عَلى فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ)[2]

ابو حمزہ کہتا ہے: (میں امام صادق ع کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے پوچھا: کیا آپ اس امر کے صاحب ہیں؟ فرمایا: نہیں۔ عرض کیا: کیا آپ کے فرزند ہیں؟ فرمایا: نہیں۔ عرض کیا: کیا آپ کے پوتے ہیں؟ فرمایا: نہیں۔ عرض کیا: کیا آپ کے پوتے کے بیٹے ہیں؟ فرمایا: نہیں۔ عرض کیا: تو پھر وہ کون ہے؟ فرمایا: وہ جو زمین کو عدل سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و ستم سے بھر گئی ہو گی، ائمہ کے ایک فاصلہ (فترت) کے بعد آئے گا، جیسے رسول اللہ (ص) رسولوں کی فترت کے بعد مبعوث ہوئے).

خلاصہ: کوئی ایسا طریقہ موجود نہیں ہے جو بارگاہِ الٰہی کو تقصیر اور کوتاہی سے منزہ رکھے اور ساتھ ہی آیتِ اکمالِ دین کے مطابق ہو اور اس سے متعارض نہ ہو، سوائے اس طریقے کے جسے ہم نے بیان کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ زمانہ خالی نہیں ہو گا:

ایک ظاہر حجت سے جو براہِ راست لوگوں سے رابطہ رکھتا ہو، یا اگر کوئی رکاوٹ ہو تو سفیروں کے ذریعے ان سے رابطہ کرے؛ یا ایک غائب حجت سے جو لوگوں سے رابطہ نہیں رکھتا، اور ایسی صورت میں زمانہ، اُن افراد کے

---

1. [احناف دراصل "حنیف" کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت ابراہیم (ع) کی قوم اور دینِ حنیف کے پیروکار تھے۔ احناف زیادہ تر حجاز میں مقیم تھے اور ان کے دین کی بنیاد توحید اور خلیفۂ خدا کی اطاعت تھی۔ لیکن افسوس کہ رفتہ رفتہ انہوں نے ابراہیمی دینِ حنیف کو بگاڑ دیا اور کعبہ، جو یکتاپرستی کا مرکز تھا، کو بت خانہ بنا دیا۔ حالانکہ وہ اب بھی ابراہیمی اصل سنتوں اور شریعتوں جیسے حج، نماز، قربانی اور حرمت والے مہینوں وغیرہ کو مانتے تھے، لیکن دین کی اصل بنیاد، یعنی خلیفۂ خدا کی اطاعت اور توحید کو بالکل مسخ کر ڈالا.] (مترجم)۔

2. غیبت نعمانی، ص 186۔

نہ ہونے کی وجہ سے جو اس کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، زمانۂ فترت ہوگا، اور اس معاملے میں مؤمنین قصور وار ہوں گے اور ان کا معاملہ اللہ کے حکم اور فیصلے کے حوالے ہوگا.

زمین پر خدا کا خلیفہ کیسے جانا جاتا ہے؟

جیسا کہ کہا گیا، استخلاف یقینی امر ہے کیونکہ اسے چھوڑنا حکمت و عقل کے خلاف اور رحمت کے خلاف ہے اور چونکہ مخلوقات میں انسان کامل ترین قسم ہے اس لیے خلیفہ کا انتخاب یقینی طور پر اسی قسم کے انسانوں میں سے ہوگا۔

خدا نے جانشین یا مستخلِف کے تعین کرنے والے کے طور پر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان استخلاف کے قانون کا حصہ ہے اور اس کی تخلیق اس طرح کی گئی ہے کہ وہ خدا کا خلیفہ بن سکے:

(وَ إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً)[1]

(اور آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں)۔

روایت میں یہ بھی ہے:

(اللَّه خَلَقَ آدَمَ عَلى صُورَتِهِ) [2] (خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا)۔

تورات یا عہد نامہ قدیم میں یہ کہا گیا ہے:

(اور خدا نے فرمایا: ہم انسان کو اپنی صورت اور مشابہت پر پیدا کرتے ہیں)۔ [3]

(چنانچہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا۔ خُدا کی صورت میں اُسے پیدا کیا)۔[4]

لہٰذا ایسی تعریف کے ساتھ یہ بات یقینی ہے کہ خدا کسی بھی وقت کسی انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ منتخب کرتا ہے، بلکہ جب خلیفہ کو غیر حاضر (غیبت میں) رہنے پر مجبور کیا جائے تو بھی اسی وجہ سے اس کا جانشین کوئی نہ کوئی ضرور ہو۔ لہٰذا ہم نے یہاں تمام مخلوقات میں سے خلیفہ کی شناخت کی ہے اور اس کی قسم کا تعین کیا ہے اور یہ کہ وہ انسان ہے۔ کیونکہ انسان کو لاہوت (خدا) کی صورت پر بنایا گیا تھا۔

---

1. قرآن کریم، سورہ بقرہ، آیت 30۔
2. الکافی، ج1، ص134؛ التوحید (صدوق)، ص103۔
3. تورات، سفر پیدایش، اصحاح 1۔
4. تورات، سفر پیدایش، اصحاح 1۔

باقی رہ گیا باہر کی دنیا میں ایسے شخص کی شناخت کرنا، یہاں ہمیں ایک ایسے قانون کی ضرورت ہے جس کی مدد سے ہم ہمیشہ خلیفہ کو دوسروں سے ممتاز کر سکیں۔ بصورت دیگر استخلاف کا مقصد، جو لوگوں کی رہنمائی اور انہیں خدا اور اس کے اوامر و نواہی اور مشیت سے متعارف کرانا ہے، پامال ہو جائے گا۔ اور نتیجے کے طور پر، ہمیں ایک ایسے قانون کی ضرورت ہے جو حجت خدا کو ہمارے سامنے متعارف کرائے اور یہ قانون خلیفہ منصوب ہونے کے پہلے دن سے قیامت تک اور اس دنیا میں امتحان کے خاتمے تک مسلسل لاگو ہونا چاہیے، کیونکہ لوگ ہمیشہ خدا کے خلفاء کو منصوب ہونے کے دوران اور ان کے منصوب ہونے کے بعد ماننے کے پابند ہیں اور وہ ان سے حق اور درست عقیدے اور ان کی ثقافت، آثار اور کلمات کو جاننے اور ان کی دعوت کے مواد پر عمل کرنے کے ذمہ دار ہیں، جب تک اگلے رسول کی دعوت سے اسے منسوخ نہ کیا جائے۔

تو کم از کم اس قاعدے کو ایک مدت تک مسلسل جاری رہنا چاہیے جب تک کہ رسالت کا فائدہ جس کے ساتھ رسول بھیجا گیا ہے ختم نہ ہو جائے۔ مثال کے طور پر حضرت محمد (ص) کے بارے میں یہ قانون آج بھی جاری ہے۔

معرفت حجت کا قانون اور اس کے تین ستون

وہ قانون جو عقل اور حکمت کے مطابق ہو وہ تمام تر وہی تین ستون ہیں جن کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ جو زمین پر خدا کے خلیفہ کی تنصیب کے ثبوت کے لیے حتمی اور یقینی ہے۔ اور یہ حکیم اور رحیم مطلق سے جاری ہونا ضروری ہے اور وہ تین ستون یہ ہیں:

خلیفہ کی تنصیب، اس کا اعلم ہونا، اور مکلفین کو اس کی اطاعت کا حکم کرنا؛ لیکن یہاں ہم ان تینوں نکات کو دوسرے مرحلے میں بیان کرتے ہیں جو خلیفہ اور مکلفین کے درمیان تعلق کا مرحلہ ہے اور یہ تین ستون کیسے مکلفین پر استدلال کے مقام میں خلیفہ کی دلیل ہو گی۔[1]

---

1. اگر آپ اس مسئلے کو اس طرح تصور کریں کہ: مستخلِف (خدا) اور پھر خلیفہ (حجت خدا) اور پھر مکلفین (خدا کے بندے) یکے بعد دیگرے ترتیب سے ہیں، تو ہمارے پچھلے کلام، استخلاف کے حتمی ہونے کے ثبوت کے بارے میں، مستخلِف (خدا) اور خدا کے خلیفہ کی تعلق سے مربوط تھا۔ لیکن یہاں ہمارے کلام خلیفہ اور مکلفین کے درمیان تعلق سے ہے۔

پہلا: نص

نص کے ذریعہ خدا کے خلیفہ کی تنصیب کو ثابت کرنا ممکن ہے؛ اور جیسا کہ ہم نے ہمیشہ زمین پر خدا کے خلفاء کی تنصیب کو نص کے ذریعہ پایا ہے، یہ ثابت ہوا ہے کہ خدا کے خلفاء کی زمین پر تنصیب میں خدا کا مقررہ الٰہی قانون اور مستقل سنت وہی نص ہے جو خدا کی طرف سے ہے یا سابقہ خلیفہ براہ راست شکل میں یا یہ بالواسطہ ہے اور خدا کی سنت نہیں بدلتی۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا:

(سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُسُلِنَا وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا)[1]

(یہ آپ سے پہلے بھیجے جانے والے رسولوں میں ہمارا طریقہ کار رہا ہے اور آپ ہمارے طریقہ کار میں کوئی تغیر نہ پائیں گے!)۔

(اسْتِكْبَارًا فِي الْأَرْضِ وَ مَكْرَ السَّيِّئِ وَ لَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَحْوِيلًا) [2]

(یہ زمین میں استکبار اور بڑی چالوں کا نتیجہ ہے حالانکہ بڑی چالیں چالباز ہی کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہیں تو کیا وہ اس روایت کا انتظار کر رہے ہیں جو ہم نے گزشتہ لوگوں کے بارے میں کی تھی؟ اور خدا کا طریقہ کار بھی نہ بدلنے والا ہے اور نہ اس میں کسی طرح کا تغیر ہو سکتا ہے)۔

(سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلا) [3]

(یہ خدائی سنت ان لوگوں کے بارے میں رہ چکی ہے جو گزر چکے ہیں اور خدائی سنت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے)۔

(سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا) [4]

(یہ خدائی سنت ان لوگوں کے بارے میں رہ چکی ہے جو گزر چکے ہیں اور خدائی سنت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے)۔

مسئلہ اللہ سبحان و تعالیٰ سے اور براہ راست شکل میں، پہلا حجت - آدم (ع) - پر نص سے شروع ہوا ہے؛ کیونکہ یہ پہلا حجت تھے؛ پھر مسئلہ کو اگلے حجت پر پچھلے حجت سے نص میں تبدیل کر دیا گیا ہے؛ چاہے براہ راست ہو یا بالواسطہ؛ کیونکہ ایک حجت موجود ہے جو اس کے بعد آنے والے شخص کے لیے اس کے نص اور وصیت کے

---

1. قرآن کریم، سورہ اسراء، آیت 77۔
2. قرآن کریم، سورہ فاطر، آیت 43۔
3. قرآن کریم، سورہ احزاب، آیت 62۔
4. قرآن کریم، سورہ فتح، آیت 23۔

ساتھ اس کی پہچان کا واضح دلیل ہے۔ پہلا مسئلہ، کہ خدا کی طرف سے حجت پر نص، باقی ہے اور ختم نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ خلیفہ خدا کی پہچان کی دلیل کے طور پر یہ پچھلے خلیفہ کی نص کے ساتھ باقی ہے۔

اور الٰہی نص کا لازمی طور پر سابق خلیفہ کے نص سے متفق ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا جو شخص سابق خلیفہ کی نص کے خلاف یا اس کے بغیر خدا کی طرف سے کسی نص یا خدائی گواہی کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے۔ سابق خلیفہ کی نص عام لوگوں کے لیے ملکوت میں خدا کی گواہی سے زیادہ واضح اور روشن ہے، کیونکہ وہ خدا کے ملکوت سے غافل ہیں اور مادّہ کی دنیا میں غرق ہو کر اس سے عادی ہو گئے ہیں، اس لیے وہ ایک ایسی نص کا مطالبہ کرتے ہیں جو انھیں ان کی اپنی دنیا سے پہنچے نہ کہ ملکوت کی دنیا سے، جس سے وہ لاعلم اور غافل ہیں۔

نص براہ راست خدا سبحان کی طرف سے وحی کے ذریعے ہے، جس طرح خدا نے آدم (ع) کی خلافت کو فرشتوں پر وحی کی اور وحی کا طریقہ تمام لوگوں کے لیے دستیاب ہے، اور جو سب لوگ سن سکتے ہیں وہ رویا ہے؛ لیکن سابق خلیفہ کی نص، وصیت کے ذریعے ہوتی ہے، خواہ وہ براہ راست یا بالواسطہ ان پر لکھی گئی ہو۔ ہم جلد ہی نص کے تین طریقوں کے بارے میں بتائیں گے اور تفصیل کی ضرورت ہو تو ہم اس کے بارے میں بحث کریں گے۔

1. خدا سبحان کی طرف سے نص

اس قسم کی نص بہت اہم ہے اور خلافت کا ثبوت ہے، کیونکہ یہ براہ راست خدا کی طرف سے ہے اور ہر وقت موجود ہے[1] اور یہ تمام لوگوں کے لیے[2] قابل حصول ہے۔

یہ ممکن نہیں ہے کہ براہ راست الٰہی نص , خلیفہ کے نص سے متصادم ہو اگر یہ موجود ہو، کیونکہ دونوں نصوص الٰہی ہیں[3] جن خوابوں (خدائی نصوص) سے دلیل لا سکتے ہیں وہ متواتر خواب ہیں جن کے دیکھنے کا دعویٰ کرنے والے کو جھٹلایا نہیں جا سکتا، اور سابق خلیفہ سے براہ راست موصول ہونے والے الٰہی نص سے یا خلیفہ کی طرف سے بالواسطہ تشخیصی نص سے اتفاق کریں، جسے "گمراہ ہونے سے روکنے" کے طور پر وصف کیا گیا ہے۔

عقلی نقطہ نظر سے: اس قسم کی وجہ حکمت اور رحمت کے حق میں ہے۔ اس لیے حکیم و رحیم اسے نہیں چھوڑتا۔[4] جب ہم نے اللہ تعالیٰ کے وجود کو ثابت کیا اور ثابت کیا کہ وہ مطلق حکیم اور رحیم ہے اور اس کے

---

1. خلیفہ یا رسول کی منصوب ہونے کے پہلے لمحے سے لے کر اس کی زندگی کے آخری لمحے تک، بلکہ یہ نص اور یہ ثبوت خلیفہ کی وفات کے بعد بھی ہر اس شخص کے لیے موجود ہے جو اس معرفت کا طالب ہے۔

2. کیونکہ خدا کی گواہی اور اس کے خلفاء کو خواب کے ذریعے لوگوں کے لیے الٰہی نص دینے کے لیے ایک خاص مذہبی حمایت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا جو کوئی بھی خدا کے وجود پر یقین رکھتا ہے، چاہے وہ یہودی ہو یا عیسائی یا مسلمان یا بدھ مت یا ہندو یا کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو جو مادّی دنیا سے باہر سچائی کے وجود پر یقین رکھتا ہو یہ دلیل موجود ہے، جبکہ یہ ملکوتی وجہ ملحدوں کے لیے بھی موجود ہے، لیکن خدا کی اپنے خلفاء کی گواہی کے ایک مقدمہ کے طور پر؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ ملحد شخص کے لیے اپنے حق اور وجود کی گواہی دیتا ہے کہ وہ پہلے اس پر اپنا وجود ثابت کرے۔

3. لہٰذا جو شخص آسمانی نص کا دعویٰ کرتا ہے (رویا اور مکاشفہ کے ذریعے) جو خدا کے سابق خلیفہ کی نص کے خلاف ہے، جھوٹ بول رہا ہے اور اس کے دعوے کو جانچنے کی ضرورت نہیں۔ جھوٹوں کے اس گروہ کی طرح زمین پر خدا کے خلیفہ کی دعوت کے خلاف جھوٹے خواب جمع کرنے والے بھی ہیں اور خلافت الٰہی کے جھوٹے اور باطل دعویدار بھی۔ تو دونوں گروہ جھوٹ بول سکتے ہیں اور جھوٹے خواب جمع کر سکتے ہیں یا اپنے دل میں یہ وہم پیدا کریں کہ انہوں نے اپنی خواہش کے مطابق خواب دیکھا ہے، لیکن یہ وہم اپنے ساتھ اس کے جھوٹ کی وجہ بھی رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ خدا کے سابق خلیفہ کی نص کے خلاف ہے۔

4. مطلق کا معنی کسی حد تک محدود نہیں ہونا ہے؛ پھر مطلق رحمت وہ جس کی کوئی حد نہیں اور مطلق حکمت وہ ہے جس کی کوئی انتہا نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: «عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاء وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَ يُؤْتُونَ الزَّكَوةَ وَ الَّذِينَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ)(الاعراف، 156)، (ارشاد ہوا کہ میرا عذاب جسے میں چاہوں گا اس تک پہنچے گا اور میری رحمت ہر شے پر وسیع ہے جسے میں عنقریب ان لوگوں کے لئے لکھ دوں گا جو خوف خدا رکھنے والے اور زکوتِ ادا کرنے والے اور ہماری نشانیوں پر ایمان لانے والے ہیں)۔

تو پھر خدا کی رحمت ہر چیز پر محیط ہے اور کافر جو جہنم کا مستحق ہے وہ بھی ایک چیز ہے اور نتیجے کے طور پر، خدا کی رحمت نے اسے لپیٹ لیا اور جہنم میں داخل ہونا اور رہنا اس کی خواہش تھی، جس نے اس میں رہنے کے اسباب فراہم کیے: «لَا تَرْكُضُوا وَ ارْجِعُوا إِلَى مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسَاكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ» (الانبیاء، 13)، (ہم نے کہا کہ اب بھاگو نہیں اور اپنے گھروں کی طرف اور اپنے سامان عیش و عشرت کی طرف پلٹ کر جاؤ کہ

دائرہ کار میں کوئی نقص نہیں ہے۔اور ہم نے اس کی مطلق حکمت اور رحمت کے ساتھ اتفاق کی وجہ سے استخلاف کا یقینی ہونے کا ثابت کیا، چنانچہ ثابت ہے کہ جو چیز اس کی مطلق حکمت اور رحمت کے موافق ہے وہ در حقیقت خلیفہ اور اس کے جانشین کی امامت پر ان کی طرف سے براہ راست نص ہے اور یہ ہمیشہ اس کا طریقہ رہا ہے؛ اور چونکہ اس کی طرف سے براہ راست نص ، وہی وحی ہے اور وحی کا جو راستہ اس کے اور اس کی مخلوقات یعنی لوگوں کے درمیان کھلا ہے وہی خواب ہے، ثابت ہے کہ وہ اپنے خلیفہ کو اس طرح ضرور نص کرے گا اور وہ نیند اور بیداری میں سچے خوابوں (رویای صادقہ) کے ذریعے وحی کے ذریعے اس کی گواہی دیتا ہے۔ورنہ اگر اس نے نص کا یہ طریقہ چھوڑ دیا تو وہ اس کی مطلق رحمت اور حکمت کے خلاف ہو گا، کیونکہ اس نے وہ راستہ چھوڑ دیا جس سے تخلیق کا ہدف (یعنی معرفت) حاصل ہو گا اور اس کے نتیجے میں اس کی مطلق الوہیت کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔خدا اس عیب سے پاک ہے۔

نقلی نقطہ نظر سے : یہ طریقہ واضح طور پر اور مکمل طور پر ثابت ہوا ہے :

اللہ تعالیٰ نے آدم (ع) کو زمین پر خدا کا پہلا خلیفہ منتخب کرنے کی کہانی میں اس طرح کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح اپنی زمین میں اپنے خلیفہ پر نص شروع کیا۔اس نے ملائکہ پر وحی کی کہ آدم اس کا خلیفہ ہے :

تم سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کی جائے گی)۔

تو پھر جہنم اس دنیا کے سوا کچھ نہیں جس میں ان کافروں اور ان کے اعمال شامل ہیں:«فَاتَّقُواْ النَّارَ الَّتِي وَ قُودُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ» (البقرہ، 24)، (تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور جسے کافرین کے لئے مہیا کیا گیا ہے)۔

آیت شریفہ «وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَ يُؤْتُونَ الزَّكَوةَ وَ الَّذِينَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ» میں یہ واضح ہے کہ اللہ کی رحمت اُن کے ذریعے پہچانی جاتی ہے جن کے لیے وہ مقرر کی گئی ہے اور جہاں وہ جلوہ گر ہوئی ہے، اور وہ وہی ہیں جن کا ذکر مقدس آیت میں کیا گیا ہے کہ میں نے اُن کے لیے اپنی رحمت لکھی ہے اور وہ انبیاء اور اوصیاء ہیں جن پر خدا کی رحمت واجب ہو گئی اور ان میں ظاہر ہوئی اور ان کی اپنی رحمت بھی خدا کی رحمت کی ایک شکل ہے اور ان کی رحمت سے خدا کی رحمت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن آیت کی تفسیر، اس طرح کہ متقیوں کے لیے رحمت کے واجب ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں صرف ان کو شامل کیا گیا ہے تو وہ ظلم اور زیادتی ہے؛ کیونکہ اس صورت میں آیت کا آغاز اس کے اختتام کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ کیونکہ آیت کا آغاز یہ کہتا ہے کہ خدا کی رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور اس کے آخر میں (اس غلط تشریح کے مطابق) یہ کہا گیا ہے کہ یہ رحمت صرف متقی اور پاکیزہ لوگوں کے لئے ہے جو خدا کی آیات پر ایمان رکھتے ہیں یعنی خدا کے ملکوت سے سنتے ہیں اور اس میں یقین رکھتے ہیں. لیکن حقیقت، جیسا کہ میں نے بیان کیا، یہ ہے کہ خدا کی رحمت لکھے گئے ہے یعنی ظاہر ہوا ہے ان متقیوں پر جو آسمانوں کے ملکوت اور ماضی اور مستقبل کے الہی آیات پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو خدا کے کلمات کو سنتے ہیں اور سچ یہ ہے کہ ان لوگوں میں رحمت کا ظہور تحصیل حاصل ہے۔(وہ چیز حاصل کرنا جو اپنے پاس پہلے سے موجود ہے۔) کیونکہ انسان خدا کی صورت پر پیدا ہوا ہے؛ پھر اگر اس میں اخلاص ہو گا تو یہ صورت اس میں ظاہر ہو گی اور جتنا اس کا اخلاص زیادہ ہو گا اس شخص میں اس صورت کی تجلی اور ظہور اتنی ہی عظیم اور زیادہ واضح ہو گی۔

(وَ إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ)[1]

(اے رسول. اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں اور انہوں نے کہا کہ کیا اسے بنائے گا جو زمین میں فساد برپا کرے اور خونریزی کرے جب کہ ہم تیری تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں تو ارشاد ہوا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو).

یہ بات انہوں نے حضرت یوسف (ع) کے انتخاب کے سلسلے میں بھی کہی۔اس نے یوسف کو وحی کی کہ تم زمین پر میرے خلیفہ ہو گے:

(إِذْ قالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَباً وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي ساجِدِينَ)[2]

(اس وقت کو یاد کرو جب یوسف(ع) نے اپنے والد سے کہا کہ بابا! میں نے خواب میں گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے اور یہ دیکھا ہے کہ یہ سب میرے سامنے سجدہ کر رہے ہیں)۔

یہاں یہ خواب خدا کے خلیفہ یوسف (ع) کو پہچاننے کا سبب تھا اور حضرت یعقوب (ع) کے قول سے واضح ہے کہ یہ خواب زمین پر خدا کے خلیفہ کو پہچاننے کا سبب تھا; کیونکہ اس نے یوسف (ع) کو اپنے بھائیوں کو یہ خواب سنانے سے خبردار کیا تھا، تاکہ خواب سن کر ہابیل کے مصائب کا اعادہ نہ ہو، جب ان کو معلوم ہو جائے کہ یوسف (ع) کو ان میں سے خدا کا خلیفہ منتخب کیا گیا ہے:

(قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَى إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُبِينٌ)[3]

(یعقوب (ع) نے کہا: کہ بیٹا خبردار اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا کہ وہ لوگ الٹی سیدھی تدبیروں میں لگ جائیں گے کہ شیطان انسان کا بڑا کھلا ہوا دشمن ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (ع) کے انتخاب کے قصے میں بھی یہی وجہ بیان فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ(ع) کی والدہ کو جو مکلفین میں سے تھیں ایک رویا کے ذریعہ وحی کی اور گواہی دی کہ موسیٰ(ع) زمین پر خدا کا خلیفہ ہے:

(وَ أَوْحَيْنَا إِلَى أُمِّ مُوسَى أَنْ أَرْضِعِيهِ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ وَ لَا تَخَافِي وَ لَا تَحْزَنِي إِنَّا رَادُّوهُ إِلَيْكِ

---

1. قرآن پاک، سورہ بقرہ، آیت 30۔
2. قرآن پاک، سورہ یوسف، آیت 4۔
3. قرآن پاک، سورہ یوسف، آیت 5۔

وَ جَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ) [1]

(اور ہم نے مادر موسٰی (ع) کی طرف وحی کی کہ اپنے بچّہ کو دودھ پلاؤ اور اس کے بعد جب اس کی زندگی کا خوف پیدا ہو تو اسے دریا میں ڈال دو اور بالکل ڈرو نہیں اور پریشان نہ ہو کہ ہم اسے تمہاری طرف پلٹا دینے والے اور اسے مرسلین میں سے قرار دینے والے ہیں)۔

نیز حضرت داؤد (ع) کے انتخاب کے قصے میں انہوں نے یہ وجہ بیان کی اور حضرت داؤد (ع) سے فرمایا کہ تم زمین پر ہمارے خلیفہ ہو:

(يا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ)[2]

(اے داؤد (ع) ! ہم نے تم کو زمین میں اپنا جانشین بنایا ہے؛ لہٰذا تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہشات کا اتباع نہ کرو کہ وہ راہ خدا سے منحرف کردیں بیشک جو لوگ راہ خدا سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لئے شدید عذاب ہے کہ انہوں نے روزِ حساب کو یکسر نظرانداز کردیا ہے)۔

اس نے یہ مسئلہ بھی حضرت عیسٰی (ع) کے انتخاب کے قصے میں بیان کیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے حواریوں پر ظاہر کیا کہ عیسٰی (ع) ان کے خلیفہ ہیں:۔

(وَ إِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَ بِرَسُولِي قَالُوا آمَنَّا وَ اشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُونَ) [3]

(اور جب ہم نے حواریین کی طرف الہام کیا کہ ہم پر اور ہمارے رسولوں پر ایمان لے آؤ تو انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے اور تو گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں)۔

کیا خدا کے مذہب میں خوابوں کے موضوع کے بارے میں مزید کوئی وضاحت ہے جو ہم آیت میں واضح طور پر دیکھتے ہیں؟!

آیت میں، کیا حواریوں کے لیے خدا کی گواہی وحی کے ذریعے واضح نہیں ہے؟ وحی کے دو طریقے ہیں، نیند میں خواب اور بیداری میں خواب۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی بات واضح ہے کہ خواب زمین پر اپنے خلیفہ اور ان تمام بندوں کے لیے جو خدا کی گواہی چاہتے ہیں، اللہ کی گواہی کا راستہ ہے۔ کیا اس سے زیادہ کوئی واضح بات ہے کہ

---

1. قرآن پاک، سورہ قصص، آیت 7۔
2. قرآن پاک، سورہ ص، آیت نمبر 26۔
3. قرآن پاک، سورہ مائدہ، آیت 111۔

خواب زمین پر اپنے خلیفہ کے لیے خدا کی نص کا راستہ ہے؛ ایسا طریقہ جسے کوئی بھی لوگ سننا چاہتے ہیں، بغیر کسی شرط کے سنیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح طور پر اور بلا شبہ نبی اکرم (ص) کی دعوت کے بارے میں بیان فرمائی۔اس طرح کہ جس کسی کے لیے بھی خدا تعالیٰ کی گواہی چاہتا ہے خدا خود اس کے لئے گواہ کے طور پر اپنا تعارف کراتا ہے۔

(مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَ مَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ وَ أَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا وَ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيداً) [1]

(جو نیکی تمہیں پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے، اور جو برائی تمہیں پہنچے وہ تمہاری اپنی طرف سے ہے۔ اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے، اور (آپ کی رسالت پر) اللہ گواہی میں کافی ہے).

(لَكِنِ اللَّهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ وَ الْمَلَائِكَةُ يَشْهَدُونَ وَ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيداً) [2]

(یہ مانیں یا نہ مانیں) لیکن خدا نے جو کچھ آپ پر نازل کیا ہے وہ خود اس کی گواہی دیتا ہے کہ اس نے اسے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور ملائکہ بھی گواہی دیتے ہیں حالانکہ خدا خود شہادت کے لئے کافی ہے)۔

(وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا قُلْ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيداً بَيْنِي وَ بَيْنَكُمْ وَ مَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ) [3]

(اور یہ کافر کہتے ہیں کہ آپ رسول نہیں ہیں کہہ دیجئے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان رسالت کی گواہی کے لئے خدا کافی ہے اور وہ شخص (جیسے امیر المومنین علی بن ابی طالب (ع) کافی ہے جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہے)۔

(قُلْ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَ بَيْنَكُمْ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيراً) [4]

(کہہ دیجئے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان گواہ بننے کے لئے خدا کافی ہے کہ وہی اپنے بندوں کے حالات سے باخبر ہے اور ان کی کیفیات کا دیکھنے والا ہے)۔

---

1. قرآن کریم، سورہ نساء، آیت 79۔
2. قرآن پاک، سورہ نساء، آیت 166۔
3. قرآن پاک، سورہ رعد، آیت 43۔
4. قرآن پاک، سورہ اسراء، آیت 96۔

(قُلْ كَفَى بِاللَّهِ بَيْنِي وَ بَيْنَكُمْ شَهِيدًا يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَ الأَرْضِ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوا بِاللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ) [1]

(آپ کہہ دیجئے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان گواہی کے لئے خدا کافی ہے جو آسمان اور زمین کی ہر چیز سے باخبر ہے اور جو لوگ باطل پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کا انکار کرتے ہیں وہ یقینا خسارہ اٹھانے والے لوگ ہیں)۔

(هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَ دِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيداً) [2]

(وہی وہ خدا ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے تمام ادیان عالم پر غالب بنائے اور گواہی کے لئے بس خدا ہی کافی ہے)۔

یہ شہادت اور یہ الٰہی نص پہلے دن سے خدا کے خلیفہ کے پاس ہے کہ وہ اس کی دعوت کا اعلان کرے جبکہ اس کی دعوت سے پہلے بھی اس کے ساتھ ہے۔

ماضی میں خدا نے مکلفین کے سامنے اپنے خلفاء کی گواہی دی۔ اور وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اپنے خلفاء کے لیے مکلفین کے لیے گواہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس لیے یہ معاملہ خدا کی سنت ہے اور اس کے نتیجے میں جیسا کہ کہا گیا ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی؛ تو خدا کے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ لوگوں کے لیے وحی کے علاوہ گواہی دے ، چاہے براہِ راست یا اپنی مخلوقات میں سے کسی کے ذریعے جیسے کہ روحوں اور فرشتوں کے ذریعے؟ اور خدا اور مکلفین کے درمیان وحی کا کون سا راستہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے سوائے خدا کے رویاے صادقہ (سچے خواب) کے؟ لیکن جو کوئی الٰہی نص کے اس طریقہ (خواب کے ذریعے وحی) کا انکار کرتا ہے، وہ قرآن کے کسی حصے میں اپنے کفر کا اعلان کرتا ہے، یا یہ کہ وہ تمام مکلفین کے لیے خدا کو گواہی دینے کے لیے کوئی اور طریقہ پیدا کرے۔ آیات یا معجزات مانگنے والوں کو رد کرتے ہوئے خدا جواب دیتا ہے کہ اگر وہ خدا کے وجود پر سچا ایمان رکھتے ہیں تو خدا کی گواہی ان کے لئے کافی ہے اور انہیں معجزات کی ضرورت نہیں ہے۔

---

1. قرآن پاک، سورہ عنکبوت، آیت 52۔
2. قرآن پاک، سورہ فتح، آیت 28۔

(وَ قَالُوا لَوْلا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّمَا الآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ ... قُلْ كَفَى بِاللَّهِ بَيْنِي وَ بَيْنَكُمْ شَهِيداً يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَ الأَرْضِ ...) [1]

(اور لوگ کہتے ہیں: اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اتاری گئیں؟ کہہ دیجئے: نشانیاں تو بس اللہ کے پاس ہیں... آپ کہہ دیجئے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان گواہی کے لئے خدا کافی ہے جو آسمان اور زمین کی ہر چیز سے باخبر ہے)۔

لہٰذا، قرآن کی آیات سے واضح ہے کہ خدا نے اپنے خلفاء پر مکلفین کے لیے وحی اور خواب کے ذریعے گواہی دی ہے؛ حضرت عیسیٰ (ع) کے حواریوں کے خوابوں اور محمد (ص) کے اصحاب کے خوابوں کی طرح، اور یہ خدا کی سنت ہے۔ جو بھی اس کا انکار کرتا ہے یا اسے تبدیل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے، اسے دلیل پیش کرنی چاہیے۔ [2] اور جو ایک سچے خواب کے ذریعے وحی کے ساتھ خدا کی گواہی کا کافی نہ ہونے کا دعوی کرتا ہے، اسے لفظ "کفی" (کافی ہے) کا دوسرا مطلب تلاش کرنا چاہئے جو پچھلی آیات میں کئی بار دہرایا گیا ہے۔

(وَ أَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا وَ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيداً)

(لَكِنِ اللَّهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ وَ الْمَلَائِكَةُ يَشْهَدُونَ وَ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيداً)

(وَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا قُلْ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيداً بَيْنِي وَ بَيْنَكُمْ)

(قُلْ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَ بَيْنَكُمْ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيراً بَصِيراً)

---

1. قرآن پاک، سورہ عنکبوت، آیات 52-50۔

2. خلافت میں الٰہی سنت کو جاننے کے لیے ہمیں آدم (ع) سے مہدی (ع) تک الٰہی خلافت کے راستے کو دیکھنا چاہیے؛ آدم (ع) خدا کا خلیفہ ہے... نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ (ع)، اور خدا کے تمام انبیاء اور رسول زمین پر خدا کے مقرر کردہ خلیفہ ہیں... محمد ص خدا کی طرف سے مقرر کردہ خلیفہ ہے اور مہدی خدا کی طرف سے مقرر کردہ خلیفہ ہے۔

رسول اللہ (ص) نے فرمایا: (تیرے خزانے کے قریب تین آدمی مارے جائیں گے، جو سب کے سب خلیفہ کے بیٹے ہیں؛ پھر خلافت ان میں سے کسی کو نہیں پہنچتی؛ پھر مشرق سے سیاہ جھنڈے نکلتے ہیں؛ پھر وہ تم سے اس طرح لڑتے ہیں کہ کسی قوم نے اس طرح نہیں لڑا؛ پھر ان کو کچھ یاد آیا اور پھر فرمایا: جب تم نے اسے دیکھا؛ پس اس کی بیعت کرو، خواہ برف پر رینگتے ہوئے جانا پڑے، کیونکہ وہ خدا کا خلیفہ مہدی ہے)۔ (المستدرک، جلد 4، ص 464) یہ حدیث شیخین (مسلم و بخاری) کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ وہ مسلمان جو محمد (ص) کے بعد خلافت الٰہی کو نہیں مانتے، انہیں حضرت آدم (ع) اور انبیاء اور حضرت داؤد (ع) اور محمد (ص) کی خلافت میں کوئی شک یا پریشانی ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے اور روایات کے مطابق، مہدی (ع) زمین پر خدا کا خلیفہ ہے، یعنی شروع سے آخر تک الٰہی دین کا راستہ، خود خدا کی طرف سے زمین پر خدا کے خلیفہ کی تنصیب پر مشتمل ہے۔ یعنی یہ ایک الٰہی سنت ہے جو تبدیل نہیں ہوتی اور نتیجتاً جو شخص سنت الٰہی کو بدلنے کا دعویٰ کرتا ہے اسے اپنے دعوے کو دلیل کے ساتھ ثابت کرنا چاہیے، نہ کہ یہ دعویٰ کرنا کہ خدا کا دین بے فائدہ اور غیر روایتی ہے، اور یہ کہ خدا نے رسول اللہ (ص) کے بعد خلافت کے حکم کو ترک کر دیا ہے اور الٰہی سنت بغیر کسی وجہ کے بدلی اور تبدیل ہو گئی، بلکہ دلیل ان کے وعدے اور یقین کے خلاف ثابت ہوتا ہے۔

(قُلْ كَفَى بِاللَّهِ بَيْنِي وَ بَيْنَكُمْ شَهِيدًا يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَ الأَرْضِ وَ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوا بِاللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ)

ان آیات کا مفہوم بالکل واضح ہے، یعنی نیند یا بیداری میں رویا کے ذریعہ عام لوگوں کے لئے خدا کی گواہی، جن پر خدا نے اپنے آپ کو گواہ بنا کر پیش کیا ہے، زمین پر خدا کے خلیفہ کے مصداق کو پہچاننے کے لئے کافی ہے۔

پھر جو کہا گیا ہے اس کے مطابق، سچا خواب اور سچی کشف جس میں اللہ اپنے خلیفہ کی حقانیت پر مکلفین کے لیے گواہی دیتا ہے، اللہ سبحان کی طرف سے ایک نص ہے، اور اس سے اعراض کرنا اللہ سبحان کی براہِ راست نص سے اعراض کرنے کے برابر ہے ۔

لیکن اس نص کے حجت ہونے کی حدود، یعنی یہ نص صرف اس کے مالک کے لیے حجت ہے یا اس کے صاحب کے علاوہ کسی اور کے لیے بھی حجت ہے؛ یا اگر ہم اس کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ یہ الٰہی نص اپنے صاحب کے علاوہ کسی اور کے لیے ثبوت ہو؟اس بنیاد پر کہ اس کا حجت ہونا اس کے اپنے صاحب پر ثابت شدہ ہے؟

در حقیقت قرآن کریم اس بیان کا ضامن ہے اور اس نے واضح طور پر کہا ہے کہ الٰہی نص اپنے مالک کے علاوہ پر بھی حجت ہے؛حضرت یعقوب (ع) نے حضرت یوسف (ع) کے خواب کو زمین پر اپنی خلافت کا سبب سمجھا اور اسی وجہ سے آپ کو اس خواب کو اپنے بھائیوں کے سامنے بیان کرنے سے منع فرمایا۔کیونکہ یوسف (ع) کے بھائی نبی زادے تھے اور شریعت کو اچھی طرح جانتے تھے۔اور وہ خوب جانتے تھے کہ خدا کے دین میں خوابوں کی کیا مقام ہے اور یہ کہ وہ خواب زمین پر حضرت یوسف (ع) کی خلافت کے لیے الٰہی نص ہیں۔اور نتیجے کے طور پر، وہ خواب سن کر، وہ سمجھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یوسف (ع) کو زمین پر خدا کے خلیفہ کے مصداق کے طور پر پہچاننا ہے؛چنانچہ حضرت یعقوب (ع) کو ڈر تھا کہ وہ یوسف (ع) سے حسد کریں گے اور حضرت آدم (ع) کے دونوں بیٹوں کی پرانی کہانی یوسف اور ان کے بھائیوں کے بارے میں دہرائی جائے گی اور یہ معاملہ اس شخص کے لیے واضح ہے جو قرآن کی آیات میں غور و فکر کرتا ہے اور اپنے ساتھ انصاف کرتا ہے:

(ذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ * قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَى إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُبِينٌ) [1]

(جب یوسف (ع) نے اپنے باپ سے کہا: اے بابا! میں نے (خواب میں) گیارہ ستاروں کو دیکھا ہے اور سورج اور چاند کو میں نے دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ کہا: بیٹا! اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا ورنہ وہ آپ کے خلاف کوئی چال سوچیں گے کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے)۔

اس کا مطلب ہے کہ وہ آپ کے لئے منصوبہ بندی کرتے ہیں، جیسا کہ قابیل نے ہابیل کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا، جب اسے معلوم ہوا کہ وہ آدم (ع) کا جانشین ہے۔

لہٰذا جیسا کہ قرآن کریم سے واضح ہے کہ اس طرح (خواب میں) الٰہی نص، اس کے صاحب اور دوسروں پر حجت ہے۔

لیکن اگر دوسرے یہ احتمال دیں کہ خواب دیکھنے والا جھوٹ کہہ رہا ہے کہ اُس نے خواب دیکھا ہے، یا یہ احتمال دیں کہ جو کچھ اُس نے دیکھا وہ شیطانی خواب ہے، یا اُس کی اپنی خواہشِ نفس سے ہے، تو اس وقت وہ خواب دوسرے کے لیے حجت نہیں ہوگا، اور یہاں ہمیں بعض امور کے بارے میں تحقیق و بررسی کی ضرورت ہے:

1. یہ احتمال کہ جو کہے کہ میں نے خواب دیکھا ہے، وہ جھوٹ بول رہا ہو:

یہ امر مردود ہوگا جب خواب زیادہ اور مسلسل ہوں اور مختلف اشخاص انہیں دیکھیں جن کے درمیان ایمان لانے سے پہلے حق کے دعوت دینے والے پر کوئی تعلق نہ رہا ہو، تاکہ جو شخص ان کے خواب سنتا ہے یہ گمان کرے کہ انہوں نے جھوٹ پر آپس میں سازش کی ہے؛ اس صورت میں پھر کوئی بھی اس بڑی تعداد کو جھوٹ کا الزام نہیں دے سکتا مگر یہ کہ وہ متکبر اور غیر منطقی ہو؛ چونکہ عقلی اعتبار سے، اس عدہ کی ملی بھگت ان اوصاف کے ساتھ جھوٹ پر ممکن نہیں ہے اور اسی سبب سے، ان کے خوابوں کا مجموعہ باقی لوگوں پر حجت ہوگا، اور اگر وہ لوگ جنہوں نے خدا کے خلیفہ کی شناخت میں خواب دیکھے ہیں مختلف مسلک، پس منظر اور عقائد رکھتے ہوں، تو اس وقت یہ حجت اور بھی عظیم تر ہوگی اور ان کی گواہی کو رد اور انکار کرنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہے گی، اس بارے میں جو انہوں نے ملکوت میں خدا کی گواہی اور اپنے خلیفہ کے بارے میں اُس کے نص کے ساتھ دیکھا اور سنا ہے.

---

1. قرآن پاک، سورہ یوسف، آیات 4-5۔

2. یہ احتمال کہ خواب شیطان کی طرف سے ہو:

یہ مسئلہ اس طرح رد ہوتا ہے کہ خواب میں یا تو زمین پر خدا کا خلیفہ ہو جس کی خلافت دیکھنے والے پر ثابت ہو چکی ہو، یا اس کے فرشتوں میں سے کوئی فرشتہ ہو، یا اس میں خدا کا کوئی نام ہو، یا آسمانی کتاب کی کوئی آیت ہو جو دیکھنے والے پر ثابت ہو، یا یہ کہ خواب میں ایسے حکیمانہ رموز ہوں جو کسی بھی صورت میں شیطان اور اس کے جیسے سفیہوں سے صادر نہیں ہو سکتے.

اللہ سبحانہ نے قرآنِ کریم میں اس نظریے کو رد کیا ہے جو کہا کرتے تھے کہ شیاطین نے قرآن نازل کیا ہے:

(وَ مَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيَاطِينُ * وَ مَا يَنْبَغِي لَهُمْ وَ مَا يَسْتَطِيعُونَ) [1]

(اور اسے شیطان لے کر نہیں اترے۔ نہ یہ ان کے لائق ہے اور نہ وہ اس کی طاقت رکھتے ہیں).

لہٰذا اللہ فرماتا ہے: نہیں، شیاطین کو قرآن کی تلاوت پر کوئی تسلط اور قدرت نہیں ہے؛ اس لیے جس طرح قرآن میں بھلائی کی دعوت دی جاتی ہے، شیطان کے شایانِ شان نہیں کہ وہ بھلائی کی طرف بلائے، ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ شیطان کی بنیاد محکم ہو جبکہ وہ بھلائی، اخلاقِ کریمہ اور یادِ خدا کی دعوت دے رہا ہو؟!

اگر یہ امور جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں شیطان کی طرف سے ہوتے، تو پھر وہ کیسے، کہاں اور کس وقت برائی کی طرف دعوت دیتا؟ کیا شیطان خود اپنے ساتھ جنگ کر رہا ہے؟ ہر گز ایسا نہیں کرتا.

جس طرح شیطان نہ تو خدا کے کلمات تلاوت کر سکتا ہے اور نہ ہی آسمانوں کے ملکوتی رموز یا خدا کے خلفاء، فرشتوں اور اسماءِ الٰہی کی صورت اختیار کر سکتا ہے؛ اور اگر یہ کام اس کے لیے ممکن ہوتے، تو پھر ملکوت کو خدا کے ہاتھ میں شمار نہیں کیا جانا چاہیے تھا بلکہ شیطان کے ہاتھ میں مانا جانا چاہیے تھا، اور پھر ملکوت سے آنے والی کسی بھی چیز پر اعتماد کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی، اور اس صورت میں تمام آسمانی رسالتوں اور تمام خلفائے الٰہی پر طعن اور اعتراض وارد ہوتا کہ شاید سب وہم تھا اور جو کچھ انہوں نے دیکھا وہ شیطان تھا، اور خود شیطان ان کے سامنے فرشتوں کی صورت میں ظاہر ہوا تھا اور وہ ان کے سامنے ایک کلام کو خدا کے کلام کے طور پر پڑھتا رہا تھا اور....؛ اور اسی وجہ سے خداوند سبحان نے اسی پر اکتفا فرمایا اور کہا: (وَ مَا يَنبَغِي لهُمْ وَ مَا يَسْتطِيعُون)، یعنی قرآن کی تلاوت ان کے لیے ممکن نہیں؛ تو پھر وہ یہ قرآن کیسے نازل کر سکتے تھے ؟!

---

1. قرآن کریم، سورہ شعراء، آیات 210 - 211۔

لہٰذا جب وہ قرآن کی وحی یا قرآن کی بعض آیات لانے سے عاجز ہیں، تو کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص، جو علم کا دعویدار ہو، اپنی جہالت کی بنا پر یہ کہے کہ شیاطین خواب میں رسول اللہ (ص) کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں ؟! کیا عقل یہ مانتی ہے کہ شیطان قرآن نازل کرنے اور اس کی تلاوت سے عاجز ہو، مگر محمد (ص) کی صورت میں ظاہر ہونے پر قادر ہو، جبکہ محمد (ص) خدا کا تام کلمہ اور قرآنِ ناطق ہیں؟ خدا کی قسم ! یہ بات سراسر ناعادلانہ ہے.

کیا بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ رسولِ خدا (ص) پر جھوٹ باندھیں اور اس طرح کے عظیم امر کے ذریعے ان پر جرات و گستاخی کریں، اور علم کے مدعی یہ کہیں کہ شیطان رسول اللہ (ص) کی صورت اختیار کر لیتا ہے، بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی دلیل ہو، بلکہ صرف حق کی دعوت کو رد اور انکار کرنے کے لیے یہ باتیں کہتے ہیں:

(مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِآبَائِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا)[1]

(انہیں اس کا کوئی علم نہیں، اور نہ ہی ان کے باپ دادا کو۔ بڑی بھاری بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے، وہ محض جھوٹ ہی بولتے ہیں).

کیا ایسا شخص اپنے آپ کو عاقل اور صاحبِ علم سمجھتا ہے کہ یہ کہتا ہے شیطان انبیاء، اوصیاء اور فرشتوں کی صورت اختیار کر سکتا ہے؟ اگر شیطان کو پاکیزہ ارواح کی صورت میں ظاہر ہونے کی قدرت حاصل ہو، تو دینِ خدا میں سے کیا باقی رہ جاتا ہے؟ اور انبیاء و رسول (ص) نے وحیِ خدا کو کس طرح پہچانا اور جانا کہ یہ خدا کی طرف سے ہے، نہ کہ شیطان کی طرف سے؟ اور جو ان کے پاس وحی لے کر آتا ہے وہ فرشتہ ہے، شیطان نہیں؟!

اس صورت میں رسول اللہ (ص) نے کیسے پہچانا کہ جو ان سے کلام کر رہا ہے وہ جبرئیل (ع) ہے، نہ کہ شیطان؟! ان کے قول کے مطابق تو شیطان جبرئیل (ع) کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے، کیونکہ وہ شیطان کا محمد (ص) کی صورت میں ظاہر ہونا جائز سمجھتے ہیں، حالانکہ آپ (ص) جبرئیل (ع) سے بلند مرتبہ ہیں!

اسی طرح ان کے نظریے کے مطابق، کیا انبیاء (ص) اس بات کے پابند تھے کہ جو بھی فرشتہ ان سے کلام کرے اور ان پر وحی کرے، وہ اس سے معجزہ طلب کریں تاکہ جان سکیں کہ وہ فرشتہ ہے اور خدا کی طرف سے ہے، نہ کہ شیطان؟! پھر جب انبیاء (ص) کے لیے وحی رویا کے ذریعے آتی تھی، تو وہ کیسے پہچانتے تھے کہ یہ وحی خدا کی طرف سے ہے، نہ کہ کسی شیطان کی طرف سے جو فرشتے کی صورت میں ان کے پاس آیا ہے؟!

---

1. قرآن کریم، سورہ کہف، آیت 5۔

خدا کی قسم! جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ شیطان محمد، اوصیاء اور فرشتوں کی صورت اختیار کر سکتا ہے، انہوں نے شیطان اور اس کے ملحد و خدا کے منکر لشکروں کے لیے ایک بڑا دروازہ کھول دیا ہے جو دینِ خدا میں سے کچھ بھی باقی نہیں چھوڑتا، اور اگر وہ سمجھیں تو اسی باطل بات کے ذریعے شیاطین اور ملحدوں کو اپنے کندھوں پر سوار کر لیا ہے.

کیا علم کے مدعی اس بڑے جرم کی سنگینی کو سمجھتے ہیں جو انہوں نے کیا ہے؟ انہوں نے اب تمام آسمانی کتابوں، تمام انبیاء و رسولان کی حقیقت، اور قرآن پر ابتدا سے انتہا تک طعن اور اعتراض وارد کر دیا ہے۔ جو شخص دینِ خدا اور رسولِ خدا محمد (ص) پر جرات اور گستاخی کرے اور یہ کہے کہ شیطان محمد (ص)، انبیاء اور اوصیاء (ع) کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اسے چاہیے کہ خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنے پروردگار سے استغفار کرے، کیونکہ یہ حقائق ایک دن لوگوں پر ظاہر ہو جائیں گے اور لوگ دن بہ دن ان کو پہچان لیں گے، اور اہلِ باطل کا فریب، جہالت، گستاخی اور ان کی خدا، ملکوت، رسول اور ائمہ (ع) پر جرات ان پر عیاں ہو جائے گی.

لہٰذا جو خواب خدا کے ذکر یا خدا کے خلفاء یا الٰہی فرشتوں پر مشتمل ہو، وہ ہرگز شیطان کی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ خدا کی جانب سے اور ملکوتِ الٰہی، فرشتگانِ الٰہی اور پاکیزہ ارواح کی طرف سے ہوتا ہے۔

تمام مسلمانوں نے روایت کیا ہے کہ شیطان رسول اللہ محمد (ص) کی صورت میں ظاہر نہیں ہو سکتا، اور یہ اسی کی ایک مثال ہے:

(وَرَوَى الْحَسَنُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ فَضَّالٍ عَنْ أَبِي الْحَسَنِ عَلِيِّ بْنِ مُوسَى الرِّضَا(ع) أَنَّهُ قَالَ لَهُ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ خُرَاسَانَ: (يَا ابْنَ رسول‌الله رَأَيْتُ رسول‌الله(ص) فِي الْمَنَامِ كَأَنَّهُ يَقُولُ لِي كَيْفَ أَنْتُمْ إِذَا دُفِنَ فِي أَرْضِكُمْ بَضْعَتِي وَ اسْتُحْفِظْتُمْ وَدِيعَتِي وَ غُيِّبَ فِي ثَرَاكُمْ نَجْمِي فَقَالَ لَهُ الرِّضَا(ع) أَنَا الْمَدْفُونُ فِي أَرْضِكُمْ وَ أَنَا بَضْعَةٌ مِنْ نَبِيِّكُمْ وَ أَنَا الْوَدِيعَةُ وَ النَّجْمُ أَلَا فَمَنْ زَارَنِي وَ هُوَ يَعْرِفُ مَا أَوْجَبَ اللَّهُ عَزَّوَ جَلَّ مِنْ حَقِّي وَ طَاعَتِي فَأَنَا وَ آبَائِي شُفَعَاؤُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ مَنْ كُنَّا شُفَعَاءَهُ نَجَا وَ لَوْ كَانَ عَلَيْهِ مِثْلُ وِزْرِ الثَّقَلَيْنِ الْجِنِّ وَ الْإِنْسِ وَ لَقَدْ حَدَّثَنِي أَبِي عَنْ جَدِّي عَنْ أَبِيهِ(ع) أَنَّ رسول‌الله(ص) قَالَ مَنْ رَآنِي فِي مَنَامِهِ فَقَدْ رَآنِي لِأَنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ فِي صُورَتِي وَ لَا فِي صُورَةِ أَحَدٍ مِنْ أَوْصِيَائِي وَ لَا فِي صُورَةِ وَاحِدَةٍ مِنْ شِيعَتِهِمْ وَ إِنَّ الرُّؤْيَا الصَّادِقَةَ جُزْءٌ مِنْ سَبْعِينَ جُزْءاً مِنَ النُّبُوَّةِ).[1]

1. من لایحضرہ الفقیہ، ج 2، ص 584؛ الأمالی (صدوق)، ص 64؛ عیون اخبار الرضا (ع) ج 2، ص 257؛ بحار الأنوار، ج 49، ص 283۔

حسن بن علی بن فضال روایت کرتا ہے کہ خراسان کے ایک شخص نے حضرت رضا (ع) کی خدمت میں عرض کیا: (اے فرزندِ رسول، میں نے رسولِ خدا (ص) کو خواب میں دیکھا کہ گویا وہ مجھ سے فرمارہے ہیں: آپ کی حالت کیسی ہوگی جب آپ کی سرزمین میں میرے جگر کا ٹکڑا دفن کیا جائے گا اور آپ میری امانت کے محافظ ہوں گے اور میرا ستارہ آپ کی خاک میں پوشیدہ ہوگا؟ امام رضا (ع) نے ان سے فرمایا: میں تمہاری سرزمین میں دفن کیا جاؤں گا اور میں تمہارے نبی کا جگر کا ٹکڑا ہوں اور میں ہی وہ امانت اور ستارہ ہوں۔ آگاہ رہو! جو بھی میری زیارت کرے اس حال میں کہ اس حق اور اطاعت کو پہچانے جو خدا نے میرے بارے میں واجب کیا ہے، تو میں اور میرے آباء واجداد قیامت کے دن اس کے شفیع ہوں گے، اور جس کے ہم شفیع ہوں وہ نجات پائے گا اگرچہ اس کے کندھوں پر جن وانس دونوں کا بوجھ ہو۔ اور میرے والد نے میرے جد سے اور انہوں نے اپنے والد سے روایت کی کہ رسول اللہ (ص) نے فرمایا: جو مجھے اپنے خواب میں دیکھے تو اس نے خود مجھے ہی دیکھا ہے، کیونکہ شیطان نہ میری صورت میں اور نہ ہی میرے کسی وصی کی صورت میں اور نہ ہی ان کے کسی شیعہ کی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ اور بے شک رویای صادقہ (سچا خواب) نبوت کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے).

لیکن بعض مدعیوں کی یہ بات [1] اس مفہوم کے ساتھ کہ حدیث کا مقصود صرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں رسول اللہ (ص) کو دیکھا ہے اور ان کی ظاہری صورت کو پہچانتے ہیں، یہی مذکورہ روایت ان کی بات کو باطل کرتی ہے، کیونکہ امام رضا (ع) بخوبی جانتے تھے کہ یہ شخص جو خواب بیان کر رہا ہے، اس نے یقینی طور پر رسول اللہ (ع) کو نہیں دیکھا، پھر بھی حضرت نے فرمایا: جو کوئی رسول اللہ (ص) کو دیکھے، تو اس نے انہی کو ہی دیکھا ہے، کیونکہ شیطان ان کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا، جبکہ امام رضا (ع) کی گفتگو اسی شخص سے ہے اور خاص طور پر اس کے خواب کو مراد لیا ہے جس نے رسول خدا (ص) کو بیداری میں نہیں دیکھا تھا.

لہٰذا وہ شرط جو بعض نے لگائی ہے - یعنی خواب دیکھنے والے کو پہلے رسول خدا (ص) کو جسمانی زندگی میں دیکھنا چاہیے - یہ شرط اس روایت اور اس سے پہلے جو ہم بیان کر چکے ہیں، اس سے باطل ہو جاتی ہے، بلکہ یہ بات

---

1. باوجود اس کے کہ یہ ایک سادہ اور بیہودہ بات ہے جو کسی ایسے شخص سے بھی صادر نہیں ہوسکتی جس کے پاس ذرا سا بھی علم ہو، لیکن افسوس کے ساتھ یہی بات اُن مدعیانِ علم اور شیخوں کی طرف سے صادر ہوئی ہے جو سیٹلائٹ چینلز پر ظاہر ہوتے ہیں (جیسا کہ بعض مؤمنین نے مجھے نقل کیا ہے)۔ اسی وجہ سے میں نے اس اشکال کا جواب دیا تاکہ وہ لوگوں کو دھوکا نہ دیں، اور تاکہ ان مدعیوں کی ظاہر بینی اور اُن کے جہالت اور غلطیوں کی انتہا ظاہر ہو جائے، اور شاید وہ توبہ اور استغفار کریں بعد اس کے کہ ان پر حق واضح ہو جائے اور سمجھ لیں کہ اُن کا قول باطل تھا۔

دراصل ان کے نفسانی خواہشات اور اوہام کا گھڑا ہوا شرط ہے اور ان کے پاس اس کے لیے دشمنی اور تکبر کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے.

لہٰذا کیا یہ معقول ہے کہ ہم مان لیں کہ کوئی شخص بغیر کسی شرعی دلیل کے دینی اور اعتقادی امور میں شرطیں عائد کرے؟! بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس تو اس جھوٹی شرط کے خلاف دلیل موجود ہے.

پھر یہ مدعی جو رسول خدا (ص) کے بارے میں ایسی شرط رکھتے ہیں، کیا فرشتوں کے بارے میں بھی یہی شرط مانتے ہیں؟ یعنی یہ کہتے ہیں کہ جو کوئی خواب میں فرشتوں کو دیکھے اسے ضرور اسی مادی زندگی میں بھی انہیں دیکھنا چاہیے، ورنہ وہ شیاطین ہیں؟!

تمام انبیاء اور جن میں حضرت محمد (ص) بھی شامل ہیں، اپنی رسالت کی ابتدا اسی طرح کرتے تھے کہ فرشتوں کو خواب اور کشف میں دیکھتے اور ان سے گفتگو کرتے تھے، اور وہ کشف اور خواب ہی ان کی پہلی رویت ہوتی تھی؛ تو جو لوگ آج خود کو علماء اسلام کہتے ہیں، اگر وہ پچھلے انبیاء کے زمانے میں (جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں) زندہ ہوتے، کیا وہ انہیں بھی اسی بات اور اعتراض سے سامنا کراتے؟ یعنی انبیاء سے کہتے کہ آپ کو کیسے معلوم ہے، شاید یہ شیطان ہے جو آپ کے لیے فرشتوں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے؟ یا رسول اللہ محمد (ص) سے کہتے کہ شیطان آپ اور آپ کے اصحاب کے پاس آیا اور موسیٰ (ع) اور عیسیٰ (ع) کی صورت میں ظاہر ہوا، کیونکہ آپ اور آپ کے اصحاب نے موسیٰ (ع) کو اس مادی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا؟!

کیا گمراہ علماء یہ جانتے ہیں کہ یہ وہی بات ہے جس کا سامنا ان جیسے لوگوں نے محمد (ص) اور ان سے پہلے کے انبیاء سے کیا تھا؟ نتیجتاً انہوں نے خدا کی اپنے بندوں پر گواہی کو رد کر دیا اور خدا کے اپنے نبی محمد (ص) پر نص کو رد کر دیا، جو ایک خواب کے ذریعے تھا جسے لوگوں نے دیکھا تھا اور اسی طرح کی باتیں کہی تھیں جیسی آج وہ کہتے ہیں:

(بَلْ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ بَلِ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ فَلْيَأْتِنَا بِآيَةٍ كَمَا أُرْسِلَ الْأَوَّلُونَ)[1]

(انہوں نے کہا: بلکہ یہ تو پریشان اور الجھے ہوئے خواب ہیں، بلکہ اس نے اسے جھوٹ گھڑ لیا ہے، بلکہ وہ ایک شاعر ہے۔ (اگر یہ واقعی اللہ کا بھیجا ہوا ہے تو) اسے ہمارے لیے کوئی معجزہ لانا چاہیے، جیسے پچھلے انبیاء معجزات کے ساتھ بھیجے گئے تھے).

---

1. قرآن کریم، سورہ انبیاء، آیت 5۔

وہ حقیقت جس سے یہ گروہ جاہل ہے یہ ہے کہ شیاطین کی جرات نہیں ہے اور نہ ہی وہ یہ قدرت رکھتے ہیں کہ کسی کو خواب دکھائیں کہ وہ زمین پر خدا کا خلیفہ ہے یا فلاں شخص زمین پر خدا کا خلیفہ ہے؛ بلکہ شیطان کے خواب (نعوذ باللہ) تو وہی پریشان کن اور احمقانہ خواب ہوتے ہیں.

3. یہ احتمال کہ خواب نفس کی تلقین اور خواہش سے ہو:

یہ مسئلہ بھی اسی دلیل سے مردود ہے جو میں نے پہلے مسئلے میں بیان کی، کیونکہ حقیقت میں یہ جھوٹ ہے؛ اس لیے کہ سرے سے اس عنوان سے کوئی چیز موجود ہی نہیں کہ کوئی شخص اپنے طور پر کوئی خواب یا کشف دیکھے کہ وہ خدا کا خلیفہ ہے یا فلاں انسان خدا کا خلیفہ ہے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص اپنے آپ کو وہم القا کرتا ہے کہ اس نے خواب دیکھا ہے، حالانکہ اس نے نہیں دیکھا، اور حقیقت میں یہ محض ایک وہم ہے جو وہ اپنے آپ کو القا کرتا ہے، اور اسی وجہ سے میں نے کہا: نفس کی خواہش؛ کیونکہ حقیقت میں جیسا کہ وہ کہتے ہیں: «اس نے ایک جھوٹ گھڑا اور اس کی تصدیق کر دی"، یعنی وہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو وہ چیز القا کرتا ہے جسے وہ پسند کرتا ہے اور جو اس کی نفسانی خواہش کے مطابق ہے، اور پھر اسی اپنے وہم کو ایسے سچ مان لیتا ہے گویا کہ وہ حقیقت ہو.[1]

---

1. انسان اپنی بیداری اور نیند میں ہمیشہ تین چیزوں کے درمیان ہوتا ہے اور ان سے باہر کچھ نہیں: نور، نفس اور ظلمت۔ یا دوسرے لفظوں میں: خدا، نفس اور جہل۔ یا پھر یوں کہہ لیں: خدا کے فرستادے یعنی فرشتے اور پاکیزہ ارواح، نفس، اور شیطان و اس کے لشکر۔ لہٰذا تین جہتیں موجود ہیں: ایک جہت جو انسان کا نفس ہے، ایک جہت خیر کی ہے اور ایک جہت شر کی ہے۔ لہٰذا، بغیر کسی خواب یا کشف کے بھی، ہر انسان کے ذہن میں جو خیالات آتے ہیں وہ یا تو خیر اور خیر کی طرف بلانے والے ہوتے ہیں، جو اس صورت میں خدا کی طرف سے ہیں؛ یا پھر شر اور شر کی طرف بلانے والے ہوتے ہیں، جو اس صورت میں شیطان کی طرف سے ہیں؛ یا محض اوہام اور خیالات ہوتے ہیں، جو نفس کی طرف سے ہیں۔ ان تین کے علاوہ کوئی چوتھی چیز نہیں پائی جاتی. یہی تین جہتیں خواب میں اور بیداری کے وقت کشف میں بھی جاری ہیں؛ لہٰذا انسان اپنے خواب میں بھی انہی تین جہتوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اسی لیے جو شخص خدا کے ذکر اور یاد سے اور خیر و نور کے ساتھ سوتا ہے، تو اگر خدا چاہے وہ خدا کی طرف سے کوئی چیز دیکھتا ہے۔ اور جو شخص خدا کی یاد سے غفلت کے ساتھ سوتا ہے، تو ممکن ہے کہ وہ شیطان کی طرف سے کوئی پریشان کن چیز دیکھے، جسے عام لوگوں کی زبان میں " ڈراؤنا خواب" کہا جاتا ہے۔ اور جو شخص جاہ و منصب کی طلب میں سوئے، تو ممکن ہے کہ وہم و خیال میں خود کو القا کرے جو اُس کی اپنی خواہش کے مطابق ہوتا ہے اور اُس کے اندر پھونکی گئی انا اور خود پسندی کو خوش کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ یہی تین چیزیں بیداری میں کشف کے ذریعے بھی پیش آ سکتی ہیں؛ یعنی ممکن ہے کہ انسان بیداری میں کوئی کشف خدا کی طرف سے دیکھے، یا شیطان اُس کو کوئی چیز دکھا دے، یا پھر وہ اپنے نفس کی خواہشات اور اپنے ہی وہم و خیالات اور تلقینات کو دیکھے یا سنے۔

لہٰذا نتیجہ یہ ہے کہ رویای صادقہ (سچے خواب) در حقیقت وحی اور الٰہی نص ہیں جو مخلوقات کے لیے آتے ہیں، جن کے ذریعے وہ زمین پر خدا کے خلیفہ کو پہچانتے ہیں، اور چونکہ یہ الٰہی وحی شمار ہوتے ہیں، اس لیے اگر شرائط پوری ہوں تو خدا کے خلیفہ کی شناخت کے لیے ایک مستقل دلیل شمار ہوتے ہیں.

آدم (ع) کے بعد ہر خلیفہ کے پاس لازماً پچھلے خلیفہ کا نص ہونا چاہیے، کیونکہ یہ امر اس کے لیے دستیاب ہے؛ تو اگر وہ ایسا نص نہ رکھتا ہو، تو دعویٰ کی گئی رؤیا محض جھوٹ ہیں جنہیں جھوٹے لوگ اپنے مذہب اور اپنے گمراہ دین کی تائید کے لیے - جو دینِ حق اور عقیدۂ حق کے مخالف ہے- جمع کرتے ہیں۔ یہ نص خدا کے خلفاء کا زمین پر ایک دوسرے کے بارے میں ہے۔ اسی طرح اس کے جھوٹ ہونے کا پہلو مثلاً اس امکان سے ہے کہ دعویٰ کرنے والے جھوٹوں کی خواب پر ملی بھگت ہو سکتی ہے.

ضروری نہیں کہ کسی کی دعویٰ کردہ خوابوں کو خلافتِ الٰہی کے انکار میں اہمیت دی جائے، کیونکہ شرعی دلیل سے یہ ثابت ہے کہ خواب بطور ایک تشخیصی دلیل آتا ہے، لیکن شرعی دلیل سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ خواب کسی شخص کی خلافت کے معارض یا اس کے انکار کی دلیل کے طور پر آئے۔ اسی طرح فقہی احکام اور عقائد کے تعین میں خوابوں کو بنیاد بنانا بھی ضروری نہیں، مگر اس صورت میں کہ خدا کا خلیفہ ان خاص احکام اور عقائد کی تصدیق کرے، کیونکہ دینِ خدا وہی ہے جو خدا کا خلیفہ، جو پروردگار کے حکم سے اس پر قائم ہے، بیان کرتا ہے.

عاجزانہ کوشش

(بَلْ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ بَلِ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ فَلْيَأْتِنَا بِآيَةٍ كَمَا أُرْسِلَ الْأَوَّلُونَ)[1]

(انہوں نے کہا: بلکہ یہ تو پریشان اور الجھے ہوئے خواب ہیں، بلکہ اس نے اسے جھوٹ گھڑ لیا ہے، بلکہ وہ ایک شاعر (خیال پرداز) ہے۔ اگر یہ واقعی اللہ کا بھیجا ہوا ہے تو اسے ہمارے لیے کوئی معجزہ لانا چاہیے، جیسے پچھلے انبیاء معجزات کے ساتھ بھیجے گئے تھے).

یہ بات آسمان کے ملکوت کے منکر کافروں اور خدا کے رسولوں کو جھٹلانے والوں نے ہر زمانے میں اور ہر رسول کی رسالت کے مقابلے میں دہرائی ہے، یہاں تک کہ گویا انہوں نے ایک دوسرے کو اس کلام کے کہنے اور دہرانے کی وصیت کی ہو۔

---

1. قرآن کریم، سورہ انبیاء، آیت 5۔

ان کی عاجزانہ کوششوں میں سے ایک یہ ہے کہ مؤمنوں کے خوابوں کو پریشان خواب ثابت کرنے کے لیے خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں اور جھوٹے خواب بیان کرتے ہیں:

(وَ مَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ قَالَ أُوحِيَ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ وَ مَنْ قَالَ سَأُنْزِلُ مِثْلَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَ لَوْ تَرَى إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلَائِكَةُ بَاسِطُو أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنْفُسَكُمُ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَ كُنْتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ)[1]

(اور کون زیادہ زیادتی کرنے والا ہے اس سے جو اللہ پر جھوٹ باندھے، یا کہے کہ مجھ پر وحی ہوئی ہے حالانکہ اس پر کچھ وحی نہیں ہوئی، اور اسی طرح جو کہے: میں جلد ہی ویسا ہی نازل کروں گا جو اللہ نے نازل کیا؟ کاش تم ظالموں کو دیکھ سکتے جب وہ موت کی سخت گھڑیاں گزار رہے ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے کہتے ہیں: اپنی جانیں نکالو! آج تمہیں اس ذلیل کرنے والے عذاب سے سزا دی جائے گی، کیونکہ تم اللہ کے بارے میں باطل باتیں کہتے تھے اور اس کی آیات قبول کرنے میں تکبر کرتے تھے).

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو خدا کے نزدیک بہت بڑا ہے، لیکن ان الٹے افراد کے نزدیک آسان ہے۔ وہ آسانی سے اپنے زمانے کے خدا کے خلیفہ کے خلاف جھوٹے خواب گھڑ لیتے ہیں؛ اور ان کا یہ عمل، مؤمنین کے سامنے خدا کی گواہی پر طعنہ زنی کرنے کی ایک مایوس کوشش ہے؛ جبکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ خواب پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ ہی اس بات پر کہ خواب زمین پر خدا کے خلیفہ کی شناخت کی دلیل ہے۔ یہ مسئلہ ان کے جھوٹ کو فاش کرتا ہے اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ ہزاروں روشن خوابوں کے، جو خدا کے خلیفہ کے نصِ تشخیصی کے مطابق ہیں، پابند ہونے سے بھاگ جائیں۔ وہی چیز جسے کئی لوگوں نے دیکھا ہے کہ ان کا جھوٹ پر ملی بھگت کرنا ناممکن ہے.

اسی طرح یہ لوگ جب جھوٹ بولتے ہیں اور جھوٹے خواب جمع کرتے ہیں، تو اس بات پر توجہ نہیں دیتے کہ حضرت آدم (ع) کے بعد اس امر کا پہچاننا بہت آسان ہو گیا ہے، کیونکہ پچھلے خلیفہ کا نص موجود ہے جو دراصل خدا کا ہی نص ہے؛ پس خدا کا اپنے خلیفہ پر نص خواب کے ذریعے لازماً اس نص کے مطابق ہو گا جو پچھلے خلیفہ کے ذریعے آیا ہے اور اس کے مخالف ہونا ناممکن ہے؛ اور نتیجتاً جو بھی ایسا جھوٹا خواب جمع کرتا ہے جو پچھلے خلیفہ کے نص کے مخالف ہو، تو اس کی یہی بات اور خواب کا دعویٰ ظاہر کرتا ہے کہ وہ خدا پر جھوٹ باندھ رہا ہے.[2]

---

1. قرآن کریم، سورہ انعام، آیت 93۔
2. کبھی کبھی یہ جھوٹے اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں: "کیسے معلوم ہو کہ ہمارے مخالف کی رؤیا جھوٹی نہ ہو؟!"

بالعموم یہ مدعی اس جھوٹ کے ذریعے خواب اور اس کی اہمیت پر طعن کرنا چاہتے ہیں۔ گویا وہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان کے جھوٹے خواب مؤمنوں کے سچے خوابوں کو باطل کرتے ہیں؛ لہٰذا مؤمنوں کے خوابوں کی حجیت بھی ساقط ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ کوشش کرتے ہیں کہ آسمانوں کے ملکوت کو خود ملکوتِ آسمانوں پر جھوٹ باندھ کر رد کریں، یعنی ایسے طریقے سے جو انتہائی خُبث اور شیطنت پر مبنی ہے، وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو خبریں آسمانوں کی ملکوت سے آتی ہیں، وہ آپس میں متضاد ہیں اور اس کے نتیجے میں بے اعتبار ہو جاتی ہیں؛ یعنی وہ بنیادی طور پر اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ خواب باطل ہیں اور کہتے ہیں کہ خواب اور ملکوتی خبریں کسی قسم کی کوئی قدر و قیمت اور کوئی حجیت نہیں رکھتے.

جو شخص اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ خواب آسمانوں کے ملکوت سے ہیں اور وہ خواب خدا کا کلام ہیں، تو وہ یقیناً اور قطعاً جانتا ہے کہ تمام خواب ایک ہی مصدر سے نکلتے ہیں اور ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں، کیونکہ یہ سب خدا کے کلمات ہیں، اور نتیجتاً ان کے درمیان کوئی حقیقی تعارض نہیں ہوتا۔ البتہ حقیقی خوابوں اور شیطانی جھوٹ، اوہام اور سفاہت کے درمیان تعارض موجود ہے، جو سب سے پہلے مؤمنوں کے خوابوں پر طعنہ زنی سے شروع ہوتا ہے، پھر آسمانوں کے ملکوت پر طعنہ زنی تک پہنچتا ہے اور بالآخر قرآن کے انکار پر ختم ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا ہے:

(وَقَالُوا لَوْلا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّمَا الآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ ... قُلْ كَفَى بِاللَّهِ بَيْنِي وَ بَيْنَكُمْ شَهِيدًا يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَ الأَرْضِ وَ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوا بِاللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ)[1]

(اور وہ کہتے ہیں: اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے معجزات کیوں نہیں نازل ہوتے؟ کہہ دو: معجزات تو صرف اللہ ہی کے پاس ہیں۔۔۔ کہہ دو: میرے اور تمہارے درمیان اللہ ہی گواہی کے لیے کافی ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور اللہ کا انکار کیا، وہی اصل میں خسارہ اٹھانے والے ہیں).

اس کا جواب بھی صرف اسی طرح واضح ہوتا ہے کہ اُن کی رؤیا اور اُن کے مخالفین کی رؤیا کو خدا کے پچھلے خلیفہ کے اُس نص پر پیش کیا جائے جس کی صفت 'گمراہی سے روکنے والا' ہے۔ پس وہ خواب جو اس نصِ تشخیصی اور پچھلے خلیفہ کی وصیت کے مطابق ہو، سچا ہے، کیونکہ خدا ایک ہے اور اس کا کلام بھی ایک ہے۔ اور وہ خواب جو نص اور پچھلے خلیفہ کی وصیت کے مخالف ہو، جھوٹا ہے یا محض نفسِ شیطانی کے وہم و خیال ہیں۔

1. قرآن کریم، سورہ عنکبوت، آیات 50 - 52۔

بلکہ یہ اس حقیقت کے انکار تک لے جاتا ہے جسے تاریخ نے عیسیٰ (ع)، محمد (ص)، علی (ع)، حسن (ع)، حسین (ع) اور دیگر کے بارے میں مؤمنوں کے لیے خدا کی گواہی کے طور پر نقل کیا ہے.

بالعموم مسئلہ بالکل واضح ہے اور جھٹلانے والوں کے لیے راستہ بند ہے؛ اور جیسا کہ میں نے بیان کیا، ان خوابوں کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیے جن کا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کسی شخص کی خلافتِ الٰہی کے انکار میں دیکھے ہیں، کیونکہ شرعی طور پر جو ثابت ہے وہ یہ ہے کہ خواب خدا کے خلیفہ کی شناخت کے مصداق کے طور پر دلیل بنتا ہے، نہ یہ کہ اسے اس شخص کے انکار یا معارضے میں دلیل بنایا جائے جس کے حق میں سابق خلیفہ کی طرف سے شرعی نص ثابت ہو چکی ہو.

حکیموں کے خواب کو کم عقلوں کے ذریعے حقیر جاننا

خواب دینِ خدای سبحان میں وحی کا ایک طریقہ شمار ہوتا ہے۔ خواب دو قسموں میں تقسیم ہوتا ہے: نیند میں خواب، اور بیداری میں خواب جو عرف میں بیداری کی حالت میں کشف (یا وحی) کہلاتا ہے، اس معنی میں کہ انسان کی آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا جاتا ہے اور وہ وہ چیز دیکھتا ہے جو دوسرے لوگ نہیں دیکھتے۔ دونوں قسم کے خواب انسان کے اعلیٰ عوالم سے رابطے کے عمل کے طور پر شمار ہوتے ہیں۔ انبیاء (ع) پر وحی بھی انہی دو طریقوں سے ہوتی ہے، یعنی یا تو نیند میں خواب ہوتا ہے یا بیداری میں.

یہ مسئلہ باقی رہتا ہے کہ جو شخص خواب کے مقابل ہے، وہی خواب کے مقام اور مرتبے کو متعین کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ خواب براہِ راست خدا کی طرف سے وحی ہو اور پردے کے پیچھے سے ہو، یا یہ کہ وہ وحی ایک بھیجے گئے فرستادے کے ذریعے ہو جسے خدا بھیجتا ہے؛ اور یہ فرستادہ کوئی بڑا فرشتہ جیسے جبرئیل (ع) ہو سکتا ہے، یا خواب کے فرشتوں میں سے کوئی ہو سکتا ہے، یا پھر پچھلے انبیاء (ع) کی ارواح میں سے کوئی ہو سکتا ہے. جس طرح خواب کی ماہیت یہ واضح کرتی ہے کہ آیا یہ خواب وحیِ تبلیغی ہے، جیسے انبیاء اور اوصیاء (ع) کے معاملے میں ہوتا ہے، یا یہ کہ انسان کے پاس الٰہی گواہی ہے، جیسے مکلفین کے ایمان کی حالت انبیاء اور فرستادگان کے بارے میں، جب خداوند سبحان و متعال ان کے لیے گواہی دیتا ہے، یا یہ کہ یہ کسی غیبی امر کی خبر دینا ہے جو کچھ مدت بعد ظاہر ہوتی ہے، جیسا کہ انبیاء اور غیر انبیاء کے معاملے میں ہوتا ہے.

لہٰذا بعض کم عقلوں کی یہ کوشش کہ اس خواب کو حقیر شمار کریں جس میں خدا اپنے خلیفہ کے لیے گواہی دیتا ہے، دراصل خدا کی وحی اور پروردگار کی گواہی کا انکار ہے، بلکہ اس قرآن کے ساتھ کفر ہے جس میں خدا کو سب

لوگوں کے لیے گواہ کے طور پر متعارف کرایا ہے؛ اور کیا خواب سے بڑھ کر کوئی واضح تر وسیلہ ہے جو خدا اور تمام لوگوں کے درمیان اتصال قائم کرتا ہو، جس کا یہ کم عقل مذاق اڑاتے ہیں؟

لہٰذا وہ خواب جو زمین پر خدا کے خلیفہ کی حقانیت کی گواہی دیتا ہے، دراصل خدا کا کلام، وحی، گواہی اور نص ہے۔ جو شخص خدا کے نص، گواہی اور وحی کو اپنی نفسانی خواہش کی رضا کی خاطر حقیر سمجھے، اسے کس چیز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟! سوائے اس کے کہ حقیقت میں وہ خدا کا منکر ہے اور اس کا ایمان، جس کا وہ دعویٰ کرتا ہے، محض ایک ظاہری ایمان ہے؛ ورنہ کیا یہ ممکن ہے کہ کسی ایسے شخص کو، جو کسی انسان کے کلام کو حقیر سمجھے اور اس کا مذاق اڑائے، اس انسان کا مؤمن یا کم از کم اس کا احترام کرنے والا کہا جائے؟ یا حقیقت میں وہ اس شخص کا منکر ہے اور اسے حقیر جانتا ہے اور اسی سبب اس کے کلام کا مذاق اڑاتا ہے۔ جو لوگ خواب کو- جو خدا کی اپنے خلیفہ کی حقانیت پر گواہی ہے- مذاق کا نشانہ بناتے ہیں، بالکل ایسے ہی ہیں؛ یعنی وہ خدا کے کلام کا، جو اس نے اپنے بندوں پر براہِ راست خواب کے ذریعے یا فرشتوں اور پاکیزہ ارواح کے واسطے سے وحی کیا ہے، مذاق اڑاتے ہیں، اور نتیجتاً ان افراد کی حقیقت، باطن اور ارواح خدا کے منکر ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے پاس کوئی چارہ نہیں رہتا سوائے اس کے کہ خدا کے کلام کو منبروں پر اور لوگوں کے سامنے تمسخر کا نشانہ بنائیں، اس کا مذاق اڑائیں اور اس پر ہنسیں؛ اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جو لوگ ان پر اعتراض نہیں کرتے وہ بھی انہی میں شمار ہوتے ہیں اور ان کے باطل عقیدے اور مذہب پر ایمان رکھنے والے سمجھے جاتے ہیں:

(قُلْ كَفَى بِاللَّهِ بَيْنِي وَ بَيْنَكُمْ شَهِيدًا يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَ الأَرْضِ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوا بِاللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ)[1]

(کہہ دو: میرے اور تمہارے درمیان [میری نبوت کی سچائی کے بارے میں] گواہ کے طور پر اللہ ہی کافی ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور جنہوں نے باطل پر ایمان لایا اور اللہ کا انکار کیا، وہی دراصل خسارہ پانے والے ہیں).

جب خدا کی اپنے خلیفہ کی حقانیت پر بندوں کے لیے گواہی وحی کے ذریعے خواب سے آتی ہے، تو پھر وہ "باطل" جس کا ذکر آیتِ شریفہ میں ہے اور جو خدا کی گواہی کے مقابلے میں ہے، کون ہے؟ (قُلْ كَفَى بِاللَّهِ بَيْنِي

1. قرآن کریم، سورہ عنکبوت، آیت 52۔

وَبَيْنَكُمْ شَهِيدًا ... وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ...) کیا یہ واضح نہیں کہ اس باطل سے مراد وہی لوگ ہیں جو خواب کا مذاق اڑاتے ہیں اور نتیجتاً خدا کی گواہی کا تمسخر کرتے ہیں؟!

پڑھو کہ خدا ان لوگوں کو کیسے بیان کرتا ہے جو اہل باطل کی بات سنتے ہیں اور ان کی بات کو، اور ان کے اس تمسخر کو جو اس خواب کے بارے میں ہے جو خدا کی خلیفہ کے حق میں گواہی ہے، قبول کرتے ہیں: (وَ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوا بِاللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ)، (اور جنہوں نے باطل پر ایمان لایا اور اللہ کا انکار کیا، وہی دراصل خسارہ پانے والے ہیں).

پھر اسی سورۂ عنکبوت کی پچھلی آیات میں غور و فکر کریں:

(وَ قَالُوا لَوْلا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّمَا الآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَ إِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُبِينٌ * أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَى عَلَيْهِمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَى لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ * قُلْ كَفَى بِاللَّهِ بَيْنِي وَ بَيْنَكُمْ شَهِيدًا يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَ الأَرْضِ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوا بِاللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ) [1]

(اور وہ کہتے ہیں: اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے معجزات کیوں نہیں نازل ہوتے؟ کہہ دو: معجزات تو صرف اللہ ہی کے پاس ہیں اور میں تو محض صریح ڈر سنانے والا ہوں۔ کیا ان کے لئے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر (وہ) کتاب نازل فرمائی ہے جو ان پر پڑھی جاتی ہے؟! بیشک اس (کتاب) میں رحمت اور نصیحت ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں۔ کہہ دو: میرے اور تمہارے درمیان [میری نبوت کی سچائی کے بارے میں] گواہ کے طور پر اللہ ہی کافی ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور جنہوں نے باطل پر ایمان لایا اور اللہ کا انکار کیا، وہی دراصل خسارہ پانے والے ہیں).

گمراہ فقہا جو انبیاء کے مقابل تھے ہمیشہ یہی بات کہتے تھے کہ ہم صرف مادی معجزے پر ایمان لاتے ہیں، بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ معجزہ لازماً ایسا مادی اور قاہر (مجبور کرنے والا) ہو کہ اسے دیکھ کر رسول کی رسالت کے انکار کی گنجائش نہ رہے، اور ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ وہ قاہر مادی معجزہ (خود) دیکھے اور مؤمنوں کی گواہی کو، جنہوں نے اسے دیکھا ہے، قبول نہیں کرتے: (وَ قَالُوا لَوْلا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِنْ رَبِّهِ)

قرآنی جواب یہ ہے کہ: (قُلْ إِنَّمَا الآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَ إِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُبِينٌ)، یعنی وہ آیات اور معجزات خدا کے پاس ہیں (میرے اختیار میں نہیں) اور میں تو صرف ایک کھلا ڈرانے والا ہوں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا ان

---

1. قرآن کریم، سورہ عنکبوت، آیات 50 - 52۔

معجزات کو ہر اس کے لیے بھیجتا ہے جس کے لیے وہ چاہے، اور جب چاہے، اور جس کیفیت میں چاہے، اور جو اس کی حکمت اور عدل کے موافق ہو، اس طرح کہ کسی کو ایمان لانے پر مجبور نہ کرے۔ اور جب کوئی قاہر (مجبور کرنے والا) معجزہ ہو تو وہ صرف مؤمنین کے لیے ہوگا اور نتیجتًا انہیں بھی ایمان پر مجبور نہیں کرے گا، بلکہ ان کے یقین اور ان کے حق پر استواری کو بڑھائے گا، کیونکہ وہ تو پہلے ہی مؤمن ہیں۔ اور اگر غیر مؤمنوں یا کفار اور منکروں کے لیے ہو تو معجزہ انہی قسم کے معجزات میں سے ہوگا جن کی تاویل ممکن ہے تاکہ ان کے لیے غیب پر ایمان لانے کا موقع باقی رہے:

(فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا لَوْلَا أُوتِيَ مِثْلَ مَا أُوتِيَ مُوسَى أَوَلَمْ يَكْفُرُوا بِمَا أُوتِيَ مُوسَى مِنْ قَبْلُ قَالُوا سِحْرَانِ تَظَاهَرَا وَ قَالُوا إِنَّا بِكُلٍّ كَافِرُونَ) [1]

(پھر جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آ گیا تو انہوں نے کہا: اسے بھی وہی کچھ کیوں نہ دیا گیا جو موسیٰ کو دیا گیا تھا؟ کیا انہوں نے اس سے پہلے موسیٰ کو دی گئی چیز کا انکار نہیں کیا تھا؟ انہوں نے کہا: یہ دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کے مددگار ہیں، اور کہا: ہم تو سب کے سب کے منکر ہیں).

(أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَى عَلَيْهِمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَرَحْمَةً وَ ذِكْرَى لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ) [2]

(کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تم پر یہ کتاب نازل کی جو ان پر پڑھی جاتی ہے؟ یقیناً اس میں رحمت بھی ہے اور نصیحت بھی، ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں (اور یہ ایک بہت واضح معجزہ ہے)).

(قُلْ كَفَى بِاللَّهِ بَيْنِي وَ بَيْنَكُمْ شَهِيدًا يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوا بِاللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ) [3]

(کہہ دو: میرے اور تمہارے درمیان [میری نبوت کی سچائی کے بارے میں] گواہ کے طور پر اللہ ہی کافی ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور جنہوں نے باطل پر ایمان لایا اور اللہ کا انکار کیا، وہی دراصل خسارہ پانے والے ہیں)، یعنی جو کچھ گزر چکا ہے، چاہے قاہر مادی معجزہ طلب کرنا ہو (وَ قَالُوا لَوْلا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِنْ رَبِّهِ) یا وہ علمی نشانی جو خدا نے اپنی رحمت کے سبب تمہیں عطا کی (أَ وَ لَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا

---

1. قرآن کریم، سورہ قصص، آیت 48۔
2. قرآن کریم، سورہ عنکبوت، آیت 51۔
3. قرآن کریم، سورہ عنکبوت، آیت 52۔

عَلَيْکَ الْکِتَابَ يُتْلَى عَلَيْهِمْ) یہ مسئلہ بنیادی طور پر اس مسئلے کے مقابلے میں اضافی ہے جو رسول تمہارے لیے لایا ہے؛ اور آغاز میں: خدا کی گواہی اس کے حق میں اور تمہارے سامنے، خواب اور مکاشفے میں وحی کے ذریعے ہے. (قُلْ كَفَى بِاللَّهِ بَيْنِي وَ بَيْنَكُمْ شَهِيدًا)

وہ خدا جو ہر چیز پر اور بندوں کے اعمال پر گواہ ہے، وہی ہے جو تمہارے لیے گواہی دیتا ہے؛ وہی خدا جو جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے؛ اور شیطان کو خدا کے ملکوت پر کوئی تسلط نہیں کہ کم عقل لوگ تمہیں یہ وہم القا کریں کہ یہ ملکوتی خواب شیطان کی طرف سے ہیں: (يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَ الأَرْضِ).

اے لوگو! جاگ اٹھو؛ بے شک خواب ملکوت سے ہیں:

(وَ كَذَلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ وَ لِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ) [1]

(اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی ملکوت (بادشاہی) دکھائی تاکہ وہ یقین رکھنے والوں میں سے ہو جائے).

اور ملکوت، خدا کا ملکوت ہے:

(قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ) [2]

(کہہ دو: کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے، اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کسی کو پناہ نہیں ملتی، اگر تم علم رکھتے ہو؟).

اور شیطان کو خدا کے ملکوت پر کوئی تسلط نہیں ہے:

(فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ) [3]

(لہٰذا پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی ملکوت (بادشاہی ہے)، اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے).

لہٰذا باطل تمہیں دھوکا نہ دے، چاہے وہ رسولِ خدا (ص) کی مانند ہو اور رسولِ خدا (ص) یا امام حسین (ع) کے منبر پر جا بیٹھے: (وَ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوا بِاللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ). کیا رسولِ

---

1. قرآن کریم، سورہ انعام، آیت 75۔
2. قرآن کریم، سورہ مؤمنون، آیت 88۔
3. قرآن کریم، سورہ یس، آیت 83۔

خدا (ص) نے خبر نہیں دی کہ عنقریب وہ اس کے منبر پر بندروں کی طرح چھلانگ لگائیں گے؟ جب وہ محمد (ص) کے منبر پر، جو خدا کی تمام مخلوقات میں سب سے برتر ہیں، بندروں کی طرح چھلانگ لگاتے ہیں، تو کیا تم گمان کرتے ہو کہ وہ حسین (ع) کے منبر پر بندروں کی طرح نہیں چھلائیں گے؟

(وَ إِذْ قُلْنَا لَكَ إِنَّ رَبَّكَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ وَ مَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ وَ الشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ وَ نُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلاّ طُغْيَانًا كَبِيرًا) [1]

(اور جب ہم نے تم سے کہا: بے شک تمہارا رب لوگوں پر مکمل احاطہ رکھتا ہے، اور وہ خواب جو ہم نے تمہیں دکھایا، اور قرآن میں وہ ملعون درخت، ہم نے انہیں لوگوں کے لیے آزمائش کے سوا کچھ نہیں بنایا۔ اور ہم انہیں ڈراتے ہیں، لیکن اس سے ان میں بڑے طغیان کے سوا کچھ اور اضافہ نہیں ہوتا!).

انہوں نے رسولِ خدا (ص) کے منبر پر حسین (ع) کے گمراہ ہونے کا فتویٰ دیا اور لوگوں کو گمراہ کیا اور ایسا کیا کہ لوگ حسین (ع) کے ساتھ جنگ کرنے لگے۔ کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ آج ان جیسے لوگ حسین (ع) کے منبر پر مہدی (ع) کے گمراہ ہونے کا فتویٰ نہیں دیں گے اور لوگوں کو گمراہ نہیں کریں گے اور ایسا نہیں کریں گے کہ لوگ مہدی (ع) کے ساتھ جنگ کریں؟! جاگ اٹھو، خدا تم پر رحم کرے؛ جاگ اٹھو، پڑھو اور سیکھو اور یہ نہ ہونے دو کہ کوئی تمہیں دھوکا دے اور وہ واقعہ دوبارہ دہرایا جائے؟[2] کیا تم نے سمجھا نہیں کہ وہ تمہیں کہاں لے جا رہے ہیں؟ اور یہ کم عقل جو بلا حساب غلطی کرتے ہیں اور خوابوں اور آسمانوں کے ملکوت کو بے وقوفی کہتے ہیں، وہ تمہیں کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟ کیا آپ ہوشیار نہیں ہوتے کہ ان سے یہ کہیں: یہ قرآن ہمارے ہاتھوں میں ہے اور اللہ اس میں فرماتا ہے کہ اُس نے اپنے خلیفہ کی حقانیت پر لوگوں کے لیے گواہی دی ہے اور نص کیا ہے:

(وَ أَرْسَلْناكَ لِلنَّاسِ رَسُولاً وَ كَفى بِاللَّهِ شَهِيداً) [3]

(اور ہم نے تمہیں لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے، اور گواہ کے طور پر اللہ ہی کافی ہے).

---

1. قرآن کریم، سورہ اسراء، آیت 60۔
2. ملاحظہ کریں: ملحقہ نمبر 5: روایات عُلمائے آخرالزّمان اور وہ لوگ جو مہدی (ع) کی مدد کریں گے۔
3. قرآن کریم، سورہ نساء، آیت 79۔

خدا کی گواہی عام لوگوں (ان کے مؤمن و کافر اور نیک و بد) کے لیے کیسے ہو گی؟ کیا وہ وحی کے ذریعے نہیں ہے؟ اور خدا اور سب لوگوں کے درمیان وحی کا کون سا طریقہ ہے جو خواب کے سوا کھولا گیا ہے؟!

خواب کے مسئلے کا خلاصہ

1. خواب، خدا کے خلیفہ کی حقیقی شناخت کے لیے دلیل ہیں اور اس معاملے کی مضبوط قرآنی وجہ یہ ہے کہ سچے خواب لوگوں کے لیے وحی اور الہی نص ہیں جن کے ذریعے خلیفہ لوگوں کے سامنے اپنا تعارف کراتا ہے اور چونکہ یہ خواب وحی الٰہی سمجھا جاتا ہے اس لیے یہ اس شخص کی خلافت کی دلیل ہیں؛ البتہ اگر وہ اہم شرائط پوری ہو جائیں جو خلیفہ خدا کی پہچان کا باعث بنتی ہیں۔ وہ شرائط یہ ہیں:

الف۔ کیونکہ یہ خدا کے سابق خلیفہ کی طرف سے جاری کردہ تشخیصی الٰہی نص سے مطابقت رکھتا ہے، آدم (ع) کے بعد کسی بھی شخص کے مبینہ خواب جن کے پاس نص اور وصیت نہ ہو اس کی کوئی قیمت نہیں ہے اور ان خوابوں کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آدم (ع) کے بعد ہر خلیفہ نے اپنے اگلے وصی یا وارث کے بارے میں وصیت لکھی ہے۔

ب ۔ان خوابوں کی تواتر (تعدد) ایسے لوگوں کے ساتھ جن کی جھوٹ میں ملی بھگت ناممکن ہے۔

ج۔ خواب کا اس پر شامل ہونا جو اس کے شیطانی ہونے کی نفی کرتا ہے۔، جیسے معصوم کا وجود یا قرآن یا غیب کی خبر۔

د۔ عام طور پر، اسے کسی خاص شخص کے بارے میں نص کرنے میں پختہ اور مستحکم ہونا چاہئے۔

2۔ نص کے خلاف خوابوں کا کوئی حجت نہیں ہے، کیونکہ نص موجود ہونے کے باوجود - جیسا کہ آدم (ع) کے زمانے سے لے کر قیامت تک ہمیشہ ہوتا ہے - خواب ہمیشہ ان نصوص کے تابع ہوتے ہیں، اور کوئی بھی خواب جو سابق خلیفہ کی نص سے باہر ہو یا تو یہ تخیل اور نفسانی ہوا ہے، یا شیطان کی طرف سے ہے یا یہ جھوٹ ہے جسے اس کا مالک جمع کرتا ہے اور وہ بالکل خواب دیکھا نہیں ہے۔ آدم (ع) کے بعد ہر خلیفہ کے پاس ہمیشہ سابق خلیفہ کی نص اور وصیت ہونی چاہیے اور اگر اس کے پاس ایسی نص نہ ہو۔ وہ خواب جو اس کے صاحبان دیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ محض تخیلات اور نفسانی اوھام یا ان کے شیطانوں کی طرف سے وحی ہیں اور ایسے خواب جن کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ ایسے جھوٹوں کے بارے میں دیکھا گیا ہے جن کی کوئی

شرعی وجہ نہیں ہے, یہ صرف جھوٹ ہیں جو کچھ جھوٹوں نے اپنے منحرف مذہب کی تصدیق کے لیے گھڑ لیے ہیں۔

3۔ کسی کی خلافت الٰہی کی نفی میں ایک خواب جس کی (خلافت کی) دلیل قطعی ہے؛ یعنی سابق خلیفہ سے جو الٰہی نص گزری ہے وہ براہ راست یا بالواسطہ ثابت ہے جس کی وضاحت بعد میں کی جائے گی، اس (خواب) کا کوئی حجت نہیں۔

4. خدا کے دین میں، خواب کا کوئی حجت نہیں ہے، نہ عقائد اور نہ احکام، سوائے اس صورت کے کہ نص (قرآن واحادیث) سے ثابت ہو، اور یہ خاص صورت جہاں خواب حجت ہے (جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں) زمین پر خدا کے خلیفہ کی مصداق کو پہچاننے کے معاملے میں ہے؛لہٰذا کسی ایسے دعوے یا عقیدے کی تصدیق کے لیے دعوے کیے گئے خواب جو کسی دلیل پر مبنی نہ ہوں، ان کی کوئی شرعی قیمت نہیں ہے۔مثال کے طور پر غیر معصوم کی تقلید کے عقیدہ اور رسول اللہ (ص) کی خلافت (کا تعیین) شوری کے ذریعہ یا فلان شخص کا حجت ہونا جو خدا کا خلیفہ نہیں ہے؛اور اسی طرح کے منحرف عقائد کہ ان عقائد کے ماننے والوں نے ان کو ثابت کرنے کے لیے نہ کوئی شرعی دلیل پیش کی ہے اور نہ ہی کوئی قابلِ اعتماد عقلی دلیل۔

دوسرا: نص شدہ منتخب شخص پر ماضی کے خلیفہ کی طرف سے براہ راست نص

یہ وہ چیز ہے جس پر الٰہی خلفاء میں تمام مومنین متفق ہیں؛ اس لیے اس کی وصیت پر ایک قطعی شکل میں براہ راست نص ان تمام لوگوں کے لیے جو اس وصیت کو سنتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جن تک یہ نص پہنچتی ہے ایک دلیل ہے۔اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر فرض کیا ہے کہ خود میں سے کچھ افراد کو بھیج دیں کہ وہ اپنے وقت کے خلیفہ سے یہ معاملہ جان لیں اور ان تک خبر پہنچائیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَ لِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ)[1]

(اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سب کے سب مومنین نکل کھڑے ہوں، پھر کیوں نہ ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے تاکہ وہ دین کی سمجھ پیدا کریں اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آئیں تو انہیں تنبیہ کریں تاکہ وہ بچے رہیں)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نص بذات خود خلیفہ خدا کی مصداق کا ایک مستقل ثبوت ہے۔

1-قرآن پاک، سورہ توبہ، آیات 122۔

تیسرا: پچھلے خلیفہ کی طرف سے منتخب منصوص علیہ شخص کے لیے بالواسطہ نص

ماضی کے خلیفہ کا ایک بالواسطہ نص بھی اس نص شدہ شخص کا تعین کرتا ہے بشرطیکہ خود نص میں یا دیگر نصوص میں ایسی خصوصیات اور ہدایات موجود ہوں جو دعوی کرتے وقت نص کو ایک شخص کے علاوہ کسی اور کے ساتھ موافقت سے روکتے ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ (ص) کی وفات کی رات کی وصیت، جسے نبی (ص) نے اس پر تمسک کرنے (چمٹے رہنے) والوں کے لیے گمراہ ہونے سے روکنے کے طور پر وصف کیا گیا ہے۔

یہاں ہم یہ کہتے ہیں کہ: عالم، قادر، صادق ، حکیم، مطلق کو چاہیے کہ اس نص کو محفوظ رکھے، جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "اس کے تمسک کرنے کو گمراہ ہونے سے روکنا" کے طور پر وصف کیا گیا ہے اور کسی جھوٹے دعویدار کو یہ دعویٰ نہ کرنے دیں۔ جب تک اس کے صاحب خود نہ آجائے۔ اور اس کا دعویٰ کرے اور اس وصیت کا مقصد پورا ہو جاہے ورنہ خدا (العیاذ باللہ) یا تو جاہل ہوگا یا نااہل ہوگا یا جھوٹا اور دھوکہ باز ہوگا اور وہ ان لوگوں کی گمراہی کا سبب بنا ہے جو اس کے الفاظ پر قائم ہیں؛ اور خدا کا جاہل یا عاجز ہونا ناممکن ہے، کیونکہ وہ سب کچھ جاننے والا اور قادر مطلق ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جھوٹ کا آنا ناممکن ہے، کیونکہ وہ صادق اور حکیم ہے، اور اسے جھوٹے وصف کرنا ممکن نہیں۔ اس پر، بصورت دیگر، آپ کسی بھی چیز کے بارے میں اس کے الفاظ پر بھروسہ نہیں کر سکتے اور مذہب کی بنیاد پامال ہو جائے گا۔

زمین پر خدا کے خلیفہ کی نص اس کے بعد آنے والے وصی کے لیے اس وصف کے ساتھ کہ وہ نص ہر اس شخص کے لیے گمراہ ہونے سے روکتی ہے جو اس سے چمٹے رہے، ایک الٰہی نص کے طور پر اسے خدا کے جانب سے جھوٹے اور جھوٹے دعویداروں کے دعووں سے محفوظ ہونا چاہیے، جب تک اس کا صاحب اس کا دعوی نہیں کرتا؛ ورنہ وہی نص جھوٹی ہوگی اور باطل کی پیروی کرنے والوں کی گمراہی کا سبب بنے گی اور ایسی بات کبھی بھی عالم، صادق، قادر، حکیم، مطلق سے جاری نہیں ہوگی۔[1]

---

1. مزید وضاحت کے لیے: اگر کوئی شخص جو غیب کا علم رکھتا ہو اور امور کا ذمہ دار ہو آپ سے کہے کہ اگر آپ پانی پینا چاہتے ہیں تو اس حصے سے پی لیں اور میں ضمانت دیتا ہوں کہ تم یہاں سے کبھی زہر نہیں پیو گے؛ پھر اسی حصہ سے زہر پیتے ہو، تو وہ کس چیز کا ضامن ہے؟ یا تو وہ جاہل تھا، یا وہ بنیادی طور پر جھوٹا تھا، یا وہ ضمانت دینے اور اسے پورا کرنے سے قاصر تھا، یا اس نے جھوٹا وعدہ کیا تھا۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ جو شخص خدا پر یقین رکھتا ہو وہ خدا کو جہالت، جھوٹ، نااہلی، یا خلف وعدوں سے وصف کرے؟! خدا ان کوتاہیوں اور عیبوں سے پاک ہے۔

قرآن کریم میں اور اہل بیت (ع) سے منقول احادیث میں خدا نے اپنے آپ کو اہل باطل کے دعووں اور چوری سے الٰہی نص کی حفاظت کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے؛ اہل باطل کو اس کا دعویٰ کرنے سے روک دیا گیا ہے اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ایسی چیز ممنوع ہے:

(وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الأقَاوِيلِ * لأخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ * ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ) [1]

(اگر یہ پیغمبر ہماری نسبت کوئی بات جھوٹ بنالاتے۔ تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے۔ پھر ان کی رگ گردن کاٹ ڈالتے)۔ [2]

---

1. قرآن پاک، سورہ الحاقہ، آیات 44-46۔

2. خدا کے لئے مطلق جھوٹ باندھنا ہمیشہ موجود ہے؛ لیکن ایسا نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے روک دیا ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ خدا جھوٹوں کو براہ راست تباہ کرے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں تھوڑی دیر کے لیے موقع دے گا۔ یہ مسئلہ ان تمام لوگوں کو معلوم ہے جنہوں نے ظاہر البطلان (جس کا باطل ہونا ظاہر ہے) کی دعوتوں میں تلاش کیا ہے؛ جیسے مسیلمہ کی دعوت۔ تو یقینی طور پر آیت کا مطلب مطلق طور پر خدا پر جھوٹ باندھنا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے اس کلام کا دعوی کرنے سے خدا پر جھوٹ باندھنا جس کے ساتھ دلیل قائم کی جاتی ہے۔ اس وقت یہ بات یقینی ہے کہ خدا اس کلام الٰہی کے دفاع کے لیے مداخلت کرتا ہے جس سے ثبوت قائم ہوتا ہے۔ اور وہ کلام وہ الٰہی نص ہے جو خدا کا خلیفہ اپنے بعد کے خلیفہ کو پہچاننے کے لیے ہم تک پہنچاتا ہے، اور اسے "گمراہ ہونے سے روکنے" کے طور پر وصف کیا گیا ہے، کیونکہ اس وقت خدا کے ساتھ مداخلت نہ کرنا حکمت کے خلاف ہے۔ اور اس قول یا نص کی مثال حضرت عیسیٰ (ع) کی وصیت اللہ کے رسول محمد (ص) کے لیے اور رسول اللہ (ص) کی وصیت ائمہ و مہدیین (ع) کے لیے ہے۔ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ایسا جھوٹ باندھنا ناممکن ہے اور اس کے نتیجے میں یہ نص اس کے صاحب کے لیے محفوظ ہے اور کوئی دوسرا اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ ایک الٰہی نص ہے جسے خدا کی طرف سے محفوظ کیا جانا چاہئے تاکہ یہ اس کے صاحب تک پہنچ جائے؛ لہٰذا وہ الٰہی نص کسی بھی موثر عامل کی مداخلت سے محفوظ ہے، خواہ یہ مداخلت ان خلفاء تک پہنچانے کے مرحلے میں ہو جو اسے پہنچادے گا یا ان خلفاء تک پہنچنے کے مرحلے میں ہوں جو جلد اس کا دعویٰ کرے گا۔

اس حقیقت کو بیان کرنے والی روایات موجود ہیں کہ اس آیت میں جھوٹ باندھنے کا تعلق نص الٰہی کے مسئلہ سے ہے:

(عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْفُضَيْلِ عَنْ أَبِي الْحَسَنِ (ع) قَالَ: (سَأَلْتُهُ عَنْ قَوْلِ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ «يُرِيدُونَ لِيُطْفِؤُا نُورَ اللَّهِ بِأَفْواهِهِمْ». قَالَ يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا وَلَايَةَ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ (ع) بِأَفْوَاهِهِمْ. قُلْتُ وَ اللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ. قَالَ وَ اللَّهُ مُتِمُّ الْإِمَامَةِ ... قُلْتُ قَوْلُهُ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ. قَالَ يَعْنِي جَبْرَئِيلَ عَنِ اللَّهِ فِي وَلَايَةِ عَلِيٍّ (ع) قَالَ قُلْتُ وَ ما هُوَ بِقَوْلِ شاعِرٍ قَلِيلًا ما تُؤْمِنُونَ قَالَ قَالُوا إِنَّ مُحَمَّداً كَذَّابٌ عَلَى رَبِّهِ وَ مَا أَمَرَهُ اللَّهُ بِهَذَا فِي عَلِيٍّ فَأَنْزَلَ اللَّهُ بِذَلِكَ قُرْآناً فَقَالَ إِنَّ وَلَايَةَ عَلِيٍّ تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعالَمِينَ. وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنا مُحَمَّدٌ بَعْضَ الْأَقاوِيلِ. لَأَخَذْنا مِنْهُ بِالْيَمِينِ. ثُمَّ لَقَطَعْنا مِنْهُ الْوَتِينَ) (الکافی، ج1، ص433)

(محمد بن فضیل نے امام کاظم (ع) سے آیت «يُرِيدُونَ لِيُطْفِؤُا نُورَ اللَّهِ بِأَفْواهِهِمْ» کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے فرمایا: اس کا مطلب ہے کہ وہ امیر المومنین (ع) کی ولایت کو اپنے منہ سے بجھا دینا چاہتے ہیں۔ میں نے پوچھا: «وَ اللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ» ؟ انھوں نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا امامت کو مکمل کرتا ہے... میں نے پوچھا: «إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ» ؟ انھوں نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہے کہ جبرائیل خدا سے علی کی ولایت کے بارے میں بتاتے ہیں۔ میں نے پوچھا: « وَ ما هُوَ بِقَوْلِ شاعِرٍ * قَلِيلًا ما تُؤْمِنُونَ »؟ انھوں نے فرمایا: اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے کہا کہ محمد (ص) خدا پر جھوٹ باندھ رہے ہیں اور خدا نے علی (ع) کی جانشینی کے بارے میں ایسا حکم نہیں دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسی

امام صادق (ع) فرماتے ہیں:

(إِنَّ هَذَا الْأَمْرَ لَا يَدَّعِيهِ غَيْرُ صَاحِبِهِ إِلَّا تَبَرَ اللَّهُ عُمرَهُ)[1]

(اس کے صاحب کے علاوہ کوئی بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا جب تک کہ خدا اس کی زندگی کاٹ نہ دے)۔

لہٰذا، جھوٹے دعویٰ کرنے والے کو الٰہی نص کا دعویٰ کرنے سے روک دیا گیا ہے، جسے "تمسک کرنے (چمٹے رہنے) والوں کو گمراہی سے روکنے" کے طور پر وصف کیا گیا ہے۔ یا یہ کہ اس کا وصیت کا دعویٰ اس کی تباہی کے مترادف ہے، اس سے پہلے کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنا دعویٰ ظاہر کرے، کیونکہ اسے مہلت دینا، جبکہ وہ وصیت کا دعویٰ کر رہا ہے، یا تو اس شخص کی جہالت، عاجزی، یا جھوٹا ہونے کے معنی میں ہے جس نے وصیت کو تھامنے والوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے ذریعے گمراہ نہیں ہوں گے۔ اور یہ سب چیزیں مطلق حق (اللہ تعالی) کے درگاہ میں ناممکن ہیں اور اسی وجہ سے فرمایا: (أَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ * ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ) اور امام صادق (ع) نے فرمایا: "خدا اس کی جان کاٹ دے گا"۔

مزید وضاحت کے لیے کہتا ہوں: یہ آیت سابقہ عقلی دلیل کے مطابق ہے، یعنی جھوٹے دعویدار کی طرف سے وصیت کا دعویٰ کرنا ناممکن ہے، کیونکہ خدا فرماتا ہے: (وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ * أَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ * ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ)، (اگر یہ پیغمبر ہماری نسبت کوئی بات جھوٹ بنا لاتے۔ تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے ۔ پھر ان کی رگ گردن کاٹ ڈالتے)۔ یعنی ہم جانتے ہیں کہ خدا کے رسول کی ہلاکت اور فنا ناممکن ہے، کیونکہ ان کے لیے خدا پر جھوٹ باندھنا ناممکن ہے، یعنی اگر وہ جھوٹ باندھنے والوں سے ہوتا تو یقیناً ہلاک ہو جاتا۔ یہ آیت ان لوگوں سے مخاطب ہے جو محمد (ص) اور قرآن کو نہیں مانتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آیت میں اس لفظ کے ساتھ دلیل لانا اس لیے نہیں ہے کہ یہ آیت خدا کا کلام ہے، کیونکہ وہ اس آیت کو بھی نہیں مانتے، بلکہ حجت اور دلیل آیت کے مواد پر مبنی ہے، یعنی کسی چیز سے استدلال جو عقلی نقطہ نظر سے ان کے لیے طے شدہ

لیے قرآن (آیت) بھیجا اور فرمایا: بے شک علی کی ولایت «تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعالَمِينَ» رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ «وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنا مُحَمَّدٌ بَعْضَ الْأَقاوِيلِ» اور اگر محمد (ص) ہم سے ایسے الفاظ کہتے (جھوٹ باندھتے) تو ہم اسے سختی سے پکڑ لیتے اور اس کی گردن کی رگ کاٹ دیتے)۔

1. الکافی، کلینی، جلد 1 ص۔373۔

اور یقینی ہے؛ الٰہی نص جس کو "اس سے تمسک کرنے والوں کو گمراہ ہونے سے روکنا" کے طور پر وصف کیا گیا ہے اس کا دعویٰ اس کے مالک کے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ تسلیم کرنا کہ اس نص کے صاحب کے علاوہ کوئی اور دعویٰ کر سکتا ہے اس کے لیے جہالت یا نااہلی یا جھوٹ کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کی ضرورت ہے۔

لہٰذا عقلی، قرآنی اور روایتی نقطۂ نظر سے یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک جھوٹے دعویدار کے لیے الٰہی تشخیصی نص کا دعویٰ کیا جائے جسے "اس سے تمسک کرنے والوں کو گمراہ ہونے سے روکنا" کے طور پر وصف کیا گیا ہے۔ یعنی یہ نص دوسروں کے دعووں سے محفوظ رہتی ہے جب تک کہ اس کا صاحب اس کا دعویٰ نہ کرے، تاکہ نص کا مقصد، جو نص پر قائم رہنے والے کو گمراہ ہونے سے روکنا ہے، پورا ہو، جیسا کہ خدا نے وعدہ کیا ہے۔[1]

---

1. وہ جو الٰہی منصب کا دعویٰ کرتا ہے:

- یا تشخیصی نص کے دعویدار کو "اس پر تمسک کرنے والوں کو گمراہ ہونے سے روکنا" کے طور پر وصف کیا گیا ہے، اس صورت میں وہ حق کا دعویدار ہے۔ اور اس کا جھوٹا یا باطل ہونا ممکن نہیں ہے، کیونکہ یہ نص یقیناً جھوٹوں اور باطل کے دعووں سے محفوظ ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو کسی ایسی چیز پر قائم رہنے کا حکم دیا ہے جو انہیں گمراہ کر دے، اور اس کے باوجود یہ نص "گمراہ ہونے سے روکنے والی" کے طور پر وصف کیا گیا ہے اور یہ ایک ایسا جھوٹ ہے جسے خدا کی طرف سے جاری کرنا ناممکن ہے۔

- یا وہ الٰہی مقام کا دعویدار ہے، لیکن وہ تشخیصی نص کا دعویدار نہیں ہے جس کو "اس پر تمسک کرنے والوں کو گمراہ ہونے سے روکنا" کے طور پر وصف کیا گیا ہے، اور یہ دعویدار یا اس کا دعویٰ ایسا ہے کہ بعض مکلفین کے لیے بعض امور کی نسبت اپنی لاعلمی کی وجہ سے شکوک و شبہات کو جنم دیتی ہیں۔ شاید خدا اس کے بارے میں قرآن کی اس آیت کو نافذ کرے اور اسے اپنے بندوں کے لیے رحمت سے ہلاک کرے؛ اگرچہ اس کے دعویٰ کا اعلان کرنے کے بعد کچھ عرصہ گزر جائے، جب کہ اس کے پیروکاروں کے لیے کوئی دلیل یا عذر نہیں ہے، یا کہ اس بات کا امکان نہیں کہ وہ کسی کو شک میں مبتلا کر دے جب تک کہ وہ خود باطل کا طالب نہ ہو اور نتیجتاً وہ بغیر کسی نص تشخیصی کے اس (مدعی) کی بات مان لے اور ساتھ ہی اس (مدعی) کی طرف سے بہت سی حماقتیں جاری ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کا جھوٹ لوگوں پر ظاہر کر دیتا ہے، لیکن کوئی وجہ نہیں کہ آیت کریمہ اس پر لاگو ہو، لیکن شاید خدا اسے ایک طویل وقت دیں؛ پس وہ ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے جو اپنی حماقت سے جھوٹ کی تلاش کرتے ہیں۔

مزید وضاحت کے لیے، میں ایک مثال دیتا ہوں:

تین دائرے ہیں: سفید، سرمئی اور سیاہ۔

سفید دائرہ, محفوظ اور حمایت شدہ ہے اور کوئی جھوٹا اس میں داخل نہیں ہو سکتا اور اس کے نتیجے میں جو بھی اس میں داخل ہوتا ہے وہ سچا دعویدار ہے۔ ہمیں اس کی تصدیق کرنی ہوگی۔ آیات مبارکہ: (لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ * لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ * ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ) یہ یقینی طور پر اس دائرے پر منطبق (موافق) ہے۔

سرمئی دائرہ، جھوٹوں کے داخلے سے محفوظ نہیں؛ تو کیا اس میں موجود کسی پر بھی بھروسہ اور اعتراف کیا جا سکتا ہے؟! بے شک، بعض اوقات جھوٹوں کے داخلے کی حفاظت کا امکان ہے؛ یہ صرف بندوں پر خدا کی رحمت کی وجہ سے ہے، حالانکہ ان کے پاس اس کے اندر موجود لوگوں کی اطاعت کے لیے کوئی عذر نہیں ہے۔ لہٰذا مبارکہ آیت اس دائرے پر منطبق ہو سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس پر لاگو ہو۔

آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہم تشخیصی نص کے دعوے کے بارے میں بات کر رہے ہیں جسے "گمراہ ہونے سے روکنا" کے طور پر وصف کیا گیا ہے، عام طور پر الٰہی منصب کے دعوے کے بارے میں نہیں؛ کیونکہ زمین پر خدائی عہدہ یا نبوت یا خلافت کا دعویٰ جھوٹا اور احمقانہ طور پر اور وصیت (تشخیصی نص) سے استدلال کیے بغیر بہت بار واقع ہو چکا ہے اور شاید امامت کا جھوٹا دعویدار طویل عرصے تک زندہ رہا ہو [1]؛ لہٰذا، خدا کی گواہی اور الٰہی نص اور وصیت کے بغیر دعویٰ کی کوئی قیمت نہیں اور یہ ایک احمقانہ دعویٰ ہے۔ لہٰذا جو بھی اس قسم کے جھوٹے دعوے کو تسلیم کرتا ہے اس کے پاس خدا کے سامنے کوئی عذر نہیں ہے۔

لہٰذا، ہمارا مقصد دعویداروں کے دعووں کی قطعی ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ، اس نے انہیں تشخیصی نص کا دعویٰ کرنے سے روک دیا کہ جس کی صفت ہے کہ "جو لوگ اس سے چمٹے رہے انہیں گمراہ ہونے سے روکتے ہیں" اور یہی وصیت عوام کے لیے دلیل ہے۔اور یہ محال ہونا جسے ہم نے عقل کے ساتھ ثابت کیا اور قرآنی نص اور روایات بھی اس پر تاکید کرتی ہیں؛ بیرونی حقیقت بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ کیونکہ سینکڑوں سال اس تشخیصی نص سے بغیر کسی دعوے کے گزر چکے ہیں اور اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے یہی کافی ہے۔

تورات میں پیغمبروں کی وصیت اور عیسیٰ (ع) کی وصیت پر سینکڑوں سال گزر چکے ہیں، اور محمد (ص) اور ان کے بعد کے اوصیاء کے علاوہ کسی نے اس کا دعویٰ نہیں کیا، جس طرح ائمہ (ع) کے علاوہ کسی نے پیغمبر (ص) کی وصیت کا دعویٰ نہیں کیا، اور امام رضا (ع) جاثلیق نصرانی کے خلاف اس حقیقت سے استدلال کیا، یعنی تورات اور بائبل سے رسول اللہ (ص) کے بارے میں ماضی کے انبیاء کی نص بیان کرنے کے بعد، جاثلیق نصرانی نے دلیل دی کہ یہ نصوص ایک سے زیادہ افراد پر لاگو ہو سکتی ہیں۔ امام رضا (ع) کا جاثلیق کو جواب اور دلیل یہ تھی کہ ایسی چیز یعنی جھوٹے دعویداروں کی وصیت کا دعویٰ آج تک پورا نہیں ہوا۔ روایت کے اس حصے پر غور کریں:

تیسرا حلقہ سیاہ ہے اور یہ جھوٹ بولنے والوں کے داخل ہونے سے کسی بھی طرح محفوظ نہیں ہے، بلکہ بنیادی طور پر یہ دائرہ جھوٹوں کا ہے اور یہ واضح ہے کہ یہ دائرہ جھوٹوں کے لیے ہے، اس لیے جھوٹوں سے اس کی حمایت اور حفاظت کی کوئی وجہ نہیں، نہ کہ ان کے آنے سے پہلے اور ان کے آنے کے بعد۔ نتیجتاً آیتِ کریمہ کا مقام اس دائرے میں نہیں ہے۔

1. مسیلمہ کذاب ان کی ایک مثال ہے۔ رسول اللہ (ص) کی زندگی میں، اس نے نبوت کا دعویٰ کیا، اور وہ رسول اللہ (ص) کی وفات تک زندہ رہے۔

(...وَلَكِنْ لَمْ يَتَقَرَّرْ عِنْدَنَا بِالصِّحَّةِ أَنَّهُ مُحَمَّدٌ هَذَا. فَأَمَّا اسْمُهُ فَمُحَمَّدٌ فَلَا يَجُوزُ لَنَا أَنْ نُقِرَّ لَكُمْ بِنُبُوَّتِهِ وَ نَحْنُ شَاكُّونَ أَنَّهُ مُحَمَّدُكُمْ .... فَقَالَ الرِّضَا: احْتَجَجْتُمْ بِالشَّكِّ؟! فَهَلْ بَعَثَ اللَّهُ مِن قَبْلُ أَوْ مِن بَعْدُ مِنْ آدَمَ إِلَى يَوْمِنَا هَذَا نَبِيّاً اسْمُهُ مُحَمَّدٌ؟ أَوْ تَجِدُونَهُ فِي شَيْءٍ مِنَ الْكُتُبِ الَّذِي أَنْزَلَهَا اللَّهُ عَلَى جَمِيعِ الْأَنْبِيَاءِ غَيْرَ مُحَمَّدٍ؟ فَأَحْجَمُوا عَنْ جَوَابِه...) [1]

جاثلیق نے کہا: (ہم جانتے ہیں کہ بائبل مقدس میں محمد کا نام آیا ہے، لیکن ہمارے لیے صحیح طور پر یہ ثابت نہیں ہوا کہ اس سے آپ کا محمد مراد ہے۔ لیکن صرف اس لیے کہ ان کا نام محمد (ص) ہے، ہم ان کی نبوت کو قبول نہیں کر سکتے جب کہ ہمیں شک ہے کہ آیا وہ آپ کے محمد ہیں؟ امام رضا (ع) نے فرمایا: تم نے شک پر احتجاج کیا؟! کیا خدا نے آدم سے پہلے یا بعد میں آج تک کوئی نبی بھیجا ہے جس کا نام محمد (ص) ہے؟! یا ان کتابوں میں سے جو خدا نے تمام انبیاء پر نازل کیں کیا تم نے ہمارے نبی محمد (ص) کے علاوہ کوئی اور پایا ہے؟! یہیں وہ امام رضا (ع) کو جواب دینے سے رہ گئے)۔

لہٰذا ماضی کے انبیاء کو اس نص سے دلیل لانا، ان کے ماننے والوں کے لیے ایک حجت ہے اور حضرت عیسیٰ (ع) اور محمد (ص) نے ماضی کے انبیاء کی نص سے استدلال کیا؛ حضرت عیسیٰ (ع) نے ماضی کے انبیاء کی نص سے استدلال کیا، حالانکہ وہ وقت کے لحاظ سے ان سے دور تھے:

(پھر سِفر (صحیفہ) اشعیای نبی اُس کے سپرد کی، اور جب اُس نے اُس سِفر کو کھولا تو وہ جگہ پائی جہاں لکھا تھا: * پروردگار کی روح میرے اوپر ہے، کیونکہ اُس نے مجھے مسح کیا ہے تاکہ میں مسکینوں کو خوشخبری دوں؛ اُس نے مجھے بھیجا ہے تاکہ دل شکستہ لوگوں کو شفا دوں، قیدیوں کے لیے آزادی کی پکار بلند کروں اور اندھوں کے لیے بینائی کی پکار، اور قیدی بنائے گئے لوگوں کو آزادی میں بھیجوں * اور میں نصیحت کروں پروردگار کے پسندیدہ طریقے سے * پھر اُس سِفر کو لپیٹ دیا اور خادم کے حوالے کر دیا، جبکہ وہاں موجود سب لوگوں کی نظریں اُس پر جمی ہوئی تھیں * پھر اُس نے آغاز کیا اور اُن سے کہا: آج یہ تحریر تمہارے کانوں میں پورا ہوا * اور سب اُس کو دیکھ رہے تھے اور اُن نعمت کے الفاظ پر تعجب کر رہے تھے جو اُس کی منہ سے نکل رہے تھے، اور کہتے تھے: کیا یہ یوسف کا بیٹا نہیں ہے؟) [2]

---

1. بحار الانوار، جلد 49، ص 76؛ اثبات الہداہ، جلد 1، ص 194-195۔
2. انجیل لوقا 4، (17 - 22)۔

محمد (ص) نے عیسیٰ (ع) اور اس سے پہلے کے انبیاء کی نص سے استدلال فرمایا۔ جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے۔

(وَ إِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رسول‌الله إِلَيْكُمْ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُبِينٌ) [1]

(اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب مریم (ع) کے بیٹے عیسیٰ نے کہا کے اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں (اور) جو (کتاب) مجھ سے پہلے آچکی ہے (یعنی) تورات اس کی تصدیق کرتا ہوں اور ایک پیغمبر جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام احمد (ص) ہوگا ان کی بشارت سناتا ہوں۔ (پھر) جب وہ ان لوگوں کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تو کہنے لگے کہ یہ تو صریح جادو ہے)۔

(الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَ الْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَ يَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَ الْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَ عَزَّرُوهُ وَ نَصَرُوهُ وَ اتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ)[2]

(جو لوگ کہ رسولِ نبی امّی کا اتباع کرتے ہیں جس کا ذکر اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں کہ وہ نیکیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے اور پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور ان پر سے احکام کے سنگین بوجھ اور قید وبند کو اٹھا دیتا ہے پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اس کا احترام کیا اس کی امداد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو اس کے ساتھ نازل ہوا ہے وہی در حقیقت فلاح یافتہ اور کامیاب ہیں)۔

اور خدا نے قرآن میں بیان کیا ہے کہ اگر محمد (ص) کا دعویٰ جھوٹا ہوتا (العیاذ باللہ) تو وہ اسے اس نص کا دعویٰ کرنے کے لیے نہ چھوڑتا، کیونکہ خدا، جھوٹے دعویداروں کے دعووں سے اس نص کی حفاظت اور تحفظ کا ذمہ دار ہے، اور خدا ان کو نص سے روکنے کا ذمہ دار ہے:

(وَ لا طَعَامٌ إِلا مِنْ غِسْلِينٍ * لا يَأْكُلُهُ إِلا الْخَاطِئُونَ * فَلا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُونَ* وَمَا لا تُبْصِرُونَ *إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ * وَ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلا مَا تُؤْمِنُونَ * وَ لا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلا مَا تَذَكَّرُونَ * تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ * وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الأَقَاوِيلِ * لأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ * ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ * فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ * وَ إِنَّهُ لَتَذْكِرَةٌ لِلْمُتَّقِينَ * وَ إِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنْكُمْ مُكَذِّبِينَ * وَ إِنَّهُ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ

1-. قرآن پاک، سورہ صف، آیت 6۔

2. قرآن پاک، سورہ اعراف، آیت 157۔

* وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ*فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ) [1]

(اور نہ پیپ کے علاوہ کوئی غذا ہے۔ جسے گنہگاروں کے علاوہ کوئی نہیں کھاتا۔ میں اس کی بھی قسم کھاتا ہوں جسے تم دیکھ رہے ہو۔ اور اس کی بھی جس کو نہیں دیکھ رہے ہو۔ یقینا یہ ایک کریم رسول کا قول ہے اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے ہاں تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔ اور یہ کسی کاہن کا کلام نہیں ہے جس پر تم بہت کم غور کرتے ہو۔ یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔ اور اگر یہ پیغمبر ہماری طرف سے کوئی بات گڑھ لیتا ۔ تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے ۔ پھر اس کی شہ رگ کاٹ دیتے۔ پھر تم میں سے کوئی مجھے روکنے والا نہ ہوتا۔ اور یہ قرآن صاحبانِ تقویٰ کے لئے نصیحت ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے جھٹلانے والے بھی ہیں ۔ اور یہ کافرین کے لئے باعث حسرت ہے۔ اور کچھ شک نہیں کہ یہ برحق قابل یقین ہے۔ لہٰذا آپ اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کریں)۔

دوسرا: علم

خدا کا خلیفہ وہ عالم ہے جو اپنے سوا کسی اور سے بے نیاز ہو سکتا ہے اور لوگوں میں سے کوئی بھی اس سے اور اس کے علم سے بے نیاز نہیں ہے، کیونکہ جو کچھ دین میں واقع ہوتا ہے اور جو کچھ اس کے زمانے کے لوگوں کو دین کے معاملے میں درکار ہوتا ہے خدا اس پر وحی کرتا ہے۔ یہاں جو علم خلیفہ خدا کے ساتھ ہونی چاہئے اس کا مفہوم علم دین ہے کہ خدا کا خلیفہ اس کو لوگوں تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ لہٰذا، خدا کے خلیفہ کا خدا سے جڑا ہونا ضروری ہے، اور خدا جو کچھ اسے اپنے مشن کی تبلیغ اور خدا کی رضا والے سچے دین کو لانے، نئے آسمانی احکام، فصل الخطاب (ہر وہ فصیح و بلیغ کلام جو حق کو باطل سے الگ کرتا ہے)، اور لوگوں کے اختلافات کو دور کرنے کے لئے ضروری ہو سکھائے گا۔

وہی چیز- یعنی نئے امور کا علم اور فصل الخطاب اور لوگوں کے علمی تنازعات کا حل- حق کے طالب شخص کے لیے خدا کے خلیفہ کی پہچان کا ثبوت ہو سکتا ہے جو نص اور وصیت کے ثبوت کی تصدیق کرتا ہے۔ خُدا کے خلیفہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ استنباطی یا تجرباتی علوم یا ماضی کے دینی علوم سے بھی واقف ہو، جیسے کہ ماضی کے خلفاء کے مشن، بلکہ خُدا کے خلیفہ کے لیے صرف ضروری علم یہ ہے کہ وہ خدا سے جڑا ہوا ہو اور اللہ رب العزت اسے سب سے پہلی چیز سکھائے جس کی اسے اپنے مشن میں ضرورت ہے۔ اور یہ اس معنی میں نہیں

---

1. قرآن کریم، سورہ الحاقۃ، آیات 36 - 52۔

کہ وہ ماضی کے خلفائے کے مشنوں یا تجرباتی اور استنباطی علوم سے ناواقف ہو، لیکن ان چیزوں اور ان کی تفصیلات کو جاننا اس پر واجب نہیں ہے۔اس لیے ممکن ہے کہ وہ بعض اوقات انہیں تعلیم کے ذریعے یا الٰہی الہام سے یا دونوں طریقوں سے جانتا ہو، یعنی دوسرے لوگوں کی طرح وہ ان کو مثال کے طور پر، پڑھ کر سیکھتا ہو، لیکن خدا اسے اس لحاظ سے احسان کر دیتا ہے چونکہ وہ خدا کا خلیفہ ہے اس لئے وہ اسے الہام کرتا ہے۔ بالخصوص اگر معاملہ دین سے متعلق ہو، جیسے کہ خدا تعالیٰ کے وجود کو ثابت کرنا یا عام طور پر دین کا دفاع کرنا۔

لیکن بعض حاشیہ آرائی کرنے والوں (ضمنی کرداروں) کے مضحکہ خیز عقائد جو کہتے ہیں کہ خدا کے خلیفہ کو تمام زبانوں کا علم ہونا چاہیے اور زبان کا معصوم ہونا چاہیے اور اس طرح کے جاہلانہ عقائد (مثال کے طور پر) یہ کہنا کہ جب وہ پتھر پر چلتا ہے تو اس پر اثر ہوتا ہے اور اس کے قدموں کے نشان باقی رہ جاتے ہیں اور... عنقریب ان باطل عقائد کا جواب اور ان باتوں پر ایمان لانے والوں کی جہالت بیان کی جائے گی۔

شاید خدا کا خلیفہ اپنی خلافت کے دور میں کسی وقت خاموش رہنے پر مجبور ہو جائے جیسا کہ فترت کے دور میں ایسا ہے اور اپنے علم کا اظہار نہ کرے اور فترت کا مسئلہ اور اس کی وجہ پہلے ہی بیان کر چکا ہوں جس میں حق کی دعوت کو قبول کرنے والے کے عدم موجودگی پر مشتمل ہو، یا یہ ممکن ہے کہ وہ اس ضرورت کی وجہ سے خاموش ہو جو خدا نے چاہا، گویا وہ اپنا اولین فرض ادا کر رہا ہے، جو اس شخص کو تیار کرنا ہے جس تک خلافت پہنچنا ہے، کیونکہ خلافت الٰہی کو سپرد کرنا ایک امانت ہے جس کا حکم خدا نے اپنے خلیفہ کو دیا ہے۔ اور اسے چاہیے کہ اس کے لیے ہر ممکن تیاری کرے کہ اس معاملے (خلافت الٰہی کی امانت کو سپرد کرنے) کو بہترین طریقے سے انجام دیا جائے کہ لوگوں کے سامنے ثبوت پیش کیے جائیں (حجت تمام ہو) اور ان کی خلاف ورزی کرنے والے کے لیے شیطان کی راہ پر چلنے اور خدا کے دین یا آئندہ خلیفہ کی خلاف ورزی کرنے کا کوئی عذر نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا) [1]

(بیشک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل تک پہنچادو اور جب کوئی فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو اللہ تمہیں بہترین نصیحت کرتا ہے بیشک اللہ سمیع بھی ہے اور بصیر بھی)۔

اس آیت کا مفہوم اگلے خلیفہ کو خلافت الٰہی کا سپرد کرنا ہے، ایک فریضہ جو ماضی کے خلیفہ کو مکمل طور پر پورا کرنا چاہیے؛ کیونکہ ایک خدائی امانت اس کی گردن پر ہے اور اس وجہ سے وہ بعض اوقات اپنی جان بچانے کے لیے اس وقت تک خاموش رہنے پر مجبور ہوتا ہے جب تک کہ اگلے خلیفہ سے متعلق کچھ معاملات تیار نہ ہو جائیں، یا کم از کم اس کی پیدائش کے وقت تک۔ درج ذیل احادیث اس مسئلہ کی وضاحت کرتی ہیں:

(الْحُسَيْنُ بْنُ مُحَمَّدٍ عَنْ مُعَلَّى بْنِ مُحَمَّدٍ عَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ الْوَشَّاءِ عَنْ أَحْمَدَ بْنِ عَائِذٍ عَنِ ابْنِ أُذَيْنَةَ عَنْ بُرَيْدٍ الْعِجْلِيِّ قَالَ: سَأَلْتُ أَبَا جَعْفَرٍ (ع) عَنْ قَوْلِ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ «إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمانات إِلى أَهْلِها وَ إِذا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ» قَالَ إِيَّانَا عَنَى أَنْ يُؤَدِّيَ الْأَوَّلُ إِلَى الْإِمَامِ الَّذِي بَعْدَهُ الْكُتُبَ وَ الْعِلْمَ وَ السِّلَاحَ «وَ إِذا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ» الَّذِي فِي أَيْدِيكُمْ ثُمَّ قَالَ لِلنَّاسِ «يا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ» إِيَّانَا عَنَى خَاصَّةً. أَمَرَ جَمِيعَ الْمُؤْمِنِينَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ بِطَاعَتِنَا فَإِنْ خِفْتُمْ تَنَازُعاً فِي أَمْرٍ «فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَ إِلَى الرَّسُولِ وَ إِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ» كَذَا نَزَلَتْ وَ كَيْفَ يَأْمُرُهُمُ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ بِطَاعَةِ وُلَاةِ الْأَمْرِ وَ يُرَخِّصُ فِي مُنَازَعَتِهِمْ إِنَّمَا قِيلَ ذَلِكَ لِلْمَأْمُورِينَ الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ «أَطِيعُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ أُولِي الأَمْرِ مِنْكُمْ») [2]

برید عجلی کہتے ہیں: میں نے امام باقر (ع) سے اس آیت (خدا آپ کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اپنے لوگوں تک پہنچادو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو) کے بارے میں پوچھا: انھوں نے فرمایا: یہ صرف ہمارے بارے میں ہے کہ ہر امام اپنے بعد کے امام کو کتابیں، علم اور ہتھیار دے۔ (اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل سے فیصلہ کرو) یعنی جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ پھر خدا نے لوگوں سے فرمایا: (اے ایمان والو! خدا اور رسول اور اپنے اولو الامر کی اطاعت کرو)۔ یہ آیت صرف ہمارے بارے میں اور تمام مومنین کو حکم دیا کہ وہ قیامت تک ہماری اطاعت کریں۔ پس اگر تم ڈرتے ہو کہ تم کسی چیز میں نزاع اور اختلاف پاؤ گے، (تو اسے خدا اور رسول اور اپنے معاملات کے ولی کی طرف لوٹادو)۔ یہ آیت اس طرح نازل ہوئی اور یہ

---

1. قرآن کریم، سورہ نساء، آیت 58۔
2. الکافی، ج1، ص276۔

کیسے ممکن ہے کہ خدا والیان امر کی اطاعت کا حکم دے لیکن ان کے جھگڑوں اور تنازعات کے بارے میں والیان امر کے پاس نہیں بھیجتا؟ یہ بات صرف مکلفین سے کہی گئی ہے، اُن ہی مکلفین سے جن سے فرمایا گیا ہے: (اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور اپنے معاملات کے والیوں کی اطاعت کرو)۔

(الْحُسَيْنُ بْنُ مُحَمَّدٍ عَنْ مُعَلَّى بْنِ مُحَمَّدٍ عَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ الْوَشَّاءِ عَنْ أَحْمَدَ بْنِ عُمَرَ قَالَ: (سَأَلْتُ الرِّضَا (ع) عَنْ قَوْلِ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ «إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَماناتِ إِلى أَهْلِها» قَالَ هُمُ الْأَئِمَّةُ مِنْ آلِ مُحَمَّدٍ(ص) أَنْ يُؤَدِّيَ الْإِمَامُ الْأَمَانَةَ إِلَى مَنْ بَعْدَهُ وَ لَا يَخُصَّ بِهَا غَيْرَهُ وَ لَا يَزْوِيَهَا عَنْهُ))[1]

احمد بن عمر نے امام رضا (ع) سے اس آیت کے بارے میں پوچھا (خدا آپ کو ان امانتوں کو اپنے لوگوں تک پہنچانے کا حکم دیتا ہے). آپ (ع) نے فرمایا: (یہ وہی امام ہیں جو آل محمد کے ہیں، اور ہر امام کو ان کے بعد والے امام کو امانت منتقل کرنا چاہیے اور اسے کسی اور کے سپرد نہ کریں اور اسے اس کے صاحب سے دوسری جگہ نہ لے جائیں)۔

(مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى عَنْ أَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنِ الْحُسَيْنِ بْنِ سَعِيدٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْفُضَيْلِ عَنْ أَبِي الْحَسَنِ الرِّضَا (ع): (فِي قَوْلِ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ «إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَماناتِ إِلى أَهْلِها» قَالَ هُمُ الْأَئِمَّةُ يُؤَدِّي الْإِمَامُ إِلَى الْإِمَامِ مِنْ بَعْدِهِ وَ لا يَخُصُّ بِهَا غَيْرَهُ وَ لَا يَزْوِيهَا عَنْهُ))[2]

محمد بن فضیل نے امام رضا (ع) سے اس آیت کے بارے میں پوچھا (خدا آپ کو حکم دیتا ہے کہ وہ امانتیں اپنے لوگوں تک پہنچائیں) ۔آنحضرت (ع) نے فرمایا: (وہ امام ہیں کہ ہر امام اپنے بعد امام کو امانت پہنچادیں اور اسے کسی اور کے سپرد نہ کریں اور امانت کو دوسری جگہ نہ لے جائیں)۔

(مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى عَنْ أَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِنَانٍ عَنْ إِسْحَاقَ بْنِ عَمَّارٍ عَنِ ابْنِ أَبِي يَعْفُورٍ عَنِ الْمُعَلَّى بْنِ خُنَيْسٍ قَالَ: (سَأَلْتُ أَبَا عَبْدِ اللَّهِ (ع) عَنْ قَوْلِ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَماناتِ إِلى أَهْلِها﴾ قَالَ أَمَرَ اللَّهُ الْإِمَامَ الْأَوَّلَ أَنْ يَدْفَعَ إِلَى الْإِمَامِ الَّذِي بَعْدَهُ كُلَّ شَيْءٍ عِنْدَهُ))[3]

---

1. الکافی، ج1، ص276۔
2. الکافی، ج1، ص276۔
3. الکافی، ج1، ص277۔

معلّٰی بن خنیس کہتے ہیں: میں نے امام صادق (ع) سے اس آیت کے بارے میں پوچھا (خدا آپ کو حکم دیتا ہے کہ وہ امانتیں اپنے لوگوں تک پہنچائیں)۔انھوں (ع) نے فرمایا: "خدا نے امام کو حکم دیا ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اپنے بعد کے امام کے لیے چھوڑ دے۔"

(رَوَى مُعَلَّى بْنُ خُنَيْسٍ عَنِ الصَّادِقِ (ع) قَالَ: (قُلْتُ لَهُ قَوْلُ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَماناتِ إِلى أَهْلِها وَ إِذا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾ قَالَ عَلَى الْإِمَامِ أَنْ يَدْفَعَ مَا عِنْدَهُ إِلَى الْإِمَامِ الَّذِي بَعْدَهُ وَ أُمِرَتِ الْأَئِمَّةُ أَنْ يَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ وَ أُمِرَ النَّاسُ أَنْ يَتَّبِعُوهُمْ))[1]

معلّٰی بن خنیس امام صادق (ع) سے روایت کرتے ہیں: (آیت کے بارے میں (خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ وہ امانتیں اپنے لوگوں تک پہنچا دو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو)۔آنحضرت (ع) نے فرمایا: امام پر واجب ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے اسے اپنے بعد کے امام کے لیے چھوڑ دے، اور اس آیت نے ائمہ کو عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ اور حکومت کرنے کا حکم دیا اور لوگوں کو ان کی اطاعت کا حکم دیا)۔

(مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ مَحْبُوبٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحُسَيْنِ بْنِ أَبِي الْخَطَّابِ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ يَحْيَى عَنْ أَبِي الْمِعْزَى عَنْ إِسْحَاقَ بْنِ عَمَّارٍ عَنِ ابْنِ أَبِي يَعْفُورٍ عَنْ مُعَلَّى بْنِ خُنَيْسٍ عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ (ع) قَالَ: (قُلْتُ لَهُ قَوْلُ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَماناتِ إِلى أَهْلِها وَ إِذا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾ قَالَ عَلَى الإِمَامِ أَنْ يَدْفَعَ مَا عِنْدَهُ إِلَى الإِمَامِ الَّذِي بَعْدَهُ وَ أُمِرَتِ الأَئِمَّةُ بِالْعَدْلِ وَ أُمِرَ النَّاسُ أَنْ يَتَّبِعُوهُمْ))[2]

محمد بن علی بن محبوب نے محمد بن حسین بن ابی الخطاب سے، وہ صفوان بن یحیٰی سے، ابی المعزی سے، وہ اسحاق بن عمار سے، وہ ابن ابی یعفور سے، وہ معلّٰی بن خنیس سے، وہ امام صادق (ع) سے روایت کرتے ہیں: (وہ کہتے ہیں: میں نے کہا: اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ (إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَماناتِ إِلى أَهْلِها وَ إِذا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ) فرمایا: امام پر واجب ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے اسے اپنے بعد کے امام کے حوالہ کر دے اور اس آیت نے ائمہ کو عدل کے ساتھ فیصلہ کرنے اور حکومت کرنے کا حکم دیا اور لوگوں کو ان کی اطاعت کا حکم دیا)۔

---

1. من لایحضرہ الفقیہ، ج3، ص3۔
2. تہذیب الاحکام، ج6، ص223۔

لہٰذا، اس عظیم آیت (إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَماناتِ إِلى أَهْلِها وَ إِذا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے خلیفہ یا امام پر لازم ہے کہ وہ امانت کو اپنے بعد آنے والے امام کے سپرد کرے اور یہ ان کا اولین فرض ہے اور اس وجہ سے وہ اپنے علم کا اظہار یا لوگوں سے بات نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنا پہلا کام پورا کرتا ہے جو کہ الٰہی مشن کو لے کر خلیفہ کو تیار کرنا ہے اور یہ امام رضا(ع) کے ساتھ ہوا:

(أَحْمَدُ بْنُ مِهْرَانَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ عَنْ أَبِي الْحَكَمِ الْأَرْمَنِيِّ قَالَ حَدَّثَنِي عَبْدُ اللَّهِ بْنُ إِبْرَاهِيمَ بْنِ عَلِيِّ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ جَعْفَرِ بْنِ أَبِي طَالِبٍ عَنْ يَزِيدَ بْنِ سَلِيطٍ الزَّيْدِيِّ قَالَ أَبُو الْحَكَمِ وَ أَخْبَرَنِي عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ عُمَارَةَ الْجَرْمِيُّ عَنْ يَزِيدَ بْنِ سَلِيطٍ قَالَ: لَقِيتُ أَبَا إِبْرَاهِيمَ (ع) وَ نَحْنُ نُرِيدُ الْعُمْرَةَ فِي بَعْضِ الطَّرِيقِ فَقُلْتُ جُعِلْتُ فِدَاكَ هَلْ تُثْبِتُ هَذَا الْمَوْضِعَ الَّذِي نَحْنُ فِيهِ قَالَ نَعَمْ فَهَلْ تُثْبِتُهُ أَنْتَ قُلْتُ نَعَمْ إِنِّي أَنَا وَ أَبِي لَقِينَاكَ هَاهُنَا وَ أَنْتَ مَعَ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ (ع) وَ مَعَهُ إِخْوَتُكَ فَقَالَ لَهُ أَبِي بِأَبِي أَنْتَ وَ أُمِّي أَنْتُمْ كُلُّكُمْ أَئِمَّةٌ مُطَهَّرُونَ وَ الْمَوْتُ لَا يَعْرَى مِنْهُ أَحَدٌ فَأَحْدِثْ إِلَيَّ شَيْئاً أُحَدِّثُ بِهِ مَنْ يَخْلُفُنِي مِنْ بَعْدِي فَلَا يَضِلَّ قَالَ نَعَمْ يَا أَبَا عَبْدِ اللَّهِ هَؤُلَاءِ وُلْدِي وَ هَذَا سَيِّدُهُمْ وَ أَشَارَ إِلَيْكَ وَ قَدْ عُلِّمَ الْحُكْمَ وَ الْفَهْمَ وَ السَّخَاءَ وَ الْمَعْرِفَةَ بِمَا يَحْتَاجُ إِلَيْهِ النَّاسُ وَ مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنْ أَمْرِ دِينِهِمْ وَ دُنْيَاهُمْ وَ فِيهِ حُسْنُ الْخُلُقِ وَ حُسْنُ الْجَوَابِ وَ هُوَ بَابٌ مِنْ أَبْوَابِ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ فِيهِ أُخْرَى خَيْرٌ مِنْ هَذَا كُلِّهِ فَقَالَ لَهُ أَبِي وَ مَا هِيَ بِأَبِي أَنْتَ وَ أُمِّي قَالَ (ع) يُخْرِجُ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ مِنْهُ غَوْثَ هَذِهِ الْأُمَّةِ وَ غِيَاثَهَا وَ عَلَمَهَا وَ نُورَهَا وَ فَضْلَهَا وَ حِكْمَتَهَا خَيْرُ مَوْلُودٍ وَ خَيْرُ نَاشِئٍ يَحْقُنُ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ بِهِ الدِّمَاءَ وَ يُصْلِحُ بِهِ ذَاتَ الْبَيْنِ وَ يَلُمُّ بِهِ الشَّعْثَ وَ يَشْعَبُ بِهِ الصَّدْعَ وَ يَكْسُو بِهِ الْعَارِيَ وَ يُشْبِعُ بِهِ الْجَائِعَ وَ يُؤْمِنُ بِهِ الْخَائِفَ وَ يُنْزِلُ اللَّهُ بِهِ الْقَطْرَ وَ يَرْحَمُ بِهِ الْعِبَادَ خَيْرُ كَهْلٍ وَ خَيْرُ نَاشِئٍ قَوْلُهُ حُكْمٌ وَ صَمْتُهُ عِلْمٌ يُبَيِّنُ لِلنَّاسِ مَا يَخْتَلِفُونَ فِيهِ وَ يَسُودُ عَشِيرَتَهُ مِنْ قَبْلِ أَوَانِ حُلُمِهِ فَقَالَ لَهُ أَبِي بِأَبِي أَنْتَ وَ أُمِّي وَ هَلْ وُلِدَ قَالَ نَعَمْ وَ مَرَّتْ بِهِ سِنُونَ قَالَ يَزِيدُ فَجَاءَنَا مَنْ لَمْ نَسْتَطِعْ مَعَهُ كَلَاماً قَالَ يَزِيدُ فَقُلْتُ لِأَبِي إِبْرَاهِيمَ (ع) فَأَخْبِرْنِي أَنْتَ بِمِثْلِ مَا أَخْبَرَنِي بِهِ أَبُوكَ (ع) فَقَالَ لِي نَعَمْ إِنَّ أَبِي (ع) كَانَ فِي زَمَانٍ لَيْسَ هَذَا زَمَانَهُ فَقُلْتُ لَهُ فَمَنْ يَرْضَى مِنْكَ بِهَذَا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللَّهِ قَالَ فَضَحِكَ أَبُو إِبْرَاهِيمَ ضَحِكاً شَدِيداً ثُمَّ قَالَ أُخْبِرُكَ يَا أَبَا عُمَارَةَ إِنِّي خَرَجْتُ مِنْ مَنْزِلِي فَأَوْصَيْتُ إِلَى ابْنِي فُلَانٍ وَ أَشْرَكْتُ مَعَهُ بَنِيَّ فِي الظَّاهِرِ وَ أَوْصَيْتُهُ فِي الْبَاطِنِ فَأَفْرَدْتُهُ وَحْدَهُ وَ لَوْ كَانَ الْأَمْرُ إِلَيَّ لَجَعَلْتُهُ فِي الْقَاسِمِ ابْنِي لِحُبِّي إِيَّاهُ وَ رَأْفَتِي عَلَيْهِ وَ لَكِنْ ذَلِكَ إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ يَجْعَلُهُ حَيْثُ يَشَاءُ وَ لَقَدْ جَاءَنِي بِخَبَرِهِ رسول‌الله (ص) ثُمَّ أَرَانِيهِ وَ أَرَانِي مَنْ يَكُونُ مَعَهُ وَ كَذَلِكَ لَا يُوصَى إِلَى أَحَدٍ مِنَّا حَتَّى يَأْتِيَ بِخَبَرِهِ رسول‌الله (ص) وَ جَدِّي عَلِيٌّ(ع) وَ رَأَيْتُ مَعَ رسول‌الله (ص) خَاتَماً وَ سَيْفاً وَ عَصًا وَ كِتَاباً وَ عِمَامَةً فَقُلْتُ مَا هَذَا يَا رسول‌الله فَقَالَ لِي أَمَّا الْعِمَامَةُ فَسُلْطَانُ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ أَمَّا السَّيْفُ فَعِزُّ اللَّهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى وَ أَمَّا الْكِتَابُ فَنُورُ اللَّهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى وَ أَمَّا الْعَصَا فَقُوَّةُ اللَّهِ وَ أَمَّا الْخَاتَمُ فَجَامِعُ هَذِهِ الْأُمُورِ ثُمَّ قَالَ لِي وَ الْأَمْرُ قَدْ خَرَجَ مِنْكَ إِلَى غَيْرِكَ فَقُلْتُ يَا رسول‌الله أَرِنِيهِ أَيُّهُمْ هُوَ فَقَالَ رسول‌الله (ص) مَا رَأَيْتُ مِنَ الْأَئِمَّةِ أَحَداً أَجْزَعَ عَلَى فِرَاقِ هَذَا الْأَمْرِ مِنْكَ وَ لَوْ كَانَتِ الْإِمَامَةُ بِالْمَحَبَّةِ لَكَانَ

إِسْمَاعِيلُ أَحَبَّ إِلَى أَبِيكَ مِنْكَ وَ لَكِنْ ذَلِكَ مِنَ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ ثُمَّ قَالَ أَبُو إِبْرَاهِيمَ وَ رَأَيْتُ وُلْدِي جَمِيعاً الْأَحْيَاءَ مِنْهُمْ وَ الْأَمْوَاتَ فَقَالَ لِي أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ (ع) هَذَا سَيِّدُهُمْ وَ أَشَارَ إِلَى ابْنِي عَلِيٍّ فَهُوَ مِنِّي وَ أَنَا مِنْهُ وَ اللَّهُ مَعَ الْمُحْسِنِينَ قَالَ يَزِيدُ ثُمَّ قَالَ أَبُو إِبْرَاهِيمَ (ع) يَا يَزِيدُ إِنَّهَا وَدِيعَةٌ عِنْدَكَ فَلَا تُخْبِرْ بِهَا إِلَّا عَاقِلًا أَوْ عَبْداً تَعْرِفُهُ صَادِقاً وَ إِنْ سُئِلْتَ عَنِ الشَّهَادَةِ فَاشْهَدْ بِهَا وَ هُوَ قَوْلُ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَاناتِ إِلى أَهْلِها﴾ وَ قَالَ لَنَا أَيْضاً ﴿وَ مَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ﴾ قَالَ فَقَالَ أَبُو إِبْرَاهِيمَ (ع) فَأَقْبَلْتُ عَلَى رسول‌الله(ص) فَقُلْتُ قَدْ جَمَعْتَهُمْ لِي بِأَبِي وَ أُمِّي فَأَيُّهُمْ هُوَ فَقَالَ هُوَ الَّذِي يَنْظُرُ بِنُورِ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ يَسْمَعُ بِفَهْمِهِ وَ يَنْطِقُ بِحِكْمَتِهِ يُصِيبُ فَلَا يُخْطِئُ وَ يَعْلَمُ فَلَا يَجْهَلُ مُعَلَّماً حُكْماً وَ عِلْماً هُوَ هَذَا وَ أَخَذَ بِيَدِ عَلِيٍّ ابْنِي ثُمَّ قَالَ مَا أَقَلَّ مُقَامَكَ مَعَهُ فَإِذَا رَجَعْتَ مِنْ سَفَرِكَ فَأَوْصِ وَ أَصْلِحْ أَمْرَكَ وَ افْرُغْ مِمَّا أَرَدْتَ فَإِنَّكَ مُنْتَقِلٌ عَنْهُمْ وَ مُجَاوِرٌ غَيْرَهُمْ فَإِذَا أَرَدْتَ فَادْعُ عَلِيّاً فَلْيُغَسِّلْكَ وَ لْيُكَفِّنْكَ فَإِنَّهُ طُهْرٌ لَكَ وَ لَا يَسْتَقِيمُ إِلَّا ذَلِكَ وَ ذَلِكَ سُنَّةٌ قَدْ مَضَتْ فَاضْطَجِعْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ صُفَّ إِخْوَتَهُ خَلْفَهُ وَ عُمُومَتَهُ وَ مُرْهُ فَلْيُكَبِّرْ عَلَيْكَ تِسْعاً فَإِنَّهُ قَدِ اسْتَقَامَتْ وَصِيَّتُهُ وَ وَلِيَكَ وَ أَنْتَ حَيٌّ ثُمَّ اجْمَعْ لَهُ وُلْدَكَ مِنْ بَعْدِهِمْ فَأَشْهِدْ عَلَيْهِمْ وَ أَشْهِدِ اللَّهَ عَزَّ وَ جَلَّ وَ كَفى بِاللَّهِ شَهِيداً قَالَ يَزِيدُ ثُمَّ قَالَ لِي أَبُو إِبْرَاهِيمَ (ع) إِنِّي أُوخَذُ فِي هَذِهِ السَّنَةِ وَ الْأَمْرُ هُوَ إِلَى ابْنِي عَلِيٍّ سَمِيِّ عَلِيٍّ وَ عَلِيٍّ فَأَمَّا عَلِيٌّ الْأَوَّلُ فَعَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ وَ أَمَّا الْآخِرُ فَعَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ (ع) أُعْطِيَ فَهْمَ الْأَوَّلِ وَ حِلْمَهُ وَ نَصْرَهُ وَ وُدَّهُ وَ دِينَهُ وَ مِحْنَتَهُ وَ مِحْنَةَ الْآخِرِ وَ صَبْرَهُ عَلَى مَا يَكْرَهُ وَ لَيْسَ لَهُ أَنْ يَتَكَلَّمَ إِلَّا بَعْدَ مَوْتِ هَارُونَ بِأَرْبَعِ سِنِينَ ثُمَّ قَالَ لِي يَا يَزِيدُ وَ إِذَا مَرَرْتَ بِهَذَا الْمَوْضِعِ وَ لَقِيتَهُ وَ سَتَلْقَاهُ فَبَشِّرْهُ أَنَّهُ سَيُولَدُ لَهُ غُلَامٌ أَمِينٌ مَأْمُونٌ مُبَارَكٌ وَ سَيُعْلِمُكَ أَنَّكَ قَدْ لَقِيتَنِي فَأَخْبِرْهُ عِنْدَ ذَلِكَ أَنَّ الْجَارِيَةَ الَّتِي يَكُونُ مِنْهَا هَذَا الْغُلَامُ جَارِيَةٌ مِنْ أَهْلِ بَيْتِ مَارِيَةَ جَارِيَةِ رسول‌الله(ص) أُمِّ إِبْرَاهِيمَ فَإِنْ قَدَرْتَ أَنْ تُبَلِّغَهَا مِنِّي السَّلَامَ فَافْعَلْ قَالَ يَزِيدُ فَلَقِيتُ بَعْدَ مُضِيِّ أَبِي إِبْرَاهِيمَ (ع) عَلِيّاً (ع) فَبَدَأَنِي فَقَالَ لِي يَا يَزِيدُ مَا تَقُولُ فِي الْعُمْرَةِ فَقُلْتُ بِأَبِي أَنْتَ وَ أُمِّي ذَلِكَ إِلَيْكَ وَ مَا عِنْدِي نَفَقَةٌ فَقَالَ سُبْحَانَ اللَّهِ مَا كُنَّا نُكَلِّفُكَ وَ لَا نَكْفِيكَ فَخَرَجْنَا حَتَّى انْتَهَيْنَا إِلَى ذَلِكَ الْمَوْضِعِ فَابْتَدَأَنِي فَقَالَ يَا يَزِيدُ إِنَّ هَذَا الْمَوْضِعَ كَثِيراً مَا لَقِيتَ فِيهِ حِيرَتَكَ وَ عُمُومَتَكَ قُلْتُ نَعَمْ ثُمَّ قَصَصْتُ عَلَيْهِ الْخَبَرَ فَقَالَ لِي أَمَّا الْجَارِيَةُ فَلَمْ تَجِئْ بَعْدُ فَإِذَا جَاءَتْ بَلَّغْتُهَا مِنْهُ السَّلَامَ فَانْطَلَقْنَا إِلَى مَكَّةَ فَاشْتَرَاهَا فِي تِلْكَ السَّنَةِ فَلَمْ تَلْبَثْ إِلَّا قَلِيلًا حَتَّى حَمَلَتْ فَوَلَدَتْ ذَلِكَ الْغُلَامَ قَالَ يَزِيدُ وَ كَانَ إِخْوَةُ عَلِيٍّ يَرْجُونَ أَنْ يَرِثُوهُ فَعَادُونِي إِخْوَتُهُ مِنْ غَيْرِ ذَنْبٍ فَقَالَ لَهُمْ إِسْحَاقُ بْنُ جَعْفَرٍ وَ اللَّهِ لَقَدْ رَأَيْتُهُ وَ إِنَّهُ لَيَقْعُدُ مِنْ أَبِي إِبْرَاهِيمَ بِالْمَجْلِسِ الَّذِي لَا أَجْلِسُ فِيهِ أَنَا)[1]

(یزید بن سلیط زیدی (جن کا نام ابا عمارہ ہے) کہتے ہیں: (ہم عمرہ کے لیے جارہے تھے کہ راستہ میں موسیٰ بن جعفر (ع) سے ملاقات ہوئی اور کہا: میں آپ پر قربان ہوں، کیا آپ کو یہ جگہ یاد ہے جہاں ہم ہیں؟

1. الکافی، ج1، صص313 - 316۔

انھوں نے فرمایا: ہاں، کیا تمہیں بھی یاد ہے؟ میں نے کہا: ہاں، میں اور میرے والد آپ سے یہاں ملے تھے اور امام صادق (ع) اور آپ کے بھائی بھی وہاں تھے۔ میرے والد نے امام صادق (ع) سے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ تمام ائمہ پاک ہیں لیکن موت سے کوئی نہیں بچا۔ مجھے کوئی ایسی بات بتائیں جو میں خلف اور اپنے بیٹے کو بتاؤں کہ وہ گمراہ نہ ہو جائے۔

انھوں نے فرمایا: ہاں اے ابو عبداللہ! (زید کے والد کی کنیت ہے) یہ میرے بیٹے ہیں اور یہ ان کا سرور ہے (اور انھوں نے آپ کی طرف اشارہ کیا)۔ وہ ہے جو فیصلے، فہم، سخاوت، اور لوگوں کی ضروریات اور دین اور ان کی دنیا کے معاملات میں اختلافات کو پہچاننے والا ہے، اور اس کا اخلاق اور جواب اچھا ہے۔ اور وہ خدا کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے اور اس کے پاس ایک اور فضیلت ہے جو ان سب سے بہتر ہے۔ میرے والد نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، وہ کیا ہے؟ حضرت نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس امت کی پکار، پناہ، علم، نور، فضیلت اور حکمت کو اس کے صلب (پشت) سے نکالے گا۔ وہ بہترین مولود اور بہترین بچہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے خونریزی کو روکے، اور لوگوں کے درمیان صلح کرائے، بکھرے ہوئے لوگوں کو جمع کرے، شگاف کو دور کرے، ننگے کو ڈھانپے، بھوکوں کو کھانا کھلائے، اور ڈرنے والوں کو محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے بارش برسائے اور اپنے بندوں پر رحم فرمائے، وہ بوڑھوں میں بہترین اور جوانوں میں بہترین ہے، اس کی گفتگو حکمت ہے اور اس کی خاموشی علم ہے۔ وہ جن چیزوں کے بارے میں لوگ اختلاف کرتے ہیں اسے ختم کر دے گا اور بالغ ہونے سے پہلے اپنے قبیلے کی سربراہی کرے گا۔ میرے والد نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، کیا وہ پیدا ہوا ہے؟ انھوں نے فرمایا: ہاں، چند سال گزر گئے۔ یزید کہتے ہیں: اس وقت ایک شخص داخل ہوا جس کی موجودگی کی وجہ سے ہم بول نہیں سکتے تھے۔ یزید کہتے ہیں کہ میں نے موسیٰ بن جعفر (ع) سے کہا: جیسا کہ آپ کے والد امام صادق (ع) نے مجھے خبر دی ہے، آپ بھی مجھے بتا دیجیئے۔ امام (ع) نے فرمایا: ہاں، میرے والد اُس زمانے میں تھے جو اِس زمانے جیسا نہیں تھا (یعنی اِس زمانہ میں تقیہ کرنا چاہیے)۔ میں نے حضرت سے کہا: جو اس جواب سے مطمئن ہو گیا اس پر خدا کی لعنت ہو۔ حضرت زور سے ہنسے، پھر فرمایا:

اے ابا عمارہ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں اپنا گھر سے باہر نکلا اور اپنے بیٹے فلان کو وصیت کی تھی اور ظاہری طور پر اپنے دوسرے بیٹوں کو اس کے ساتھ شریک کیا تھا لیکن باطنی اور نجی طور پر میں نے صرف اسی کے لیے

وصیت کی تھی۔ اگر یہ میرے اختیار میں ہوتا تو میں اپنے بیٹے قاسم کو امامت دے دیتا، جس سے میں محبت کرتا ہوں اور اس پر مہربان ہوں، لیکن یہ اختیار اللہ تعالیٰ کا ہے اور وہ جہاں چاہتا ہے اسے دیتا ہے۔

ان کی امامت کی خبر مجھے رسول اللہ (ص) کی طرف سے پہنچی اور آپ نے مجھے ان کو اور ان کے ہم عصروں کو دکھایا، اور وہ بھی ہم میں سے کسی کے لیے وصیت نہ کرے جب تک کہ وہ رسول اللہ (ص) اور میرے جد امجد علی (ع) سے نہ سن لے اور میں نے خواب میں دیکھا کہ نبی (ص) کے پاس ایک انگوٹھی، ایک تلوار، ایک عصا، ایک کتاب اور پگڑی تھے۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ (ص) یہ کیا ہیں؟ فرمایا: پگڑی خدا کی حاکمیت کی علامت ہے اور تلوار اس کی عزت کی علامت ہے اور کتاب اس کے نور کی علامت ہے اور عصا خدا کی طاقت اور قدرت کی علامت ہے۔ اور انگوٹھی ان تمام امور کا جامع علامت ہے۔ پھر رسول اللہ (ص) نے مجھ سے فرمایا: امامت کا حکم تم کو چھوڑ کر کسی اور کے پاس پہنچ گیا ہے۔ میں نے کہا: اے خدا کے رسول مجھے دکھائیں کہ وہ کون ہے! انھوں نے فرمایا: میں نے کسی امام کو تم جیسا امامت کے فراق پر بے تاب ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اگر امامت کا حکم محبت اور دوستی پر مبنی تھا، اسماعیل آپ کے والد کے نزدیک آپ سے زیادہ محبوب تھے، لیکن امام خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے، تو موسیٰ ابن جعفر (ع) نے فرمایا: میں نے اپنے تمام زندہ اور مردہ بچوں پر غور کیا۔ پھر امیر المومنین (ع) نے میرے بیٹے علی کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: یہ ان کا سرور ہے، وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں، اور خدا صالحین کے ساتھ ہے۔

پھر موسیٰ بن جعفر (ع) نے کہا: اے یزید، یہ باتیں آپ کے پاس امانت ہیں، کسی کو مت کہو سوائے کسی عقل مند یا خدا کے بندے کے جسے تو نے سچا قرار دیا ہے، اور اگر وہ تجھ سے گواہی مانگیں تو گواہی دے، کیونکہ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے: (خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچا دو)؛ اور اس نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ (اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو خدا کی گواہی کو اپنے پاس چھپائے؟)۔

موسیٰ بن جعفر (ع) فرماتے ہیں: میں نے (خواب میں) رسول اللہ (ص) کو دیکھا اور کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ نے میرے تمام بچوں کا ایک ساتھ ذکر کیا، فرمایئے گا کہ امام کون سا ہے؟ فرمایا: وہ جو خدا کے نور سے دیکھتا ہے اور عقل سے سنتا ہے اور وہ اپنی حکمت سے بات کرتا ہے، وہ صحیح چلتا ہے اور غلطی نہیں کرتا، اس کے پاس علم ہے اس لیے وہ جاہل نہیں ہے، اسے حکمت اور علم سکھایا گیا ہے۔ پھر آپ (ص) نے میرے بیٹے علی کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: یہ وہی ہے۔

پھر فرمایا: تم اس کے ساتھ کتنے کم ہو! (یعنی آپ کی وفات قریب ہے) جب آپ (مکہ) سفر سے واپس آئیں تو وصیت کریں اور اپنے معاملات کو منظّم کرو اور جس سے چاہو اس سے فراغت حاصل کرو کیونکہ تم ان سے الگ ہو جاؤ گے اور تم دوسروں کے پڑوسی بن جاؤ گے۔ جب آپ (وصیت) کرنا چاہیں تو علی سے کہیں کہ آپ کو غسل دیں اور آپ کو کفن سے ڈھانپ دیں، کیونکہ اسے غسل دینے سے آپ پاک ہو جائیں گے اور اس کے علاوہ صحیح نہیں، اور یہ ایک سنت ہے جو پہلے سے قائم ہو چکی ہے؛ اور آپ (میت کی نماز کے دوران) اس کے سامنے لیٹ جائیں اور اس کے پیچھے اس کے بھائیوں اور چچاوں کو صف بندی کریں اور اسے حکم دیں کہ وہ آپ پر 9 تکبیریں کہے۔ کیونکہ اس کی وصیت کو برقرار رکھا گیا ہے اور وہ آپ کی زندگی میں آپ کے معاملات کا انچارج رہے۔ پھر اپنے بچوں کو جمع کرو جو اس کے بعد ہیں اور ان میں سے اس کے لیے گواہ بناؤ اور اللہ کو بھی گواہ بنالو اور وہی خدا گواہ کے لیے کافی ہے۔ یزید کہتا ہے: پھر موسیٰ بن جعفر (ع) نے مجھ سے فرمایا: مجھے اس سال لے جائیں گے، اور امامت میرے بیٹے علی کے پاس ہے، جو دو علی (ماضی کے اماموں) کا ایک جیسا نام ہے: پہلے علی، علی بن ابی طالب، اور دوسرا علی، علی بن الحسین۔ علی اول کی فہم، ضبط نفس، نصرت، دوستی، دین اور محنت اور علی دوم کی مشکلات پر صبر اور محنت، اس کو دیا گیا ہے اور ہارون کی موت کے چار سال بعد تک اسے زبان کی آزادی نہیں ہے اور اسے کچھ نہیں کہنا چاہیے۔

پھر انھوں نے مجھ سے فرمایا: اے یزید جب بھی تم یہاں سے گزرو اور اس سے ملو (کہ آپ ملیں گے) اسے خوشخبری دو کہ اللہ تعالیٰ اسے ایک بیٹا عطا کرے گا، جو قابل اعتماد، امانت دار اور برکت والا ہو، اور وہ تمہیں بتائے گا کہ تم یہاں مجھ سے ملے ہو۔ پھر آپ اسے بتاو کہ وہ لونڈی، اس بیٹے کی ماں، ماریہ کے خاندان کی لونڈی، (جو کہ ماریہ) رسول اللہ کی لونڈی اور ابراہیم کی ماں ہے، اور اگر آپ میرا اسلام اس تک پہنچا سکتے ہیں تو پہنچا دیئے گا۔ یزید کہتا ہے: میں موسیٰ بن جعفر (ع) کی وفات کے بعد، علی (ع) سے ملا۔ انھوں نے مجھ سے شروع کیا اور فرمایا: اے یزید، عمرہ پر جانے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں؛ یہ سب آپ پر ہے، آپ دیکھ لیجیے؛ میرے پاس کوئی خرچہ نہیں ہے، انھوں نے فرمایا: سبحان اللہ؛ ہم اس وقت تک تکلیف (حکم) نہیں کرتے جب تک کہ ہم آپ کے اخراجات کے ذمہ دار نہ ہوں۔ ہم چلتے رہے یہاں تک کہ ہم اس جگہ پہنچ گئے۔ حضرت نے بات شروع کی اور فرمایا: تم یہاں اپنے پڑوسیوں اور چچوں سے کئی بار ملے ہو۔ (یزید زید بن علی کی اولاد میں سے تھا، جو چھٹے اور ساتویں امام کے چچازاد بھائی ہیں، اور چچازاد بھائی چچا جیسا

ہوتا ہے)۔ میں نے کہا: جی ہاں۔ پھر میں نے اسے کہانی سمجھائی۔ اس نے مجھ سے فرمایا: لیکن وہ لونڈی ابھی تک نہیں آئی؟! آئی تو آنحضرت کے سلام اسے پہنچادوں گا۔ پھر ہم مکہ گئے اور اسی سال انھوں نے اس لونڈی کو خرید لیا اور جلد ہی وہ حاملہ ہو گئی اور اس لڑکے کو جنم دیا۔ یزید کہتا ہے: علی کے بھائیوں کو موسیٰ بن جعفر (ع) کے وارث اور وصی ہونے کی امید تھی اور وہ مجھ سے بغیر کسی عذر کے دشمن بن گئے۔ اسحاق بن جعفر ان سے کہا کرتے تھے: میں نے دیکھا کہ یزید موسیٰ بن جعفر (ع) کی محفل میں ایسی جگہ بیٹھا تھا جہاں میں نہیں بیٹھتا تھا)۔

تیسرا: خدا کی حاکمیت کی طرف بلانا

زمین کبھی بھی ہدایت اور سچائی سے خالی نہیں ہو گی اور اگر وہ جھنڈوں سے خالی ہو جو خدا کی حاکمیت کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ اس وقت زمین ہدایت اور سچائی سے خالی ہے۔ لہٰذا، خدا کی حاکمیت کی دعوت، خاص طور پر جب حق کا دعویٰ کرنے والا (خلیفہ خدا) ہی واحد شخص ہو جو اس کی طرف دعوت دے رہا ہو، حق کی پہچان کرنے والے طالبوں کے لیے دلیل ہے، جو سابقہ وصیت اور نص کی دلیل کی تصدیق کرتے ہیں، یعنی نص کے ساتھ خدا کی حاکمیت کی طرف بلانا، خدا کے خلیفہ کی سچائی کا ثبوت ہو گا، یعنی یہ ایک ایسا ثبوت ہے جو نص کی مدد کرتا ہے اور مومنوں کے اس کی سچائی پر یقین کو بڑھاتا ہے۔

بلاشبہ خدا کی حاکمیت کا مفہوم صرف قانون سازی کی سطح پر نہیں ہے، بلکہ نفاذ اور حکومت کی سطح پر بھی ہے، حالانکہ یہ بنیادی طور پر ناممکن ہے کہ کوئی قانون سازی کی سطح پر خدا کی حاکمیت پر یقین رکھتا ہو جبکہ نفاذ اور حکومت کی سطح پر نہیں، کیونکہ قانون سازی ایک تجدید شدہ اور نیا معاملہ ہے؛ لہٰذا خدا سے جڑے دروازے ہونے چاہئیں تاکہ خدا ہر نئے مسئلے اور واقعہ کا فیصلہ اس تک پہنچا سکے؛ اور یہ ضروری نہیں ہے کہ خدا کا خلیفہ براہ راست حکومت کا انچارج ہو، بلکہ یہ ضروری ہے کہ وہ نظام حکومت اور خاص طور پر لوگوں کی زندگیوں پر غلبہ رکھتا ہو، جیسے جنگ اور امن کے فیصلوں یا قصاص سے متعلق خصوصی مسائل، یعنی۔ موت کی سزائیں۔

مادی جسمانی معجزہ اور اس کا مقام دینِ خدا میں

اس جسمانی عالم میں داخل ہونے کا سبب لوگوں کی آزمائش اور امتحان ہے۔ اللہ تعالی نے فرمایا:

(الَّذی خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیاةَ لِیبْلُوَکُمْ أَیکُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً وَ هُوَ الْعَزیزُ الْغَفُور)[1]

(وہ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمالے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرنے والا ہے، اور وہ سب پر غالب، بہت بخشنے والا ہے).

جب لوگ اس دنیا میں امتحان کے لیے داخل ہوئے، تو حکیم مطلق امتحان لینے والے کی طرف سے یہ درست نہیں کہ ان میں سے بعض کو ابتداء ہی میں بغیر کسی سبب کے دوسروں پر برتری دے؛ اور بعض کا امتحان منسوخ کر دینا اور انہیں بہترین نتیجہ دینا بغیر کسی سبب یا کسی مقدمے کے جو وہ انجام دیں، درست نہیں.

مادی جسمانی معجزہ اگر ایسا ہو کہ اس میں مخالفین کی طرف سے کوئی خطا یا شبہ نہ ہو، تو وہ قاہر اور مجبور کرنے والا ہوتا ہے اور غیب کے دائرے کو ختم کر دیتا ہے اور ایمان بالغیب کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا، اور کچھ امتحان دینے والوں کا امتحان منسوخ کر دیتا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض امتحان دینے والوں کو بعض دوسروں پر بلاسبب برتری دی جائے.

اس طرح کہ اس قسم کا معجزہ، اگر فرض کریں واقع ہو، تو جس فرد کے لیے وہ پیش آتا ہے اس کا امتحان ختم کر دیتا ہے۔ اس اعتبار سے کہ اس فرد کا ایمان محض مادی ایمان ہوگا اور اس میں غیب کا حصہ صفر ہوگا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ جس فرد کے لیے یہ معجزہ واقع ہوتا ہے، وہ دوسرے پر برتری پاتا ہے اور بغیر کسی امتحان کے جنت حاصل کر لیتا ہے۔ نتیجتاً امتحان دینے والے دو افراد کے درمیان عدل قائم نہیں ہوتا. اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں: اگر مادی معجزہ آئے، تو وہ ایسی حدود کے دائرے میں ہونا چاہیے کہ ایمان بالغیب میں سنتِ الٰہی کو ختم نہ کرے۔

اگر ہم دینی نصوص میں جو ہمارے پاس ہیں تلاش کریں، تو ہمیں یہ امور نظر آتے ہیں:

قرآن میں

پہلی: وہ آیات جو بیان کرتی ہیں کہ انبیاء اللہ تعالیٰ کے اذن سے معجزہ لاتے ہیں اور بسا اوقات اللہ تعالیٰ معجزے کی اجازت نہیں دیتا:

(وَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَیمانِهِمْ لَئِنْ جاءَتْهُمْ آیةٌ لَیؤْمِنُنَّ بِها قُلْ إِنَّمَا الْآیاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَ ما یشْعِرُکُمْ أَنَّها

---

1. قرآن کریم، سورۂ ملک، آیت 2۔

إذا جاءَتْ لا يؤْمِنُون)[1]

(اورانہوں نے اللہ کی سخت ترین قسمیں کھا کھا کر کہا کہ اگر ان کے لیے (ان کی پسند کا) معجزہ آ جائے تو وہ ضرور اس پر ایمان لے آئیں گے۔ کہہ دو: معجزات تو صرف اللہ کے اختیار میں ہیں، اور تم کیا جانتے ہو (کہ حقیقت کیا ہے؟) حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ معجزہ بھی آ جائے تو یہ ایمان نہیں لائیں گے).

(وَ قالُوا لَوْ لا أُنْزِلَ عَلَيهِ آياتٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّمَا الْآياتُ عِنْدَ اللَّهِ وَ إِنَّما أَنَا نَذيرٌ مُبِينٌ)[2]

(اور وہ کہتے ہیں: اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے معجزات (جیسے پچھلے انبیاء کے) کیوں نہیں نازل ہوتے؟ کہہ دو: معجزات تو صرف اللہ ہی کے پاس ہیں اور میں تو محض صریح ڈر سنانے والا ہوں).

دوسری: وہ آیات جو یہ بیان کرتی ہیں کہ اگر معجزات قاہر اور مجبور کرنے والے انداز میں آئیں اور غیب کے لیے کچھ باقی نہ چھوڑیں، تو اس کے ذریعے حاصل ہونے والا ایمان قبول نہیں کیا جاتا:

(هَلْ ينْظُرُونَ إِلاَّ أَنْ تَأْتِيهُمُ الْمَلائِكَةُ أَوْ يأْتِي رَبُّكَ أَوْ يأْتِي بَعْضُ آياتِ رَبِّكَ يوْمَ يأْتي بَعْضُ آياتِ رَبِّكَ لا ينْفَعُ نَفْساً إِيمانُها لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فى إِيمانِها خَيراً قُلِ انْتَظِرُوا إِنَّا مُنْتَظِرُون)[3]

(کیا یہ لوگ اسی کے منتظر ہیں کہ فرشتے ان کے پاس آ جائیں، یا تیرا رب آ جائے، یا تیرے رب کی بعض نشانیاں آ جائیں؟ جس دن تیرے پروردگار کی بعض نشانیاں ظاہر ہوں گی، اُس دن جس نے پہلے ایمان نہیں لایا تھا، یا اپنے ایمان سے کوئی بھلائی حاصل نہیں کی تھی، اُس کا ایمان لانا کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ کہہ دو: انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں).

آیت واضح ہے: (جس دن تیرے پروردگار کی بعض نشانیاں ظاہر ہوں گی، اُس دن جس نے پہلے ایمان نہیں لایا تھا، یا اپنے ایمان سے کوئی بھلائی حاصل نہیں کی تھی، اُس کا ایمان لانا کچھ فائدہ نہیں دے گا).

---

1. قرآن کریم، سورۂ انعام، آیت 109۔
2. قرآن کریم، سورۂ عنکبوت، آیت 50۔
3. قرآن کریم، سورۂ انعام، آیت 158۔

جب بعض آیات یا معجزات آ جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایمان کو قبول نہیں کرتا۔ حالانکہ ہم یہ حقیقت جانتے ہیں کہ توبہ آخری سانس تک قبول کی جاتی ہے۔ لہٰذا صرف ایک ہی ممکن صورت ہے کہ یہ آیات اور معجزات امتحان کو منسوخ کر دیتے ہیں؛ اس طرح کہ انسان کی حالت اس مردے کی مانند ہو جاتی ہے جو دنیا سے جا چکا ہو اور اس سے نہ ایمان قبول کیا جاتا ہے اور نہ کوئی عمل۔ یعنی اس نے اپنا امتحان منسوخ کر دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، قاہر معجزے کے وقوع کے ساتھ ہی امتحان کے جوابات اس کے سامنے بالکل واضح رکھ دیے گئے ہیں اور اس کی جانب سے پوچھے گئے سوال کے جواب دینے کا کوئی معنی باقی نہیں رہتا.

(وَ جاوَزْنا بِبَنی إِسْرائیلَ الْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَ جُنُودُهُ بَغْياً وَ عَدْواً حَتَّى إِذا أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قالَ آمَنْتُ أَنَّهُ لا إِلهَ إِلاَّ الَّذی آمَنَتْ بِهِ بَنُوا إِسْرائیلَ وَ أَنَا مِنَ الْمُسْلِمینَ * آلْآنَ وَ قَدْ عَصَیتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدینَ * فَالْیوْمَ نُنَجِّیكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آیةً وَ إِنَّ كَثیراً مِنَ النَّاسِ عَنْ آیاتِنا لَغافِلُونَ)[1]

(اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر پار کرا دیا، تو فرعون اور اس کے لشکر نے سرکشی اور ظلم کے ساتھ ان کا پیچھا کیا، یہاں تک کہ وہ ڈوبنے کے قریب ہو گیا تو اس نے کہا: میں ایمان لے آیا کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، اور میں (اس کے) فرماں برداروں میں سے ہوں۔ (جواب ملا:) کیا اب؟ حالانکہ تو نے پہلے نافرمانی کی اور تو مفسدین میں سے تھا۔ تو آج ہم تیرے بدن کو بچا لیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے ایک نشانی بن جائے، اور بے شک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں).

ان آیات کے معنی کے بیان میں میں پہلے کچھ مطالب لکھ چکا ہوں۔ آپ کتاب "سورۂ یونس کی ایک آیت کی تفسیر" کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

تیسری: وہ آیات جو واضح کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا ایمان قبول کرتا ہے جو معجزہ نازل کیے جانے کے وقت ایمان لاتے ہیں، اور ان کا ایمان صحیح ہے:

---

1. قرآن کریم، سورۂ یونس، آیات 90 - 92۔

(فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّداً قالُوا آمَنَّا بِرَبِّ هارُونَ وَ مُوسى ... وَ مَنْ يأْتِهِ مُؤْمِناً قَدْ عَمِلَ الصَّالِحاتِ فَأُولئِكَ لَهُمُ الدَّرَجاتُ الْعُلى جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهارُ خالِدِينَ فيها وَ ذلِكَ جَزاءُ مَنْ تَزَكَّى)[1]

(پھر جادو گر سجدے میں گر گئے اور کہنے لگے: ہم ایمان لائے ہارون اور موسیٰ کے رب پر۔... اور جو اس کے پاس ایمان کی حالت میں آئے گا اور اس نے نیک عمل کیے ہوں گے، تو ایسے ہی لوگوں کے لیے بلند درجے ہیں۔ ہمیشہ رہنے کے باغات (جنّتِ عدن) جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ اور یہ جزا ہے اس کی جو پاکیزگی اختیار کرے).

ان کے ایمان کے قبول کیے جانے کی علت یہ ہے کہ وہ مکمل جواب تک نہیں پہنچے؛ بلکہ کچھ جوابات تک پہنچے؛ یعنی اس شخص کی مانند جسے تم رہنمائی اور نشانیاں دیتے ہو تا کہ امتحان کے سوالات کے جواب دینے میں اس کی مدد ہو۔ یہ شخص اگرچہ اس دوسرے سے نچلے درجے میں ہے جس نے بغیر مدد کے جواب دیا ہے، لیکن نتیجے میں اس کا جواب بھی قبول کیا جاتا ہے؛ اس وجہ سے کہ یہ ثابت ہو گیا کہ اس شخص کے پاس اتنی معرفت موجود ہے جس کے باعث وہ اگرچہ کسی خاص مدد کے ساتھ ہی، جواب تک پہنچ گیا۔ یعنی ان افراد کا امتحان ختم نہیں ہوا اور امتحان کے سوالات کے جوابات ان کے سامنے اس طرح نہیں رکھے گئے کہ ان کا جواب بے قدر ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ "دوسرے" گروہ کی طرح امتحان سے باہر نہیں نکلے.

چوتھا: وہ آیات جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ معجزات میں کچھ حد تک غلطی اور پردہ پوشی ہونی چاہیے:

(وَ لَوْ جَعَلْناهُ مَلَكاً لَجَعَلْناهُ رَجُلاً وَ لَلَبَسْنا عَلَيهِمْ ما يلْبِسُونَ)[2]

(اور اگر ہم اسے فرشتہ بھی بنا دیتے تو ہم اسے مرد ہی کی شکل میں بھیجتے، اور تب بھی ہم ان پر وہی شبہ ڈال دیتے جس میں وہ خود پڑے ہوئے ہیں).

گزشتہ مطالب کا خلاصہ: آیات اور معجزات اللہ تعالیٰ کے اذن سے آتے ہیں، نہ کہ لوگوں کی درخواست پر۔ لہٰذا لوگوں کی جانب سے معجزہ طلب کرنا اور فرستادہ کا اسے نہ لانا، اس بات کے معنی نہیں کہ فرستادہ برحق نہیں

1. قرآن کریم، سورۂ طہ، آیات 70 - 74۔
2. قرآن کریم، سورۂ انعام، آیت 9۔

ہے۔اسی طرح ایسے معجزات بھی ہیں کہ جب آئیں اور انسان انہیں دیکھے تو اس کا ایمان قبول کیا جاتا ہے، اور کچھ معجزات ایسے بھی ہیں کہ جب آئیں تو انسان کا ایمان قبول نہیں کیا جاتا۔ نیز جیسا کہ ہم نے کہا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جب میں کوئی آیت بھیجتا ہوں تو اس میں ایک شبہہ رکھ دیتا ہوں:

(وَلَوْ جَعَلْناهُ مَلَكاً لَجَعَلْناهُ رَجُلاً وَلَلَبَسْنا عَلَيهِمْ ما يلْبِسُونَ)

(اور اگر ہم اسے فرشتہ بھی بنادیتے تو ہم اسے مرد ہی کی شکل میں بھیجتے، اور تب بھی ہم ان پر وہی شبہ ڈال دیتے جس میں وہ خود پڑے ہوئے ہیں).

لہٰذا وہ نشانی جس کے ذریعے ایمان قبول کیا جاتا ہے، وہ نشانی ہے جس میں شبہ اور پردہ پوشی ہو؛ یعنی ایسا معجزہ جو غیب پر ایمان لانے کے لیے موقع باقی رکھے۔ لیکن وہ معجزہ جس کے ذریعے ایمان قبول نہیں کیا جاتا، وہ معجزہ ہے جس میں کوئی شبہ نہ ہو اور کسی کو طعن و تشنیع کا موقع نہ ملے۔ یہ مسئلہ حضرت موسیٰ (ع) کی داستان سے واضح ہے؛ جب عصا سانپ میں بدل گیا تو فرعون نے عصا کے معجزے پر طعنہ زنی کی اور شک پیدا کیا.

(قالَ آمَنْتُمْ لَهُ قَبْلَ أَنْ آذَنَ لَكُمْ إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذى عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ)[1]

((فرعون نے کہا:) کیا تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا؟ بے شک وہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے).

(فَلَمَّا جاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنا قالُوا لَوْلا أُوتِى مِثْلَ ما أُوتِى مُوسى أَ وَلَمْ يكْفُرُوا بِما أُوتِى مُوسى مِنْ قَبْلُ قالُوا سِحْرانِ تَظاهَرا وَقالُوا إِنَّا بِكُلٍّ كافِرُونَ)[2]

(پھر جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آ گیا تو انہوں نے کہا: اسے بھی وہی کچھ کیوں نہ دیا گیا جو موسیٰ کو دیا گیا تھا؟ کیا انہوں نے اس سے پہلے موسیٰ کو دی گئی چیز کا انکار نہیں کیا تھا؟ انہوں نے کہا: یہ دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کے مددگار ہیں، اور کہا: ہم تو سب کے سب کے منکر ہیں).

لیکن وہ (فرعون) دریا کے شق ہونے کے معجزے میں شک ڈالنے سے عاجز اور مغلوب ہو گیا اور اس نے

---

1. قرآن کریم، سورۂ طہ، آیت 71۔
2. قرآن کریم، سورۂ قصص، آیت 48۔

تصدیق کی اور کہا: میں ایمان لے آیا:

(وَ جاوَزْنا بِبَنی إِسْرائیلَ الْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَ جُنُودُهُ بَغْياً وَ عَدْواً حَتَّى إِذا أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قالَ آمَنْتُ أَنَّهُ لا إِلهَ إِلاَّ الَّذی آمَنَتْ بِهِ بَنُوا إِسْرائیلَ وَ أَنَا مِنَ الْمُسْلِمینَ)[1]

(اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر پار کرادیا، تو فرعون اور اس کے لشکر نے سرکشی اور ظلم کے ساتھ ان کا پیچھا کیا، یہاں تک کہ وہ ڈوبنے کے قریب ہو گیا تو اس نے کہا: میں ایمان لے آیا کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، اور میں (اس کے) فرماں برداروں میں سے ہوں).

لیکن اس کا ایمان قبول نہیں کیا جاتا؛ اس لیے کہ یہ ایک قاہر (مجبور کرنے والے) معجزے پر ایمان ہے جس میں کوئی شبہ نہیں اور جو شک کی گنجائش نہیں رکھتا:

(آلْآنَ وَ قَدْ عَصَیتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدینَ * فَالْیوْمَ نُنَجِّیكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آیةً وَ إِنَّ كَثیراً مِنَ النَّاسِ عَنْ آیاتِنا لَغافِلُونَ)[2]

((جواب دیا گیا:) کیا اب؟ حالانکہ تو اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا اور مفسدین میں شامل تھا۔ تو آج ہم تیرے جسم کو بچالیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے ایک نشانی بن جائے، اور بے شک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں).

یہاں تک کہ ان آیات کی سطح پر بھی، جو محمد رسولِ خدا (ص) سے معجزے کی درخواست کو مخالفین کی جانب سے بیان کرتی ہیں، بظاہر ان معجزات کے خلاف ہیں جو تاریخی اسناد میں اُن سے منقول ہیں۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان:

(وَ قالُوا لَوْلا أُنْزِلَ عَلَیهِ آیاتٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّمَا الآیاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَ إِنَّما أَنَا نَذیرٌ مُبینٌ)[3]

(اور وہ کہتے ہیں: اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے معجزات کیوں نہیں نازل ہوتے؟ کہہ دو: معجزات تو صرف اللہ ہی کے پاس ہیں اور میں تو محض صریح ڈر سنانے والا ہوں).

---

1. قرآن کریم، سورۂ یونس، آیت 90۔
2. قرآن کریم، سورۂ یونس، آیات 91و 92۔
3. قرآن کریم، سورۂ عنکبوت، آیت 50۔

ممکن ہے کہ بعض لوگ اس آیت سے یہ مطلب لیں کہ آنحضرت (ص) نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا، اور اسی وجہ سے انہوں نے آپ سے معجزہ طلب کیا، اور آپ استدلال کرتے تھے کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے.

در حقیقت یہ موضوع اُن لوگوں کے نزدیک جو اسلام اور رسول اللہ کی پیغمبری کی صحت پر طعنہ زنی کرتے ہیں، ایک واضح تعارض ہے، اور کم از کم ایک واضح مخالفت ہے قرآن کے نص اور ان مطالب کے درمیان جو محمد (ص) کے لیے معجزات کے وقوع کے دعوے کے بارے میں منقول ہیں۔ لیکن حقیقت میں کوئی تعارض موجود نہیں؛ کیونکہ معجزات ایمان بالغیب کے سلسلے میں عمومی قانون اور سنتِ الٰہی کے دائرے میں واقع ہوتے ہیں۔ یعنی جو ایمان قابلِ قبول ہے، وہی ایمان بالغیب ہے. لہٰذا وہ معجزات جو بھیجے گئے رسول، بشمول محمد (ص)، ان مخالفین کے لیے لاتے ہیں جنہیں ایمان کی دعوت دی جاتی ہے، قاہر اور مجبور کرنے والے معجزات نہیں ہوتے۔ جبکہ منکرین ایسے قاہر (مجبور کرنے والے) معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں جن میں کوئی شبہ نہ ہو.

اگر معجزہ قاہر ہو اور غیب کے لیے کوئی جگہ باقی نہ چھوڑے تو اس کے ذریعے ایمان قبول نہیں کیا جاتا۔ اسی وجہ سے قاہر معجزہ اس لیے نہیں آتا کہ دشمن شخص اس کے ذریعے ایمان لے آئے، بلکہ قاہر معجزہ ان صورتوں میں واقع ہوتا ہے:

1. مؤمنین کے لیے، اس حالت میں معجزے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ غیب پر ایمان لائیں، کیونکہ وہ پہلے ہی ایمان لا چکے ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ معجزہ اُن کے یقین میں اضافہ کرتا ہے اور اُن لوگوں کے لیے حجت بن جاتا ہے جنہیں یہ واقعہ نقل کیا جاتا ہے.

2. اُن افراد کے لیے جو ایمان اور حق کے اقرار کے قریب ہیں۔ لہٰذا اُن کے ایمان میں غیب کی حد ختم نہیں ہوئی؛ کیونکہ وہ دعوتِ الٰہی کی برتری تک پہنچ چکے ہیں اور کسی حد تک دعوتِ الٰہی پر ایمان رکھتے ہیں؛ اگرچہ انہوں نے اپنے ایمان کو ظاہر نہیں کیا.

3. اُن کافروں کے لیے جو معجزے کے ذریعے عذاب دیے جاتے ہیں۔ جیسے حضرت نوح (ع) کا طوفان کا معجزہ اور حضرت موسیٰ (ع) کے لیے دریا کے شق ہونے کا معجزہ.

عام طور پر اگر کوئی معجزہ سب کے لیے پیش آئے یا اُن منکرین کے لیے جو ایمان لانے کے لیے معجزہ طلب کرتے ہیں، تو وہ معجزہ غیب کے دائرے پر مشتمل ہونا چاہیے اور اس میں شبہ ہونا چاہیے۔ اسی وجہ سے کافروں نے اُس چیز کو جو محمد (ص) کی دعوت کے ساتھ تھی، معجزہ نہیں مانا؛ کیونکہ وہ معجزات جو محمد (ص) سے مؤمنین

کے ذریعے نقل ہوئے اور جو مؤمنین کے لیے واقع ہوتے تھے، انہیں وہ جھوٹ قرار دیتے تھے، اور وہ واقعات جو اُن کے لیے یا اُن کے لوگوں کے ساتھ پیش آتے، انہیں محض جادو یا وہم سمجھتے تھے.

(وَ لَوْ فَتَحْنا عَلَيهِمْ باباً مِنَ السَّماءِ فَظَلُّوا فيهِ يعْرُجُونَ لَقالُوا إِنَّما سُكِّرَتْ أَبْصارُنا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَسْحُورُون)[1]

(اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے اور وہ اس میں چڑھتے رہتے، تو بھی وہ کہتے: ہماری آنکھوں پر جادو کر دیا گیا ہے، بلکہ ہم تو جادوزدہ لوگ ہیں).

وہ کبھی کبھی معجزات کو محض غلط فہمیاں اور روزمرہ کے قدرتی واقعات کی تاویلیں قرار دیتے تھے۔ مثلاً جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کو براہِ راست ایک گھوڑے کے ذریعے ہلاک کر دیتا، یا اُسے آگ میں ڈال دیتا جو اُسے آگ کی طرف کھینچ لیتی، یا اُس پر کوئی پتھر گر پڑتا اور محمد (ص) کی بے ادبی کے سبب اُسے مار دیتا، تو وہ اس واقعے کو ایک قدرتی حادثہ کہتے اور کہتے کہ موت تو جاری ہے اور یہ روزانہ پیش آتا ہے. جب رسول اللہ (ص) کی مسجد کے ستون کی رونے کی آواز سننے کی خبر مؤمنین سے مخالفین تک پہنچی، تو انہوں نے اسے جھوٹ قرار دیا اور کہا کہ مؤمنین اِن جھوٹوں کے ذریعے محمد (ص) کے لیے بازار گرم کرنا چاہتے ہیں۔

اسی طرح غیر قاہر معجزات پر ردِ عمل کا سلسلہ، جو غیب کے لیے جگہ باقی رکھتے ہیں، جاری رہتا ہے؛ اور یہ ان کا قول ہے:

(وَ قالُوا لَوْلا أُنْزِلَ عَلَيهِ آياتٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّمَا الآياتُ عِنْدَ اللَّهِ وَ إِنَّما أَنَا نَذيرٌ مُبينٌ)[2]

(اور وہ کہتے ہیں: اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے معجزات کیوں نہیں نازل ہوتے؟ کہہ دو: معجزات تو صرف اللہ ہی کے پاس ہیں اور میں تو محض صریح ڈر سنانے والا ہوں).

یعنی وہ ایسی روشن قاہر آیات چاہتے ہیں جن میں کوئی شبہ نہ ہو اور جو ایمان بالغیب کے لیے کوئی جگہ باقی نہ چھوڑیں۔ یہی ان کی درخواست کا خلاصہ ہے جو آج تک جاری ہے؛ حالانکہ یہ عقل، دینی نص اور سنتِ الٰہی کے خلاف ہے۔ یہ پہلے کبھی واقع نہیں ہوا اور نہ ہی آئندہ کبھی واقع ہوگا؛ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بعض

---

1. قرآن کریم، سورۂ حجر، آیات 14 و 15۔
2. قرآن کریم، سورۂ عنکبوت، آیت 50۔

مخلوقات کا امتحان، جو دنیا کے امتحان میں داخل کیے گئے ہیں، منسوخ کر دیا جائے؛ اور یہ بے خردی حکیمِ مطلق سے صادر نہیں ہوتی۔ کیسے لوگ امتحان میں داخل ہوں اور پھر بعض کا امتحان بلا کسی دلیل اور سبب کے منسوخ ہو جائے، بغیر اس کے کہ اس میں اُس شخص کے درمیان کوئی فرق رکھا گیا ہو جس کا امتحان منسوخ کر دیا گیا ہے اور اُس کے درمیان جو امتحان دے چکا ہے؟

کیسے وہ شخص جس کا امتحان منسوخ ہو گیا ہے، جنت میں داخل ہو؛ جبکہ اگر امتحان دینے والا شخص امتحان میں ناکام ہو جائے تو وہ آگ میں داخل ہو؟! پس اس بات اور اللہ تعالیٰ پر اس جھوٹ کے مطابق، اللہ سبحان و متعال کی عدالت کہاں ہے؟!

نتیجہ جو قرآن اور عقل کو ساتھ ملا کر حاصل ہوتا ہے، یہ ہے کہ معجزے کا موضوع حدود اور قیود رکھتا ہے، اور جیسا کہ بے عمل علما گمان کرتے ہیں، یہ کھیل اور بے مقصد نہیں ہے؛ خاص طور پر اس لیے کہ وہ ہر زمانے میں انبیاء اور اوصیاء (ع) سے روبرو ہوتے ہیں.

جیسے کہ واضح ہو چکا ہے، معجزہ نہ تو رسول کی درخواست پر ظاہر ہوتا ہے اور نہ ہی مکلفین کی خواہش پر، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جب اور جہاں چاہے، اسے ظاہر کرے۔ اگر مادی معجزہ آ جائے تو ضروری ہے کہ غیب کے دائرے کو ختم نہ کرے؛ کیونکہ الٰہی قانون اور سنتِ الٰہی یہی ہے کہ ایمان غیب پر ہو. جبکہ بد قسمتی سے زیادہ تر لوگ زمانے کے دوران ایسے معجزات کی درخواست کرتے ہیں جو انہیں ایمان لانے پر مجبور کر دیں اور تاویل یا شک کی کوئی گنجائش باقی نہ چھوڑیں۔ نتیجتاً وہ محض مادی ایمان کا تقاضا کرتے ہیں، ایسا ایمان جس میں غیب کے لیے کوئی جگہ نہیں، اور ایسا ایمان قبول نہیں کیا جاتا۔ نتیجتاً وہ ایک بے خردانہ درخواست پیش کرتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ ان کے لیے پورا نہیں کرتا؛ کیونکہ وہ حکیمِ مطلق ہے اور بے عقلوں کے ساتھ ان کی بے عقلی میں شریک نہیں ہوتا.

انجیل میں

عیسیٰ (ع) اور معجزہ، جیسا کہ انجیل میں آیا ہے:

(پھر کچھ دینی علما اور فریسیوں نے اُس سے کہا: اے استاد! ہم تجھ سے کوئی نشانی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُس نے جواب دیا: شرارت پیشہ اور بدکار نسل نشانی مانگتی ہے! لیکن انہیں کوئی نشانی نہیں دی جائے گی، سوائے یونس نبی کی نشانی کے؛ کیونکہ جس طرح یونس تین دن اور تین رات بڑی مچھلی کے پیٹ میں رہا، اُسی طرح ابنِ آدم بھی تین دن اور تین رات زمین کے دل میں رہے گا).[1]

(فریسی عیسیٰ کے پاس آئے اور اُس سے بحث و گفتگو کرنے لگے۔ انہوں نے آزمائش کے لیے اُس سے کوئی نشانی طلب کی۔ لیکن عیسیٰ نے دل سے ایک آہ بھری اور کہا: یہ نسل کیوں نشانی کی طلبگار ہے؟ میں تم سے سچ کہتا ہوں، انہیں کوئی نشانی نہیں دی جائے گی۔ پھر وہ انہیں چھوڑ کر چلا گیا).[2]

جیسا کہ ہم انجیل کی ان دو عبارتوں میں ملاحظہ کرتے ہیں، عیسیٰ (یسوع) فرماتے ہیں: (شرارت پیشہ اور بدکار نسل نشانی چاہتی ہے! لیکن انہیں کوئی نشانی نہیں دی جائے گی). اور وہ فرماتا ہے: (یہ نسل کیوں نشانی کی طلبگار ہے؟ میں تم سے سچ کہتا ہوں، انہیں کوئی نشانی نہیں دی جائے گی).

دونوں عبارتوں میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ وہ نشانی یا معجزہ جس کا انہوں نے مطالبہ کیا، وقوع پذیر نہیں ہوگا۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک ایسے معجزے کا مطالبہ کر رہے تھے جو قاہر ہو اور ان معجزات کے علاوہ جو آ چکے ہیں، ورنہ انجیل میں عیسیٰ کے کلمات باہم متناقض ہو جاتے.

انجیل میں ایسے متون ہیں جو بیان کرتے ہیں کہ آیات یا معجزات واقع ہوئے ہیں۔ ان متون میں سے کچھ بطور مثال درج ذیل ہیں:

(وہ ابھی گفتگو ہی کر رہا تھا کہ چند لوگ یایروس کے گھر سے، جو کنیسہ کا سردار تھا، آئے اور کہنے لگے: تیری بیٹی مر گئی ہے! اب استاد کو کیوں تکلیف دیتا ہے؟ عیسیٰ نے جب اُن کی بات سنی تو کنیسہ کے سردار سے کہا: خوف نہ کر! فقط ایمان رکھ؛ اور اُس نے کسی کو اپنے پیچھے جانے کی اجازت نہ دی سوائے پطرس، یعقوب اور یعقوب کے

---

1. انجیل متی، باب 12، آیات 38 سے 40۔
2. انجیل مرقس، باب 8، آیات 11 سے 13۔

بھائی یوحنا کے۔ جب وہ کنیسہ کے سردار کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ ہنگامہ برپا ہے اور کچھ لوگ بلند آواز سے روتے اور نوحہ کرتے تھے۔ پس وہ اندر گیا اور اُن سے کہا: یہ ہنگامہ اور نوحہ کیوں ہے؟ لڑکی مری نہیں ہے بلکہ سوئی ہوئی ہے۔ مگر وہ اُس پر ہنسنے لگے۔ پس جب اُس نے اُن سب کو باہر نکال دیا تو لڑکی کے ماں باپ اور اُن شاگردوں کو جو اُس کے ساتھ تھے، اپنے ساتھ لیا اور اُس جگہ داخل ہوا جہاں لڑکی تھی. پھر اُس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور اُس سے کہا: "تالیتا کوم!" یعنی اے چھوٹی لڑکی، میں تجھ سے کہتا ہوں: اُٹھ جا! وہ فوراً اُٹھ بیٹھی اور چلنے لگی۔ وہ لڑکی بارہ سال کی تھی۔ وہ اس واقعہ سے بے حد حیران ہوگئے۔ عیسیٰ نے اُنہیں سختی سے حکم دیا کہ کسی کو اس واقعہ کی خبر نہ ہونے دیں اور فرمایا کہ اُس لڑکی کو کچھ دیں). [1]

(اسی دوران جب عیسیٰ یہ باتیں اُن سے کہہ رہا تھا، ایک سردار اُس کے پاس آیا اور اُس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بولا: میری بیٹی ابھی مر گئی ہے۔ پھر بھی آ اور اپنا ہاتھ اُس پر رکھ تاکہ وہ زندہ ہو جائے۔ عیسیٰ اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے شاگردوں کے ساتھ اُس کے ساتھ روانہ ہوا. اسی وقت ایک عورت، جو بارہ سال سے خون ریزی کی بیماری میں مبتلا تھی، پیچھے سے عیسیٰ کے قریب آئی اور اُس کے جامے کا کنارہ چھو لیا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا تھا: اگر میں صرف اُس کے جامے کو چھو لوں تو شفا پاؤں گی۔ عیسیٰ پلٹا، اُسے دیکھا اور فرمایا: بیٹی! دلیر ہو۔ تیرے ایمان نے تجھے شفا دی ہے۔ اور اُسی گھڑی وہ عورت شفا پا گئی). [2]

(جب عیسیٰ نے اپنی تمام باتیں لوگوں سے مکمل کر لیں تو کفرناحوم میں داخل ہوا۔ وہاں ایک رومی فوجی تھا جس کا ایک نہایت عزیز غلام تھا۔ وہ غلام بیمار اور مرنے کے قریب تھا۔ جب اُس سپاہی نے عیسیٰ کے بارے میں سنا تو اُس نے چند یہودی بزرگوں کو اُس کے پاس بھیجا تاکہ اُس سے درخواست کریں کہ آ کر اُس کے غلام کو شفا دے. وہ عیسیٰ کے پاس آئے اور بہت التجا سے اُس سے کہا: یہ شخص اس لائق ہے کہ تو اُس پر یہ مہربانی کرے، کیونکہ وہ ہماری قوم سے محبت رکھتا ہے اور اُس نے ہمارے لیے کنیسہ بھی بنایا ہے۔ پھر عیسیٰ اُن کے ساتھ روانہ ہوا۔ جب وہ گھر کے قریب پہنچا تو اُس سپاہی نے اپنے چند دوستوں کو عیسیٰ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا: اے میرے آقا! زحمت نہ کرو کیونکہ؛ میں اس لائق نہیں ہوں کہ تو میرے چھت کے نیچے آئے۔ اسی سبب میں نے خود کو بھی اس قابل نہ سمجھا کہ تیرے پاس آؤں۔ بس ایک بات کہہ دے کہ میرا خادم شفا پائے گا۔ کیونکہ میں خود بھی

---

1. انجیل مرقس، باب 5، آیات 35 سے 43۔
2. انجیل متی، باب 9، آیات 18 سے 22۔

ایک آدمی ہوں جو حکم کے ماتحت ہے، اور میرے زیرِ حکم سپاہی بھی ہیں۔ میں ایک کو کہتا ہوں: جا، وہ جاتا ہے۔ دوسرے کو کہتا ہوں: آ، وہ آتا ہے۔ اور اپنے غلام سے کہتا ہوں: یہ کام کر، وہ کرتا ہے۔ عیسیٰ نے جب یہ سنا تو اُس پر حیران ہوا اور اُس نے اُس بھیڑ کی طرف رُخ کیا جو اُس کے پیچھے آ رہی تھی اور کہا: میں تم سے کہتا ہوں، ایسا ایمان تو میں نے اسرائیل میں بھی نہیں دیکھا۔ جب بھیجے گئے لوگ گھر واپس لوٹے تو غلام کو تندرست پایا۔ کچھ عرصہ بعد عیسیٰ نائین نامی ایک شہر کی طرف روانہ ہوا۔ اُس کے شاگرد اور ایک بڑی بھیڑ بھی اُس کے ساتھ تھی۔ جب وہ شہر کے دروازے کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک مردے کو لے جایا جا رہا ہے، جو ایک بیوہ عورت کا اکلوتا بیٹا تھا. شہر کے بہت سے لوگ بھی اُس عورت کے ساتھ تھے۔ جب پروردگار نے اُسے دیکھا تو اُس پر ترس کھایا اور کہا: گریہ نہ کر۔ پھر آگے بڑھا اور تابوت کو چھو لیا۔ جو لوگ اُسے اُٹھائے ہوئے تھے، رک گئے۔ عیسیٰ نے کہا: اے جوان! میں تجھ سے کہتا ہوں، اُٹھ جا! مُردہ سیدھا بیٹھ گیا اور بات کرنا شروع کر دیا! عیسیٰ نے اُسے اُس کی ماں کے حوالے کر دیا۔ خوف اور ہیبت سب پر طاری ہو گئی اور وہ خدا کی تمجید کرتے ہوئے کہنے لگے: ایک عظیم نبی ہمارے درمیان ظاہر ہوا ہے۔ خدا اپنی قوم کی مدد کے لیے آیا ہے۔ عیسیٰ کے اس کام کی خبر ساری یہودیہ اور اُس کے گرد و نواح میں پھیل گئی۔ یحییٰ کے شاگردوں نے اُسے ان تمام واقعات سے آگاہ کیا).[1]

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں، اوپر کے متون میں مشترک معنی -جو مردوں کو زندہ کرنا ہے- یہ ہے کہ اُن کے مرنے سے زندہ ہونے تک صرف چند گھنٹوں کا فاصلہ رہا ہے۔ مثلاً: میری بیٹی ابھی وفات پا گئی ہے. لہٰذا اُن کا زندہ ہونا دفن سے پہلے کا معاملہ تھا۔ اسی سبب جو شخص شبہے کی راہ اختیار کرے وہ آسانی سے یہ استدلال کر سکتا ہے کہ یہ لوگ بے ہوش تھے، یا کوئی اور بہانہ تاکہ اُس معجزے پر طعن کرے جو واقع ہوا تھا۔ اسی طرح علاج اور شفا پانا بھی اِسی بنیاد پر ممکن ہے.

لیکن وہ متون جو انجیل یا تورات میں معجزۂ قاہر کو بیان کرتے ہیں، ہم ان کی صحت پر ایمان نہیں رکھتے۔ حتیٰ کہ خود مسیحیوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ ہر ایک متن کی صحت پر ایمان نہ رکھیں؛ کیونکہ بعض واقعات یا معجزات کے بارے میں اُن کے پاس ایک سے زیادہ تاریخی متون موجود ہیں، اور یقینی طور پر اُن میں سے کچھ کم از

---

1. انجیل لوقا، باب 7، آیات 1 سے 18۔

کم درست نہیں ہیں. لہٰذا اگر دو متن مثلاً انجیل متی اور یوحنا میں ایک دوسرے کے مخالف ہوں، تو دونوں متن پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا.

خلاصہ: وہ مادی معجزہ جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے لانا ممکن ہے اور جس کی بنیاد پر اگر کوئی شخص ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ اُس کا ایمان قبول کرتا ہے، مادی غیر قاہر معجزہ ہے؛ جیسے موسی (ع) کا عصا سانپ میں بدل جانا،[1] رسول اللہ (ص) کے لیے بعض مؤمنوں کی طرف سے ستون کے نالے کو سننا، اور محمد رسول اللہ (ص) کی طرف سے قلیل کھانے کے ذریعے بڑی جماعت کو سیر کرنا، اور امام حسین (ع) کی دعا سے کربلا میں بعض افراد کی ہلاکت، اور حسین (ع) کی مظلومیت کی فتح، اور بعض مریضوں کا شفا پانا اور انبیاء و اوصیاء (ع) کے باقی معجزات۔ یہ سب معجزات اُن اکثر لوگوں کے لیے جو اُن سے روبرو ہوئے، کسی حد تک شبہے کا سبب تھے؛ کیونکہ اُسے سو فیصد پہچانا نہیں جا سکتا؛ بالخصوص اگر معاملہ ویسا ہی ہو جیسا فرعون نے کہا تھا: (سِحْرَانِ تَظَاهَرَا) (یہ دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کے مددگار ہیں). یا یہ کہیں: جو کچھ موسی (ع) لائے وہ معجزہ ہے اور جو کچھ جادوگر لائے وہ صرف جادو ہے؛[2] اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ معجزہ جو قاہر نہیں ہے، بذاتِ خود اصل دلیل نہیں ہے، بلکہ ایک تائید کرنے والا اور وہ دلیل ہے جو نص کو مضبوط کرتی ہے.

---

1. یہ اُس معجزے کے برعکس ہے جو موسی (ع) کے لیے دریا کے شق ہونے کی صورت میں ظاہر ہوا؛ کیونکہ دریا کے شق ہونے کا معجزہ ایک قاہر (مجبور کرنے والا) معجزہ تھا اور ایسے معجزے کی وجہ سے جو ایمان لایا جائے وہ قبول نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرعون کا ایمان بھی اس قاہر معجزے کی وجہ سے قبول نہیں کیا: ﴿وَ جاوَزْنا بِبَنِي‌إِسْرائيلَ الْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَ جُنُودُهُ بَغْياً وَ عَدْواً حَتَّى إِذا أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قالَ آمَنْتُ أَنَّهُ لا إِلهَ إِلاَّ الَّذي آمَنَتْ بِهِ بَنُوا إِسْرائيلَ وَ أَنَا مِنَ الْمُسْلِمينَ * آلآنَ وَ قَدْ عَصَيتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدينَ * فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيةً وَ إِنَّ كَثيراً مِنَ النَّاسِ عَنْ آياتِنا لَغافِلُونَ﴾ (اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر پار کرا دیا، تو فرعون اور اس کے لشکر نے سرکشی اور ظلم کے ساتھ ان کا پیچھا کیا، یہاں تک کہ وہ ڈوبنے کے قریب ہو گیا تو اس نے کہا: میں ایمان لے آیا کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، اور میں (اس کے) فرماں برداروں میں سے ہوں۔ (جواب ملا:) کیا اب؟ حالانکہ تو نے پہلے نافرمانی کی اور تو مفسدین میں سے تھا۔ تو آج ہم تیرے بدن کو بچا لیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے ایک نشانی بن جائے، اور بے شک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں)۔

2. یعنی، جس شخص نے جادوگروں کی لاٹھیوں اور موسیٰ (ع) کی لاٹھی کو دیکھا، اُس کے لیے کیسے ممکن تھا کہ تمیز کرے اور فیصلہ دے کہ جادوگروں کا عمل جادو ہے اور موسیٰ کا عمل معجزہ ہے؟ یہی مسئلہ اُن کے سانپوں کو موسیٰ (ع) کی لاٹھی یا موسیٰ (ع) کے سانپ نے نگلنے کا تھا، جسے فرعون نے آسانی سے یوں جواب دیا: سِحْرَانِ تَظَاهَرَا (یہ دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کے مددگار ہیں). اور (اس کے نزدیک) موسیٰ (ع) ایک بڑا جادوگر ہے، اور اسی لیے اُس کا جادو جادوگروں کے جادو پر غالب آگیا، کیونکہ وہ اُن کا سردار ہے:

لیکن وہ لوگ جو غیر قاہر معجزے کو اصل دلیل سمجھتے ہیں، سب سے بڑی چیز جسے وہ اپنے استدلال میں استعمال کرتے ہیں یہ ہے کہ اگر کوئی معجزہ کسی باطل کے دعوے دار کے ذریعے واقع ہو تو وہ لوگوں کے گمراہ ہونے کا سبب بنے گا، اور یہ ایسا کام ہے جو حکیمِ مطلق کی طرف سے صادر نہیں ہوتا. لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اصل بات ہی یہ ہے کہ یہ ثابت ہو کہ جو کام انجام دیا جارہا ہے، وہ اُن افراد کے لیے جو اُس سے روبرو ہیں، معجزہ ہے۔ یہ مسئلہ محلِ تردید ہے اور جیسا کہ قرآن نے صراحت کی ہے، اس میں شبہ موجود ہے،[1] جیسا کہ میں نے بیان کیا اور جیسے تمام انبیاء کے معجزات غیر مؤمنوں کے لیے، اور اسی طرح وہ معجزہ جو موضوعِ بحث ہے یعنی موسی (ع) کا عصا، واضح ہے.

لہٰذا دینِ اللہ تعالیٰ میں معجزے کا مقام یہ ہے کہ معجزات تائید کرنے والے اور غیر مستقل دلائل ہیں، اور جب دوسرے دلائل کے ساتھ رکھے جائیں تو معنی پیدا کرتے ہیں۔ یعنی اگر معجزہ اصل اور مستقل دلیل کے ساتھ آجائے تو یہ ضرورت سے زیادہ ہے، اور دینِ اللہ تعالیٰ میں اُس کا مقام لوگوں کے یقین میں اضافہ اور اُنہیں زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلیفہ پر ایمان لانے کی ترغیب دینا ہے، جو دلیل "نص" کے ساتھ آیا ہے.

یہ اس بات کا بھی مطلب ہے کہ امام مہدی (ع) کو پہچاننے کا راستہ - جو ہزار سال سے غائب ہیں - اُن لوگوں کے لیے بند ہے جن کی دلیل اُن کے بارے میں یہ ہے کہ وہ معجزے کے ساتھ آئیں گے.

معجزہ کے بارے میں بعض اقوال پر مبنی ایک بحث

علامہ حلّی کہتے ہیں:

﴿فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا لَوْلاَ أُوتِيَ مِثْلَ مَا أُوتِيَ مُوسَى أَوَلَمْ يَكْفُرُوا بِمَا أُوتِيَ مُوسَى مِنْ قَبْلُ قَالُوا سِحْرَانِ تَظَاهَرَا وَقَالُوا إِنَّا بِكُلٍّ كَافِرُونَ﴾ (پھر جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آگیا تو انہوں نے کہا: اسے بھی وہی کچھ کیوں نہ دیا گیا جو موسیٰ کو دیا گیا تھا؟ کیا انہوں نے اس سے پہلے موسیٰ کو دی گئی چیز کا انکار نہیں کیا تھا؟ انہوں نے کہا: یہ دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کے مددگار ہیں، اور کہا: ہم تو سب کے سب کے منکر ہیں!) (قصص: 48) ﴿قَالَ آمَنْتُمْ لَهُ قَبْلَ أَنْ آذَنَ لَكُمْ إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ﴾ ((فرعون نے کہا:) کیا تم اس پر ایمان لے آئے اس سے پہلے کہ میں تمہیں اجازت دیتا؟ بے شک وہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے). (طہ: 71 و شعرا: 49)۔

1. ﴿وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكاً لَجَعَلْنَاهُ رَجُلاً وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلْبِسُونَ﴾ (اور اگر ہم اسے فرشتہ بھی بنا دیتے تو ہم اسے مرد ہی کی شکل میں بھیجتے، اور تب بھی ہم ان پر وہی شبہ ڈال دیتے جس میں وہ خود پڑے ہوئے ہیں). (انعام: 9)۔

(تیسرا: امام کے پاس نص ہونا ضروری ہے؛ اس لیے کہ عصمت ایک باطنی مسئلہ ہے جسے صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ لہٰذا جس شخص کی عصمت کو وہ جانتا ہے، اُس کے بارے میں نص ہونا ضروری ہے یا اُس کے ہاتھوں پر کوئی معجزہ ظاہر ہو جو اس کے سچّا ہونے کی دلیل ہو)۔[1]

مقداد سیوری، علامہ حلّی کے کلام پر حاشیہ میں کہتے ہیں:

(میں کہتا ہوں: یہ امام کے تعیّن کے طریقے کی طرف اشارہ ہے اور اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور سابقہ امام کی طرف سے نص، امام (ع) کے تعیّن میں ایک مستقل طریقہ ہے۔ اور اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا اس کا تعیّن نص کے علاوہ کسی اور طریقے سے بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اصحابِ امامیہ نے مطلق طور پر اس کو رد کر دیا ہے اور کہتے ہیں کہ نص کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں؛ اس لیے کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ عصمت، امامت میں شرط ہے۔ اور عصمت ایک پوشیدہ امر ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ لہٰذا یہ کسی بھی شخص میں ہو، اس کا علم حاصل نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ غیب کا جاننے والا اسے ظاہر کرے؛ اور یہ دو طریقوں سے حاصل ہوتا ہے: اوّل: کسی معصوم کی طرف سے اس کا اعلان کیا جائے، جیسے پیغمبر (ص) ہمیں امام (ع) کی عصمت سے آگاہ کریں اور اُنہیں مقرر فرمائیں۔ دوم: اس کے ذریعے معجزے کا ظاہر ہونا جو اس کے دعویٰ امامت میں اس کی سچائی پر دلالت کرے)۔[2]

گذشتہ مباحث میں، میں نے بیان کیا کہ سابقہ حجت کی طرف سے نص، خواہ براہِ راست ہو یا بالواسطہ، زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کی پہچان کی دلیل ہے۔ لیکن معجزہ محض ایک تأیید ہے۔ البتہ حلّی اور سیوری کا معجزے کے بارے میں کہنا دلیل سے خالی ہے؛ مگر یہ کہ اس بنیاد پر ہو کہ جب معجزہ آئے تو وہ آشکار ہو اور اس طرح ہو کہ اس میں کوئی شبہ باقی نہ رہے، اور اس معجزے کا مقصد وہ افراد ہوں جو اس سے روبرو ہوں؛ اور یہ موضوع حقیقت میں اُن معجزات میں موجود نہیں ہے جو اس وقت ظاہر ہوں جب کسی کا ایمان معجزے کے ذریعے قبول کیا گیا ہو؛ اس لیے کہ معجزے میں ضرور کچھ شبہ ہونا چاہیے تاکہ ایمان بالغیب کی حد کو ختم نہ کرے۔

---

1. الباب حادی عشر، علامہ حلّی۔
2. تعلیق علی الباب حادی عشر، مقداد سیوری، صص 100 و 101۔

(وَلَوْ جَعَلْناهُ مَلَكاً لَجَعَلْناهُ رَجُلاً وَلَلَبَسْنا عَلَيهِمْ ما يلْبِسُونَ)[1]

(اور اگر ہم اسے فرشتہ بھی بنادیتے تو ہم اسے مرد ہی کی شکل میں بھیجتے، اور تب بھی ہم ان پر وہی شبہ ڈال دیتے جس میں وہ خود پڑے ہوئے ہیں).

لہٰذا حقیقت میں سابقہ عقلی اصول کو قاہر معجزے کے سوا، جب وہ لوگوں پر ظاہر ہو، کسی اور پر منطبق نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ وہ کسی غلطی اور شبہ کی گنجائش باقی نہیں چھوڑتا، اور جیسا کہ ہم نے کہا، موضوعِ بحث یہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ، جیسا کہ ہم نے عقلی اور نقلی دونوں طریقوں سے بیان کیا، اس قسم کے معجزے کا مقصد ایمان نہیں ہوتا، اور ایسے شخص کا ایمان جو اس کے ذریعے ایمان لے آئے، قبول نہیں کیا جاتا.

حقیقت یہ ہے کہ وہ مسئلہ جس کا ان فقہا کو سامنا ہوا اور جس نے انہیں اس غلطی میں ڈال دیا، یہ ہے کہ وہ قاہر معجزے اور غیر قاہر معجزے کے درمیان فرق نہیں کر پاتے؛ قاہر معجزہ وہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے باعث ایمان لے آئے تو اس کا ایمان قبول نہیں ہوتا، جیسا کہ موسیٰ (ع) کے ذریعے فرعون کے لیے سمندر کا شگافتہ ہونا پیش آیا۔ جبکہ غیر قاہر معجزہ وہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے ذریعے ایمان لائے تو اس کا ایمان قبول ہے، جیسا کہ جادوگروں کے ساتھ اس وقت پیش آیا جب موسیٰ (ع) کا عصا سانپ میں بدل گیا اور اس سانپ نے ان کی لاٹھیاں نگل لیں، جنہیں لوگ رینگتے ہوئے سانپ کی شکل میں دیکھ رہے تھے۔ اس مثال میں معجزہ مشتَبہ ہے اور اس میں ایک پردہ موجود ہے، اور یہ ان افراد کے لیے جو اس کا سامنا کرتے ہیں سو فیصد واضح معجزہ نہیں ہے.

خلافت محمد (ص)

پہلا: نص

زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت اُس وقت سے جاری ہے جب اللہ تعالیٰ نے آدم (ع) کو خلق کیا۔ ہم یہاں محمد (ص) سے پہلے کے خلفائے الٰہی کی خلافت کے اثبات پر گفتگو نہیں کرتے بلکہ صرف محمد (ص) کی خلافت کے اثبات پر بات کرتے ہیں۔ چونکہ ہر خلیفۂ الٰہی کی خلافت کے اثبات کے لیے نص ضروری ہے، اسی وجہ سے ہم اسلام سے پہلے کی ابراہیمی مذاہب کی معتبر آسمانی کتابوں پر تکیہ کرتے ہیں، یعنی یہودیت اور مسیحیت کی کتابوں پر۔ یہ کتابیں عہدِ قدیم اور عہدِ جدید ہیں.

---

1. قرآن کریم، سورۂ انعام، آیت 9۔

پیدایش، باب 21: (صبح کے وقت ابراہیم اٹھا، روٹی اور پانی کی ایک مشکیزہ لی اور ہاجرہ کو دی، اور وہ اس کے کاندھے پر رکھ دی، پھر اسے اور اس کے بیٹے کو روانہ کیا۔ پھر وہ گئی اور بیئر سبع کے بیابان میں بھٹکتی رہی۔ اور جب مشکیزہ کا پانی ختم ہو گیا تو بیٹے کو ایک جھاڑی کے نیچے رکھ دیا۔ اور اُس سے دور فاصلے پر، ایک تیر کے پھینکنے کی مسافت تک چلی گئی، اُس کی طرف رُخ کر کے بیٹھ گئی، کیونکہ وہ کہتی تھی: میں اپنے بیٹے کی موت نہ دیکھوں۔ اور اُس کی طرف رُخ کر کے بیٹھی اور اپنی آواز بلند کی اور روئی۔ اور خدا نے بیٹے کی آواز سنی اور خدا کا فرشتہ آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اُس سے کہا: «اے ہاجر، تجھے کیا ہوا ہے؟ خوفزدہ نہ ہو، کیونکہ خدا نے بیٹے کی آواز وہاں جہاں وہ ہے، سن لی ہے۔ اٹھ اور بیٹے کو اٹھا، اسے اپنے ہاتھ میں پکڑ، کیونکہ میں اس سے ایک بڑی امت پیدا کروں گا»۔ اور خدا نے اس کی آنکھیں کھول دیں تو اُس نے ایک پانی کا کنواں دیکھا۔ پھر گئی اور مشکیزہ کو پانی سے بھرا اور بیٹے کو پلایا۔ اور خدا اُس لڑکے کے ساتھ تھا۔ اور وہ بڑا ہوا، صحرا میں رہنے لگا اور تیر اندازی کرتے ہوئے بڑا ہو گیا۔ اور وہ فاران کے صحرا میں سکونت پذیر ہوا).

زیادہ تعداد اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی امت شمار نہیں ہوتی۔ امتِ عظیم اور بڑی امت سے مراد- اور عظمت اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے لیے ہے- دراصل انبیاء اور اوصیاء ہیں؛ یعنی اسماعیل (ع) کی نسل سے امتِ عظیم اور بڑی امت سے مراد انہی کے فرزندوں میں سے انبیاء اور اوصیاء ہیں۔ وہ خاص طور پر محمد اور آلِ محمد (ع) ہیں، جو زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلفاء ہیں۔ آج اسماعیل بن ابراہیم کی اولاد میں سے معروف بڑی امت صرف وہی ہیں۔ جو بھی شخص ان کا انکار کرے، اس نے اس چیز کا انکار کیا ہے جس کی بشارت تورات نے دی ہے، اور اس کی سب سے اہم سِفر کا، جو کتاب سِفر پیدایش ہے، انکار کیا ہے.

حبقوق، باب 3: (حبقوق نبی کی دعا شُجونوت کے لیے۔ اے خدا! جب میں نے تیری خبر سنی تو ڈر گیا۔ اے خدا! اپنے عمل کو برسوں کے دوران زندہ کر! برسوں کے دوران اسے ظاہر کر، اور غضب کے وقت رحمت کو یاد فرما۔ خدا تیمان سے آیا اور قدوس فاران کے پہاڑ سے، سِلاہ۔ اس کا جلال آسمانوں کو ڈھانپ گیا اور زمین اس کی تسبیح سے بھر گئی۔ اس کی روشنی نور کی مانند تھی اور اس کے ہاتھ سے شعاع نکلتی تھی، اور وہیں اس کی قدرت پوشیدہ تھی۔ اس کے آگے وبا چلتی تھی اور بخار کی آگ اس کے پاؤں کے پاس ہوتی تھی).

تیمان یعنی یمن اور فاران یعنی مکہ۔ لہٰذا اوپر کے متن کا مطلب یہ ہے:

خدا تیمان سے آیا: یعنی خداوند یمن سے آیا.

قدوس جبلِ فاران سے: یعنی قدوس مکہ سے آیا.

اللہ تعالیٰ اس سے بالاتر ہے کہ اسے آسمان سے آنے کے ساتھ وصف کیا جائے، تو پھر وہ زمین سے کیسے آ سکتا ہے؟! کیونکہ آنے اور جانے کی لازمہ حرکت ہے اور نتیجتاً اس کا لازمہ حادث ہونا ہے، جو اس کے قدیم اور ازلی ہونے کی نفی کرتا ہے؛ اور اس طرح اس کی مطلق الوہیت کی نفی کا سبب بنتا ہے. لہٰذا نہیں مانا جا سکتا کہ جو شخص تیمان یا یمن سے آتا ہے، یا جو فاران سے آتا ہے، وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے؛ اس کے علاوہ دیگر اوصاف جیسے ہاتھ اور پاؤں وغیرہ، جن سے اللہ تعالیٰ بہت بلند و برتر ہے.

(اس کی روشنی نور کی مانند تھی اور اس کے ہاتھ سے شعاع نکلتی تھی، اور وہیں اس کی قدرت پوشیدہ تھی۔ اس کے آگے وبا چلتی تھی اور بخار کی آگ اس کے پاؤں کے پاس ہوتی تھی).

لہٰذا وہ شخصیت جو آئی ہے اور جس پر اوپر کے متن کی صفات پوری طرح منطبق ہوتی ہیں، اللہ کا بندہ اور اس کا رسول محمد (ص) ہیں اور ان کے بعد ان کا خاندان۔ اس لیے کہ وہ مکہ یعنی «فاران» سے آئے ہیں، اور محمد اور آلِ محمد (ع) یمانی بھی ہیں؛ کیونکہ مکہ تہامہ میں ہے اور تہامہ یمن یا تیمان سے ہے۔ محمد (ص) کا آنا دراصل اللہ تعالیٰ کا آنا ہے؛ اس لیے کہ محمد (ص) مخلوقات میں اللہ کی نشانی ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے اس موضوع کو کتاب 'توحید' میں بیان کیا ہے.[1]

یہ کہ تیمان کا معنی یمن ہے، انجیل میں بھی عیسیٰ (ع) کی زبان پر آیا ہے؛ جب انہوں نے یمن کے بادشاہ کو 'تیمن' یا 'تیمان' کہا.

---

1. چونکہ اللہ تعالیٰ کامل ہے اور وہی ہے جس کی طرف کمی کو دور کرنے اور کمال حاصل کرنے کے لیے پناہ لی جاتی ہے، اس لیے اجمالاً الوہیت کی صفت کا موصوف ہونا صرف اللہ تعالیٰ (سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ) (پاک و برتر ہے وہ اُن چیزوں سے جنہیں وہ شریک بناتے ہیں) تک محدود نہیں۔ ہاں، مطلق الوہیت صرف اور صرف اللہ سبحان و متعال کے لیے مخصوص ہے۔ کلمہ "لاإله إلا الله" کلمۂ توحید ہے، کیونکہ اس سے مراد مطلق الوہیت ہے۔ عمومی طور پر الوہیت کی صفت اُس کے کامل مخلوق کو بھی شامل ہوتی ہے کہ مخلوقِ دیگر اُس کی طرف پناہ لیتی ہے تاکہ وہ اُن پر کمال جاری کرے اور اُن کی کمی کو دور کرے. نتیجتاً محمد (ص) جو اللہ سبحان و متعال کی صورت اور تصویر ہیں، "اللہ فی الخَلق" ہیں۔ لیکن محمد (ص) کا الوہیت کی صفت سے موصوف ہونا اور اللہ سبحان و متعال کی الوہیت کے درمیان فرق یہ ہے کہ محمد (ص) کا الوہیت کی صفت سے موصوف ہونا، اللہ سبحان و متعال کی طرف حاجت اور احتیاج کے قید کے ساتھ ہے۔ جبکہ اللہ سبحان و متعال کی الوہیت، الوہیتِ مطلق ہے۔ اور اسی وجہ سے وصف "صمد" وارد ہوا ہے، یعنی وہ ہستی جس میں نہ کوئی شگاف ہے اور نہ کوئی کمی؛ اُس کی تسبیح اور تنزیہ کے سبب، اور اس لیے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اللہ سبحان و متعال کی الوہیت، پاک اور تسبیح کی گئی ہے اور اُس میں کوئی شگاف یا کمی نہیں۔
کتاب توحید سے نقل کی گئی ہے. اس بارے میں مزید تفصیل کے لیے آپ کتاب «توحید» کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

انجیل متی، باب12: (تیمن (جنوب) کی ملکہ حساب کے دن اس قوم کے ساتھ کھڑی ہو گی اور ان پر حکم دے گی؛ کیونکہ وہ زمین کے دورترین حصے سے آئی تاکہ سلیمان کی حکمت کو سنے، اور دیکھو! سلیمان سے بھی بڑا ایک شخص یہاں موجود ہے).

انجیل لوقا، باب11: (تیمن (جنوب) کی ملکہ حساب کے دن اس جماعت کے لوگوں کے ساتھ کھڑی ہو گی اور ان پر فیصلہ کرے گی؛ کیونکہ وہ زمین کے دورترین حصے سے آئی تھی تاکہ سلیمان کی حکمت کو سنے).

اشعیا، باب11: (اور یسی کے تنے سے ایک ٹہنی نکلے گی اور اس کی جڑوں سے ایک شاخ پھوٹے گی۔ اور خداوند کی روح اس پر قرار پائے گی، یعنی حکمت اور فہم کی روح، مشورت اور قوت کی روح، معرفت اور خوفِ خدا کی روح۔ اور اس کی خوشی خدا کے خوف میں ہو گی، اور وہ اپنی آنکھوں کی دیکھ پر فیصلہ نہیں کرے گا اور نہ ہی اپنے کانوں کی سننے پر تنبیہ کرے گا. بلکہ مسکینوں کا انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور زمین کے مظلوموں کے لیے راستی کے ساتھ حکم کرے گا؛ اور دنیا کو اپنے منہ کی لاٹھی سے مارے گا اور اپنی لبوں کی پھونک سے شریروں کو ہلاک کرے گا۔ اور اس کی کمر کا کمربند عدالت ہو گا اور اس کے پہلو کا کمربند امانت۔ اور بھیڑیا برّے کے ساتھ سکونت کرے گا اور چیتا بکری کے بچے کے ساتھ لیٹے گا، اور بچھڑا، شیر اور فربہ جانور سب ایک ساتھ ہوں گے، اور ایک چھوٹا بچہ انہیں ہانکے گا؛ اور گائے ریچھ کے ساتھ چرائے گی اور ان کے بچے اکٹھے لیٹیں گے، اور شیر بچھڑے کی طرح بھوسا کھائے گا۔ اور دودھ پیتا بچہ سانپ کے سوراخ پر کھیل کرے گا اور دودھ چھڑایا ہوا بچہ افعی کے بل پر اپنا ہاتھ رکھے گا۔ اور میرے تمام مقدس پہاڑ پر نہ کوئی نقصان ہو گا اور نہ فساد؛ کیونکہ دنیا خداوند کی معرفت سے بھر جائے گی، جیسے پانی سمندر کو ڈھانپ لیتا ہے؛ اور اُس دن یہ واقع ہو گا کہ یسی کی جڑ قوموں کے لیے ایک عَلَم کے طور پر قائم کی جائے گی، اور اُمتیں اس کو تلاش کریں گی، اور اس کی سلامتی جلال کے ساتھ ہو گی. اور اُس دن ایسا ہو گا کہ خداوند پھر سے اپنا ہاتھ بڑھائے گا تاکہ اپنی اُس قوم کے باقی ماندہ حصے کو واپس لے آئے جو آشور، مصر، فتروس، حبش، عیلام، شنعار، حَمات اور سمندر کے جزیروں میں باقی رہ گئے ہوں۔ اور قوموں کے لیے ایک عَلَم برافراز کرے گا، اور اسرائیل کے جلاوطنوں کو جمع کرے گا، اور یہودا کے منتشر لوگوں کو دنیا کے چاروں گوشوں سے اکٹھا کرے گا).

اوپر کا متن عہدِ قدیم سے ہے جو آخرالزمان میں منجی کے بارے میں بیان کرتا ہے۔ مسیحیوں نے اس کی تفسیر عیسی (ع) (یسوع) پر کی؛ لیکن مسیحیوں کی یہ تفسیر کہ شاخ سے مراد عیسی (ع) ہیں، درست نہیں ہے؛ اس

لیے کہ یہ متن اُن کی تفسیر سے مطابقت نہیں رکھتا اور اُن کے عقیدے کے خلاف ہے. عیسی (ع) اُن کے عقیدے کے مطابق مطلق پروردگار ہیں۔ تو وہ پروردگار سے کیسے ڈرتے ہیں اور اُن کی خوشی پروردگار کے خوف میں کیسے ہے؟!! شاید وہ اپنے باطل اور متناقض عقیدے یعنی تین اقانیم (تثلیث) کی طرف پناہ لینا چاہیں، جس کے باطل ہونے کو میں نے دلیل کے ساتھ کتاب 'توحید' میں بیان کیا ہے.

جس طرح عیسی (ع) نے حکومت نہیں کی اور لوگوں کے درمیان فیصلہ نہیں فرمایا، اسی طرح ظالموں کے خلاف عدل یا انصاف قائم کرنا ممکن نہ تھا۔ تو پھر یہ متن اُن پر کیسے منطبق ہوتا ہے؟!

عیسی (ع) کے زمانے میں وہ بات جس کی متن منظر کشی کرتا ہے، محقق نہیں ہوئی۔ یہ کہ زمین پروردگار کی معرفت سے بھر جائے، جس طرح پانی سمندروں کو بھر دیتا ہے۔ اس معرفت کی علامتیں یہ ہیں: دولت مند غریبوں کے ساتھ ہمدردی کریں، طاقتور کمزور کی مدد کرے اور زمین تقریباً ظلم سے خالی ہو جائے۔ یہ تو کسی علاقے یا ایک چھوٹے شہر کی حد تک بھی محقق نہیں ہوا. انہوں نے اسرائیل کے جلاوطنوں (ان کے نزدیک یعقوب) کو جمع نہیں کیا اور یہودا کے منتشر لوگوں (ان کے نزدیک یعقوب کا فرزند) کو دنیا کے چاروں طرف سے اکٹھا نہیں کیا۔ اگر کہا جائے کہ انہوں نے انہیں اپنے اوپر ایمان لانے کے ذریعے جمع کیا ہے، تب بھی یہ صحیح نہیں؛ کیونکہ حضرت عیسیٰ (ع) کی دعوت اُس وقت تک جب تک کہ وہ آسمان پر اُٹھائے گئے، چند ہی شہروں کی حد تک تبلیغ کے درجے سے آگے نہ بڑھ سکی، چہ جائے کہ اس پر ایمان اور عقیدہ لایا گیا ہو، ایمان اور عقیدے کی بات تو بہت دور ہے۔ جبکہ متن کہتا ہے: یہ شخصیت یہودا کے منتشر لوگوں کو زمین کے اطراف سے جمع کرے گا۔ یعنی متن کا مطلب یہ ہے کہ: جب یہ شخصیت برانگیختہ ہو گی تو دنیا کی کئی حکومتوں اور اُن حکومتوں کے لوگ جو اُس کے برانگیختہ ہونے کے مقام سے دور ہیں، خاص طور پر 'زمین کے اطراف' سے، اُس پر ایمان اور عقیدہ رکھیں گے.

(اور قوموں کے لیے ایک عَلَم برافراز کرے گا، اسرائیل کے جلاوطنوں کو جمع کرے گا، اور یہودا کے منتشر لوگوں کو دنیا کے چاروں گوشوں سے اکٹھا کرے گا).

لفظ «یہودا» عربی میں «حمد» یا «احمد» کے معنی رکھتا ہے.

تورات، سفر پیدایش، باب 29: (اور وہ دوبارہ حاملہ ہوئی اور ایک بیٹے کو جنم دیا اور کہا: «اس بار میں خداوند کی حمد کروں گی»۔ پس اس کا نام یہودا رکھا۔ پھر وہ جننے سے باز آئی).[1]

لفظ «اسرائیل» عربی میں «عبداللہ» ہے.

لہٰذا متن اس طرح ہو جاتا ہے: (اور قوموں کے لیے ایک عَلَم برافراز کرے گا، اسرائیل (عبداللہ) کے جلاوطنوں کو جمع کرے گا، اور یہودا (احمد) کے منتشر لوگوں کو دنیا کے چاروں گوشوں سے اکٹھا کرے گا).

قرآن میں آیا ہے کہ محمد (ص) جب رسالت پر فائز ہوئے تو وہ احمد یا 'یہودا' ہیں جن کی بشارت کتاب میں دی گئی ہے۔ یعنی انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ متن ان پر منطبق ہوتا ہے۔ جیسا کہ محمد (ص) نے فرمایا: (میں عبداللہ ہوں اور میں اسرائیل ہوں، اور جو کچھ اُس کے لیے مقصود ہے، وہی میرے لیے بھی مقصود ہے).

لہٰذا احمد یعنی «یہودا» اور عبداللہ یعنی «اسرائیل»، جن کی بشارت کتابِ مقدس میں دی گئی ہے، آ چکے ہیں اور نص کے مدعی ہیں، اور وہ محمد (ص) ہیں.

اسی طرح اسلام میں وہ «منتشر لوگ» جو خزاں کے پتوں کی طرح زمین کے اطراف سے گرتے ہوئے جمع ہوں گے تاکہ قائم (پہلے مہدی، احمد) کی مدد کریں، وہی امام مہدی (ع) کے انصار ہیں جو آخرالزمان میں ہوں گے، جیسا کہ محمد اور آلِ محمد (ع) کی روایات سے ظاہر ہے.

لیکن نص اللہ سبحان و متعال کی جانب سے، اللہ نے قرآن میں بیان کیا ہے کہ اُس نے، سبحانہ و تعالی، اُن لوگوں کے لیے جو اللہ سبحان کی طرف سے نص طلب کرتے تھے، محمد (ص) کے بارے میں نص اور تصریح کی ہے۔ اور جو لوگ اُس کی گواہی طلب کرتے ہیں، اُن کے لیے اپنی ذات کو بطور گواہ قرار دیا ہے۔ یعنی وہ پختہ خواب جسے انسان دیکھتا ہے اور اس سے حق کا راستہ روشن ہو جاتا ہے.

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (قُلْ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا)[2]

(کہہ دو: میرے اور تمہارے درمیان گواہ کے طور پر اللہ ہی کافی ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں کے حال سے

---

1. قاموسِ کتابِ مقدس میں لفظ "یہودا بن یعقوب" کی تشریح میں کہا گیا ہے: "یہ ایک عبرانی نام ہے جس کا مطلب حمد (تعریف) ہے اور یہ یعقوب کا چوتھا بیٹا ہے جو لیئہ سے تھا۔ اور یہ بین النہرین میں پیدا ہوا تھا۔" یہ نام اس کی ماں نے اُس کی پیدائش کے وقت شکر گزاری کے باعث اسے دیا۔

2. قرآن کریم، سورۂ اسراء، آیت 96۔

خوب باخبر اور دیکھنے والا ہے).

(وَيقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا قُلْ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ)[1]

(کافروں نے کہا: تم اللہ کے بھیجے ہوئے نہیں ہو۔ کہہ دو: میرے اور تمہارے درمیان گواہ کے طور پر اللہ کافی ہے، اور وہ (شخص) [جیسے امیر المؤمنین علی بن ابی طالب (ع)] کہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے).

جو بھی شخص محمد (ص) کے حق میں اللہ کی گواہی طلب کرتا ہے، اللہ کل، آج اور آنے والا کل بھی محمد (ص) اور آلِ محمد (ص) کے لیے خود کو بطور گواہ قرار دیتا ہے۔ انسان پر صرف یہ لازم ہے کہ حق کی پہچان طلب کرنے میں اخلاص رکھے؛ اللہ جلد ہی اُس سے رؤیا اور روحی ملکوتی ذرائع کے ذریعے کلام کرے گا اور اُس پر حق اور یہ کہ اللہ محمد (ص) اور آلِ محمد (ص) کے ساتھ ہے، واضح کر دے گا.

رسول اللہ (ص) کے زمانے میں بہت سے لوگوں نے اللہ کی گواہی ان کے بارے میں خواب کے ذریعے طلب کی؛ اور اللہ نے ان کے لیے گواہی دی اور نتیجتاً اُن پختہ خوابوں کے سبب جو انہوں نے دیکھے، ایمان لے آئے؛ وہ خواب جن میں اللہ نے ان کے لیے محمد (ص) اور آلِ محمد (ص) کا حق واضح کیا۔ یہ اُن خوابوں میں سے کچھ ہیں جن میں اللہ نے محمد (ص)، رسولِ خدا، کے لیے گواہی دی.

جابر بن عبداللہ انصاری روایت کرتے ہیں: (جُندب بن جنادہ یہودی، خیبر سے رسول اللہ (ص) کے پاس آیا اور عرض کیا: اے محمد! مجھے خبر دو اُس چیز کے بارے میں جو اللہ کے پاس نہیں ہے، اور اُس چیز کے بارے میں جو اللہ نہیں کرتا، اور اُس چیز کے بارے میں جو اللہ نہیں جانتا۔ رسول اللہ (ص) نے فرمایا: جو چیز اللہ کے پاس نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اور جو کام اللہ نہیں کرتا، وہ یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ اور جو چیز اللہ نہیں جانتا، وہ تمہارا یہ قول ہے اے یہودی جماعت: 'عزیر اللہ کا بیٹا ہے'؛ اور اللہ اپنے لیے کسی بیٹے کو نہیں جانتا. جُندب نے عرض کیا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ برحق اللہ کے رسول ہیں۔ پھر اس نے عرض کیا: اے رسول اللہ! میں نے کل رات خواب میں موسیٰ بن عمران

---

1. قرآن کریم، سورۂ رعد، آیت 43۔

(ع) کو دیکھا، انہوں نے مجھ سے فرمایا: اے جُندب! محمد (ص) کے ہاتھ پر اسلام قبول کر اور ان کے بعد کے اوصیاء سے تمسک اختیار کر...).[1]

ابن عساکر نے اپنی سند کے ساتھ سعد بن ابی وقاص کے اسلام قبول کرنے کی داستان ذکر کی ہے:

عائشہ بنتِ سعد کہتی ہیں: (میں نے اپنے والد سے سنا کہ وہ کہہ رہے تھے: اسلام قبول کرنے سے تین دن پہلے میں نے خواب دیکھا گویا میں اندھیرے میں ہوں اور کچھ نہیں دیکھتا۔ اچانک ایک چاند میرے لیے روشن ہوا اور میں اُس کے پیچھے چل پڑا۔ گویا میں ایک شخص کو دیکھ رہا ہوں جو مجھ سے پہلے اُس چاند تک پہنچ چکا ہے۔ میں نے زید بن حارثہ اور علی بن ابی طالب اور ابو بکر کو دیکھا۔ گویا میں نے اُن سے پوچھا: تم کب یہاں پہنچے ہو؟ انہوں نے کہا: ابھی اسی وقت۔ مجھے خبر ملی کہ رسول اللہ (ص) خفیہ طور پر اسلام کی دعوت دے رہے ہیں۔ میں نے اُن سے 'وادیِ اجیاد' میں ملاقات کی اور عرض کیا: آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟ فرمایا: کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں رسول اللہ ہوں؟ میں نے عرض کیا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ محمد، رسول اللہ ہیں).[2]

ابن سعد، حاکم اور دیگر نے روایت کیا ہے: محمد بن عبداللہ بن عمر بن عثمان کہتے ہیں: (خالد بن سعید کا اسلام لانا قدیم تھا اور وہ اپنے بھائیوں میں سب سے پہلے اسلام لانے والا تھا۔ اس کے اسلام کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ آگ کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اُس نے اُس کی وسعت کے بارے میں کچھ بیان کیا جسے اللہ بہتر جانتا ہے؛ اور خواب میں دیکھا کہ اس کا باپ اُسے اس آگ میں گھسیٹ رہا ہے اور رسول اللہ (ص) کو دیکھتا ہے کہ آپ نے اس کی کمر بند پکڑی ہوئی ہے تاکہ وہ آگ میں نہ گرے۔ وہ خوف زدہ ہو کر نیند سے جاگتا ہے اور کہتا ہے: قسم بخدا کہ یہ خواب حق ہے... وہ رسول اللہ (ص) سے، جب آپ 'اجیاد' میں تھے، ملاقات کرتا ہے اور عرض کرتا ہے: اے محمد! آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟ آپ (ص) نے فرمایا: میں اُس اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں جو ایک ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں، اور اس بات کی طرف کہ محمد اُس کا بندہ اور اُس کا رسول ہے؛ اور یہ کہ پتھر کی پرستش (چھوڑ دو) جو نہ سنتا ہے، نہ دیکھتا ہے، نہ نقصان پہنچاتا ہے اور نہ فائدہ دیتا ہے، اور نہ اس شخص میں فرق کرتا ہے جو اسے پوجتا ہے اور نہ اس میں جو اسے نہیں پوجتا؛ ان سب سے باز آ جاؤ.

---

1. کفایۃ الاثر، خزاز قمی: ص 57 سے 58 تک؛ بحار الانوار، مجلسی: ج 36 ص 304۔

2. تاریخ مدینۃ دمشق ابن عساکر، ج 20، ص 299؛ اسد الغابۃ، ابن الاثیر، ج 2 ص 292؛ الوافی بالوفیات، الصفدی، ج 15، ص 91۔

خالد نے عرض کیا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ رسول اللہ (ص) اس کے اسلام لانے پر خوش ہوئے...).[1]

اسی طرح وہ معجزات بھی جو اللہ نے محمد (ص) کی دعوت کی تائید کے لیے ظاہر فرمائے، نص میں اضافہ ہوتا ہے.

دوسرا: علم اور حکمت

کتابِ مقدس میں حکمت، علم اور اللہ کی حاکمیت کی دعوت موجود ہے، اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ شیطان کی طرف بلانے والے بے عقلی کی بات کرتے ہیں، جبکہ اللہ کی طرف بلانے والے حکمت سے کلام کرتے ہیں، اور محمد (ص) حکمت اور علم کے ساتھ آئے ہیں.

عیسی (ع) کے کلام:

(... عیسی (ع) ایک گونگے شخص سے شیطانی روح نکال رہے تھے۔ جب شیطان باہر نکل گیا تو وہ گونگا بولنے لگا اور لوگ حیران ہوئے۔ لیکن بعض نے کہا: وہ شیاطین کو بعلزبول، جو شیاطین کا سردار ہے، کی مدد سے نکالتا ہے. دیگر لوگوں نے بھی آزمائش کی نیت سے اُس سے ایک آسمانی نشانی طلب کی۔ اُس نے ان کے خیالات کو جان لیا اور ان سے کہا: ہر وہ ملک جو اپنے ہی خلاف تقسیم ہو جائے، برباد ہو جائے گا، اور ہر وہ گھر جو اپنے ہی خلاف تقسیم ہو جائے، گر جائے گا۔ اگر شیطان بھی اپنے ہی خلاف تقسیم ہو جائے تو اس کی حکومت کس طرح قائم رہ سکتی ہے؟...).[2]

جو شخص انجیل پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ قرآن کی آیات پڑھے اور انصاف کے ساتھ ان میں غور و فکر کرے۔ پچھلے انجیل کے متن کی بنیاد پر، کیا یہ ممکن ہے کہ ان آیات کو شیطانی کہا جائے، جیسا کہ وہ لوگ کرتے ہیں جو محمد (ص) سے کینہ رکھتے ہیں؟

اور یہ قرآن کے متون کی چند مثالیں ہیں:

---

1. الطبقات الکبری، ابن سعد، ج 4، ص 94؛ المستدرک، الحاکم، ج 3، ص 248؛ اسد الغابۃ، ابن الاثیر، ج 2، ص 82۔
2. انجیل لوقا، باب 11۔

(اُدْعُ إِلى سَبيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جادِلْهُمْ بِالَّتي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبيلِهِ وَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدينَ)[1]

(اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ، اور ان سے پسندیدہ طریقے سے بحث کرو۔ بے شک تمہارا رب خوب جانتا ہے کون اس کے راستے سے بھٹک گیا ہے اور وہ ہی زیادہ جاننے والا ہے کون ہدایت پانے والا ہے).

(وَ اعْبُدُوا اللَّهَ وَ لا تُشْرِكُوا بِهِ شَيئاً وَ بِالْوالِدَينِ إِحْساناً وَ بِذِي الْقُرْبى وَ الْيتامى وَ الْمَساكينِ وَ الْجارِ ذِي الْقُرْبى وَ الْجارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَ ابْنِ السَّبيلِ وَ ما مَلَكَتْ أَيمانُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لا يحِبُّ مَنْ كانَ مُخْتالاً فَخُوراً)[2]

(اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو، اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں (سے) اور نزدیکی ہمسائے اور اجنبی پڑوسی اور ہم مجلس، مسافر (جو راستے میں درماندہ ہو) اور ان (غلاموں و کنیزوں) سے جن کے تم مالک ہو چکے ہو (ان سے نیکی کیا کرو)۔ بے شک اللہ اس کو پسند نہیں کرتا جو گھمنڈی اور فخر کرنے والا ہے).

(وَ لا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَ لا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحاً إِنَّ اللَّهَ لا يحِبُّ كُلَّ مُخْتالٍ فَخُورٍ)[3]

(اور لوگوں سے منہ نہ پھیر (تکبر سے)، اور زمین پر اکڑ کر مت چل۔ بے شک اللہ ہر متکبر اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا).

(لِكَيلا تَأْسَوْا عَلى ما فاتَكُمْ وَ لا تَفْرَحُوا بِما آتاكُمْ وَ اللَّهُ لا يحِبُّ كُلَّ مُخْتالٍ فَخُورٍ)[4]

(تاکہ جو چیز تمہیں نہ مل سکی اس پر افسوس نہ کرو، اور جو تمہیں عطا کی گئی اس پر اتراؤ نہیں۔ اور اللہ کسی متکبر فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا).

---

1. قرآن کریم، سورۂ نحل، آیت 125۔
2. قرآن کریم، سورۂ نساء، آیت 36۔
3. قرآن کریم، سورۂ لقمان، آیت 17۔
4. قرآن کریم، سورۂ حدید، آیت 23۔

یہ آیات سورۂ اسراء سے پڑھیں اور اپنے آپ سے پوچھیں:

کیا شیطان اللہ تعالیٰ کی تنہا عبادت کی دعوت دے سکتا ہے؟ کیا شیطان اچھے اخلاق، والدین کے ساتھ نیکی، فقراء کی مدد اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے اور محتاج کی دستگیری کی طرف دعوت دیتا ہے؟ اور کیا وہ قتل و غارت، زنا اور یتیم کے مال پر دست درازی سے روکتا ہے اور عہد پورا کرنے اور پیمانہ پورا کرنے کا حکم دیتا ہے؟

اگر شیطان ان پاکیزہ اخلاق کی طرف بلاتا ہے، تو پھر ان کے خیال میں اللہ سبحانہ و متعال کس چیز کی طرف بلاتا ہے؟

کیا یہ تمام انبیاء کی وصیتیں اور ان کی حکمت نہیں تھیں کہ وہ اللہ کی طرف سے انہیں لے کر آئیں:

(لَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُومًا مَخْذُولًا * وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا * وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا * رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ إِنْ تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا * وَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا * إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا * وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِنْ رَبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُلْ لَهُمْ قَوْلًا مَيْسُورًا * وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَحْسُورًا * إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا * وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا * وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا * وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا * وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّى يَبْلُغَ أَشُدَّهُ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا * وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا * وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا * وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا * كُلُّ ذَلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا * ذَلِكَ مِمَّا أَوْحَى إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَتُلْقَى فِي جَهَنَّمَ مَلُومًا مَدْحُورًا)[1]

(اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا، ورنہ تو ملامت زدہ اور بے یار و مددگار بیٹھا رہ جائے گا۔ اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ بھلائی کرو۔ اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے اُف تک نہ کہنا اور انہیں جھڑکنا نہیں، اور ان

1. قرآن کریم، سورۂ اسراء، آیات 22 سے 39 تک۔

سے عزت و احترام کی بات کہنا۔ اور ان دونوں کے لئے نرم دلی سے عجز و انکساری کے بازو جھکائے رکھو اور دعا کرو: اے میرے رب! ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔ اگر تم نیکوکار ہو تو بے شک وہ توبہ کرنے والوں کے لیے نہایت بخشنے والا ہے. اور رشتہ دار کو اس کا حق دو، اور مسکین اور اس مسافر (جو راستے میں درماندہ ہو) کی بھی (مدد کرو) اور فضول خرچی نہ کرو۔ بے شک فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔ اور اگر تمہیں اپنے رب کی کسی رحمت (رزق) کے انتظار میں ان سے منہ موڑنا پڑے، جس کی تم امید رکھتے ہو، تو ان سے نرمی کی بات کہہ دیا کرو۔ اور اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا (کنجوسی سے) نہ رکھو، اور نہ ہی اسے بالکل کھلا (اسراف سے) پھیلا دو کہ ملامت زدہ اور درماندہ بیٹھ جاؤ۔ بے شک تمہارا رب جس کے لیے چاہے رزق کشادہ کرتا ہے اور (جس کے لیے چاہے) تنگ کر دیتا ہے۔ یقیناً وہ اپنے بندوں کو خوب جاننے والا اور دیکھنے والا ہے؛ اور اپنی اولاد کو فقر کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی۔ یقیناً ان کا قتل بڑا گناہ ہے۔ اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک وہ بے حیائی ہے اور بہت برا راستہ ہے۔ اور جس جان کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، اسے حق کے سوا قتل نہ کرو۔ اور جسے ظلم سے قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے ولی کو بدلہ لینے کی طاقت دی ہے؛ لہٰذا (وہ) قتل میں حد سے تجاوز نہ کرے، کیونکہ وہ (شریعت کی طرف سے) مدد یافتہ ہے۔ اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اس طریقے سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔ اور وعدہ پورا کیا کرو، بیشک وعدہ کی ضرور پوچھ گچھ ہو گی۔ اور ناپ تول پورا کرو جب تم ناپو، اور سیدھی ترازو سے وزن کرو، یہی بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی اچھا ہے؛ اور ایسی بات کے پیچھے نہ پڑو جس کا تمہیں علم نہیں؛ بے شک کان، آنکھ اور دل، ان سب کے بارے میں سوال ہو گا۔ اور زمین میں اکڑ کر مت چلو؛ نہ تو تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ ہی پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ یہ سب (اعمال) برے ہیں، اور تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ یہ سب کچھ حکمت میں سے ہے جو تمہارے رب نے تمہاری طرف وحی کی ہے۔ اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا، ورنہ تم جہنم میں ڈال دیے جاؤ گے ملامت زدہ اور دھتکارے ہوئے).

حضرت عیسیٰ (ع) فرماتے ہیں:

(ہر حکومت جو اپنے ہی خلاف تقسیم ہو جائے، تباہ ہو جائے گی، اور ہر گھر جو اپنے ہی خلاف تقسیم ہو جائے، گر جائے گا۔ اگر شیطان بھی اپنے ہی خلاف تقسیم ہو جائے تو اس کی حکومت کس طرح قائم رہ سکتی ہے؟)

کیا ضروری نہیں کہ مسیحی اس قول کو معیار بنائیں اور قرآن کے مضامین کا موازنہ کریں تاکہ معلوم ہو کہ قرآن اللہ کی طرف سے ہے؟ کیا یہ حضرت عیسی (ع) کا وہی موازنہ نہیں ہے؟ تو پھر وہ اس سے کیوں رو گردانی کرتے ہیں؟ سوائے اس کے کہ کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہیں اور دوسرے حصے سے کفر کرتے ہیں؟

قرآن حکمت سے، نیکی کی دعوت سے اور پاکیزہ و کریم اخلاق کی زینت سے سرشار ہے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسی چیز کسی بے عقل شیطان کی طرف سے ہو جو ہمیشہ برائی اور مذموم اخلاق کی طرف بلاتا ہے؟ کیا شیطان اپنے ہی خلاف تقسیم ہو جائے گا؟ کیا شیطان کی حکومت اپنے ہی خلاف تقسیم ہو سکتی ہے؟

کیا اس کے سوا ہے کہ شیطان اسی صفت سے پہچانا جاتا ہے کہ وہ اپنی حکومت کو قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے، نہ کہ اسے تباہ کرنے کی؟

میرا خیال ہے کہ لوگ اگر چاہیں تو یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ حکمت اور بے عقلی کے درمیان فرق کریں؛ بھلائی اور برائی کے درمیان؛ اچھے اخلاق اور مذموم اخلاق کے درمیان.

شیطان کی حکومت اپنے ہی خلاف تقسیم نہیں ہوتی۔ وہ نیکی کی طرف دعوت نہیں دیتا بلکہ برائی کی طرف بلاتا ہے۔ وہ اخلاقِ کریمہ کی طرف دعوت نہیں دیتا بلکہ مذموم اخلاق کی طرف بلاتا ہے۔

حضرت عیسی (ع) فرماتے ہیں:

(ہر حکومت جو اپنے ہی خلاف تقسیم ہو جائے، تباہ ہو جائے گی، اور ہر گھر جو اپنے ہی خلاف تقسیم ہو جائے، گر جائے گا۔ اگر شیطان بھی اپنے ہی خلاف تقسیم ہو جائے تو اس کی حکومت کس طرح قائم رہ سکتی ہے؟).

اس کے علاوہ عقیدے کی اصلاح اور توحید کی طرف بازگشت اور تثلیث کے عقیدے کے ازالے پر غور کریں جو محمد (ص) اور ان کے بعد کے اوصیاء لے کر آئے۔ خود انجیل سے میں نے بیان کیا ہے کہ یہ عقیدہ کس طرح باطل اور غلط ہے۔ جو شخص حق لے کر آتا ہے، وہ زیادہ حقدار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔ جو شخص کلیسا کے عقیدے کو کتابِ مقدس سے واضح، شفاف اور بغیر کسی شک و شبہ کے باطل ثابت کرتا ہے، وہ زیادہ لائق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے.

ہر انصاف والا شخص جو قرآن کو پڑھے گا، دیکھے گا کہ وہ علم و حکمت جو محمد (ص) قرآن میں لائے ہیں، ایک کامل حکمت ہے جو صرف اللہ سبحانہ کی طرف سے ہو سکتی ہے۔[1]

تیسرا: حاکمیتِ خداوند

حضرت محمد (ص) نے حاکمیتِ خداوند کا مطالبہ کیا، بلکہ جب انہیں موقع ملا تو مدینۂ منورہ میں، پھر مکہ اور حجاز میں اللہ کی حاکمیت کو نافذ کیا۔ آپ (ص) نے واضح طور پر بیان فرمایا کہ حق حاکمیتِ خداوند ہی میں ہے، اور مسلمانوں کے تمام وہ فرقے جو حاکمیتِ خداوند سے باہر نکل جائیں، گمراہ فرقے ہیں۔ فرقۂ ناجیہ کی حدیث اور اس کی صفت آگ کی طرح پہاڑ کی چوٹی پر نمایاں اور مشہور ہے۔

رسول اللہ (ص) نے فرمایا: (میری امت پر بالکل وہی چیزیں آئیں گی جو بنی اسرائیل پر آئیں تھیں، بالشت بہ بالشت؛ حتیٰ کہ اگر ان میں سے کسی نے علانیہ اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کی ہو تو میری امت میں بھی کوئی ایسا کرے گا۔ بنی اسرائیل 72 فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت 73 فرقوں میں بٹ جائے گی، وہ سب آگ میں

---

1. میں نے عیسیٰ (ع) کی مطلق الوہیت کے عقیدے کو عقلی طور پر باطل کیا۔ اسی طرح اس کے بطلان کو کتاب توحید میں انجیل کے متون سے بھی بیان کیا (انجیل سے حتمی قول یہ ہے: عیسیٰ (ع) اُس گھڑی کے بارے میں لاعلمی رکھتے ہیں۔ عیسی اپنے متعلق فرماتے ہیں: اُس گھڑی کے بارے میں، جس میں قیامتِ صغری برپا ہو گی، وہ لاعلم ہیں. « لیکن اُس دن اور اُس گھڑی کے بارے میں باپ کے سوا کوئی نہیں جانتا؛ نہ آسمان کے فرشتے اور نہ ہی بیٹا» (مرقس، باب 13) نادانی ایک قسم کی کمی ہے، جبکہ لاہوتِ مطلق کاملِ مطلق ہے، جس میں نہ کمی کی گنجائش ہے اور نہ نادانی کی؛ کیونکہ وہ ایسا نور ہے جس میں کوئی ظلمت نہیں۔ نادانی اس لیے مخلوق کو لاحق ہوتی ہے کہ اُس کے وجود کے صفحے میں ظلمت پائی جاتی ہے. لہٰذا عیسی (ع) نور اور ظلمت کا ایک مرکب ہیں؛ اور یہ بات ثابت کرتی ہے کہ عیسیٰ لاہوتِ مطلق نہیں ہیں، بلکہ ایک بندہ ہیں، ایسی مخلوق جو ظلمت اور نور سے مرکب ہے، اور وہ نور نہیں ہیں جس میں کوئی ظلمت نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند و برتر ہے۔
اس آخری کلام میں اہلِ خرد کے لیے نصیحت اور عبرت ہے، اور یہ عبارت عیسیٰ (ع) کا ہی قول ہے، جیسا کہ انجیلِ مرقس میں مذکور ہے: « مگر اُس دن اور اُس گھڑی کے بارے میں باپ کے سوا کوئی نہیں جانتا، نہ آسمان کے فرشتے اور نہ بیٹا۔ پس خبردار اور ہوشیار رہو اور دعا کرتے رہو، کیونکہ تم نہیں جانتے کہ وہ وقت کب آئے گا۔ یہ ایسے ہے جیسے کوئی آدمی سفر پر روانہ ہو اور اپنے گھر کو چھوڑ کر اپنے نوکروں کو اختیار دے، ہر ایک کو اُس کا کام سونپے اور دربان کو حکم دے کہ جاگتا رہے۔ لہٰذا جاگتے رہو، کیونکہ تم نہیں جانتے کہ گھر کا مالک کس وقت آئے گا شام کو، یا آدھی رات کو، یا صبح کی اذانِ مرغ، یا صبح کو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اچانک آ جائے اور تمہیں سوتا ہوا پائے۔ لیکن جو کچھ میں تم سے کہتا ہوں، سب سے کہتا ہوں: جاگتے رہو!» (مرقس، باب 12)
کتاب توحید سے نقل کی گئی ہے. اس بارے میں مزید تفصیل کے لیے آپ کتاب «توحید» کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

ہوں گے سوائے ایک فرقے کے۔ عرض کیا گیا: اے رسول اللہ! وہ کون سا ہے؟ آپ (ص) نے فرمایا: وہ جو اس طریقے پر ہوں گے جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں)[1]

رسول اللہ (ص) نے فرمایا: (میری امت 73 فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، وہ سب آگ میں ہوں گے سوائے ایک کے۔ عرض کیا گیا: وہ فرقہ کون سا ہے؟ آپ (ص) نے فرمایا: وہ جس پر میں اور میرے صحابہ آج ہیں)[2]

رسول اللہ (ص) نے فرمایا: (میری امت پر وہی کچھ آئے گا جو بنی اسرائیل پر آیا تھا، بعینہٖ اسی طرح۔ وہ 72 فرقوں میں تقسیم ہوئے تھے اور میری امت 73 فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، جو ایک زیادہ ہیں، اور ان میں سے ایک کے سوا سب آگ میں ہوں گے۔ عرض کیا گیا: اے رسول اللہ! وہ ایک کون سا ہے؟ آپ (ص) نے فرمایا: وہ جس پر ہم اور میرے صحابہ آج ہیں)[3]

لہٰذا فرقۂ ناجیہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایسا فرقہ ہے جس میں وہی تعلق پایا جاتا ہے جو محمد رسول اللہ (ص) اور ان کے صحابہ کے درمیان تھا۔ رسول اللہ محمد (ص) وہ رہبر ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے منتخب کیا گیا ہے، اور ان کے صحابہ اس الٰہی قیادت پر ایمان رکھتے ہیں۔

اشکال اور جدال کا موضوع باقی رہتا ہے۔ کوئی شخص کہتا ہے: محمد (ص) نے یہ کام کیوں کیا اور اس طرح کیوں کہا۔ اگر وہ واقعی خدا کا بھیجا ہوا ہے تو اس نے یہ بات کیوں کہی اور وہ کام کیوں انجام دیا۔ قرآن عربی قواعد اور نحو کے مطابق نہیں ہے اور اس میں غلطی اور بلاغت کی کمزوری پائی جاتی ہے۔ یہ وہ اشکالات ہیں جو ہر فرستادے، ہر کتاب یا ہر الٰہی دین پر وارد کیے جا سکتے ہیں، اور ان اشکالات کے جوابات دیے جا چکے ہیں۔

جبکہ ہمیں یہ بات مد نظر رکھنی چاہیے کہ جو شخص کسی دلیل کا جواب دینے، اسے نقض کرنے اور یہ واضح کرنے سے پہلے کہ یہ دلیل دراصل دلیل ہی نہیں ہے، اشکال تراشی کی طرف مائل ہو جاتا ہے، وہ درحقیقت اسی دلیل اور عقیدے کا اقرار اور اس کی تائید کر رہا ہوتا ہے جس پر وہ اشکال کر رہا ہے۔ ایسا شخص اپنے اسی اشکال کے ذریعے اس کے واضح اور آشکار ہونے کے مرحلے میں ہوتا ہے، کیونکہ اشکالات محض اشکال ہی رہتے ہیں اور

---

1. سنن الترمذی، جلد 4، ص 135۔
2. مجمع الزوائد، الہیثمی، جلد 1، ص 189۔
3. معانی الأخبار، الصدوق، ص 323۔

حقیقت میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی، لیکن یہ اعتراضات دراصل طاغوت کے ہاتھ میں ایک ایسا آلہ ہیں جس کے ذریعے وہ لوگوں کو سبک مغز ثابت کرتا ہے، اور گمراہ علما اور طواغید انہی اعتراضات کو اپنے پیروکاروں کو سبک مغز دکھانے، انہیں اپنی پیروی اور اندھی تقلید پر قائم رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں، تاکہ وہ اپنے منصب اور دنیاوی مفادات کو محفوظ رکھ سکیں۔

جب ان کا باطل عقیدہ منہدم ہو جاتا ہے اور ان کے تمام اعتراضات ختم ہو جاتے ہیں تو وہ نہایت معمولی اور غیر اہم اعتراضات کی طرف لوٹ آتے ہیں، جن کا مقصد اپنے پیروکاروں کے جذبات کو ان کے باپ دادا اور گذشتہ لوگوں کے حق میں ابھارنا ہوتا ہے۔ ان کا اعتراض وہی ہے جو فرعون نے اللہ کے نبی حضرت موسی (ع) پر کیا تھا، جب اس نے ان سے سوال کیا:

(فَما بالُ الْقُرُونِ الْأُولى)[1]

(لہٰذا پچھلی امتوں کا حال کیسا ہے؟)۔

موسی (ع) کا جواب یہ تھا:

(عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَا يضِلُّ رَبِّي وَلَا ينْسَى)[2]

(ان کا علم میرے رب کے پاس ایک کتاب میں ہے، میرا رب نہ غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے)۔

اس اعتراض کا جواب میں نے زمانۂ فترت اور اس زمانے میں لوگوں کی حالت کے موضوع میں بیان کر دیا ہے۔

محمد رسولِ خدا (ص) کے بعد زمین میں اللہ تعالیٰ کی خلافت کا تسلسل

ختمِ نبوت

نبوت سے مراد بعض آسمانی خبروں کی معرفت حاصل ہونا ہے، اور یہ زمین میں صرف اللہ تعالیٰ کے خلفا تک محدود نہیں بلکہ ہر اس مخلوق اور ہر اس فرد کے لیے ممکن ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے خلوص اختیار کرے۔ ممکن ہے

---

[1] . قرآنِ کریم، سورۂ طٰہٰ، آیت 51۔

[2] . قرآنِ کریم، سورۂ طٰہٰ، آیت 52۔

کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کے لیے بعض آسمانی خبروں کی پہچان کا دروازہ کھول دے، اسی اعتبار سے وہ اس معنی میں نبی اور رسول ہوتا ہے، یعنی وہ بعض آسمانی خبروں سے آگاہ ہوتا ہے۔ اس معنی میں نبوت یقیناً اللہ تعالیٰ کے تمام خلفا کے لیے قابلِ حصول ہے، اس لیے کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے مخلص بندوں کے سردار ہوتے ہیں، اور محمد رسولِ خدا (ص) کے بعد اللہ تعالیٰ کے خلفا کے سردار آلِ محمد (ع) ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ ختمِ نبوت کا مطلب یہ ہے کہ ان حضرات کی طرف وحی کا آنا بالکل ختم ہو گیا ہے، درست نہیں۔

لہٰذا محمد رسولِ خدا (ص) کے بعد ختمِ نبوت کا کیا مفہوم ہے؟

درحقیقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھیجی جانے والی نبوت وہی چیز ہے جو محمد رسولِ خدا (ص) پر آکر ختم ہو گئی؛ اور اس ختم ہونے کی وجہ اللہ تعالیٰ کے کامل خلیفہ محمد (ص) کا مبعوث ہونا اور تخلیق کا اپنے مقصدِ خلقت تک پہنچ جانا ہے، اور وہ مقصد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کامل خلیفہ محمد (ص) ہے، جو ارسال اور بھیجنے کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کے مقام پر ہے۔ اسی لیے وہ نبوت جس کی نوعیت محمد (ص) کی طرف سے بھیجنے کی ہے، اسی سے آغاز ہوئی ہے۔ یہ تبدیلی اس کے بعد کہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے کامل خلیفہ محمد (ص) تک پہنچا، لازمی ہے؛ کیونکہ وہ مخلوق میں لاہوت کا مظہر ہے۔[1]

محمد رسولِ خدا (ص) - جو اللہ تعالیٰ کے کامل خلیفہ ہیں - کے بعد اللہ تعالیٰ کے خلفا مقامِ نبوت رکھتے ہیں، لیکن وہ محمد (ص) کی طرف سے بھیجے گئے ہوتے ہیں۔ ان کے بھیجنے والے اور ان کے پشت پناہ محمد (ص) ہیں۔ یہ بات ان روایات کے مفہوم کو واضح کرتی ہے جو ان کی نبوت کی نفی کرتی ہیں، اور نیز ان دوسری روایات کے مفہوم کو بھی روشن کرتی ہے جو اس امر کو ثابت کرتی ہیں کہ ان کی طرف وحی کی جاتی ہے۔ جو چیز محمد (ص) کے بعد نفی ہوئی ہے وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے نبوت ہے، نہ کہ مطلق نبوت۔

بصائر الدرجات میں ہے: علی بن عبدالعزیز اپنے والد سے نقل کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں: میں نے امام صادق (ع) سے عرض کیا: (میں آپ پر قربان جاؤں؛ لوگ گمان کرتے ہیں کہ رسولِ اللہ (ص) نے علی (ع) کو یمن اس لیے بھیجا تھا کہ وہ ان کے درمیان فیصلے کریں۔ علی (ع) نے فرمایا: جو بھی مسئلہ میرے سامنے آتا، میں اس میں اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے رسول (ص) کے حکم کے مطابق فیصلہ کرتا تھا۔ امام (ع) نے فرمایا: وہ سچ

---

[1] . مزید تفصیل کے لیے کتاب «نبوتِ خاتم» کی طرف رجوع کیجیے۔

کہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا: یہ کیسے ہو سکتا ہے، حالانکہ پورا قرآن نازل نہیں ہوا تھا اور رسولِ اللہ (ص) بھی ان سے دور تھے؟ امام (ع) نے فرمایا: روح القدس انہیں القا کرتا تھا)[1]

الکافی میں ہے: حارث بن مغیرہ کہتے ہیں: امام باقر (ع) نے فرمایا: (علی (ع) مُحَدَّث تھے۔ میں نے عرض کیا: کیا آپ یہ فرما رہے ہیں کہ وہ نبی تھے؟ تو آپ نے اپنے ہاتھ سے اس طرح اشارہ کیا، پھر فرمایا: جیسے سلیمان کا ساتھی، یا موسی کا ساتھی، یا ذوالقرنین کی مانند، یا جیسا کہ تم تک یہ بات پہنچی ہے کہ [علی] نے کہا: تمہارے درمیان بھی اس (ذوالقرنین) کی مانند ایک ہے)[2]

یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ارسالی نبوت کا ختم ہونا اور محمد رسولِ خدا (ص) کی جانب سے ارسالی نبوت کا آغاز، سابقہ انبیا کی برتری کے معنی میں نہیں ہے؛ اس لیے کہ یہ امر بذاتِ خود کسی معین برتری کے معنی میں نہیں ہے؛ کیونکہ محمد رسولِ خدا (ص) کی جانب سے رسالت درحقیقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کی جانب سے رسالت ہے۔ پہلے کا ارسال اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور محمد (ص) کے ذریعے (قریب تر حجاب کے واسطے سے) تھا، کیونکہ اس وقت وہ ابھی مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ بعد کا ارسال اللہ تعالیٰ کے حکم سے کامل خلیفہ محمد (ص) کی جانب سے ہے، اور یہ ان کے مبعوث ہو جانے کے بعد ہے۔

اب ہم زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلفا کے علم کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، جو درحقیقت لوگوں کی دینی ضروریات کے حوالے سے لمحہ بہ لمحہ نازل ہونے والی وحی ہے۔

اب میں ان کے علم کے منبع کے بارے میں ایک روایت نقل کرتا ہوں جو اس مقام کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے، جس میں امام یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ محمد (ص) کی طرف سے بھیجے گئے ہیں، اور جو ہستی انہیں تعلیم دیتی ہے وہ خود رسولِ اللہ محمد (ص) ہیں۔ ظاہر ہے کہ علی بن ابی طالب (ع) کے بعد اللہ تعالیٰ کے خلفا کے بارے میں، علی (ع) ہی محمد (ص) کا دروازہ ہیں، اور محمد (ص) علم کا شہر ہیں۔ اس میں کوئی مانع نہیں کہ وہی حضرات بھی ان کے علم تک پہنچنے کا راستہ ہوں:

---

[1] . بصائر الدرجات، صفّار، ص 472۔

[2] . کافی، کلینی، جلد 1، ص 269۔

منصور بن حازم کہتے ہیں: (میں نے امام صادق (ع) سے سنا کہ آپ نے فرمایا: ہمارے پاس ایک صحیفہ ہے جس میں خراش کی دیت تک درج ہے۔ میں نے عرض کیا: یہ علم ہے۔آپ نے فرمایا: یہ علم نہیں ہے، یہ میراث ہے۔ علم وہ ہے جو ہر دن اور ہر رات رسولِ اللہ (ص) اور علی بن ابی طالب (ع) کی طرف سے پیدا ہوتا ہے)[1]

اصل خلافتِ الٰہی ہے

فرمانروائی خاص اللہ تعالیٰ کی ہے اور کسی فرد کو اللہ تعالیٰ کی فرمانروائی میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں، مگر اس کی اجازت سے۔ جو شخص یہ چاہے کہ فرمانروائی کو اللہ تعالیٰ سے لوگوں کی طرف منتقل کرے تاکہ لوگوں کو خلیفہ یا حاکم کے نصب کی ولایت حاصل ہو - جیسا کہ اہلِ سنت کا عقیدہ ہے - تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس بات کی دلیل پیش کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس کام کی اجازت دی ہے؛ ورنہ مسئلہ اپنی اصل ہی پر قائم رہے گا۔ یعنی ولایت اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہی منتقل ہوتی ہے، اور حاکم کا تقرر صرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی جائز ہے۔

اصلِ ثابت یہی ہے کہ زمین میں خلافت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وہ الٰہی تعیین کے ساتھ ہوتی ہے، اور یہ کہ ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ زمین میں ایک جانشین رکھتا ہے جسے وہ خود مقرر کرتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلاً)[2]

(یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آ رہی ہے، اور تم اللہ تعالیٰ کی سنت میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے)۔

جو کوئی بھی اس کو نقض کرنا چاہے، اس پر لازم ہے کہ وہ اس نقض کی دلیل پیش کرے، حالانکہ وہ اس کے پاس موجود نہیں۔

یہ تعیین پہلے ہی دن حضرت آدم (ع) پر نافذ ہوئی؛ اللہ تعالیٰ نے آدم کو زمین میں اپنا جانشین قرار دیا اور انہیں زمین میں اپنا خلیفہ مقرر فرمایا:

---

[1] . بصائر الدرجات، صفّار، ص 344۔

[2] . قرآنِ کریم، سورۂ فتح، آیت 23۔

(وَ إِذْ قالَ رَبُّكَ لِلْمَلائِكَةِ إِنِّي جاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قالُوا أَ تَجْعَلُ فِيها مَنْ يفْسِدُ فِيها وَ يسْفِكُ الدِّماءَ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ قالَ إِنِّي أَعْلَمُ ما لا تَعْلَمُون)[1]

(اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا: میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، انہوں نے کہا: کیا آپ اس میں ایسے کو مقرر کریں گے جو اس میں فساد کرے اور خون بہائے، حالانکہ ہم آپ کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں، فرمایا: میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے)۔

اور دین کا علم اس کا زادِ راہ بنایا:

(وَ عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْماءَ كُلَّها ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلائِكَةِ فَقالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْماءِ هؤُلاءِ إِنْ كُنْتُمْ صادِقِين)[2]

(اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام نام سکھا دیے، پھر ان سب کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ)۔

اور مخلوقات کو اس کی اطاعت کا حکم دیا (اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے نفاذ کے طور پر):

(وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلائِكَةِ اسْجُدُوا لآدَمَ فَسَجَدُوا إِلا إِبْلِيسَ أَبَى وَاسْتَكْبَرَوَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ)[3]

(اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے، جس نے انکار کیا اور تکبر کیا؛ اور وہ کافروں میں سے تھا)۔

یہ معاملہ محمد (ص) تک بطور جاری سنتِ الٰہی کے جاری رہا ہے اور محمد (ص) کے بعد بھی جاری ہے؛ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ زمین اور اس پر موجود لوگوں کا وارث بن جائے، اور اس زمین پر آخری مکلفین کی موجودگی کے ساتھ خلافتِ الٰہی کا اختتام ہو جائے۔

اس موضوع کے بارے میں اہلِ سنت کی احادیث:

محمد رسول اللہ (ص) کے لیے علی (ع) کی جانشینی کے بارے میں احادیث:

(علی محمد رسول اللہ (ص) کے بعد ہدایت کرنے والے ہیں)[4]

---

1. قرآنِ کریم، سورۂ بقرہ، آیت 30۔
2. قرآنِ کریم، سورۂ بقرہ، آیت 31۔
3. قرآنِ کریم، سورۂ بقرہ، آیت 34۔
4. درج ذیل منابع میں یہ بات وارد ہوئی ہے:

یہ ان روایات کی چند مثالیں ہیں: ابن جریر طبری نے اپنی کتاب جامع البیان (جلد 13، صفحہ 142) میں اپنی سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ (جب آیت (إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ) [1] (تم تو صرف ڈرانے والے ہو اور ہر قوم کے لیے ایک ہدایت کرنے والا ہے) نازل ہوئی تو رسول اللہ (ص) نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا اور فرمایا: میں ہی منذر اور خبر دار کرنے والا ہوں، اور ہر قوم کا ایک ہدایت کرنے والا ہوتا ہے۔ پھر آپ (ص) نے اپنے ہاتھ سے علی (ع) کے کندھے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: اے علی، تم ہی ہدایت کرنے والے ہو، میرے بعد ہدایت پانے والے تمہارے ذریعے ہدایت پائیں گے۔) [2] حاکم نیشابوری نے مستدرک الصحیحین (جلد 3، صفحہ 130) میں اپنی سند کے ساتھ علی بن ابی طالب (ع) سے روایت کی ہے کہ آپ نے اس آیت کے بارے میں فرمایا: (رسول خدا (ص) منذر یعنی خبر دار کرنے والے تھے اور میں ہدایت کرنے والا ہوں) [3]

ابن ابی حاتم اپنی تفسیر میں (جلد 7، صفحہ 2225، روایت نمبر 12152) امام علی (ع) سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: (ہر قوم کا ایک ہدایت کرنے والا ہوتا ہے، یعنی ان کا ہدایت کرنے والا بنی ہاشم میں سے ایک

- مستدرک، حاکم نیشابوری، جلد 3، ص 129، حضرت علی (ع) سے منقول ہے۔
- کنزالعمال، متقی ہندی، جلد 2، ص 441، حضرت علی (ع) سے۔
- نظم درر السمطین، زرندی حنفی، صفحات 89 سے 90، ابوبرزہ اسلمی اور ابن عباس سے۔
- تفسیر طبری، جلد 13، ص 142، ابن عباس سے۔
- تاریخ مدینہ دمشق، ابن عساکر، جلد 42، صفحات 359 اور 360، عبد خیر اور عبداللہ اسدی سے۔

اور «رَجُلٌ مِن بَنِي هَاشِم» (بنی ہاشم میں سے ایک مرد) کے الفاظ کے ساتھ درج ذیل منابع میں آیا ہے:

- مسند احمد، جلد 1، ص 126، حضرت علی (ع) سے منقول ہے۔
- معجم الصغیر، طبرانی، جلد 1، ص 261، اور معجم الاوسط، جلد 2، ص 96، اور جلد 5، ص 153، اور جلد 7، ص 379۔
- مجمع الزوائد، ہیثمی، جلد 7، ص 41، عبداللہ سے۔

1. قرآن کریم، سورۃ الرعد، آیت 7۔
2. ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب فتح الباری، جلد 8، ص 285 میں کہا ہے: یہ حدیث حَسَن سند کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔
3. حاکم نیشابوری اس روایت کے ذیل میں لکھتے ہیں: یہ حدیث صحیح السند ہے، لیکن ان دونوں نے یعنی بخاری اور مسلم نے اسے نقل نہیں کیا!

مرد ہوتا ہے۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ ابن الجُنَید نے کہا: بنی ہاشم میں سے وہ شخص علی بن ابی طالب (ع) ہیں۔)[1]

اسی طرح شیعہ طرق سے بھی ان روایات کو ذکر کیا جا سکتا ہے: کلینی نے الکافی جلد 1، صفحات 191 اور 192 میں صحیح یا حسن سند کے ساتھ روایت نقل کی ہے کہ (امام باقر (ع) سے آیت (إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ)[2] (تم تو صرف ڈرانے والے ہو اور ہر قوم کے لیے ایک ہدایت کرنے والا ہے) کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: رسول اللہ (ص) ڈرانے والے ہیں اور ہر زمانے کے لیے ہم میں سے ایک ہدایت کرنے والا ہوتا ہے جو لوگوں کو اس چیز کی طرف ہدایت کرتا ہے جو رسول خدا (ص) لائے ہیں، اور آپ کے بعد ہدایت کرنے والے علی (ع) ہیں، پھر یکے بعد دیگرے اوصیاء)۔ اور اسی جلد 1، صفحہ 192 میں اپنی سند کے ساتھ یہ روایت بھی نقل کی ہے: (ابو بصیر کہتے ہیں کہ میں نے امام صادق (ع) سے زیر بحث آیت کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: رسول اللہ (ص) منذر یعنی بیم دینے والے ہیں اور علی (ع) ہدایت کرنے والے ہیں۔ اے ابو محمد! کیا آج بھی کوئی ہدایت کرنے والا موجود ہے؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں، آپ پر قربان جاؤں، ہمیشہ آپ لوگوں میں سے ایک کے بعد ایک ہدایت کرنے والا موجود رہا ہے یہاں تک کہ یہ ذمہ داری آپ تک پہنچی ہے۔ تب آپ نے فرمایا: اے ابو محمد! اللہ تم پر رحم کرے۔ اگر آیت کسی ایک شخص پر نازل ہو، پھر وہ شخص وفات پا جائے تو کیا آیت بھی مر جاتی ہے؟ کیا کتاب مر جاتی ہے؟ نہیں، بلکہ کتاب زندہ ہے اور لوگوں میں باقی رہتی ہے اور جاری رہتی ہے، جیسے پہلے جاری تھی)۔

---

[1] - اہل سنت کے دیگر محدثین نے بھی اس مذکورہ حدیث کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، مثلاً:
طبرانی نے المعجم الاوسط جلد 2 ص 94 اور جلد 5 صفحات 153 سے 154 میں ذکر کیا ہے؛
مسند احمد بن حنبل جلد 1 ص 126 میں روایت آئی ہے؛
احمد محمد شاکر نے مسند احمد پر اپنی تعلیق اور حاشیے میں (جلد 2، صفحات 48 اور 49) اس کی تصحیح کی ہے اور کہا ہے: "اس کی سند صحیح ہے، مطلب بن زیاد بن ابی زہیر ثقفی کوفی ثقہ ہیں، کیونکہ احمد، ابن معین اور دوسروں نے ان کی توثیق کی ہے اور بخاری نے الکبیر (4/2/8) میں اس کے حالات ذکر کیے ہیں اور ان پر کوئی جرح یا عیب بیان نہیں کیا۔۔۔ اور یہ حدیث عبداللہ بن احمد کے اضافات میں سے ہے۔"
ہیثمی نے مجمع الزوائد جلد 7 ص 41 میں اس روایت کے بارے میں کہا ہے: "عبداللہ بن احمد اور طبرانی نے المعجم الصغیر اور المعجم الاوسط میں اسے روایت کیا ہے اور مسند احمد کے تمام راوی ثقہ (یعنی معتبر اور قابل اعتماد) ہیں۔"

[2] . قرآن کریم، سورۂ رعد، آیت ی ۷۔

اور اسی جلد 1، صفحہ 192 میں اپنی سند کے ساتھ یہ بھی نقل کیا ہے کہ امام باقر(ع) نے اوپر مذکور آیت کے بارے میں فرمایا: (رسول اللہ (ص) بیم دینے والے ہیں اور علی ہدایت کرنے والے ہیں۔ آگاہ رہو، خدا کی قسم! یہ ہدایت کرنے والا ہم میں سے کبھی جدا نہیں ہوا اور ہمیشہ قیامت تک ہم میں موجود رہے گا)۔

حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ[1]

یہ اس حدیث کے کچھ نمونے ہیں جو بعض مصادر میں مذکور ہیں:

مسند احمد میں آیا ہے کہ زاذان بن عمر کہتے ہیں: (میں نے رحبہ میں علی سے سنا کہ وہ لوگوں سے اُن افراد کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے جو غدیرِ خم کے دن رسول اللہ (ص) کے ساتھ موجود تھے، پھر آپ نے اپنا کلام بیان

---

[1] . یہ حدیث درج ذیل مصادر میں نقل ہوئی ہے:

مسند احمد، جلد 1، صفحات 84، 118، 119 اور 152، اور جلد 4، صفحات 281، 370 اور 373، اور جلد 5، صفحات 366، 373 اور 419، اور اسے علی (ع)، زاذان بن عمر، سعید بن وہب، زید بن یثیع، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، براء بن عازب، ابو طفیل، زید بن ارقم اور ریاح بن حرث سے روایت کیا گیا ہے؛

سنن ابن ماجہ، جلد 5، ص 297، سعد بن ابی وقاص سے؛

سنن ترمذی، جلد 5، ص 279، ابو سریحہ یا زید بن ارقم سے؛

المستدرک، حاکم نیشابوری، جلد 3، صفحات 109، 110، 371 اور 533، زید بن ارقم اور بریدہ اسلمی سے؛

مصنف ابن ابی شیبہ کوفی، جلد 7، صفحات 495، 496، 499، 503 اور 506، جابر بن عبداللہ، رباح بن حارث، سعد، زید بن یثیع، براء اور بریدہ سے؛

سنن کبریٰ، نسائی، جلد 5، صفحات 45، 108، 130، 131، 132، 134 اور 136، بریدہ، سعد بن ابی وقاص، عمیرہ بن سعد، سعید بن وہب، زید بن یثیع، ابو طفیل اور عمرو ذو مر سے؛

مسند ابی یعلیٰ، جلد 1، ص 429 اور جلد 11، ص 307، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ اور ابو یزید اودی سے؛

صحیح ابن حبان، جلد 15، ص 376، ابو طفیل سے؛

مجمع الزوائد ہیثمی، جلد 9، ص 103، باب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان «من کنت مولاہ فعلی مولاہ» کے بارے میں، جو علی(ع)، رباح بن حارث، عمرو ذو مر، زید بن ارقم، ابو طفیل، سعید بن وہب، زید بن یثیع، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، ابن عمر، ملک بن حویرث، حبشی بن جنادہ، جریر، زیاد بن مطرف، نذیر، سعد بن ابی وقاص، زاذان ابی عمر، عمارہ، ابن عباس، عمیرہ بنت سعد، عمیر بن سعد، ابی سعید، عبداللہ بن مسعود اور بریدہ سے نقل کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت سے مصادر موجود ہیں۔

آلبانی کہتے ہیں: «حدیث 'من کنت مولاہ فعلی مولاہ، اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ' نہایت صحیح ہے۔ صحابہ کے ایک گروہ کے ذریعے روایت ہوا ہے کہ ان میں سے 7 افراد کی احادیث نقل ہوئی ہیں اور بعض کے لیے ایک سے زیادہ طریق ہیں، میں نے ان سب کو جمع کیا اور ان کی اسناد کو مکمل کیا ہے» (سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ، ص 1750، سنن ابن ابی عاصم، ظلال الجنۃ فی تخریج السنۃ، محمد ناصر الدین آلبانی، ص 552)۔

فرمایا۔ اس پر تیرہ آدمی کھڑے ہوئے اور انہوں نے گواہی دی کہ انہوں نے رسول اللہ (ص) سے یہ فرماتے ہوئے سنا تھا: جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کا مولا ہے)[1]

مسند احمد میں آیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کہتے ہیں: (ہم نے دیکھا کہ علی (ع) نے رحبہ میں لوگوں سے سوال کیا: کس نے رسول اللہ (ص) کو غدیرِ خم کے دن یہ فرماتے ہوئے سنا کہ (جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کا مولا ہے؟ عبدالرحمٰن کہتے ہیں: میں نے اہلِ بدر میں سے بارہ افراد کو دیکھا کہ وہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ہم گواہی دیتے ہیں کہ رسول اللہ (ص) نے غدیر کے دن پوچھا: کیا میں مؤمنوں پر ان کی اپنی جانوں سے زیادہ حق نہیں رکھتا اور کیا میری بیویاں ان کی مائیں نہیں ہیں؟ ہم نے عرض کیا: کیوں نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا: جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کا مولا ہے۔ اے اللہ! جو اس کی ولایت رکھے تو اسے دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی کرے تو اس سے دشمنی کر)[2]

مسند احمد: علی (ع) نے فرمایا: (رسول اللہ (ص) نے غدیر خم کے دن فرمایا: جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں۔ اس کے بعد لوگوں نے اس عبارت کا اضافہ کیا: جو اس سے ولایت رکھتا ہے اس سے محبت رکھ، اور جو اس سے دشمنی کرے تو اس سے دشمنی کر)[3]

مسند احمد: براء بن عازب بیان کرتے ہیں: (ہم رسول اللہ (ص) کے ساتھ ایک سفر میں تھے، غدیر خم پر اترے۔ ہم میں نماز باجماعت کے لیے اعلان کیا گیا، اور رسول اللہ (ص) کے لیے دو درختوں کے نیچے جگہ صاف کی گئی۔ آپ (ص) نے نمازِ ظہر ادا کی، پھر علی (ع) کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ میں مؤمنوں پر ان کی اپنی جانوں سے زیادہ حق رکھتا ہوں؟ لوگوں نے عرض کیا: جی ہاں۔ پھر آپ (ص) نے علی (ع) کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں۔ اے اللہ! جو اس سے ولایت رکھے تو اسے دوست رکھ، اور جو اس سے دشمنی کرے تو اس سے دشمنی کر۔ راوی کہتے ہیں: اس کے بعد عمر نے علی (ع) سے ملاقات کی اور ان سے کہا: اے ابو طالب کے بیٹے! آپ کو مبارک ہو، آپ ہر مؤمن مرد اور مؤمن عورت کے مولا بن گئے)[4]

---

1. مسند احمد، جلد 1، ص 84۔
2. مسند احمد، جلد 1، ص 119۔
3. مسند احمد، جلد 1، ص 152۔
4. مسند احمد، جلد 4، ص 281۔

مسند احمد: ابو طفیل بیان کرتے ہیں: (علی (ع) نے رحبہ میں لوگوں کو جمع کیا، پھر ان سے فرمایا: تم میں سے کون مسلمان ہے جس نے وہ بات سنی ہو جو رسول اللہ (ص) نے غدیر خم میں فرمائی تھی؟ تو تیس آدمی کھڑے ہوئے۔ ابو نعیم کہتے ہیں: بہت سے لوگ کھڑے ہوئے اور گواہی دی کہ جب رسول اللہ (ص) نے علی (ع) کا ہاتھ پکڑا تو لوگوں سے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ میں مؤمنوں پر ان کی اپنی جانوں سے زیادہ حق رکھتا ہوں؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں، اے رسول اللہ۔ آپ (ص) نے فرمایا: جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں۔ اے اللہ! جو اس سے ولایت رکھے تو اسے دوست رکھ، اور جو اس سے دشمنی کرے تو اس سے دشمنی کر۔ راوی کہتے ہیں: میں وہاں سے نکلا تو گویا میرے دل میں کچھ کھٹک تھی۔ میں زید بن ارقم سے ملا اور ان سے کہا: میں نے علی (ع) سے اس طرح کی بات سنی ہے۔ انہوں نے کہا: تم انکار کیوں کرتے ہو؟ میں نے خود رسول اللہ (ص) سے اس کے بارے میں اسی طرح فرماتے ہوئے سنا ہے)[1]

مسند احمد: ابو عبداللہ بیان کرتے ہیں: (میں زید بن ارقم کے پاس تھا کہ فسطاط کے انتہائی دور دراز مقام سے ایک شخص آیا اور اس نے ان سے ایک بیماری کے بارے میں سوال کیا۔ انہوں نے کہا: رسول اللہ (ص) نے فرمایا: کیا میں مؤمنوں پر ان کی اپنی جانوں سے زیادہ حق نہیں رکھتا؟ لوگوں نے عرض کیا: جی ہاں۔ آپ (ص) نے فرمایا: جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں۔ میمون کہتے ہیں: قوم کے بعض افراد نے زید سے میرے لیے حدیث بیان کی کہ رسول اللہ (ص) نے فرمایا: اے اللہ! جو اس کی ولایت رکھے تو اسے دوست رکھ، اور جو اس سے دشمنی کرے تو اس سے دشمنی کر)[2]

مسند احمد: ابو اسحاق بیان کرتے ہیں: میں نے سعید بن وہب سے سنا کہ وہ لوگوں کو قسم دلاتے تھے۔ تو نبی (ص) کے صحابہ میں سے پانچ یا چھ آدمی کھڑے ہوئے اور گواہی دی کہ رسول اللہ (ص) نے فرمایا: (جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں)[3]

مسند احمد: زید بن ارقم کہتے ہیں: (اس نے لوگوں کو گواہ بنایا اور کہا: ایک شخص نے لوگوں کو قسم دی کہ جس نے نبی (ص) سے یہ سنا ہو کہ آپ (ص) نے فرمایا: جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں۔ اے اللہ!

---

[1] . مسند احمد، جلد 4، ص 370۔

[2] . مسند احمد، جلد 4، ص 373۔

[3] . مسند احمد، جلد 5، ص 366۔

جو اس کی ولایت رکھے تو اسے دوست رکھ، اور جو اس سے دشمنی کرے تو اس سے دشمنی کر۔ تو سولہ آدمی کھڑے ہوئے اور انہوں نے گواہی دی)[1]

مسند احمد: ریاح بن حارث بیان کرتے ہیں: (رحبہ میں ایک جماعت علی (ع) کے پاس آئی اور عرض کیا: اے ہمارے مولا! آپ پر سلام ہو۔ آپ نے فرمایا: میں تمہارا مولا کیسے ہوں جبکہ تم عربوں کا ایک گروہ ہو؟ انہوں نے عرض کیا: ہم نے رسول اللہ (ص) سے غدیر کے دن سنا ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا: جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں۔ ریاح کہتے ہیں: جب وہ لوگ چلے گئے تو میں ان کے پیچھے گیا اور ان کے بارے میں پوچھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ انصار میں سے چند افراد تھے اور ان میں ابو ایوب انصاری بھی شامل تھے)[2]

سنن ابن ماجہ: سعد بن ابی وقاص بیان کرتے ہیں: (معاویہ کے ایک حج کے سفر میں سعد ان کے پاس آئے۔ وہاں علی (ع) کا ذکر کیا گیا تو معاویہ نے ان کے بارے میں گستاخی کی۔ اس پر سعد غضبناک ہو گئے اور کہا: کیا تم ایک ایسے شخص کے بارے میں یہ بات کہتے ہو جس کے متعلق میں نے رسول اللہ (ص) سے سنا کہ آپ (ص) نے فرمایا: جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں۔ اور میں نے آپ (ص) کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا کہ: تم میرے نزدیک ایسے ہو جیسے ہارون موسی کے نزدیک تھے، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور میں نے یہ بھی سنا کہ آپ (ص) نے فرمایا: آج میں یہ جھنڈا ایسے شخص کے ہاتھ میں دوں گا جس سے اللہ اور اس کا رسول محبت کرتے ہیں؟)[3]

سنن ترمذی: سلمہ بن کہیل کہتے ہیں کہ میں نے ابو طفیل سے سنا، وہ ابی سریحہ یا زید بن ارقم سے روایت کرتے ہیں، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: (جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں)۔ یہ حدیث حسن اور غریب ہے۔

مستدرک، حاکم نیشاپوری: زید بن ارقم کہتے ہیں: (جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) حجۃ الوداع سے واپس آئے اور غدیرِ خم میں قیام فرمایا تو آپ نے حکم دیا کہ درختوں سے ایک بلند سایہ بنایا جائے۔ چنانچہ وہ سایہ تیار کیا گیا۔ پھر آپ نے فرمایا: گویا مجھے بلا لیا گیا ہے اور مجھے اس

---

[1] . مسند احمد، جلد 5، ص 370۔

[2] . مسند احمد، جلد 5، ص 419۔

[3] . سنن ابن ماجہ، جلد 1، ص 45۔

کی دعوت قبول کرنی ہے۔ میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، جن میں سے ایک دوسری سے بڑی ہے: اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری عترت۔ دیکھنا کہ میرے بعد تم ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہو۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ حوض پر میرے پاس واپس آ جائیں گے۔ پھر فرمایا: اللہ عزوجل میرا مولا ہے اور میں ہر مومن کا مولا ہوں۔ پھر آپ نے علی(ع) کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں۔ اے اللہ! جو اس کی ولایت رکھے اسے دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی کرے اس سے دشمنی رکھ)۔ اور [حاکم نے] اس حدیث کو اس کے طول کے ساتھ ذکر کیا۔ یہ حدیث شیخین کی شرط پر صحیح ہے، مگر انہوں نے اسے اس کے طول کے ساتھ ذکر نہیں کیا۔

اس کی تائید سَلَمہ بن کہیل کی ابو طفیل سے روایت کردہ حدیث سے ہوتی ہے، جو ان دونوں کی شرط پر صحیح ہے۔ ... زید بن ارقم کہتے ہیں: (رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ اور مدینہ کے درمیان درختوں کے پاس تشریف فرما ہوئے۔ وہاں پانچ بڑے درخت تھے۔ لوگوں نے درختوں کے نیچے کی جگہ صاف کی۔ آپ وہاں بیٹھے اور نماز ادا کی۔ پھر خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی، اس کا ذکر کیا اور لوگوں کو نصیحت فرمائی۔ پھر جو کچھ اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ ارشاد فرمایا۔ پھر فرمایا: اے لوگو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، اگر تم ان دونوں کی پیروی کرو گے تو ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میرے اہل بیت، یعنی میری عترت ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ میں مومنوں پر ان کی اپنی جانوں سے زیادہ حق رکھتا ہوں؟ یہ بات آپ نے تین مرتبہ فرمائی اور تینوں مرتبہ لوگوں نے کہا: جی ہاں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں)۔ بریدہ اسلمی کی یہ حدیث شرطِ شیخین کے مطابق صحیح ہے۔

مستدرک، حاکم نیشابوری میں ہے: بریدہ اسلمی بیان کرتے ہیں کہ (ہم علی (ع) کے ساتھ یمن کے راستے میں ایک جنگ میں شریک ہوئے۔ میں نے ان میں بے چینی دیکھی۔ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور علی کا ذکر کیا اور ان پر عیب لگایا۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ کا چہرہ مبارک بدل گیا اور آپ نے فرمایا: اے بریدہ! کیا میں مومنوں پر ان کی اپنی جانوں سے زیادہ حق نہیں رکھتا؟ میں نے عرض کیا: جی

ہاں، اے رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا: جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں، اور حدیث کو ذکر فرمایا)۔ یہ حدیث شرطِ مسلم کے مطابق صحیح ہے، اور ان دونوں نے اسے روایت نہیں کیا۔[1]

رفاعہ بن ایاس اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ (ہم علی (ع) کے ساتھ جنگِ جمل کے دن تھے۔ انہوں نے طلحہ بن عبیداللہ کی طرف پیغام بھیجا کہ میرے ساتھ ملاقات کرو۔ طلحہ ان کے پاس آیا۔ علی (ع) نے فرمایا: میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں! کیا تم نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے یہ نہیں سنا کہ آپ (ص) نے فرمایا تھا: جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں۔ اے اللہ! جو اس کی ولایت رکھے اس سے محبت فرما، اور جو اس سے دشمنی کرے اس سے دشمنی فرما؟ اس نے عرض کیا: ہاں۔ علی (ع) نے فرمایا: پھر تم مجھ سے کیوں جنگ کر رہے ہو؟ اس نے عرض کیا: مجھے یاد نہیں۔ راوی کہتا ہے: پھر طلحہ واپس لوٹ گیا۔[2]

مستدرک، حاکم نیشاپوری میں ہے: زید بن ارقم بیان کرتے ہیں کہ (ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے، یہاں تک کہ غدیرِ خم پہنچے۔ آپ نے ٹھہرنے کا حکم دیا۔ وہ دن ایسا تھا کہ اس سے زیادہ گرم دن ہم پر کبھی نہیں آیا تھا۔ زمین صاف کی گئی۔ پھر آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا: اے لوگو! کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا گیا مگر یہ کہ اس نے اپنے سے پہلے نبی کی عمر کے نصف کے برابر ہی زندگی پائی. میں بھی عنقریب بلایا جانے والا ہوں اور مجھے جواب دینا ہوگا۔ میں تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہیں ہوگے، وہ اللہ عزوجل کی کتاب ہے۔ پھر آپ کھڑے ہوئے اور علی (ع) کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا اے لوگو! تم پر خود تمہاری جانوں سے زیادہ حق رکھنے والا کون ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں)۔ یہ وہ حدیث ہے جو سند کے اعتبار سے صحیح ہے، اور ان دونوں نے اسے روایت نہیں کیا۔[3]

---

[1] . المستدرک، حاکم نیشاپوری، جلد 3، ص 109 اور 110۔

[2] . المستدرک، حاکم نیشاپوری، جلد 3، ص 371۔

[3] . المستدرک، حاکم نیشاپوری، جلد 3، ص 533۔

مصنف، ابن ابی شیبہ میں ہے: جابر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ (ہم جُحفہ میں غدیرِ خم کے مقام پر تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے، علی کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کا مولا ہے۔)

مصنف، ابن ابی شیبہ: رباح بن حارث بیان کرتے ہیں کہ (جب علی (ع) رحبہ میں بیٹھے ہوئے تھے تو ایک شخص آیا جس پر سفر کی علامات تھیں، اس نے عرض کیا: اے میرے مولا! آپ پر سلام ہو۔ علی (ع) نے فرمایا: یہ کون ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: یہ ابو ایوب انصاری ہیں۔ ابو ایوب نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ (ص) نے فرمایا: جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں)[1]

تمہارا میرے ساتھ وہی تعلق ہے جو ہارون کا موسی کے ساتھ تھا۔[2]

اس حدیث کی چند مثالیں یہ ہیں:

صحیح بخاری میں ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی (ع) سے فرمایا: (کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میرے نزدیک تمہارا مرتبہ وہی ہو جو موسی کے نزدیک ہارون کا تھا؟)[3]

---

1. المصنف، ابن ابی شیبہ، جلد 7، ص 495 اور 496۔
2. یہ حدیث اسی یا اس کے ہم معنی جملوں کے ساتھ درج ذیل مصادر میں وارد ہوئی ہے:
   - صحیح بخاری، جلد 4، ص 208، باب: مہاجرین کے مناقب اور ان کی فضیلت، اور جلد 5، ص 129، باب: غزوۂ تبوک، سعد سے روایت۔
   - صحیح مسلم، جلد 7، ص 120 اور 121، باب: علی کے فضائل، سعد بن ابی وقاص سے روایت۔
   - مسند احمد، جلد 1، صفحات 170، 173، 175، 177، 179، 182، 184، 185 اور 331، جلد 3، صفحات 32 اور 338، جلد 6، صفحات 369 اور 438، سعد بن مالک، سعد بن ابی وقاص، ابن عباس، ابو سعید خدری، جابر بن عبداللہ اور اسماء بنت عمیس سے روایت۔
   - سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحات 42 اور 45، سعد سے روایت۔
   - سنن ترمذی، جلد 5، صفحات 301 اور 304، سعد اور جابر بن عبداللہ سے روایت۔
   - فضائل الصحابہ، نسائی، صفحات 13 اور 14، سعد بن ابی وقاص سے روایت۔
   - مستدرک، حاکم نیشابوری، جلد 2، ص 337، علی (ع) سے روایت، اور جلد 3، صفحات 108 اور 133، سعد اور ابن عباس سے روایت۔
   - سنن کبریٰ، بیہقی، جلد 9، ص 40، سعد سے روایت۔
3. صحیح بخاری، جلد 4، ص 208، باب: مہاجرین کے مناقب اور ان کی فضیلت۔

صحیح بخاری میں ہے: مصعب بن سعد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کی طرف روانہ ہوئے اور علی کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ علی (ع) نے عرض کیا: کیا آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں اپنا جانشین بنا رہے ہیں؟ آپ (ص) نے فرمایا: کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میرے نزدیک تمہارا مرتبہ موسی کے مقابلے میں ہارون جیسا ہو؟ سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں)[1]

صحیح مسلم میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی سے فرمایا: (تم میرے نزدیک موسی کے مقابلے میں ہارون کے مانند ہو، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں)[2]

صحیح مسلم میں ہے: سعد بن ابی وقاص بیان کرتے ہیں کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک میں علی بن ابی طالب (ع) کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ علی (ع) نے عرض کیا: اے رسولِ خدا! کیا آپ مجھے بچوں اور عورتوں کے درمیان اپنا جانشین بنا رہے ہیں؟ آپ (ص) نے فرمایا: کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میرے نزدیک تمہارا مرتبہ موسی کے مقابلے میں ہارون جیسا ہو؟ سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں)[3]

صحیح مسلم میں ہے: سعد بن ابی وقاص اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ (معاویہ بن ابی سفیان نے سعد سے کہا: تمہیں کس چیز نے ابو تراب کو برا کہنے سے روکا ہوا ہے؟ سعد نے کہا: کیا تمہیں وہ تین باتیں یاد نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی سے فرمائی تھیں؟ جب تک ان میں سے ایک بھی میرے پاس ہے، میں اسے گالی نہیں دیتا، اور یہ بات میرے لیے سرخ بالوں والے اونٹوں سے بھی زیادہ محبوب ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے انہیں اپنی بعض غزوات میں اپنا جانشین مقرر فرمایا، اور علی نے آپ سے عرض کیا۔ اے رسولِ اللہ! کیا آپ مجھے بچوں اور عورتوں کے درمیان اپنا جانشین مقرر فرما رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میرے نزدیک تمہارا مرتبہ موسی کے مقابلے میں ہارون جیسا ہو؟ سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور میں نے سنا کہ خیبر کے دن آپ نے فرمایا: میں یہ جھنڈا ایسے مرد کے ہاتھ میں دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔ ہم نے جھنڈا ان کے لیے لایا۔ آپ نے فرمایا: علی کو میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ وہ انہیں لے آئے، آپ نے

---

1. صحیح بخاری، جلد 5، ص 129، باب: غزوۂ تبوک۔
2. صحیح مسلم، جلد 7، ص 120، باب: علی (ع) کے فضائل۔
3. صحیح مسلم، جلد 7، ص 120، باب: علی (ع) کے فضائل۔

اپنا لعابِ دہن علی کی آنکھوں پر ملا اور جھنڈا ان کے حوالے کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے فتح عطا فرمائی۔ اور جب یہ آیت نازل ہوئی: (فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ) (کہہ دیجیے آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنے بیٹوں کو)، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی، فاطمہ، حسن اور حسین کو بلایا اور فرمایا: اے اللہ! یہ میرے اہلِ بیت ہیں)[1]

صحیح مسلم میں ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی سے فرمایا: (کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میرے نزدیک تمہارا مرتبہ موسی کے مقابلے میں ہارون جیسا ہو؟)[2]

مسند احمد میں ہے: (عائشہ بنت سعد اپنے والد سے روایت کرتی ہیں کہ : علی (ع) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے یہاں تک کہ ثنیہ الوداع پہنچے، اور علی (ع) روتے تھے اور عرض کرتے تھے: کیا آپ مجھے پیچھے رہ جانے والوں میں جانشین مقرر فرما رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میرے نزدیک تمہارا مرتبہ موسی کے مقابلے میں ہارون جیسا ہو، سوائے نبوت کے)[3]

ہارون، موسی کے بھائی اور ان کے وصی تھے۔ یقینی طور پر یہاں منزلت اور مقام سے مراد یہ نہیں کہ وہ ان کے بھائی تھے۔ یہ بات بے معنی ہے کہ رسول یہ خبر دیں کہ علی ان کے قریب ہیں، یہ بات سب پر واضح اور طے شدہ ہے اور اس کے لیے خبر دینے، اعلان کرنے یا بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ اس حدیث کا موضوع الٰہی اجر و ثواب ہے، کیونکہ محض قربت بذاتِ خود کسی کو پاک نہیں کرتی اور نہ ہی اسے الٰہی اجر شمار کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ابو لہب رسول کے چچا تھے۔ لہٰذا باقی ماندہ مفہوم یہ ہے کہ منزلت سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین پر وصایت اور خلافت ہے۔ جس طرح ہارون، موسی کے وصی تھے، اسی طرح علی (ع)، محمد (ص) کے وصی ہیں۔ اسی بنا پر بعض منقول احادیث کے اگلے حصے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھیجی جانے والی نبوت کو علی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ میں نے اس موضوع پر اپنی کتاب «نبوتِ خاتم» میں گفتگو کی ہے اور واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی نبوت کیوں ختم ہو چکی ہے اور

---

1. صحیح مسلم، جلد 7، ص 120، باب: علی (ع) کے فضائل۔
2. صحیح مسلم، جلد 7، ص 121، باب: علی (ع) کے فضائل۔
3. مسند احمد، جلد 1، ص 170۔

محمد (ص) کی جانب سے بھیجی جانے والی نبوت کیوں شروع ہوئی، اور یہ کہ آپ کی ذات مخلوقات میں لاہوت کا کامل ترین جلوہ ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ: ان احادیث سے جو معنی مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ علی بن ابی طالب (ع)، محمد رسول اللہ (ص) کے بعد مخلوقات میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہیں۔

محمد رسولِ خدا (ص) کے اہلِ بیت کے ائمہ کی خلافت سے متعلق احادیث

(میرے اہلِ بیت کی مثال نوح کی کشتی کی مثال ہے کہ جو بھی اس پر سوار ہو، نجات اور رہائی پاتا ہے، اور جو اس سے کنارہ کشی کرے، وہ غرق ہو جاتا ہے)۔

یہ اس حدیث کی چند مثالیں ہیں:[1]

---

[1] . یہ حدیث ایک سے زیادہ طرق سے اور واقعی قریب المعنی الفاظ کے ساتھ روایت ہوئی ہے، اور جیسا کہ منقول ہے:

- مستدرک: (خبردار رہو۔ میرے اہلِ بیت کی مثال نوح کی کشتی کی مانند ہے، جو کوئی اس پر سوار ہو وہ نجات اور رہائی پاتا ہے، اور جو اس سے کنارہ کشی کرے، وہ غرق ہو جاتا ہے)۔ (میرے اہلِ بیت کی مثال نوح کی کشتی کی مانند ہے، جو کوئی اس پر سوار ہو وہ نجات اور رہائی پاتا ہے، اور جو اس سے کنارہ کشی کرے، وہ غرق ہو جاتا ہے)۔

- مجمع الزوائد: (میرے اہلِ بیت کی مثال نوح کی کشتی کی مانند ہے، جو کوئی اس پر سوار ہو وہ نجات اور رہائی پاتا ہے، اور جو اس سے کنارہ کشی کرے، وہ غرق ہو جاتا ہے۔ اور جو ہمارے ساتھ آخری زمانے میں جنگ کرے، وہ اس شخص کی مانند ہے جو دجال سے جنگ کرتا ہے)۔ بزاز اور طبرانی نے اپنی سندوں کے ساتھ ابوذر سے روایت کیا ہے۔

(میرے اہلِ بیت کی مثال نوح کی کشتی کی مانند ہے کہ جو کوئی اس پر سوار ہو، نجات اور رہائی پاتا ہے، اور جو اس سے کنارہ کشی کرے، غرق ہو جاتا ہے)۔ بزاز نے اپنی سند کے ساتھ عبداللہ بن زبیر سے روایت کیا ہے۔

(میرے اہلِ بیت کی مثال نوح کی کشتی کی مانند ہے کہ جو کوئی اس پر سوار ہو، نجات اور رہائی پاتا ہے، اور جو کوئی اس سے سر باز زند، غرق ہو جاتا ہے)۔ بزاز اور طبرانی نے اپنی سندوں کے ساتھ ابنِ عباس سے روایت کیا ہے۔

(میرے اہلِ بیت کی مثال نوح کی کشتی کی مانند ہے کہ جو کوئی اس پر سوار ہو، نجات اور رہائی پاتا ہے، اور جو کوئی اس سے سر باز زند، غرق ہو جاتا ہے؛ اور تمہارے درمیان میرے اہلِ بیت کی مثال بنی اسرائیل میں دروازۂ حِطّہ کی مانند ہے، جو کوئی اس میں داخل ہو، وہ بخش دیا جاتا ہے)۔ طبرانی نے اپنی سند کے ساتھ ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے۔

- جامع الصغیر سیوطی: (بے شک میرے اہلِ بیت کی مثال نوح کی کشتی کی مانند ہے، جو کوئی اس پر سوار ہو وہ نجات اور رہائی پاتا ہے، اور جو اس سے کنارہ کشی کرے وہ غرق ہو جاتا ہے)۔ (میرے اہلِ بیت کی مثال نوح کی کشتی کی مانند ہے، جو کوئی اس پر سوار ہو وہ نجات اور رہائی پاتا ہے، اور جو اس سے کنارہ کشی کرے وہ غرق ہو جاتا ہے، اور تمہارے درمیان میرے اہلِ بیت کی مثال بنی اسرائیل میں دروازۂ حِطّہ کی مانند ہے، جو کوئی اس میں داخل ہو وہ بخش دیا جاتا ہے)۔

اور اسی کے قریب الفاظ کے ساتھ۔ اب ہم مراجع و مصادر ذکر کرتے ہیں:

مستدرک، حاکم نیشابوری: اپنی سند کے ساتھ ابوذر سے روایت کرتے ہیں۔ رسول اللہ (ص) نے فرمایا: (خبردار رہو۔ میرے اہلِ بیت کی مثال نوح کی کشتی کی مثال ہے کہ جو کوئی اس پر سوار ہو، نجات اور رہائی پاتا ہے، اور جو اس سے کنارہ کشی کرے، وہ غرق ہو جاتا ہے)۔

بزّاز اپنی سند کے ساتھ عبداللہ بن زبیر سے روایت کرتے ہیں: (میرے اہلِ بیت کی مثال نوح کی کشتی کی مثال ہے کہ جو کوئی اس پر سوار ہو، سلامت پاتا ہے، اور جو اس سے کنارہ کشی کرے، غرق ہو جاتا ہے)۔

فضائل الصحابہ، احمد بن حنبل، جلد 2، ص 987، حدیث 1402؛ بحر الزخار، بزاز، جلد 11، ص 329، حدیث 5142؛ المستدرک، حاکم نیشابوری، جلد 3، صفحات 150 تا 151، اور جلد 2، ص 343، اور اس کے بارے میں کہا ہے: «یہ حدیث مسلم کی شرط پر صحیح ہے، اور ان دونوں نے اسے نقل نہیں کیا۔» معجم کبیر، طبرانی، جلد 3، صفحات 45 تا 46، حدیث 2636، حدیث 2637، حدیث 2638؛ نوادر الاصول، حکیم ترمذی، جلد 2، ص 840، حدیث 1133؛ جامع الصغیر، سیوطی، جلد 1، ص 373، حدیث 2442، جلد 2، ص 533، حدیث 8162؛ احیاء المیت، سیوطی، صفحات 20 اور 21، حدیث 24 ابن زبیر سے، حدیث 25 ابن عباس سے، حدیث 26 ابوذر سے، حدیث 27 ابو سعید خدری سے؛ کنز العمال، متقی ہندی، جلد 12، صفحات 94 تا 99، حدیث 34144، حدیث 34151، حدیث 34169، حدیث 34170؛ مجمع الزوائد، ہیثمی، جلد 9، ص 168؛ صواعق المحرقہ، ابن حجر ہیتمی، جلد 2، باب الامان ببقائہم، ص 207، اور وہ کہتے ہیں: یہ روایت بہت سے طرق سے آئی ہے جن میں سے بعض بعض کو تقویت دیتے ہیں۔ «میرے اہلِ بیت کی مثال» اور ایک روایت میں آیا ہے: «بے شک میرے اہلِ بیت ہی کی مثال» اور ایک دوسری روایت میں ہے: «بے شک میرے اہلِ بیت کی مثال» اور ایک روایت میں آیا ہے: (خبردار رہو، بے شک میرے اہلِ بیت کی مثال نوح کی کشتی کی مانند ہے کہ جو کوئی اس پر سوار ہو، سلامتی پاتا ہے، اور جو اس سے کنارہ کشی کرے، غرق ہو جاتا ہے)۔ اور ایک روایت میں ہے: (جو کوئی اس پر سوار ہو، نجات اور رہائی پاتا ہے، اور جو اس سے کنارہ کشی کرے، غرق ہو جاتا ہے، اور تمہارے درمیان میرے اہلِ بیت کی مثال بنی اسرائیل میں دروازۂ حِطّہ کی مانند ہے، جو کوئی اس میں داخل ہو، بخش دیا جاتا ہے)۔ سبل الہدیٰ والرشاد، صالحہ شامی، جلد 11، صفحات 11 اور 12، اور اس کے بارے میں کہا ہے: «حافظ ابو الخیر سخاوی کہتے ہیں: اس حدیث کے بعض طرق بعض دوسرے طرق کو تقویت دیتے ہیں»۔ نظم درر السمطین، زرندی حنفی، ص 235؛ ینابیع المودۃ لذوی القربیٰ، قندوزی، جلد 1، صفحات 92 تا 94، اور جلد 2، ص 90؛ المؤتلف والمختلف، دارقطنی (متوفی 385ھ)، تحقیق ڈاکٹر موفق بن عبداللہ بن عبدالقادر، دارالغرب الاسلامی، بیروت، طبع اول، 1406ھ/1986ء، جلد 2، ص 1046؛ ذخائر العقبی، محب طبری، ص 20؛ کفایۃ الطالب، گنجی شافعی، صفحات 378 تا 379؛ رشفۃ الصادی، ابو بکر حضرمی، صفحات 79 تا 80؛ فتح الکبیر للنبہانی، دارالکتاب العربی، بیروت، جلد 3، ص 133؛ بلدانیات، محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی (متوفی 902ھ)، تحقیق حسام بن محمد قطان، دارالعطاء، طبع اول، 1422ھ/2001ء، صفحات 186 تا 187، اور اس کے بارے میں کہا ہے: « یہ حدیث حسن ہے»؛ پھر بزاز کے اس قول کے جواب میں کہ اس حدیث کی روایت میں ابوذر منفرد ہیں، صفحات 188 تا 189 میں کہتے ہیں: «ایسا نہیں ہے، بلکہ اسی باب میں ابن عباس سے بھی حدیث مروی ہے، اور ابن زبیر اور ابو سعید خدری سے بھی، اور ان میں سے بعض روایات بعض کو تقویت دیتی ہیں، اسی وجہ سے میں نے اسے حسن قرار دیا ہے»۔ دارالسحابہ، شوکانی، باب 3، فصل 1، ص 268، حدیث 12؛ سراج المنیر بشرح الجامع الصغیر، عزیزی، جلد 3، ص 279، اور اس کے بارے میں کہا ہے: «اس کی سند حسن ہے»۔

بزّاز اور طبرانی اپنی سندوں کے ساتھ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں: (میرے اہلِ بیت کی مثال نوح کی کشتی کی مثال ہے کہ جو کوئی اس پر سوار ہو، نجات اور رہائی پاتا ہے اور جو اس سے کنارہ کشی کرے، غرق ہو جاتا ہے)۔

طبرانی اپنی سند کے ساتھ ابو سعید خدری سے روایت کرتے ہیں: (میرے اہلِ بیت کی مثال نوح کی کشتی کی مانند ہے، جو کوئی اس میں سوار ہو وہ نجات اور رہائی پاتا ہے، اور جو اس سے کنارہ کشی کرے وہ غرق ہو جاتا ہے، اور تمہارے درمیان میرے اہلِ بیت کی مثال بنی اسرائیل میں دروازۂ حِطّہ کی مانند ہے، جو کوئی اس میں داخل ہوا وہ بخش دیا گیا)۔

رسول اللہ (ص) سے منقول روایات، اہلِ بیت کو جن کے بارے میں آیتِ تطہیر نازل ہوئی ہے، یعنی علی اور ان کی اولاد (ع) کو اس طرح بیان کرتی ہیں کہ وہ نوح کی کشتی کی مانند ہیں، کہ جو کوئی اس میں داخل ہو وہ نجات پا جاتا ہے؛ لہٰذا محمد رسول اللہ (ص) واضح طور پر بیان کرتے ہیں کہ جو شخص اہلِ بیت سے وابستہ ہو جائے، اس نے یقینا حق کو پہچان لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات پا لی ہے، اسی طرح جیسے نوح کی کشتی میں سوار ہونے والے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ رہے اور جو کوئی اہلِ بیت سے رو گردانی کرے اور دین میں ان کی بات کو قبول نہ کرے، وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب میں ہلاک ہو چکا ہے، اسی طرح جیسے وہ لوگ ہلاک ہوئے جنہوں نے نوح (ع) کی بات کو چھوڑ دیا اور ان کی اطاعت نہ کی۔ اہلِ بیت سے وابستہ ہونا در حقیقت ان کے ساتھ چلنا، ان کی دعوت پر ایمان لانا اور ان کی بات کو قبول کرنا ہے، اور یہ ماننا ہے کہ وہ محمد رسول اللہ (ص) کے اوصیاء ہیں جن پر آپ نے نص فرمائی ہے، اور ان میں سب سے پہلے علی کے بارے میں آپ نے متعدد نصوص کے ذریعے واضح اور صریح تصریح فرمائی ہے۔ اور یہی ان امور میں سے ایک ہے جس نے مخالفین کو حیران و سرگرداں کر رکھا ہے کہ وہ اس کی صریح دلالت کو کس طرح چھپائیں، کہ علی ہی رسول (ص) کے بعد اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور واجب الاطاعت امام ہیں۔

قریش میں سے خلفاء کے بارے میں احادیث

احادیث میں آیا ہے کہ محمد رسول اللہ (ص) کے ایسے خلفاء ہیں جو قریش میں سے ہوں گے، اور محمد اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہیں، اور جس شخص کو محمد شرعی طریقے سے، اس انداز میں کہ جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے، حکمرانی کے لیے مقرر کریں، وہ اللہ کی طرف سے مقرر ہوتا ہے؛ اس لیے کہ فرمانروائی اللہ سبحان و متعال ہی کے

لیے ہے، اور صرف بارہ امام ہی ایسے ہیں جنہوں نے الٰہی تقرر کا دعوی کیا ہے، ان کے علاوہ کسی نے نہیں؛ جیسا کہ دیگر نصوص بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں۔

صحیح بخاری: عبدالملک بیان کرتے ہیں: (میں نے جابر بن سمرہ سے سنا، وہ کہتے ہیں: میں نے نبی (ص) سے سنا کہ آپ نے فرمایا: بارہ امیر ہوں گے. آپ نے ایک بات ارشاد فرمائی جسے میں نہ سن سکا۔ میرے والد نے کہا: آپ نے فرمایا: وہ سب قریش میں سے ہوں گے)[1]

صحیح مسلم: رسول اللہ (ص) نے فرمایا: (جب تک لوگوں میں سے دو آدمی بھی باقی رہیں گے، یہ امر ہمیشہ قریش ہی میں رہے گا)[2]

صحیح مسلم: سعد بن ابی وقاص بیان کرتے ہیں: (میں نے اپنے غلام کے ذریعے جابر بن سمرہ کو لکھا کہ وہ مجھے اس بات کی خبر دیں جو انہوں نے رسول اللہ (ص) سے سنی تھی۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ میں نے رسول اللہ (ص) کو جمعہ کی رات یہ فرماتے ہوئے سنا: (دین ہمیشہ قائم رہے گا یہاں تک کہ قیامت برپا ہو جائے، یا تمہارے لیے بارہ خلفاء ہوں گے، اور وہ سب قریش میں سے ہوں گے)[3]

خلفائے راشدین سے متعلق احادیث

خلفائے راشدین کے بارے میں احادیث بھی گزشتہ احادیث کی مانند ہیں، جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ محمد رسول اللہ (ص) کے خلفاء اللہ سبحان و متعال کی جانب سے مقرر کیے گئے ہیں۔ وہ اللہ جو ملک کا حقیقی فرمانروا ہے، اور اس کی اجازت کے بغیر کسی فرد کو اس کے ملک اور اس کی فرمانروائی میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں۔

مسند احمد بن حنبل: عرباض بن ساریہ بیان کرتے ہیں: (رسول اللہ (ص) نے ہمیں ایسی نصیحت فرمائی کہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور دل خوف زدہ ہو گئے۔ ہم نے عرض کیا: اے رسول اللہ! یہ تو رخصتی کی نصیحت معلوم ہوتی ہے، آپ ہم سے کس بات کا عہد لیتے ہیں؟ آپ (ص) نے فرمایا: میں تمہیں ایسی سفیدی پر چھوڑ رہا ہوں جس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے، میرے بعد اس سے صرف وہی شخص ہٹے گا جو ہلاک ہونے والا ہو گا۔ جو کوئی میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا۔ تم پر میری سنت لازم ہے اور ہدایت یافتہ

---

1. صحیح بخاری، جلد 8، ص 127، کتاب الاَحکام۔
2. صحیح مسلم، جلد 6، ص 3، باب الناس تبع لقریش والخلافۃ فی قریش۔
3. صحیح مسلم، جلد 6، ص 4، باب الناس تبع لقریش والخلافۃ فی قریش۔

راشد خلفا کی سنت بھی، اور تم پر ان کی اطاعت لازم ہے، اگرچہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہوں، اس پر اس طرح مضبوطی سے قائم رہو جیسے داڑھ کے دانتوں پر منہ مضبوطی سے جما دیا جاتا ہے۔ مؤمن فرمانبردار اونٹ کی مانند ہوتا ہے کہ اسے جہاں بھی لے جایا جائے، وہ چل پڑتا ہے)[1]

مسند احمد بن حنبل: (عرباض بن ساریہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز ادا کی، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ہمیں ایسی نصیحت فرمائی کہ دل خوف زدہ ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہم نے عرض کیا: اے رسول اللہ! یہ تو گویا رخصت کی نصیحت ہے، ہمیں وصیت فرمایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمہیں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے اور سننے اور اطاعت کرنے کی وصیت کرتا ہوں، اگرچہ کوئی حبشی غلام ہی تم پر حاکم ہو۔ جو شخص تم میں سے میرے بعد زندہ رہا وہ بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا۔ پس تم پر میری سنت اور ہدایت یافتہ راشد خلفا کی سنت لازم ہے اس پر اس طرح مضبوطی سے قائم رہو جیسے داڑھ کے دانتوں پر منہ مضبوطی سے جما دیا جاتا ہے اور نئے نئے امور سے بچو، کیونکہ ہر نیا امر بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے)[2]

مستدرک حاکم نیشابوری: (عرباض بن ساریہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز ادا کی، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ہمیں ایسی نصیحت فرمائی کہ دل خوف زدہ ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہم نے عرض کیا: اے رسول اللہ! گویا یہ رخصتی کی نصیحت ہے، ہمیں وصیت فرمایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمہیں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے اور سننے اور اطاعت کرنے کی وصیت کرتا ہوں، اگرچہ کوئی حبشی غلام ہی تمہیں حکم دے۔ اگر تم میں سے کوئی میرے بعد زندہ رہا تو وہ بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا۔ تم پر میری سنت اور ہدایت یافتہ راشد خلفا کی سنت لازم ہے، جن پر داڑھ کے دانتوں کی طرح مضبوطی سے جما ہوا جاتا ہے۔ نئے امور سے دور رہو، کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے)[3]

سنن کبریٰ بیہقی: عرباض بن ساریہ کہتے ہیں: (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز ادا کی، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ہمیں ایسی نصیحت فرمائی کہ دل خوف زدہ ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہم نے عرض کیا: اے رسول اللہ! گویا یہ الوداعی نصیحت ہے، ہمیں وصیت فرمایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

1. مسند احمد، جلد 4، ص 126۔
2. مسند احمد، جلد 4، ص 126۔
3. المستدرک، حاکم نیشاپوری، جلد 1، ص 9۔

میں تمہیں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے اور سننے اور اطاعت کرنے کی وصیت کرتا ہوں، اگرچہ کوئی غلام ہی تمہیں حکم دے۔ اگر تم میں سے کوئی زندہ رہا تو وہ بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا۔ تم پر میری سنت اور ہدایت یافتہ راشد خلفا کی سنت لازم ہے، اور اس کو داڑھ کے دانتوں کی طرح مضبوطی سے تھامے رکھو جن پر منہ جما رہتا ہے۔ نئے امور سے دور رہو، کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے)[1]

وہ تجدید کرنے والا فرد جو دین کو تحریف سے محفوظ رکھتا ہے[2]

اس لیے کہ کوئی فرد دین کی تجدید کرے اور دین کے حق کو اس کے مقام پر واپس لے آئے اور اس سے تحریف کو دور کر دے، ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہو، تاکہ اللہ تعالیٰ اسے تصحیح اور تجدید کے مقامات سمجھا دے؛ ورنہ وہ بھی دین میں تحریف کرنے والوں میں سے ایک تحریف کرنے والا ہی ہے، اس سے بڑھ کر نہیں۔

اہلِ سنت کے ہاں مشہور احادیث میں سے ایک روایت وہ ہے جسے ابو ہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر سو برس کے سرے پر ایک ایسے شخص کو بھیجتا ہے جو اس کے دین کی تجدید کرے)[3]

---

1 . السنن الکبریٰ، بیہقی، جلد 10، ص 114۔

2 . تفسیر عیاشی میں روایت نقل ہوئی ہے کہ جابر کہتے ہیں: میں نے امام باقر(ع) سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا: (وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ فَإِذا جاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لا يظْلَمُونَ) (یونس، 47) یعنی (ہر امت کے لیے ایک رسول ہے، پھر جب ان کا رسول آتا ہے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کیا جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا)۔ امام (ع) نے فرمایا: اس کی باطنی تفسیر یہ ہے کہ اس امت کے ہر صدی کے لیے آلِ محمد میں سے ایک رسول ہوتا ہے جو اس صدی کے لوگوں کی طرف بھیجا جاتا ہے۔ وہی اولیاء ہیں اور وہی رسول ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس قول: (فَإِذا جاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ) (پھر جب ان کا فرستادہ آتا ہے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کیا جاتا ہے)، یعنی فرستادے عدل کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، وہ ظلم نہیں کرتے۔

3 . سنن ابی داود، جلد 2، ص 311؛ مستدرک، حاکم، جلد 4، ص 552؛ معجم الاوسط، طبرانی، جلد 6، ص 324؛ جامع الصغیر، سیوطی، ص 282، حدیث 1845؛ کنزالعمال، متقی ہندی، جلد 12، ص 193، حدیث 34623؛ کشف الخفا، عجلونی، جلد 1، ص 243، حدیث 740۔ اور اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں: "ابوداود نے اسے ابوہریرہ سے رسول اللہ (ص) سے روایت کیا ہے، اور طبرانی نے اسے اپنی سند کے ساتھ ثقہ راویوں سے نقل کیا ہے، اور حاکم نے اسے حدیثِ ابن وہب سے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے، اور ائمہ نے اس حدیث پر اعتماد کیا ہے"۔ مقاصد الحسنۃ، سخاوی، تصحیح و تعلیق عبد اللہ محمد صدیق، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، پہلی طباعت، 1979ء، ص 121 تا 122، حدیث 238؛ اور اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں: "طبرانی نے اسے الاوسط میں پہلے کی طرح روایت کیا ہے، اور اس کی سند صحیح ہے، اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں"۔ مختصر المقاصد، زرقانی، تحقیق محمد بن لطفی صباغ، بیروت، چوتھی طباعت، مکتب اسلامی، 1989ء، ص 87، حدیث 215؛

اللہ تعالیٰ کا خلیفہ، مہدی

روایت کیا گیا ہے کہ مہدی زمین میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ اس بات کو کسی وضاحت اور تفسیر کی ضرورت نہیں۔ یہ حدیث رسول کے خلفا میں سے ایک کے بارے میں صریح نص ہے، جس میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کسی فرد کو مقرر نہ کرے اور اس پر نص نہ فرمائے، کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ قرار دینا درست نہیں۔ سنن ابن ماجہ: ثوبان کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (تمہارے خزانے کے پاس تین افراد قتل کیے جائیں گے، جو سب خلیفہ کے بیٹے ہوں گے، پھر خلافت ان تینوں میں سے کسی کو نہیں ملے گی۔ پھر مشرق کی طرف سے سیاہ جھنڈے نکلیں گے اور وہ تمہیں اس طرح قتل کریں گے کہ اس سے پہلے کسی جماعت نے اس طرح قتل نہیں کیا ہوگا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ فرمایا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ پھر فرمایا: پس جب تم اسے دیکھو تو اس سے بیعت کر لینا، اگرچہ برف پر سینہ کے بل گھسٹ کر جانا پڑے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا خلیفہ، مہدی ہے)[1]

حاکم نے اسے مستدرک میں سفیان ثوری کے واسطے سے ایک دوسرے سند کے ساتھ روایت کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (تمہارے خزانے کے پاس تین افراد قتل کیے جائیں گے جو سب خلیفہ کے بیٹے ہوں گے؛ پھر خلافت ان میں سے کسی کو نہیں ملے گی؛ پھر مشرق کی سمت سے سیاہ جھنڈے نکلیں گے؛ پھر وہ تم سے اس طرح جنگ کریں گے کہ کوئی جماعت اس طرح نہیں لڑی ہوگی۔ پھر آپ نے کچھ فرمایا، پھر فرمایا: جب تم اسے دیکھو تو اس سے بیعت کرنا، اگرچہ برف پر سینہ کے بل گھسٹ کر جانا پڑے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا خلیفہ، مہدی ہے)[2]

شیعہ کی کتابوں میں

محمد رسولِ خدا (ص) کے بعد خلافتِ الٰہی کے تسلسل کے اثبات میں شیعہ کی کتب میں روایات بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے بعض روایات درج ذیل ہیں:

اور اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں: "یہ صحیح ہے"۔ سلسلۃ الصحیحۃ، البانی، جلد 2، ص 148، حدیث 599؛ اور اس کے بارے میں انہوں نے کہا ہے: "اس کی سند صحیح ہے، اس کے راوی ثقہ ہیں اور صحیح مسلم کے راوی ہیں"۔

[1] . سنن ابن ماجہ، تصنیف محمد بن یزید قزوینی، وفات 273ھ، محمد فؤاد عبدالباقی کی تحقیق، نمبرنگ اور حواشی کے ساتھ، مطبوعہ دارالفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، جلد 2، ص 1367، حدیث 4084۔

[2] . المستدرک علی الصحیحین، تصنیف حاکم نیشابوری (وفات 405ھ)، زیرِ نگرانی یوسف عبدالرحمٰن المرعشلی، جلد 4، ص 463 تا 464۔

محمد رسول اللہ (ص) کی وصیت

شیخ طوسی: ابو عبداللہ جعفر بن محمد اپنے والد باقر سے، وہ اپنے والد ذی الثفنات سید العابدین سے، وہ اپنے والد حسینِ زکی شہید سے، اور وہ اپنے والد امیر المؤمنین (ع) سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ (ص) نے اپنی وفات کی رات علی (ع) سے فرمایا: اے ابو الحسن! ایک صحیفہ اور دوات حاضر کرو۔ رسول اللہ (ص) نے اپنی وصیت خود املا فرمائی، یہاں تک کہ فرمایا: (اے علی! میرے بعد بارہ امام ہوں گے اور ان کے بعد بارہ مہدی ہوں گے۔ پھر اے علی! تم بارہ اماموں میں سے پہلے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے آسمان میں علی مرتضیٰ، امیر المؤمنین اور صدیقِ اکبر اور فاروقِ اعظم اور مأمون اور مہدی نام دیا ہے، اور یہ نام تمہارے سوا کسی کے لائق نہیں۔ اے علی! تم میرے اہلِ خانہ پر، ان کے زندہ اور مردہ ہونے کی حالت میں، میرے وصی ہو؛ اور تم میری ازواج پر بھی وصی ہو، جنہیں تم میری زوجیت میں باقی رکھو گے وہ قیامت کے دن مجھ سے ملاقات کرے گی، اور جسے تم طلاق دو گے میں اس سے بیزار ہوں گا، نہ وہ مجھے دیکھے گی اور نہ میں اسے میدانِ محشر میں دیکھوں گا؛ اور تم میرے بعد میری امت پر میرے خلیفہ اور جانشین ہو؛ جب تمہاری وفات کا وقت آئے تو خلافت میرے بیٹے حسن کے سپرد کرنا، کیونکہ وہ نیک اور برّ وصول (حق تک پہنچنے والا) ہے؛ جب اس کی وفات کا وقت آئے تو اسے میرے بیٹے حسینِ زکی، شہید مقتول کے سپرد کرے؛ جب اس کی وفات کا وقت آئے تو اسے اس کے بیٹے سید العابدین ذی الثفنات علی کے سپرد کرے؛ جب اس کی وفات کا وقت آئے تو اسے اس کے بیٹے محمد باقر کے سپرد کرے؛ اور جب اس کی وفات کا وقت آئے تو اسے اس کے بیٹے جعفر صادق کے حوالے کرے؛ اور جب اس کی وفات کا وقت آئے تو اسے اس کے بیٹے موسیٰ کاظم کے سپرد کرے؛ اور جب اس کی وفات کا وقت آئے تو اسے اس کے بیٹے علی رضا کے سپرد کرے؛ اور جب اس کی وفات کا وقت آئے تو اسے اس کے بیٹے محمد ثقہ تقی کے حوالے کرے؛ اور جب اس کی وفات کا وقت آئے تو اسے اس کے بیٹے علی ناصح کے سپرد کرے؛ اور جب اس کی وفات کا وقت آئے تو اسے اس کے بیٹے حسن فاضل کے حوالے کرے؛ اور جب اس کی وفات کا وقت آئے تو اسے اس کے بیٹے محمد کے سپرد کر دے جو آلِ محمد میں محفوظ رکھے گئے ہیں اور وہ بارہ امام ہوں گے۔ اس کے بعد بارہ مہدی ہوں گے؛ پھر جب اس کی وفات کا وقت آئے گا تو خلافت اپنے بیٹے کے سپرد کرے گا جو مہدیوں میں سے پہلا ہے، اور اس کے لیے تین نام ہوں گے۔ ایک اس کا نام میرے نام کے مانند ہوگا، اور دوسرا اس کا نام میرے

والد کا نام ہوگا اور وہ عبداللہ اور احمد ہیں، اور تیسرا نام مہدی ہے، اور وہ ایمان لانے والوں میں سب سے پہلا ہے)[1]

میں اس روایت کی سند کی صحت پہلے ہی بیان کر چکا ہوں اور یہ بھی کہا ہے کہ طوسی نے اس روایت کو اس بات کی گواہی دیتے ہوئے صحیح قرار دیا ہے کہ اس کے راوی شیعہ ہیں۔ نیز فاضل عالم شیخ ناظم عقیلی، اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے، نے متعدد کتابوں میں روایتِ وصیت کی سند اور اس کے مضمون کے تواتر پر بحث کی ہے۔ یہاں فائدہ کے لیے میں ان کی کتاب ''مہدیین اور اولادِ قائم (ع) کے بارے میں چالیس احادیث'' سے ان کا کلام نقل کرتا ہوں:

میں نے روایتِ وصیت کی سند کے بارے میں کتابوں ''انتصار للوصیہ''، ''دفاعا عن الوصیہ'' اور ''الوصیہ والوصی احمد الحسن (ع)'' میں تفصیل کے ساتھ شرح اور وضاحت بیان کی ہے۔ یہاں اتنا ذکر کرنا کافی ہے کہ مرزائے نوری نے اپنی کتاب ''النجم الثاقب'' جلد 2، صفحہ 71 میں روایتِ وصیت کی سند کے معتبر ہونے کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے امام مہدی کے لیے ذریت کے وجود پر استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے: "شیخ طوسی نے معتبر سند کے ساتھ امام صادق (ع) سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں رسولِ خدا (ص) کی بعض وصیتیں امیر المؤمنین (ع) کے لیے ان کی وفات کی رات بیان ہوئی ہیں، اور اس کے فقروں میں سے ایک یہ جملہ ہے: پھر جب اس (امام مہدی) کی وفات کا وقت آ پہنچے تو اسے اپنے بیٹے، یعنی سب سے پہلے مقربین، کے سپرد کر دے"۔

مرزائے نوری اکابر علما میں سے ہیں اور علمِ حدیث اور علمِ رجال میں گہری مہارت رکھتے ہیں، لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ وہ بغیر علم اور سمجھ کے احکام بیان کرنے میں سستی کریں۔ ایسے عالم کی طرف سے، جن کے علم اور تقویٰ پر اتفاقِ رائے موجود ہے، یہ بات خود ایک گواہی اور شہادت ہے، اور یہی مختصر کلام اس مقام پر کافی ہے۔

سندِ روایت کے رجال (راویوں) کے حالات کا جائزہ لینے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ دیکھا جائے آیا وہ شخص معتبر ہے اور روایت نقل کرنے میں قابلِ اعتماد ہے یا نہیں۔ اور جب ہم اس نتیجے تک پہنچ جائیں کہ سندِ روایت کے راوی معتبر ہیں تو مقصود حاصل ہو جاتا ہے اور اس سے زیادہ کلام کو طول دینا ضروری نہیں رہتا، کیونکہ کسی روایت کی سند کے راویوں کے حالات کا جائزہ لینے کا اصل مقصد بھی اسی نتیجے تک پہنچنا ہوتا ہے۔

---

[1] .(غیبت، طوسی، ص 150؛ فارسی ترجمہ، اشاعت مسجد جمکران، ص 300) مترجم۔

مرزائے نوری کا یہ حکم علامہ حلّی کے اس طریقۂ کار کی بنیاد پر ہے جس میں راویوں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ سید خوئی نے اپنی معجم میں بارہا ذکر کیا ہے، علامہ حلّی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر اس شیعہ راوی پر اعتماد کرتے ہیں جس کے بارے میں نہ مدح وارد ہوئی ہو اور نہ ذم۔ شیخ طوسی نے روایتِ وصیت کی سند کے راویوں کے بارے میں گواہی دی ہے کہ وہ سب شیعہ امامیہ تھے، کیونکہ انہوں نے اس روایت کو ان روایات کے ضمن میں نقل کیا ہے جو خاصہ (یعنی شیعہ) کے طریقے سے روایت کی گئی ہیں۔

اور یہی علامہ حلّی کا وہی طریقہ ہے جس کی بنیاد تمام شیعہ راویوں پر اعتماد پر قائم ہے، جب تک ان کے بارے میں کوئی مدح یا ذم وارد نہ ہوئی ہو۔

اسی بناپر مرزائے نوری کا حکم بھی وہی مفہوم رکھتا ہے جو شیخ علی نمازی شاہرودی نے وصیت کی سند کے معتبر ہونے کے بارے میں بیان کیا ہے، یعنی یہ کہ اس کی بنیاد اس کے راویوں کے معتبر ہونے اور ان کے صحیح عقیدہ پر ہونے پر ہے، جیسا کہ انہوں نے وصیت کی سند کے بعض رجال کے حالات کے بیان میں اس امر کی صراحت کی ہے۔

ان تمام امور کی تفصیل، ان کے مصادر کے ساتھ، نیز روایتِ وصیت کی سند کے ہر ہر راوی کے حالات کی شرح کتاب "انتصار للوصیہ" میں بیان کی گئی ہے، اور جو شخص چاہے وہ اس کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔[1]

محمد رسول اللہ (ص) کے بعد بارہ ائمہ یا ان میں سے بعض کے بارے میں نص پر مشتمل روایات

ان روایات میں سے درج ذیل کو ذکر کیا جا سکتا ہے:

امام سجاد (ع) نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ نے محمد (ص) اور علی (ع) اور ان کی اولاد میں سے گیارہ افراد کو اپنی عظمت کے نور سے پیدا فرمایا۔ انہیں اپنے نور کی روشنی میں اشباح کی صورت میں قرار دیا۔ مخلوقات کی تخلیق سے پہلے وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے اور اس کی تسبیح و تقدیس کرتے تھے۔ وہ رسول اللہ (ص) کی اولاد میں سے ائمہ ہیں)[2]

---

[1]. چالیس حدیث مہدیین اور قائم (علیہ السلام) کی اولاد کے بارے میں، شیخ ناظم عقیلی، پہلی حدیث کا حاشیہ۔

[2]. کافی، کلینی: جلد 1، ص 530 تا 531، باب فیما جاء فی الاثنی عشر والنص علیہم السلام۔

امام باقر(ع) نے فرمایا:(حسین بن علی(ع) کے بعد نو امام ہوں گے، جن میں سے نواں ان کا قائم(ع) ہے)[1]

رسول اللہ (ص) اور علی(ع) و فاطمہ (س) کی اولاد میں سے بارہ ائمہ پر نص کی روایات

اس موضوع میں روایات بہت زیادہ ہیں؛ بطور نمونہ میں یہ روایات شیخ ناظم عقیلی کی کتاب (مہدیین اور فرزندانِ قائم(ع) کے بارے میں چالیس احادیث) سے نقل کرتا ہوں۔ جو افراد اس موضوع میں مزید روایات کے خواہش مند ہوں، وہ اس کتاب کی طرف رجوع کریں:

شیخ کلینی روایت کرتے ہیں: محمد بن یحییٰ [2] نے محمد بن احمد [3] سے، انہوں نے محمد بن حسین [4] سے، انہوں نے ابو سعید عصفوری [5] سے، انہوں نے عمرو بن ثابت [6] سے، انہوں نے ابو جارود[7] سے، امام باقر(ع) سے نقل کیا کہ آپ نے فرمایا: رسول اللہ (ص) نے فرمایا:(میں اور میری اولاد میں سے بارہ افراد، اور تم اے علی (ع)، زمین کے پناہ گاہیں ہیں، یعنی اس کے استحکام کا سبب اور اس کے پہاڑ ہیں؛ اللہ نے ہمارے ذریعے زمین کو قائم رکھا تاکہ وہ اپنے رہنے والوں کو نہ نگل لے۔ پھر جب میری اولاد میں سے وہ بارہ افراد چلے جائیں گے تو زمین اپنے رہنے والوں کو نگل لے گی، اور انہیں ہر گز مہلت نہیں دی جائے گی)۔

---

1 . کافی، کلینی: جلد 1، ص 533، باب فیما جاء فی الاثنی عشر والنص علیہم السلام۔

2 . محمد بن یحییٰ ابو جعفر عطار قمی کو نجاشی نے رجال میں ص 353، نمبر 946 پر موثق قرار دیا ہے۔

3 . محمد بن احمد بن عمران بن عبداللہ بن سعد بن مالک اشعری قمی ابو جعفر کو نجاشی نے رجال میں ص 348، نمبر 939 پر، اور شیخ طوسی نے فہرست میں ص 221، نمبر 622 پر توثیق کیا ہے۔

4 . محمد بن حسین بن ابی خطاب ابو جعفر زیات ہمدانی کو نجاشی نے رجال میں ص 334، نمبر 897 پر موثق قرار دیا ہے۔ نیز محقق خوئی نے معجم میں جلد 16، ص 248، نمبر 10576 اور ص 308، نمبر 10581 میں ان کے بارے میں وضاحت کی ہے۔

5 . میرزائے نوری نے خاتمۃ المستدرک، ج 1، ص 53 اور 54 میں ان کی تعریف کی ہے؛ نیز محقق خوئی نے معجم، ج 10، ص 227، شمارہ 6135 اور ص 236، شمارہ 6157 اور ج 22، ص 184، شمارہ 14344 میں ان کی توثیق کی ہے۔

6 . ان کے بارے میں ایک روایت نقل ہوئی ہے جو اہلِ بیت (ع) کے ساتھ ان کے بلند مقام اور ان کی نیک ولایت پر دلالت کرتی ہے۔ اس کے لیے اختیار معرفۃ الرجال، طوسی، ج 2، ص 690 کی طرف رجوع کریں۔ علامہ نے انہیں خلاصۃ الاقوال کے پہلے حصے میں، ص 212 پر ذکر کیا ہے۔ اسی طرح شیخ علی نمازی شاہرودی نے مستدرکات علم رجال الحدیث، ج 6، ص 23، شمارہ 10721 میں ان کی توثیق ذکر کی ہے۔ مزید برآں، ان کا نام تفسیر قمی اور کامل الزیارات کی اسناد میں بھی آیا ہے، اور خوئی اسے راویوں کے موردِ وثوق ہونے کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ عمرو بن ابی مقدام کے حالاتِ زندگی کے لیے معجم رجال الحدیث، ج 14، ص 80 اور 81، شمارہ 8863 کی طرف رجوع کریں۔

7 . زیاد بن منذر ابو جارود ہمدانی، جو نابینا تھے، محقق خوئی نے معجم، ج 8، ص 332، شمارہ 4815 میں ان کی توثیق کی ہے۔ شیخ علی نمازی شاہرودی نے مستدرکات علم رجال الحدیث، ج 3، ص 454 اور 455، شمارہ 5874 میں ان کے موردِ وثوق ہونے کی تائید کی ہے۔

شیخ کلینی روایت کرتے ہیں: ابو علی اشعری[1] نے حسن بن عبیداللہ [2] سے، انہوں نے حسن بن موسی خشاب [3] سے، انہوں نے علی بن سماعہ [4] سے، انہوں نے علی بن حسن بن رباط [5] سے، انہوں نے ابن

---

1 . نجاشی نے رجال میں، ص 92، نمبر 228؛ اور شیخ طوسی نے فہرست میں، ص 71، نمبر 81، انہیں موثق قرار دیا ہے۔

2 . حسین بن عبداللہ = حسین بن عبیداللہ؛ نجاشی نے رجال میں، ص 42 تا 44، نمبر 86، ان کا ذکر اس طرح کیا ہے: (حسین بن عبیداللہ سعدی ابو عبداللہ بن عبیداللہ بن سہل اُن افراد میں سے ہیں جن پر طعن کیا گیا ہے اور انہیں غلو کا متہم قرار دیا گیا ہے۔ ان کی بعض کتابیں صحیح السند ہیں؛ جن میں توحید، مؤمن و مسلم، مقت و توبیخ، امامت، نوادر، مزار، متعہ شامل ہیں۔ ابو عبداللہ بن شاذان نے ہمیں خبر دی کہ انہوں نے کہا: علی بن حاتم نے ہمیں حدیث بیان کی اور کہا احمد بن علی فائدی نے حسین سے صرف اس کی کتابِ متعہ کی خبر دی ہے۔ اور محمد بن علی بن شاذان نے احمد بن محمد بن یحییٰ سے، انہوں نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ حسین بن عبیداللہ نے ہمیں اپنی کتابوں میں سے ایمان اور صفتِ مؤمن کے نام سے خبر دی ہے)۔ شیخ علی نمازی نے بھی اسے مستدرکات علم رجال الحدیث، جلد 3، ص 151، نمبر 4463 میں اس طرح ذکر کیا ہے: (حسین بن عبیداللہ بن سہل سعدی ابو عبداللہ اُن افراد میں سے ہے جن پر طعن کیا گیا ہے اور اسے غلو کا متہم قرار دیا گیا ہے۔ اس کے پاس صحیح کتابیں ہیں۔ نجاشی نے یہ کہا ہے، پھر اس نے اس کی کتابوں اور ان کی فصلوں کو گنایا ہے۔ احمد بن ادریس نے ان سے ان کے درست حال میں حسن بن علی بن ابی عثمان کی کتاب روایت کی ہے۔ احمد بن علی فائدی نے اس سے، اور اس نے ابراہیم بن ہاشم سے، مفضل بن عمر کی تحریریں روایت کی ہیں، جیسا کہ جش، ص 295 میں آیا ہے۔ اس کی ایک کتاب امامت کے بارے میں بھی ہے، جیسا کہ مدینۃ المعاجز کے آغاز میں آیا ہے، اور وہاں اس کے دادا کا نام ذکر نہیں کیا گیا۔ بعض نسخوں میں اس کے والد کا نام عبداللہ مکبّر بھی ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے)۔

3 . نجاشی نے اسے رجال، ص 42، نمبر 85 میں اس طرح سراہا ہے: (حسن بن موسی خشاب ہمارے بہترین اصحاب میں سے ہیں۔ وہ مشہور ہیں اور ان کا علم اور حدیث بہت زیادہ ہے۔ ان کی چند کتابیں ہیں، جن میں سے «الرد علی الواقفۃ» اور «النوادر» شامل ہیں۔ نیز «حج» اور «انبیا» کے نام سے بھی ان کی کتابیں بیان کی گئی ہیں۔ محمد بن علی قزوینی نے ہمیں خبر دی ہے، وہ کہتے ہیں: احمد بن محمد بن یحییٰ نے اپنے والد سے، انہوں نے عمران بن موسی اشعری سے، اور انہوں نے حسن بن موسی سے ہمیں حدیث نقل کی ہے)۔

علامہ حلی نے خلاصۃ الاقوال، حصہ اول، ص 104 میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے: (حسن بن موسی خشاب ہمارے بہترین اصحاب میں سے ہیں، مشہور ہیں اور ان کا علم اور حدیث بہت زیادہ ہے)۔

4 . غیبتِ طوسی، ص 151، حدیث 112 میں، اسی طرح بحار الانوار، جلد 36، ص 393 میں، علی بن سماعہ کے بجائے حسن بن سماعہ آیا ہے۔ اور کتابِ کافی کی اسناد میں علی بن سماعہ صرف اسی روایت کی سند میں آیا ہے اور کتبِ رجالیہ میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ یہ بات اس امر کی تائید کرتی ہے کہ یہاں تصحیف کی خطا واقع ہوئی ہے اور صحیح نام وہی حسن بن سماعہ ہے۔ اس کی مزید تائید اس نکتے سے بھی ہوتی ہے کہ کلینی نے یہی روایت معمولی اختلاف کے ساتھ جلد 1، ص 531 میں نقل کی ہے اور اس کی سند میں «ابن سماعہ» کا ذکر کیا ہے، جو معروف طور پر حسن بن سماعہ ہی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ معجم رجال الحدیث، محقق خوئی، جلد 23، ص 196 تا 198، نمبر 15115 کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

حسن بن سماعہ کی توثیق نجاشی نے رجال، ص 40 اور 41، نمبر 84 میں کی ہے۔ اسی طرح معجم رجال الحدیث، محقق خوئی، جلد 5، ص 342، نمبر 2860؛ جلد 6، ص 126، نمبر 3115؛ اور جلد 23، ص 196، نمبر 15115 میں بھی ان کی توثیق کی گئی ہے۔

5 . نجاشی نے اسے رجال، ص 251، نمبر 659 میں موثق قرار دیا ہے۔

اذینہ[1] سے، انہوں نے زرارہ[2] سے نقل کیا کہ میں نے امام باقر (ع) کو یہ فرماتے ہوئے سنا: (آلِ محمد میں بارہ امام ہیں، جن میں سے سب محدّث[3] ہیں، اور وہ رسول اللہ (ص) اور علی (ع) کی اولاد میں سے ہیں، اور رسول اللہ (ص) اور علی (ع) ان سب کے باپ ہیں) [4]،[5]

بارہ امام اور بارہ مہدیوں پر نص والی روایات

میں اس سے پہلے روایتِ وصیت اور دیگر روایات بیان کر چکا ہوں جن میں بارہ مہدیوں پر نص موجود ہے۔ یہاں میں امام رضا (ع) سے ایک دعا نقل کرتا ہوں جس میں آپ امام مہدی (ع) کی اولاد میں سے مہدیوں کے لیے دعا فرماتے ہیں:

شیخ طوسی [6] اپنی سند کے ساتھ یونس بن عبدالرحمٰن سے نقل کرتے ہیں کہ امام رضا (ع) صاحبُ الامر کے لیے اس دعا کے ذریعے دعا کرنے کی تاکید فرمایا کرتے تھے: (اَللّٰهُمَّ ادفَع عَن وَلِيِّكَ وَخَلِيفَتِكَ وَحُجَّتِكَ عَلَى

---

1 . اور نجاشی نے اسے رجال، ص 283 اور 284، نمبر 752 میں اس طرح سراہا ہے: (یہ ہمارے بصری اصحاب میں سے ایک شیخ ہیں اور ان میں سب سے بہترین ہیں)؛ اور یہ بات اس کی وثاقت کی دلیل ہے۔ شیخ طوسی نے فہرست، ص 184، نمبر 593 میں اسے موثق قرار دیا ہے۔

2 . اس کی وثاقت اور جلالت پر اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے۔

3 . اہلِ بیت (ع) کی زبان میں محدث اس شخص کو کہا جاتا ہے جس سے فرشتے گفتگو کرتے ہیں اور وہ ان کی آواز سنتا ہے۔ (مترجم)

4 . کافی، کلینی، ج 1، ص 533۔

5 . یہ بات کتاب «چالیس حدیث مہدیین اور قائم (ع) کی اولاد کے بارے میں» تألیف شیخ ناظم عقیلی، چالیسویں حدیث سے منقول ہے۔

6 . سید بن طاؤس نے جمال الاسبوع، ص 307 میں ذکر کیا ہے کہ شیخ طوسی نے اس دعا کو یونس بن عبدالرحمٰن سے متعدد اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے، اور یہ ان کے کلام کا متن ہے: (وہ اشخاص جن کا ذکر میں نے اس کتاب کے مختلف مقامات پر اپنے جد ابو جعفر طوسی کی طرف منسوب اسناد کے ساتھ کیا ہے، انہوں نے کہا: ابن ابی جید نے محمد بن حسن بن سعید بن عبداللہ حمیری اور علی بن ابراہیم اور محمد بن صفار سے روایت کی ہے، اور ان سب نے ابراہیم بن ہاشم سے، انہوں نے اسماعیل بن مولد اور صالح بن سندی سے، اور انہوں نے یونس بن عبدالرحمٰن سے نقل کیا ہے، اور میرے جد ابو جعفر طوسی نے اسے یونس بن عبدالرحمٰن سے مروی روایات میں چند طریقوں کے ساتھ نقل کیا ہے، اور میں نے کلام کے طویل ہونے سے بچنے کے لیے اسے ذکر نہیں کیا۔ یونس بن عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ امام رضا (ع) ہمیشہ صاحب الامر کے لیے اس دعا کی سفارش کیا کرتے تھے...)

اور میرزائے نوری نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ یہ دعا کئی معتبر اور صحیح اسناد کے ساتھ روایت ہوئی ہے۔ اور یہ ان کے کلام کا متن ہے: (علما کی ایک بڑی جماعت نے روایت کی ہے، جن میں شیخ طوسی مصباح میں اور سید بن طاؤس جمال الاسبوع میں معتبر اور صحیح اسناد کے ساتھ یونس بن عبدالرحمٰن سے نقل کرتے ہیں کہ امام رضا (ع) ہمیشہ صاحب الامر کے لیے اس دعا کی سفارش فرمایا کرتے تھے: ...) نجم الثاقب، میرزائے نوری، جلد 2، ص 456۔

میرزائے نوری کا یہ کلام ہمیں سند کے رجال کی توثیق کو تفصیل سے بیان کرنے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

خَلقِكَ ... اَللَّهُمَّ، أَعطِهِ فِي نَفسِهِ وَأَهلِهِ وِوُلدِهِ وَذُرِّيَّتِهِ وَأُمَّتِهِ وَجَمِيعِ رَعِيَّتِهِ مَا تُقِرُّ بِهِ عَينَهُ وَتُسِرُّ بِهِ نَفسَهُ وَتُجَمِّعُ لَهُ مُلكَ المَملَكَاتِ كُلَّهَا قَرِيبَهَا وَبَعِيدَهَا وَعَزِيزَهَا وَذَلِيلَهَا ... اَللَّهُمَّ، صَلِّ عَلَى وُلَاةِ عَهدِهِ وَالأَئِمَّةَ مِن بَعدِهِ وَبَلِّغهُم آمَالَهُم وَزِد فِي آجَالِهِم وَأَعِزَّ نَصرَهُم وَتَمِّم لَهُم مَا أَسنَدتَ إِلَيهِم مِن أَمرِكَ لَهُم وَثَبِّت دَعَائِمَهُم وَاجعَلنَا لَهُم أَعوَاناً وَعَلَى دِينِكَ أَنصَاراً فَإِنَّهُم مَعَادِنُ كَلِمَاتِكَ وَخُزَّانُ عِلمِكَ وَأَركَانُ تَوحِيدِكَ وَدَعَائِمُ دِينِكَ وَوُلَاةُ أَمرِكَ وَخَالِصَتُكَ مِن عِبَادِكَ وَصَفوَتُكَ مِن خَلقِكَ وَأَولِيَاؤُكَ وَسَلَائِلُ أَولِيَائِكَ وَصَفوَةِ أَولَادِ نَبِيِّكَ وَالسَّلَامُ عَلَيهِ وَعَلَيهِم وَرَحمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ)(اے اللہ! اپنے ولی، اپنے خلیفہ اور اپنی مخلوق پر اپنی حجّت کے بارے میں دور فرما۔۔۔، اے اللہ! خود اس کو، اس کے گھر والوں کو، اس کے بیٹوں کو، اس کی ذریت کو، اس کی امت اور اس کی رعیت کو وہ عطا فرما جو اس کی آنکھ کو روشن کرے اور اسے شادمان بنائے؛ اور اس کے لیے تمام سرزمینوں کی حکومت جمع کر دے، خواہ وہ قریب ہوں یا دور، طاقتور ہوں یا کمزور۔۔۔، اے اللہ! اس کے عہد کے والیوں اور اس کے بعد آنے والے ائمہ پر درود بھیج، اور انہیں ان کی آرزوؤں تک پہنچا، اور ان کی عمروں میں اضافہ فرما، اور ان کی نصرت کو عزت عطا فرما، اور جو کچھ تو نے اپنے امر میں ان کے سپرد کیا ہے اسے کامل فرما، اور ان کی دعا قبول فرما، اور ہمیں ان کے مددگاروں اور تیرے دین کے یاوروں میں شامل فرما، کیونکہ وہ تیرے کلمات کے معدن ہیں، تیرے علم کے خزانے ہیں، تیرے توحید کی بنیادیں ہیں، تیری مخلوق میں سے تیرے برگزیدہ ہیں، تیرے دوست ہیں، تیرے دوستوں کی نسل سے ہیں، اور تیرے نبی کی اولاد میں سے منتخب ہیں، ان پر اور ان سب پر اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں)[1]،[2]

مہدیین پر نص والی روایات سے علم اور اعتقاد حاصل ہوتا ہے

مہدیین پر نص والی روایات یا ان میں سے بعض کی تعداد بہت زیادہ ہے اور حدِّ تواتر تک پہنچتی ہے، اور ان سے علم اور اعتقاد حاصل ہوتا ہے۔ نیز ائمہ اور مہدیین کے بارے میں بیان کی گئی روایات کے درمیان کوئی تعارض موجود نہیں۔ یہ روایات بہت کثیر ہیں اور انہیں نہ تو انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان میں سے بعض کو رد کیا جا سکتا ہے؛ مگر جہالت یا دشمنی اور گمراہی کی بنا پر، اور ایسا شخص درست علمی بحث کے طریقے سے دور ہو جاتا ہے۔ ان روایات سے حاصل ہونے والا علمی نتیجہ یہ ہے کہ بارہ اماموں کے بعد اللہ کے زمین میں خلفاء ہیں۔ سابقہ روایات کے درمیان جمع کرنا آسان اور سہل ہے، اور یہ سب محمد رسول اللہ (ص) کی وفات کی شب والی وصیت

---

[1] . مصباح المتہجد، طوسی، ص409؛ جمال الاسبوع، ابن طاؤس، ص307۔

[2] . کتاب «چالیس حدیث مہدیین اور قائم (ع) کی اولاد کے بارے میں» تألیف شیخ ناظم عقیلی سے منقول، دسویں حدیث۔

کے موافق ہیں جو بارہ اماموں اور بارہ مہدیوں پر نص کرتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے حق کو اس کے طالبوں کے لیے ظاہر اور روشن قرار دیا ہے۔

محمد رسول اللہ (ص) کی وفات کے وقت لکھی جانے والی وصیت کے لکھے جانے کا اثبات، جو گمراہی سے روکنے والی ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(كُتِبَ عَلَيكُمْ إِذا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيراً الْوَصِيةُ لِلْوالِدَينِ وَ الْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ) [1]

(تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ جائے، وہ کوئی خیر چھوڑ جائے، تو والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے بھلے طریقے کے مطابق وصیت کرے؛ یہ پرہیزگاروں پر ایک حق ہے)۔

اس آیت میں وجوب پر دلالت کرنے والی دو صریح باتیں ہیں:

1- اللہ تعالیٰ کا فرمان: كُتِبَ عَلَيكُمْ (تم پر فرض کیا گیا ہے)۔

2- اللہ تعالیٰ کا فرمان: حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِين (یہ پرہیزگاروں پر ایک حق ہے)۔

نتیجتاً، پہلے متقی، محمد رسول اللہ (ص) پر وصیت واجب ہے، جنہوں نے تمام خیر کو زمین میں اللہ تعالیٰ کی خلافت کے طور پر چھوڑا۔ لہٰذا کوئی مسلمان یہ دعویٰ کیسے کر سکتا ہے کہ آپ (ص) نے وصیت نہیں کی اور اس کے مصادیق معین نہیں کیے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کی۔ آپ (ص) اس بات سے منزہ ہیں۔ اہلِ سنت اور شیعہ دونوں کے نزدیک یہ بات ثابت ہے کہ آپ (ص) نے وصیت لکھوانے کی کوشش فرمائی اور اسے امت کو گمراہی سے بچانے والا قرار دیا، جیسا کہ روایاتِ رزیۃ الخمیس میں یہ واقعہ مشہور ہے۔

ابن عباس کہتے ہیں: جمعرات کا دن تھا، اور کیا ہی جمعرات کا دن تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تکلیف کی شدت بڑھ گئی، تو آپ (ص) نے فرمایا: (آؤ، میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دوں تاکہ اس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہ ہو)؛ انہوں نے آپس میں جھگڑا کیا، حالانکہ نبی کے سامنے جھگڑا مناسب نہیں تھا۔ بعض نے کہا: یہ بات آپ کے شایانِ شان نہیں، آپ ہذیان کہہ رہے ہیں، ان کا حال دریافت کرو۔ اور وہ آپ کی بات رد کرنے لگے۔ اس

---

[1] . قرآنِ کریم، سورۂ بقرہ، آیت 180۔

پر آپ (ص) نے فرمایا: (مجھے چھوڑ دو، میں جس حال میں ہوں وہ اس بات سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو)۔ پھر آپ نے انہیں تین باتوں کی وصیت فرمائی۔ فرمایا: (مشرکوں کو جزیرۂ عرب سے نکال دو، اور جس طرح میں قافلے والوں کو اجازت دیا کرتا تھا، اسی طرح انہیں اجازت دو)۔ اور تیسری بات کے بارے میں خاموش رہے، یا فرمایا: میں اسے بھول گیا)[1]

ابن عباس کہتے ہیں: جمعرات کا دن تھا، اور کیا ہی جمعرات کا دن تھا۔ پھر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، یہاں تک کہ ان کے رخساروں تک پہنچ گئے، گویا وہ موتیوں کے دانوں کی مانند تھے۔ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (لوح اور دوات لے آؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دوں کہ اس کے بعد تم کبھی بھی ہمیشہ کے لیے گمراہ نہ ہو)۔ انہوں نے کہا: (رسول اللہ ہذیان کہہ رہے ہیں)[2]

سلیم بن قیس ہلالی کہتے ہیں: سلمان کہتے ہیں کہ جب اس شخص (عمر) نے اپنی بات کہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غضبناک ہوئے اور لوح پھینک دیا، تو میں نے علی (ع) سے کہا: (کیا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کے بارے میں نہ پوچھیں جو وہ لوح پر لکھنا چاہتے تھے، کہ اگر وہ اسے لکھ دیتے تو کوئی بھی شخص گمراہ نہ ہوتا اور نہ ہی دو افراد کے درمیان اختلاف ہوتا؟) وہ خاموش رہے یہاں تک کہ گھر میں موجود لوگ اٹھ گئے اور علی، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام رہ گئے۔ میں اور میرے ساتھی ابوذر اور مقداد بھی اٹھنا چاہتے تھے کہ علی (ع) نے ہم سے فرمایا: (بیٹھے رہو)۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا چاہتے تھے اور ہم سن رہے تھے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گفتگو کا آغاز فرمایا اور ارشاد فرمایا: (اللہ تعالیٰ نے میرے بعد میری امت میں جدائی اور اختلاف مقدر فرما دیا ہے، اور مجھے حکم دیا ہے کہ وہ تحریر جو میں لکھنا چاہتا تھا، تمہارے لیے لوح پر لکھوں اور ان تین افراد کو اس پر گواہ بناؤں۔ میرے لیے ایک صحیفہ لاؤ)۔ وہ صحیفہ لایا گیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر اپنے بعد ہدایت کے اماموں کے نام ایک ایک کر کے املا فرماتے رہے اور علی (ع) لکھتے رہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میری امت پر میرے بھائی،

---

1. صحیح بخاری، جلد 4، ص 4168۔
2. صحیح مسلم، کتابِ وصیت۔

میرے وزیر، میرے وارث اور میرے خلیفہ علی بن ابی طالب ہیں، پھر حسن، پھر حسین، پھر حسین کی اولاد میں سے نو افراد)[1]

سلیم بن قیس ہلالی کہتے ہیں: امام علی (ع) نے طلحہ سے فرمایا: (کیا تم اس وقت گواہ نہ تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوح طلب کی تھی تاکہ اس پر ایسی بات لکھ دیں کہ امت نہ گمراہ ہو اور نہ اختلاف کرے؟ تمہارے ساتھ موجود ایک شخص نے کہا: رسولِ خدا ہذیان کہہ رہے ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غضبناک ہو گئے...)[2]

سلیم بن قیس کہتے ہیں: علی (ع) نے طلحہ سے ایک طویل حدیث میں، مہاجرین و انصار کے فخر کے ذکر کے ضمن میں اپنے مناقب اور فضائل بیان کرتے ہوئے فرمایا: (اے طلحہ، کیا تم اس وقت گواہ و شاہد نہ تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے لوح طلب کی تھی تاکہ اس پر ایسی بات لکھ دیں کہ اس کے بعد امت نہ گمراہ ہو اور نہ اختلاف کرے، اور تمہارے ساتھ موجود ایک شخص نے کہا: رسول اللہ ہذیان کہہ رہے ہیں، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غضبناک ہو گئے اور اسے چھوڑ دیا؟) اس نے کہا: ہاں، میں گواہ تھا۔ پھر فرمایا: (جب تم لوگ باہر چلے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس بات کی خبر دی جسے وہ لکھنا چاہتے تھے، اور جس پر انہوں نے عام لوگوں کو گواہ بنایا تھا، اور جبرئیل نے آپ (ص) کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ امت اختلاف کرے گی اور جدا ہو جائے گی۔ پھر آپ نے ایک صحیفہ طلب فرمایا اور جو بات آپ لوح پر لکھنا چاہتے تھے وہ مجھے املا کروائی، اور اس معاملے پر تین افراد کو گواہ بنایا: سلمان فارسی، ابوذر اور مقداد۔ اور ہدایت کے اماموں کے نام بیان فرمائے جن کی اطاعت کا حکم اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو قیامت کے دن تک دیا ہے۔ ان میں سب سے پہلے میرا نام لیا، پھر میرے اس بیٹے حسن کا، پھر میرے اس بیٹے حسین کا، پھر میرے اس بیٹے حسین کی اولاد میں سے نو افراد کا۔ اے ابوذر، اور اے مقداد، کیا ایسا ہی نہیں ہے؟ انہوں نے عرض کیا: (ہم اس معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے گواہی دیتے ہیں)۔ طلحہ نے کہا: (اللہ کی قسم، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے ابوذر سے فرمایا: آسمان اور زمین نے ابوذر سے زیادہ سچا اور نیک بندہ نہیں

---

[1] . کتاب سلیم بن قیس، ص 398۔

[2] . کتاب سلیم بن قیس، ص 211۔

دیکھا؛ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ ان دونوں نے صرف حق کی گواہی دی ہے، اور تم میرے نزدیک ان دونوں سے بھی زیادہ سچے اور نیک ہو)[1]

نتیجہ یہ ہے کہ موت کے وقت وصیت کرنا، جبکہ وصیت کا موقع میسر ہو، واجب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعرات کے دن اسے لکھنے کی کوشش کی اور اسے ایسی تحریر قرار دیا جو گمراہی سے بچانے والی ہو، مگر آپ کو اسے لکھنے سے روک دیا گیا۔ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلند ہمت رکھتے ہیں اور ان لوگوں کی طرف مائل نہیں ہوتے جو آپ کو روکیں، اور نہ ہی اس اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہیں جس نے آپ کو ایسی وصیت لکھنے کا حکم دیا ہو جو امت کو ہمیشہ کے لیے گمراہی سے بچانے والی ہو؛ حالانکہ جمعرات سے پیر تک آپ کے پاس اس وصیت کو لکھنے کے لیے پورا وقت موجود تھا، اور یہ کوئی قلیل مدت نہیں تھی۔ کیا یہ عقل کے مطابق ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی تحریر لکھنے کو ترک کر دیں جو امت کو گمراہی سے بچاتی ہو، جبکہ آپ کو اسے لکھنے کی قدرت بھی حاصل ہو؟ اگر وہ تحریر چھوڑ دیتے تو کیا یہ عدمِ حکمت اور عدمِ رحمت کی نسبت نہ ہوتی؟ آپ (ص) اس نسبت سے بالکل منزہ ہیں۔ آپ (ص) نے عملاً وصیت لکھ دی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو نافذ فرمایا، اور اللہ تعالیٰ کی مشیت پوری ہو گئی۔ یہ وصیت یکتا اور بے مثال طور پر روایت کی گئی تاکہ اس کے منکرین کی حجت اور دلیل ختم ہو جائے، اور اسے چھپانے کے ذریعے منکرین کے خلاف گواہی قائم ہو جائے۔ یہ وصیت خاتم النبیین (ص) کی طرف سے قیامت کے دن تک کے لیے ہے۔ ہلاکت ہے اس شخص کے لیے جو اس کا انکار کرے۔

لیکن جو لوگ آیتِ وصیت کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں، وہ اس روایت کو بنیاد بناتے ہیں:

ابو بصیر نے ائمہ میں سے ایک امام علیہم السلام سے نقل کیا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں: (كُتِبَ عَلَيكُمْ إذا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيراً الْوَصِيةُ لِلْوالِدَينِ وَ الْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ) (یعنی تم پر لازم کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ پہنچے، اگر وہ کوئی خیر چھوڑ جائے، تو والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کرے، یہ پرہیزگاروں پر ایک حق ہے)، فرمایا: (یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے، فرائض والی آیت جو وراثت کے احکام پر مشتمل ہے، اس نے اسے منسوخ کر دیا ہے، فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ

---

[1] . غیبت نعمانی، ص 81، باب: "اماموں کے بارہ ہونے کے بارے میں روایات"۔

ما سَمِعَهُ فَإِنَّما إِثْمُهُ عَلَى الَّذينَ يبَدِّلُونَهُ (پھر جو شخص اس [وصیت] کو سن لینے کے بعد بدل دے تو اس کا گناہ انہی لوگوں پر ہے جو اسے بدلتے ہیں)، مراد وہی وصی)[1]

یہ لوگ توجہ کریں کہ خیر صرف اموال اور دارائیوں تک محدود نہیں ہے۔ اگر آیت منسوخ بھی ہو تو نسخ کا حکم ان اموال اور جائیدادوں سے آگے نہیں بڑھتا جو ورثاء کے درمیان تقسیم کا موضوع بنتی ہیں۔ یعنی آیتِ مواریث نازل ہونے کے بعد مادی اموال اور جائیدادوں کے بارے میں وصیت پر عمل کرنا دو تہائی اموال میں واجب نہیں رہتا۔ لیکن اس کے علاوہ دیگر موارد میں آیت کا حکم جاری رہتا ہے اور یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ آیتِ مواریث نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔

محمد بن مسلم کہتے ہیں کہ میں نے امام باقر (ع) سے وارث کے لیے وصیت کے بارے میں پوچھا، تو آپ نے فرمایا: (یہ جائز ہے)۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: (إِنْ تَرَكَ خَيراً الْوَصِيةُ لِلْوالِدَينِ وَ الْأَقْرَبِينَ)(اگر وہ کوئی خیر چھوڑ جائے تو اپنے والدین اور رشتہ داروں کے لیے معروف طریقے کے مطابق وصیت کرے)[2]

اسی طرح یہ آیت مؤمنوں کے لیے ان کے اموال کے ایک تہائی کی حیثیت کو بیان کرتی ہے جس کے بارے میں انہیں وصیت کرنے کا حق حاصل ہے، یعنی یہ کہ وہ اموال کے ایک تہائی یا اس کے کسی حصے کی اس زمانے میں زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کے حق میں وصیت کریں، جیسا کہ اہلِ بیت سے منقول ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس واجب کو ساقط کر دے، جس طرح اسے خمس کو ساقط کرنے کا حق ہے، اس لیے کہ یہ وہ اموال ہیں جو اسی سے متعلق ہیں اور وہ جب چاہے انہیں ساقط کر سکتا ہے۔ یہ وہ اموال ہیں جن کے ذریعے وہ امت اور اس کے فقراء کی کفالت کرتا ہے اور انہی کے ذریعے زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کا حکم مضبوط ہوتا ہے۔

امام صادق (ع) نے اللہ عزوجل کے اس قول کے بارے میں فرمایا: (الْوَصِيةُ لِلْوالِدَينِ وَ الْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ) (والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے معروف طریقے کے مطابق وصیت ہے، یہ متقی لوگوں پر ایک حق ہے)، آپ نے فرمایا: (یہ وہ چیز ہے جو اللہ عزوجل نے صاحبِ امر کے لیے مقرر

---

1. تفسیرِ عیاشی، جلد 1، ص 77۔
2. الکافی، کلینی، جلد 7، ص 10۔

کی ہے)۔ میں نے عرض کیا: (کیا اس کی کوئی حد ہے؟) فرمایا: (ہاں)۔ میں نے عرض کیا: (اس کی حد کیا ہے؟) فرمایا: (اس کی کم سے کم مقدار، ایک تہائی کے ایک تہائی کے برابر ہے)[1]

عمار بن مروان کہتے ہیں کہ میں نے امام صادق (ع) سے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں سوال کیا: (إِنْ تَرَكَ خَيراً الْوَصِيةُ) (اگر وہ کوئی خیر چھوڑ جائے تو وصیت کرے) تو آپ نے فرمایا: (یہ وہ حق ہے جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اموال میں اور صاحبِ امر کے لیے مقرر کیا ہے)۔ میں نے عرض کیا: (کیا اس کے لیے کوئی مقررہ حد ہے؟) فرمایا: (ہاں)۔ میں نے عرض کیا: کتنی؟ فرمایا: (اس کی کم سے کم مقدار ایک چھٹا ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ مقدار ایک تہائی ہے)[2]

احمد بن محمد سیاری نے اپنی کتاب (تنزیل و تحریف) میں اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں نقل کیا ہے:

(إِنْ تَرَكَ خَيراً الْوَصِيةُ) (اگر وہ کوئی خیر چھوڑ جائے تو وصیت کرے)۔ انہوں نے کہا: امام صادق (ع) نے فرمایا: (یہ وہ حق ہے جو اللہ عزوجل نے ایک تہائی میں سے صاحبِ امر کے لیے مقرر کیا ہے)۔ لوگوں نے پوچھا: (اس کی مقدار کتنی ہے؟) فرمایا: (اس کی کم سے کم مقدار ایک تہائی مال ہے، اور اس کا باقی حصہ اس چیز میں ہے جسے مرنے والا پسند کرتا ہے)[3]

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کی وصیت کرنا اور لوگوں کو زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کی مدد پر ابھارنا بھی لازم ہے، خصوصاً اس شخص کے لیے جو یہ گمان رکھتا ہو کہ اس کا کلام یا اس کی وصیت ان بعض لوگوں کے لیے، جو اس کی وصیت اس کی وفات کے بعد پڑھیں گے، حق کی شناخت اور اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کی مدد میں اثر رکھتی ہے۔ امیر المؤمنین (ع) نے تو فقیر شخص کو بھی وصیت ترک کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ وصیت ترک نہ کرنے اور اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کی وصیت کرنے کا حکم دیا۔

امام صادق (ع) نے اپنے والد سے اور اپنے آباء سے نقل فرمایا کہ ایک فقیر آدمی امیر المؤمنین (ع) کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: (اے امیرِ مؤمنان، کیا میں وصیت کروں؟) آپ نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کی وصیت کرو، لیکن مال اپنے ورثہ کے لیے چھوڑ دو، کیونکہ وہ تھوڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إِنْ تَرَكَ خَيراً

---

1. من لایحضرہ الفقیہ، جلد 4، ص 235۔
2. مستدرک الوسائل، میرزای نوری، جلد 14، ص 143۔
3. مستدرک الوسائل، میرزای نوری، جلد 14، ص 143۔

الْوَصِيةُ) (اگر وہ کوئی خیر چھوڑ جائے تو وصیت کرے) اور تم نے کوئی خیر نہیں چھوڑی کہ اس کے بارے میں وصیت کی جائے)[1]

لہٰذا محمد رسول اللہ (ص) جو رفیقِ اعلیٰ کی طرف جانے کے بعد اپنے بعد بہت بڑی خیر چھوڑ گئے ہیں، اور وہ زمین میں اللہ تعالیٰ کی خلافت کا مقام ہے، یہ درست نہیں کہ وہ اس مسئلے کے بارے میں وصیت کو ترک کریں۔ آپ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہی لوگوں تک تکلیف (شرعی ذمہ داری) پہنچنے کا راستہ ہوتا ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ آپ اپنے جانشین کے بارے میں وصیت کو ترک کر دیں اور لوگوں کو بے ترتیبی، اختلاف اور دشمنی میں چھوڑ دیں؟!

لیکن بعض شیعوں کے اس قول کے بارے میں جو اپنے آپ کو صاحبِ علم سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: وصیت لکھنے کو مطلقاً ترک کرنا بہتر ہے، اس لیے کہ جن لوگوں نے رزیۃُ الخمیس میں وصیت لکھنے پر اعتراض کیا اور کہا کہ آپ ہذیان فرما رہے ہیں اور بیماری آپ پر غالب آ گئی ہے، یعنی عمر اور اس کا گروہ، وہ رسول اللہ (ص) کی وفات کے بعد بھی وصیت لکھتے وقت آپ کی عقلی قوتوں کی سلامتی پر طعن کرنے سے نہیں ڈرتے، جیسا کہ انہوں نے رزیۃُ الخمیس میں کیا تھا۔

ان کی یہ بات درست نہیں ہے؛ اس لیے کہ یہ معاملہ اسی وقت پیش آ سکتا تھا جب وصیت لکھی جاتی اور ان اعتراض کرنے والوں پر ظاہر کر دی جاتی اور ان کے سامنے بیان کی جاتی؛ لیکن اگر وصیت علی (ع) کے لیے لکھی جاتی اور پہلے ہی اس پر گواہ مقرر کر دیے جاتے، بغیر اس کے کہ اسے معترضین پر ظاہر کیا جاتا، تو رسول اللہ (ص) پر کوئی طعن وارد نہ ہوتا اور اسی کے ساتھ وصیت لکھنے کا مقصد بھی حاصل ہو جاتا، یعنی یہ وصیت اس امت کی آنے والی نسلوں تک پہنچے اور قیامت کے دن تک امت کو گمراہی سے بچائے۔

ہاں، جو لوگ فقہ کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کے لیے یہ جائز ہے کہ اس سابقہ بات کو صرف اسی خاص موقع میں، یعنی جمعرات کے دن، رسول اللہ (ص) کے وصیت لکھنے پر اصرار نہ کرنے کی دلیل کے طور پر بیان کریں، نہ کہ مطلق طور پر۔

یہ بات بالکل واضح ہے۔ کیا وہ شخص جس کے لیے ماہِ رمضان کے ایک دن کا روزہ رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، کیا وہ مطلق طور پر اس دن کے روزے سے معاف ہو جاتا ہے، یا کسی دوسرے دن جب روزہ رکھنا ممکن ہو، روزہ

---

[1] . مستدرک الوسائل، میرزای نوری، جلد 14، ص 141۔

رکھتا ہے؟ اور کیا وہ شخص جو کسی جگہ نجاست کی موجودگی کی وجہ سے نماز نہیں پڑھ سکتا، کیا وہ نماز چھوڑ دیتا ہے، یا کسی دوسری جگہ نماز ادا کرتا ہے؟!!

رسول اللہ (ص) کی تحریر، وفات کے وقت، یعنی وصیت، ایک عظیم مسئلہ ہے جو روزہ اور نماز سے بھی بڑا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے قول کُتِبَ اور حَقّاً کے ذریعے واجب قرار دیا ہے، اور رسول اللہ (ص) نے اس کی یہ صفت بیان فرمائی ہے کہ یہ امت کو قیامت کے دن تک گمراہی سے بچاتی ہے؛ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ رسول اللہ (ص) کلی طور پر اور محض ایک گروہ کے اعتراض کی وجہ سے، جمعرات کے دن، اسے بالکل ترک کر دیں؟

درحقیقت یہ ایک بہت بڑا اور نہایت خطرناک مسئلہ ہے کہ رسول اللہ (ص) پر یہ الزام عائد کیا جائے کہ آپ نے وفات کے وقت وصیت لکھنے کو ترک کر دیا؛ کیونکہ اس میں رسول پر یہ تہمت آتی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو، اس کے انجام دینے اور اس پر عمل کرنے کی قدرت رکھنے کے باوجود، چھوڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وصیت لکھنے کو ایک ہی آیت میں دو مرتبہ، پرہیزگاروں کے سردار اور امام، محمد (ص) پر واجب قرار دیا ہے، اپنے اس قول کے ذریعے: کُتِبَ اور حَقّاً ۔

(كُتِبَ عَلَيكُمْ إِذا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيراً الْوَصِيةُ لِلْوالِدَينِ وَ الْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ) [1] (تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ جائے، اگر وہ کوئی خیر چھوڑ جائے، تو والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے معروف طریقے کے مطابق وصیت کرے، یہ متقی لوگوں پر ایک حق ہے)

جبکہ آج فلاں شخص آ کر یہ کہتا ہے کہ حضرت محمد (ص) نے وہ وصیت ترک کر دی جس میں ثقلین کو واضح کیا گیا ہے۔ اس طرح وہ نہایت آسانی سے رسول اللہ (ص) پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی؛ اس وجہ سے کہ جو واحد وصیت روایت ہوئی ہے وہ ان کی خواہشِ نفس کے مطابق نہیں، اور اس میں مہدیین کا ذکر اور ان میں سے پہلے کے نام کا بیان موجود ہے۔

لہٰذا اس میں کوئی تعجب نہیں کہ وہ یہ کہیں کہ رسول اللہ (ص) نے وصیت نہیں کی۔ کیا خواہشِ نفس کی پیروی اس سے زیادہ واضح بھی ہو سکتی ہے؟!

مصیبت یہ ہے کہ ان میں سے بعض یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ (ص) کی وصیت میں جو کچھ ہے اسے جانتے ہیں؛ ایسی وصیت جسے اُن کے گمان کے مطابق آپ (ص) نے لکھا ہی نہیں۔ اور یہ کہ یہ وصیت محض

---

[1] . قرآنِ کریم، سورۂ بقرہ، آیت 180۔

بیعتِ غدیر کی تاکید اور حدیثِ ثقلین کا ایک مجمل اور مختصر بیان تھی۔ اسی بناپر اُن کے خیال میں آپ (ص) نے اسے لکھنے کی کوشش نہیں کی اور ناگوار واقعۂ جمعرات کے بعد بھی اسے تحریر نہ فرمایا؛ حتیٰ کہ اُن مسکینوں کے لیے بھی نہیں جو اسے قبول کرتے ہیں، جیسے عمار، ابوذر اور مقداد؛ حتیٰ کہ علی (ع) کے لیے بھی اسے نہیں لکھا تاکہ وہ اسے اپنے بعد قبول کرنے والوں تک پہنچادیں، تاکہ مردوں کی صلبوں میں موجود تمام افراد ہلاک نہ ہو جائیں اور گمراہ نہ ہوں اور امت گمراہی سے محفوظ رہے۔

مجھے معلوم نہیں کہ انہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ وصیت محض واقعۂ غدیر کی تکرار یا اس کی تاکید تھی، یا رسول اللہ (ص) کے سابقہ واقعات اور ارشادات کا بقیہ حصہ تھی، جیسے حدیثِ ثقلین کا مجمل اور مختصر بیان؟ حالانکہ آپ اللہ کی طرف سے نبی اور رسول تھے، اور آپ پر وحی کا سلسلہ جاری تھا، اور لوگوں کی ہدایت کے لیے آپ کی رسالت آپ کی زندگی کے آخری لمحے تک برقرار رہی۔ کیا مثلاً اللہ تعالیٰ نے انہیں خبر دے دی تھی کہ محمد (ص) کو وفات سے پہلے ایک دن یا ایک مہینہ یا دو مہینے کے دوران ثقلین میں سے کسی ایک کے بارے میں نئی تفصیلات کے ساتھ کوئی نیا حکم وحی نہیں ہوا؟ بالخصوص اُن کے بعد آنے والے اوصیاء کے بارے میں اور اُن میں سے بعض کے نام اور خصوصیات کے متعلق، جو قیامت تک امت کے گمراہ نہ ہونے کا سبب بنتی ہیں؛ جبکہ یہ بات حکمت کے عین مطابق ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ان مدعیوں پر کوئی چیز وحی نہیں کی، تو پھر وہ کس بنیاد پر اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ نبی (ص) کی مراد وصیت محض سابقہ امور کی تکرار ہی تھی؟ اور اسی بناپر اُن کے گمان کے مطابق ناگوار واقعۂ جمعرات کے بعد وصیت لکھنے کو ترک کر دینا بہتر سمجھا گیا؟

اللہ کے خلیفہ کی وفات کے وقت وصیت کی وجہ اور اس کی حکمت یہ ہے کہ زمین میں اللہ کے خلیفہ کے لیے وحی اور تبلیغ یہاں تک کہ زندگی کے آخری لمحے تک بھی جاری رہتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی وصیت، اس پر ہونے والی آخری وحی میں اللہ کے خلیفہ یا اس کے بعد آنے والے خلفاء یا اس کے اوصیاء کے بارے میں ہو؛ اسی بنا پر اللہ سبحانہ، جو کامل حکمت والا ہے، فرماتا ہے: (كُتِبَ عَلَيكُمْ إِذا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيراً الْوَصِيةُ (تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ پہنچے، اگر وہ کچھ خیر چھوڑ جائے تو وصیت کرے)، اور یہ نہیں فرمایا: كُتِبَ عَلَيكُمُ الْوَصِيةُ (تم پر وصیت فرض کی گئی ہے)۔ اسی لیے محمد رسول اللہ (ص) نے اس واقعے میں جسے رزیۃ الخمیس (جمعرات کا ناگوار واقعہ) کہا جاتا ہے، بیان فرمایا کہ وفات کے وقت ان کی وصیت گمراہی سے بچانے والی ہے؛ اس لیے کہ وہ ثقلین کو ان کے ناموں اور خصوصیات کے ساتھ واضح کرنے

والی ہے، اور جو شخص قیامت کے دن تک اس وصیت کا پابند رہے گا، اس کے لیے گمراہی کے پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔

آخر میں اس نکتے کی طرف توجہ اور دقت دلانا چاہتا ہوں کہ ناگوار جمعرات کے دن، جیسا کہ ابن عباس نے اسے نام دیا، رسول اللہ (ص) کا یہ فرمان کہ: (میرے لیے کاغذ اور دوات لے آؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایسی تحریر لکھ دوں کہ اس کے بعد تم ہر گز گمراہ نہ ہو)، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تبلیغ جو رسول اللہ (ص) لائے، جس میں قرآن اور علی (ع) شامل ہیں اور جس میں آپ نے بارہا ان کے وصی ہونے کی طرف اشارہ فرمایا، اور حسن (ع) اور حسین (ع) جن کی تعیین حدیثِ کساء اور دیگر دلائل سے ہوئی، خود بہ خود امت کو قیامت تک گمراہی سے نہیں بچاتی؛ بلکہ امت کو گمراہی سے بچانے والا واحد عامل، ثقلین کی یہ دقیق اور واضح تعیین ہے جو رسول اللہ (ص) پر وحی کی گئی، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ اپنی وفات کے وقت، اپنی مبارک زندگی اور رسالت کے اختتام پر، اپنی مبارک وصیت کے ذریعے اسے لوگوں تک پہنچادیں۔

آخر میں:

ہمارے پاس قرآن کی ایک آیت موجود ہے جو موت کے آ پہنچنے کے وقت وصیت لکھنے کو، وجوب پر دلالت کرنے والے دو الفاظ کے ساتھ، واجب قرار دیتی ہے: کُتِبَ اور حَقًّا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(كُتِبَ عَلَيكُمْ إِذا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيراً الْوَصِيةُ لِلْوالِدَينِ وَ الْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ)[1] (تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ پہنچے، اگر وہ کچھ خیر چھوڑ جائے، تو والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے معروف طریقے سے وصیت کرے، یہ متقیوں پر ایک حق ہے)۔

جو شخص وصیت لکھنے کا انکار کرتا ہے، اس نے رسول اللہ (ص) کو معصیت کا مرتکب قرار دیا ہے۔

ہمارے پاس ایسی روایات بھی موجود ہیں جو وصیت لکھنے پر دلالت کرتی ہیں، یا موت کے آ پہنچنے کے وقت رسول اللہ (ص) کے وصیت لکھنے کی کوشش پر دلالت کرتی ہیں؛ جیسے رزیۃ الخمیس، جو بخاری میں روایت ہوئی ہے، اور وہ روایت جو سلیم بن قیس نے اپنی کتاب میں نقل کی ہے۔

---

[1] . قرآنِ کریم، سورۂ بقرہ، آیت 180۔

اسی طرح ہمارے پاس ایسی روایات بھی ہیں جو وصیت کے مضمون کے موافق ہیں، اور وہ بارہ مہدیوں کی روایات ہیں، جن کے مصادر کی طرف شیعہ اور اہلِ سنت دونوں کے ہاں رجوع کیا جا سکتا ہے۔ نیز وہ روایت بھی ہے جو طوسی نے ان (ع) سے نقل کی ہے، جس میں مہدی کے نام (احمد، عبداللہ اور مہدی) بیان ہوئے ہیں۔ اور وہ روایت بھی جو اہلِ سنت سے منقول ہے کہ مہدی کا نام نبی (ص) کے نام کے مشابہ ہوگا، یعنی احمد، جیسا کہ وصیت میں آیا ہے۔

ہمارے پاس نبی (ص) کی وفات کے وقت لکھی گئی وصیت کا متن بھی موجود ہے، جسے طوسی نے کتاب الغیبہ میں روایت کیا ہے، اور ہمارے نزدیک وصیت کے متن کے مقابل کوئی معارض یا مخالف چیز موجود نہیں ہے۔

نیز وصیت کو رد کرنے کے لیے جو بھی اعتراضات پیش کیے گئے، ان سب کا مکمل جواب دیا جا چکا ہے اور ان کے باطل ہونے کو نہایت واضح اور روشن انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔

تو پھر ان سب کے بعد کسی عقل مند شخص کے لیے وصیت کو رد کرنا کیسے ممکن ہے؟ اس شخص کے لیے جو آخرت سے ڈرتا ہے، وصیت کو رد کرنا کیسے ممکن ہے؟ اور اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، وصیت کو رد کرنا کیسے ممکن ہے؟!!!

خلاصہ:

محمد رسول اللہ (ص) کے بعد زمین میں اللہ کی خلافت، جیسا کہ عقل اور نقل بیان کرتے ہیں، جاری رہتی ہے۔

رسول اللہ (ص) نے علی (ع) اور اہلِ بیت کے ائمہ (ع) پر نص اور صراحت فرمائی ہے۔

رسول اللہ (ص) کے خلفاء نے دعویٰ کیا کہ وصیت انہی کے بارے میں ہے، اور اس گمراہی سے بچانے والی تحریر کا دعویٰ ان کے سوا کسی اور نے نہیں کیا، یہاں تک کہ ان کا دعویٰ مکمل طور پر ثابت ہو گیا اور وصیت کا مقصد انہی کے حق میں پورا ہو گیا۔

یہ ان کے حق کے اثبات اور ان کے مخالفین کے بطلان کے لیے کافی ہے۔

میں اضافہ کرتا ہوں کہ جو علم ان چیزوں کے بارے میں ہے جن کے لوگ محتاج ہیں اور لوگوں کے دینی مسائل میں پیدا ہوتا ہے، وہ ان سے ظاہر ہو چکا ہے، جیسا کہ انہوں نے زمین میں اللہ کی حاکمیت کی طرف دعوت دی۔

اسی طرح ان کی خلافت کے اثبات کے ستون مکمل ہو چکے ہیں اور ان کے مخالفین اور ان سے رو گردانی کرنے والوں کے لیے کوئی عذر اور بہانہ باقی نہیں رہتا، سوائے جہالت یا دشمنی اور گمراہی کے۔

تیسرا اصل

رسالت

آفرینش کا مقصد بندگی اور معرفت ہے، اور اس مقصد کے تحقق کے لیے آفرینندہ کی مشیت یا رسالت کے بارے میں علم اور معرفت حاصل ہونا ضروری ہے؛ اس طرح مکلّف افراد معرفت تک پہنچتے ہیں اور آفرینش کا مقصد پورا ہوتا ہے۔ ورنہ فرد کی رفتار میں تیزی بھی اسے مقصد سے مزید دور ہی کر دیتی ہے۔

رسالت میں عقیدہ اور تشریع دونوں شامل ہیں۔ یہ کتاب عقائد سے متعلق ہے؛ اسی وجہ سے ہم رسالت میں صرف عقیدے کے حصے پر اکتفا کرتے ہیں اور تشریع کے حصے کا مختصر طور پر ذکر کرتے ہیں۔

تشریع

ہمیشہ یہ امکان موجود رہتا ہے کہ دینِ الٰہی کے سفر کے دوران تشریع کی جزئیات میں تبدیلی واقع ہو جائے، خواہ پے در پے آنے والے رسولوں کے زمانے میں ہو یا خود ایک رسول کے مبعوث کیے جانے کے دوران، جیسے محمد (ص) ۔ محمد رسول اللہ (ص) کی رسالت کے دوران بعض ایسے احکام میں نسخ واقع ہوا جن کی آپ (ص) نے بعثت کے آغاز میں تائید فرمائی تھی، جیسے اُس عورت کی عدّت جس کا شوہر وفات پا جائے۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (وَ الَّذينَ يتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يذَرُونَ أَزْواجاً وَصِيةً لِأَزْواجِهِمْ مَتاعاً إِلَى الْحَوْلِ غَيرَ إِخْراجٍ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلا جُناحَ عَلَيكُمْ فی ما فَعَلْنَ فی أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَعْرُوفٍ وَ اللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ)[1]

(اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، [ان پر لازم ہے کہ] اپنی بیویوں کے لیے وصیت کریں کہ انہیں ایک سال تک خرچ دیا جائے اور [شوہر کے گھر سے] نہ نکالا جائے، پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو جو کچھ وہ اپنے بارے میں معروف طریقے سے کریں، اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں، اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے)۔

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ بقرہ، آیت 240۔

(وَ الَّذينَ يتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يذَرُونَ أَزْواجاً يتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَ عَشْراً فَإِذا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلا جُناحَ عَلَيكُمْ فيما فَعَلْنَ فى أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَ اللَّهُ بِما تَعْمَلُونَ خَبيرٌ)[1]

(اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ (بیویاں) اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن تک روکے رکھیں۔ پھر جب وہ اپنی عدّت پوری کر لیں تو جو کچھ وہ اپنے بارے میں معروف طریقے سے کریں، اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں، اور اللہ اس سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو)۔

قرآن نے بعض آیات میں تشریع کے بدلنے کے موضوع کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے، جن میں سے ایک یہ ہے:

(شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ ما وَصَّى بِهِ نُوحاً وَ الَّذى أَوْحَينا إِلَيكَ وَ ما وَصَّينا بِهِ إِبْراهيمَ وَ مُوسى وَ عيسى أَنْ أَقيمُوا الدِّينَ وَ لا تَتَفَرَّقُوا فيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكينَ ما تَدْعُوهُمْ إِلَيهِ اللَّهُ يجْتَبى إِلَيهِ مَنْ يشاءُ وَ يَهْدى إِلَيهِ مَنْ ينيبُ)

(اس نے تمہارے لیے دین میں وہی چیز مقرر کی جس کی اس نے نوح کو وصیت کی تھی، اور وہ جس کی ہم نے تمہاری طرف وحی کی، اور وہ جس کی ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو وصیت کی تھی کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ مشرکوں پر وہ بات بہت گراں گزرتی ہے جس کی طرف تم انہیں بلاتے ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی طرف چن لیتا ہے، اور جو اس کی طرف رجوع کرے اسے اپنی طرف ہدایت دیتا ہے)[2]

یہ امکان بھی موجود ہے کہ بعض تشریعات ایسی ہوں جن کے کچھ مقاصد لوگوں کو پاک کرنا اور نادان افراد کو اُن لوگوں سے جدا کرنا ہوں جو حق کے طالب ہوں۔ حالانکہ مکہ میں احناف کا قبلہ کعبہ ہی تھا، رسول اللہ (ص) کا قبلہ اور آپ (ص) کی نماز بیت المقدس کی طرف اور یہود کے قبلے کی جانب تھی۔ پھر جب آپ (ص) مدینہ تشریف لے گئے اور یہود کا قبلہ بھی اور آپ (ص) کا قبلہ بھی بیت المقدس ہی تھا، تو ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ (ص) کا قبلہ کعبہ قرار دے دیا۔ اگر مکہ میں آپ (ص) کا قبلہ کعبہ ہی ہوتا تو احناف کے لیے ایمان لانا آسان تر ہوتا۔ یقیناً مکہ میں محمد (ص) کی طرف سے یہود کے قبلے کو اختیار کرنا احناف کے لیے ایک بھاری بات

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ بقرہ، آیت 234۔

[2] . قرآن کریم، سورۂ شوریٰ، آیت 13۔

تھی، کیونکہ ان کا قبلہ تو کعبہ ہی تھا۔ اسی طرح مدینہ میں محمد (ص) کی طرف سے کعبہ کو قبلہ قرار دینا نصاریٰ اور یہود کے لیے ایک بھاری بات تھی، کیونکہ ان کا قبلہ بیت المقدس تھا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(وَ كَذلِكَ جَعَلْناكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِتَكُونُوا شُهَداءَ عَلَى النَّاسِ وَ يكُونَ الرَّسُولُ عَلَيكُمْ شَهِيداً وَ ما جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيها إِلاَّ لِنَعْلَمَ مَنْ يتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ ينْقَلِبُ عَلى عَقِبَيهِ وَ إِنْ كانَتْ لَكَبِيرَةً إِلاَّ عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ وَ ما كانَ اللَّهُ لِيضِيعَ إِيمانَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَؤُفٌ رَحِيمٌ)[1]

(اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ ہو، اور جس قبلہ پر تم تھے ہم نے اسے صرف اس لیے مقرر کیا تاکہ ہم ظاہر کر دیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے، اور یقیناً یہ بات بہت بھاری تھی مگر ان لوگوں پر نہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی، اور اللہ ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع کر دے، بے شک اللہ لوگوں پر بہت مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(قَدْ نَرى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّماءِ فَلَنُوَلِّينَّكَ قِبْلَةً تَرْضاها فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرامِ وَ حَيثُ ما كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ وَ إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتابَ لَيعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَ مَا اللَّهُ بِغافِلٍ عَمَّا يعْمَلُونَ)[2]

(ہم تمہارا بار بار آسمان کی طرف منہ پھیرنا دیکھ رہے ہیں، لہٰذا ہم ضرور تمہیں اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس سے تم خوش ہو جاؤ گے، پس تم اپنا منہ مسجدِ حرام کی طرف پھیر لو، اور تم جہاں کہیں بھی ہو اپنے منہ اسی کی طرف پھیر لیا کرو، اور بے شک جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (وَ لَئِنْ أَتَيتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتابَ بِكُلِّ آيةٍ ما تَبِعُوا قِبْلَتَكَ وَ ما أَنْتَ بِتابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَ ما بَعْضُهُمْ بِتابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْواءَهُمْ مِنْ بَعْدِ ما جاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذاً لَمِنَ الظَّالِمِينَ)[3]

---

1 . قرآن کریم، سورۂ بقرہ، آیت 143۔

2 . قرآن کریم، سورۂ بقرہ، آیت 144۔

3 . قرآن کریم، سورۂ بقرہ، آیت 145۔

(اور اگر تم اہلِ کتاب کے پاس ہر قسم کی نشانی لے آؤ تب بھی وہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے، اور نہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے ہو، اور نہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے والے ہیں، اور اگر اس علم کے آ جانے کے بعد جو تمہارے پاس آ چکا ہے تم ان کی خواہشات کی پیروی کرو گے تو یقیناً اس وقت تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے)۔

لہٰذا تشریعِ الٰہی میں نسخ اور تبدیلی و تبدل کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ بہت سے دلائل موجود ہیں جو نسخ اور تبدیلی کا سبب بنتے ہیں، ان میں سے وہ حالات بھی ہیں جنہوں نے اس زمین پر انسانی معاشرے کو گھیر رکھا ہے۔

اسی طرح تشریع کے بعض حصے رسولوں کے سپرد کیے گئے ہیں۔ جو کچھ رسول، ان حدود کی رعایت کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہیں، تشریع کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(كُلُّ الطَّعامِ كانَ حِلاًّ لِبَنى إِسْرائيلَ إِلاَّ ما حَرَّمَ إِسْرائيلُ عَلى نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْراةُ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْراةِ فَاتْلُوها إِنْ كُنْتُمْ صادِقينَ)[1]

(بنی اسرائیل کے لیے تمام کھانے حلال تھے سوائے اس کے جو اسرائیل [= یعقوب] نے تورات کے نازل ہونے سے پہلے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، کہہ دو اگر تم سچے ہو تو توریت لے آؤ اور اسے پڑھو)۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ بعض ایسے امور موجود تھے جنہیں اللہ کے نبی یعقوب (ع) نے حرام قرار دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کے سوا، اور ان رسولوں کے علاوہ جنہیں تشریع سونپی گئی ہے، کسی اور کے لیے تشریع کرنا جائز نہیں۔ دین اللہ تعالیٰ ہی کا ہے اور وہی سبحانہ اپنے دین کا ذمہ دار ہے۔ لہٰذا کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اللہ کے دین میں از خود اور بچکانہ انداز میں تشریع اپنے ذمہ لے۔ اس موضوع پر میں نے آیتِ اِکمالِ دین کے ضمن میں گفتگو کی ہے۔

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ آلِ عمران، آیت 93۔

کیا حُسن اور قُبح عقلی ہیں؟

عقل سے مراد وہی فکری قوت ہے جو ہر انسان میں رکھی گئی ہے، اور وہ نیک و بد، مؤمن و کافر سب میں پائی جاتی ہے۔

عقل میزان اور پرکھنے کا ایک آلہ ہے، لہٰذا اس کے لیے کسی وزن یا معیار کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ذریعے باقی چیزوں کو پرکھا جائے اور اچھے اور برے میں امتیاز کیا جائے۔ اگر پرکھنے کا معیار موجود نہ ہو تو عقل حسن اور قبح، اور حق و باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اسی وجہ سے حق اور باطل میں تمیز کے معاملے میں لوگوں سے اکثر اوقات غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔

جو افراد حسن کو قبیح سے یا حق کو باطل سے تمیز نہیں دے پاتے، وہ درج ذیل میں سے کسی ایک مشکل کا شکار ہوتے ہیں:

یا تو ان کے پاس میزان یا ترازو ہی موجود نہیں ہوتا، اور یہ وہ لوگ ہیں جو دیوانہ ہوتے ہیں یا عقلی اعتبار سے کسی خرابی میں مبتلا ہوتے ہیں۔

یا وہ لوگ جو جانچ کے معیار ہی نہیں رکھتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حق حاصل کرنے اور جانچ کے اُن معیاروں کو پہچاننے کے لیے کوشش نہیں کرتے، جو حق اور باطل میں فرق کرنے کے لیے دستیاب ہوتے ہیں۔ یا پھر وہ حق کو نادانی، سمجھ کی کمزوری یا بے سمجھی کے ساتھ تلاش کرتے ہیں۔ یعنی وہ اپنی زبانوں سے حق کا مطالبہ کرتے ہیں؛ بغیر اس کے کہ وہ حق اور باطل کو پرکھنے اور پہچاننے کے معیاروں کی معرفت کے لیے سیکھنے اور حقیقی اور دقیق تلاش کے پیچھے جائیں۔ ایسے ہی لوگوں میں گمراہ (ضالّین) شامل ہیں۔

یا وہ لوگ جو میزان یا ترازو رکھتے ہیں اور جانچ کے معیاروں کو بھی جانتے اور سمجھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود حق اور باطل اور حسن و قبیح کو پہچاننے کے لیے جانچ سے جان بوجھ کر دور رہتے ہیں کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ جس باطل میں وہ ہیں، اسی میں اس کی مدد کے لیے باقی رہیں۔ ایسے لوگوں میں المغضوب علیہم کا گروہ شامل ہے۔

یہ ممکن نہیں کہ کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اس کے پاس جانچ کے تمام معیار موجود ہیں، بلکہ یہ تو درکنار کہ ہم یہ دعویٰ کریں کہ تمام لوگ ایسے ہیں؛ کیونکہ جانچ کے تمام معیار رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر چیز کی حقیقت، اس کا انجام، اور اس سے وابستہ تمام امور کو ہر حال میں جانتا ہو، اور یہ احاطہ سوائے اللہ سبحان و متعال کے کسی کے لیے ممکن نہیں۔

لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ ہر چیز کے حسن و قبح کی پہچان مطلق طور پر، عقل ہی کے ذریعے ہو۔ بلکہ جیسا کہ میں نے بیان کیا، عقل اتنی ہی حد تک تمیز کی صلاحیت رکھتی ہے جتنی حد تک جانچ کے وزن اور معیار اس کے پاس موجود ہوں۔

اسی وجہ سے یہ کہنا کہ عقل تشریع کرنے والی ہو سکتی ہے، ایک باطل بات ہے؛ کیونکہ اس صورت میں یہ مطلق لاہوت کی تعدد کا قائل ہونے کے برابر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان باتوں سے پاک اور بلند تر ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔

الٰہی عقیدہ آدم سے لے کر قیامت کے قائم ہونے تک

یہ ممکن نہیں کہ الٰہی عقائد میں تبدیلی اور تحول پیدا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا دین ایک ہی ہے اور وہی ایک اللہ سبحان کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ بعض مصادیق بدل جائیں یا عقیدے کے بیان اور اس کی وضاحت میں زیادہ وسعت اور گہرائی پیدا ہو جائے، یا کسی عقیدے پر قائم معرفت اور اس کے مطابق عمل، اسے قبول کرنے والے فرد کی موجودگی کے باعث زیادہ وسیع ہو جائے۔ لیکن حق عقیدہ خود کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(إِنَّ هذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً واحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ)[1]

(بے شک یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں ہی تمہارا رب ہوں، لہٰذا میری عبادت کرو)۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(يا أَيهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيباتِ وَاعْمَلُوا صالِحاً إِنِّي بِما تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ * وَإِنَّ هذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً واحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ)[2]

(اے رسولوں، پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو، بے شک میں اس سے خوب آگاہ ہوں جو تم انجام دیتے ہو، اور بے شک یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں ہی تمہارا رب ہوں، لہٰذا مجھ سے ڈرتے رہو)۔

---

1. قرآنِ کریم، سورۂ انبیاء، آیت 92۔
2. قرآنِ کریم، سورۂ مؤمنون، آیات 51 اور 52۔

تمام فرستادے ایک ہی امت ہیں اور ان کے عقائد ایک ہی ہیں۔ وہ بہترین لوگ ہیں جنہوں نے اللہ سبحان کے سامنے کامل طور پر سر تسلیم خم کیا اور ان کا دین اللہ کے لیے تسلیم ہونا ہے، یعنی اسلام:

(إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الاسْلامُ وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذينَ أُوتُوا الْكِتابَ إِلاَّ مِنْ بَعْدِ ما جاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْياً بَيْنَهُمْ وَ مَنْ يَكْفُرْ بِآياتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسابِ)[1]

(بے شک اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے، اور اہلِ کتاب نے جو اپنے پاس علم آجانے کے بعد اختلاف کیا وہ صرف باہمی حسد و عناد کے باعث تھا، اور جو کوئی اللہ کی آیات کا انکار کرے تو بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے)۔

(إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْراةَ فيها هُدى وَ نُورٌ يحْكُمُ بِهَا النَّبِيونَ الَّذينَ أَسْلَمُوا لِلَّذينَ هادُوا وَ الرَّبَّانِيونَ وَ الْأَحْبارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتابِ اللَّهِ وَ كانُوا عَلَيهِ شُهَداءَ فَلا تَخْشَوُا النَّاسَ وَ اخْشَوْنِ وَ لا تَشْتَرُوا بِآياتى ثَمَناً قَليلاً وَ مَنْ لَمْ يحْكُمْ بِما أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولئِكَ هُمُ الْكافِرُونَ)[2]

(بے شک ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور تھا، اس کے مطابق وہ نبی فیصلہ کرتے تھے جو فرمانِ خدا کے آگے سر تسلیم خم کرنے والے تھے، یہودیوں کے لیے، اور اسی کے مطابق اللہ والے (یعنی ان کے اولیاء) اور علما بھی فیصلہ کرتے تھے، اس لیے کہ وہ اللہ کی کتاب کی حفاظت پر مقرر کیے گئے تھے اور اس پر گواہ تھے۔ پس لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرو، اور میری آیات کو تھوڑی قیمت پر نہ بیچو، اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے، وہی کافر ہیں)۔

(وَ مَنْ أَحْسَنُ ديناً مِمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ وَ اتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْراهيمَ حَنيفاً وَ اتَّخَذَ اللَّهُ إِبْراهيمَ خَليلاً)[3]

(اور دین کے اعتبار سے اس شخص سے بہتر کون ہے جس نے خود کو اللہ کے سپرد کر دیا اور وہ نیکوکار بھی ہے، اور ابراہیم کے دین کی پیروی کرتا ہے جو یکسو تھا، اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنالیا)۔

---

1. قرآنِ کریم، سورۂ آلِ عمران، آیت 19۔
2. قرآنِ کریم، سورۂ مائدہ، آیت 44۔
3. قرآنِ کریم، سورۂ نساء، آیت 125۔

نجات کے حاصل ہونے کے لیے لازم ہے کہ ان کی اقتدا کی جائے اور ان کے سامنے تسلیم کیا جائے۔ وہ عقائد جو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے لے کر آئے، حق واضح ہے، اور اس کے سوا سب باطل ہے۔ فرستادوں کا دین اور اللہ سبحان کے نزدیک دین، اللہ کے لیے تسلیم ہونا ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(وَ مَنْ يرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْراهيمَ إِلاَّ مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ وَ لَقَدِ اصْطَفَيناهُ فِي الدُّنْيا وَ إِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحينَ * إِذْ قالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعالَمينَ * وَ وَصَّى بِها إِبْراهيمُ بَنيهِ وَ يعْقُوبُ يا بَنِي إِنَّ اللَّهَ اصْطَفى لَكُمُ الدِّينَ فَلا تَمُوتُنَّ إِلاَّ وَ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ)[1]

(اور کون ہے جو ملتِ ابراہیم سے منہ موڑے، سوائے اس کے جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کرے؟ اور ہم نے ابراہیم کو دنیا میں چن لیا تھا، اور یقیناً وہ آخرت میں بھی صالحین میں سے ہوں گے۔ جب ان کے رب نے ان سے فرمایا کہ فرمانبردار ہو جاؤ، تو انہوں نے کہا میں ربّ العالمین کا فرمانبردار ہو گیا۔ اور اسی کی وصیت ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو کی اور یعقوب نے بھی کہ اے میرے بیٹو! بے شک اللہ نے تمہارے لیے یہ دین چن لیا ہے، لہٰذا تمہیں ہر گز موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو)۔

دینِ ابراہیم حق ہے، اور اس کے سوا سب کچھ سبک مغزی اور بے خردی ہے: (وَ مَنْ يرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْراهيمَ إِلاَّ مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ) (اور کون ہے جو ملتِ ابراہیم سے منہ موڑے، سوائے اس کے جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کرے؟)۔

دینِ ابراہیم درحقیقت اللہ کے لیے مکمل تسلیم ہونا ہے، اور وہی اسلام ہے: (إِذْ قالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعالَمينَ) (جب اس کے رب نے اس سے فرمایا: تسلیم ہو جا، تو اس نے کہا: میں ربّ العالمین کے لیے تسلیم ہو گیا)۔

جو شخص اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرے وہ مسلمان ہے اور اس کا دین اسلام ہے، خواہ وہ ابراہیم کے زمانے میں ان کی پیروی کرے، یا موسیٰ کے زمانے میں ان کی، یا عیسیٰ کے زمانے میں ان کی پیروی کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

[1] . قرآنِ کریم، سورۂ بقرہ، آیات 130 - 132۔

(أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يبْغُونَ وَ لَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّماواتِ وَ الْأَرْضِ طَوْعاً وَ كَرْهاً وَ إِلَيهِ يرْجَعُونَ * قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَ ما أُنْزِلَ عَلَينا وَ ما أُنْزِلَ عَلى إِبْراهيمَ وَ إِسْماعيلَ وَ إِسْحاقَ وَ يعْقُوبَ وَ الْأَسْباطِ وَ ما أُوتِي مُوسى وَ عيسى وَ النَّبِيونَ مِنْ رَبِّهِمْ لا نُفَرِّقُ بَينَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ * وَ مَنْ يبْتَغِ غَيرَ الْإِسْلامِ ديناً فَلَنْ يقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخاسِرِينَ)[1]

(کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں، حالانکہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے وہ خوشی سے ہو یا مجبوری سے اسی کے آگے جھکا ہوا ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر بھی جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب پر نازل کیا گیا، اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا (سب پر ایمان لائے ہیں)، ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔ اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا)۔

لیکن دین یا اس کی اعتقادی بنیاد تسلیم کی طرف لوٹتی ہے، اس وجہ سے کہ ہم کہتے ہیں کہ ایک مطلق خالق موجود ہے جس نے محدود مخلوقات کو پیدا کیا ہے، پھر انہیں ظلمت اور تاریکی کی طرف بھیجا ہے، پھر انہیں اپنی طرف، نور کی طرف دعوت دی ہے۔ جو شخص اپنے خالق کے سامنے تسلیم ہو اور جواب دے اور نور کی طرف لوٹ آئے، وہ نجات اور رہائی پالیتا ہے، اور جو نافرمانی کرے وہ ہلاک ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ تاریکی اور ظلمت میں ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی کی بنا پر نجات پانے والوں میں سے کچھ افراد کو بھیجتا ہے جو ہلاک ہونے والوں کو، وقت پورا ہونے سے پہلے، تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ (وَ لَوْ لا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ...) (اور اگر تمہارے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات مقرر نہ ہو چکی ہوتی)۔

(وَ لَوْ لا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيكُمْ وَ رَحْمَتُهُ ما زَكى مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَداً وَ لكِنَّ اللَّهَ يزَكِّي مَنْ يشاءُ وَ اللَّهُ سَميعٌ عَلِيمٌ)[2]

---

[1] . قرآنِ کریم، سورۂ آلِ عمران، آیات 83 سے 85۔

[2] . قرآنِ کریم، سورۂ نور، آیت 21۔

(اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہو سکتا، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے پاک کرتا ہے، اور اللہ سب کچھ سننے والا، خوب جاننے والا ہے)۔

(وَ ما كانَ النَّاسُ إِلاَّ أُمَّةً واحِدَةً فَاخْتَلَفُوا وَ لَوْ لا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فيما فيهِ يخْتَلِفُونَ)[1]

(اور لوگ ایک ہی امت تھے، پھر انہوں نے اختلاف کیا، اور اگر تمہارے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات مقرر نہ ہو چکی ہوتی تو جن باتوں میں وہ اختلاف کر رہے ہیں ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا)۔

(وَ لَقَدْ آتَينا مُوسَى الْكِتابَ فَاخْتُلِفَ فيهِ وَ لَوْ لا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَ إِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٍ)[2]

(اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی، پھر اس میں اختلاف کیا گیا، اور اگر تمہارے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات مقرر نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا، اور وہ یقیناً اس کے بارے میں اضطراب انگیز شک میں مبتلا ہیں)۔

(وَ لَوْ لا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَكانَ لِزاماً وَ أَجَلٌ مُسَمًّى)[3]

(اور اگر تمہارے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی مقرر نہ ہو چکی ہوتی اور ایک مقررہ مدت نہ ٹھہرا دی گئی ہوتی تو یقیناً (عذاب) لازم آ جاتا)۔

(وَ لَقَدْ آتَينا مُوسَى الْكِتابَ فَاخْتُلِفَ فيهِ وَ لَوْ لا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَ إِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٍ)[4]

(اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی، پھر اس میں اختلاف کیا گیا، اور اگر تمہارے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات مقرر نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا، اور بے شک وہ اس کے بارے میں ایسے شک میں مبتلا ہیں جو انہیں بے چین رکھتا ہے)۔

---

1. قرآنِ کریم، سورۂ یونس، آیت 19
2. قرآنِ کریم، سورۂ ہود، آیت 110۔
3. قرآنِ کریم، سورۂ طٰہٰ، آیت 129۔
4. قرآنِ کریم، سورۂ فصلت، آیت 45۔

(وَما تَفَرَّقُوا إِلاَّ مِنْ بَعْدِ ما جاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْياً بَينَهُمْ وَلَوْلا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ إِلى أَجَلٍ مُسَمًّى لَقُضِيَ بَينَهُمْ وَإِنَّ الَّذينَ أُورِثُوا الْكِتابَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٍ)[1]

(اور انہوں نے تفرقہ نہیں ڈالا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا، محض آپس کی ضد اور سرکشی کی بنا پر، اور اگر تمہارے رب کی طرف سے ایک مقررہ مدت تک کے لیے پہلے ہی ایک بات طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا، اور بے شک وہ لوگ جنہیں ان کے بعد کتاب کا وارث بنایا گیا، اس کے بارے میں ایسے سخت شک میں مبتلا ہیں جو انہیں بے چین رکھتا ہے)۔

جو شخص نجات یافتہ لوگوں اور اس ہستی کی اطاعت اختیار کرے جس نے انہیں بھیجا ہے، وہ نجات اور رہائی پا لیتا ہے، اور جو ان کے حکم کی نافرمانی کرے وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ یہ تخلیق کی مکمل داستان ہے، اس شخص کے لیے جو اسے سمجھ لے۔ یہ وہ معاملہ ہے جو عالمِ ذر میں پیش آیا، اور اس کا ذکر قرآن [2] میں اور آلِ محمد (ع) [3] کی روایات میں بھی آیا ہے۔

---

1. قرآنِ کریم، سورۂ شوریٰ، آیت 14۔

2. وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ (سورۂ اعراف، آیت 172) (اور جب تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور انہیں خود ان پر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، تو انہوں نے کہا کیوں نہیں، ہم نے گواہی دی، تاکہ قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم اس بات سے بے خبر تھے)۔

3. امام باقر (ع) نے فرمایا: (اللہ تبارک و تعالیٰ نے جب مخلوقات کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو سب سے پہلے ایک میٹھا پانی اور ایک کھارا کڑوا پانی پیدا کیا، پھر ان دونوں پانیوں کو آپس میں ملا دیا، پھر زمین کی سطح سے مٹی لی اور اسے خوب رگڑا، اس کے بعد اصحابِ یمین سے جو چیونٹیوں کی طرح حرکت کر رہے تھے فرمایا: سلامتی کے ساتھ جنت کی طرف چلے جاؤ، اور اصحابِ شمال سے فرمایا: جہنم کی طرف جاؤ اور مجھے کوئی پرواہ نہیں، پھر فرمایا: کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں، ہم گواہی دیتے ہیں، تاکہ قیامت کے دن یہ نہ کہیں کہ ہم اس سے بے خبر تھے، پھر انبیاء سے عہد لیا اور فرمایا: کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ اور کیا یہ محمد میرا رسول نہیں اور یہ علی (ع) امیر المؤمنین نہیں ہیں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں، پس ان کی نبوت ثابت ہو گئی، اور اللہ تعالیٰ نے اولوالعزم پیغمبروں سے عہد لیا کہ میں تمہارا پروردگار ہوں اور محمد میرا رسول ہے اور علی امیر المؤمنین اور ان کے بعد اوصیاء میرے امر کے والی اور میرے علم کے خزانہ دار ہیں اور یہ کہ مہدی وہ ہیں جن کے ذریعے میں اپنے دین کو نصرت دوں گا اور اپنی دولت کو ظاہر کروں گا اور اپنے دشمنوں سے انتقام لوں گا اور اسی کے ذریعے چاہے لوگ چاہیں یا نہ چاہیں میری عبادت کی جائے گی، انہوں نے کہا: اے ہمارے پروردگار! ہم نے اقرار کیا اور گواہی دی، لیکن آدم نے نہ انکار کیا اور نہ اقرار، پس ان پانچ کے لیے مہدی کے سبب اولوالعزم کا مقام ثابت ہوا اور آدم کے لیے اس اقرار پر عزم نہ پایا گیا (اسی وجہ سے وہ اولوالعزم انبیاء میں شامل نہ ہوئے)، یہی اللہ عزوجل کا فرمان ہے: ولقد عهدنا إلى آدم من قبل فنسي ولم نجد له عزما (سورۂ طٰہٰ، آیت 115) (اور یقیناً ہم نے اس سے پہلے آدم سے عہد لیا تھا اور اس نے اسے بھلا دیا اور ہم نے اس کے لیے پختہ عزم نہ پایا)، پھر فرمایا کہ: یہاں بھولنے سے مراد ترک کرنا ہے، پھر اللہ نے آگ کو حکم دیا تو وہ بھڑک اٹھی، اور اصحابِ شمال سے فرمایا: اس میں داخل ہو جاؤ، وہ ڈر گئے، پھر اصحابِ یمین سے فرمایا: داخل ہو جاؤ، وہ داخل ہو

جن افراد نے ابتدا میں جواب دیا تھا (ہاں)، اگلے مرحلے میں وہی دعوت دینے والے اور ڈرانے والے امتحان کا سبب بنے۔ (أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قالُوا بَلَى) (کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: ہاں)۔ امتحان بھی انہی کے ذریعے ہے اور نجات اور رہائی بھی انہی کے ذریعے ہے۔ (هذا نذير من النذر الأولى) (یہ بھی پہلے ڈرانے والوں میں سے ایک ڈرانے والا ہے)۔ میں پھر دہراتا ہوں کہ یہ نیکی لوگوں ہی کے حق میں ہے، اس لیے کہ ان سب کے پاس یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اسی مقام پر پہلے جواب دینے والوں میں شامل ہو سکتے تھے، لہٰذا انہیں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ ان افراد کو ہم پر برتری کیوں دی گئی اور کیوں انہیں ایسا اور ویسا قرار دیا گیا؟ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے کسی ایک فرد کو دوسرے پر برتری نہیں دی، اس نے سب کو پیدا کیا اور سب کو وہی فطرت عطا کی جس کے ذریعے یہ اہلیت موجود تھی کہ سب کے سب، بہترین مخلوق کی طرح اور پہلے جواب دینے والے کی طرح بن سکتے تھے، لیکن انہوں نے انکار کیا اور اپنی طرف دیکھا، اور وہ سب اللہ پاک سے غافل ہو گئے اور اپنی ذات اور اپنی انا کی طرف متوجہ ہو گئے، اور ان میں سے ہر ایک نے کسی نہ کسی حد تک (میں) کہا، اور وہ پہلے جواب دینے والوں کی مانند نہ رہے جنہوں نے کہا تھا: (ھو = وہ)، اور ان میں سے ہر ایک نے جتنی مقدار میں اپنی انا سے رو گردانی کی، اسی مقدار میں ان بلند مقامات کو حاصل کیا۔

اس دنیاوی زندگی میں جس میں ہم موجود ہیں، موضوع (أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قالُوا بَلَى) (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں) واقع ہو چکا ہے اور واقع ہوتا ہے اور واقع ہوتا رہے گا، اور اس دنیاوی زندگی کے اختتام تک جاری رہے گا۔ یہاں ایک ہستی ہے جس نے ہمیں پیدا کیا اور ہمیں اس مادی، جسمانی اور تاریک عالم میں بھیجا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیں پکارتا اور بلاتا رہتا ہے اور ہم سب کو وہی فطرت اور صلاحیتیں عطا کی ہیں تاکہ ہم اس کی بات سنیں اور اس کی طرف بڑھیں۔ اس طرف جو نور اور پاکیزگی ہے۔ لیکن بہت ہی کم لوگ اس کی نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں اور اس کی پکار پر لبیک کہتے ہیں اور (ھو) کہتے ہیں اور اپنی اَنا سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ وہ حقیقتاً بہت کم ہیں، بالکل اسی طرح جیسے تاریک آسمان میں ستارے کم ہوتے ہیں۔ وہی انبیاء اور اوصیاء اور بھیجے گئے رسول ہیں۔ (وَ قَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ)[1] (اور میرے بندوں میں شکر گزار بہت ہی کم

گئے تو آگ ان پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو گئی، تب اصحابِ شمال نے کہا: اے ہمارے پروردگار! ہمیں معاف فرما اور دوبارہ حکم دے، فرمایا: میں نے دوبارہ حکم دیا، جاؤ اور داخل ہو جاؤ، پھر بھی وہ ڈر گئے، اسی مقام پر اطاعت اور ولایت اور معصیت ثابت ہو گئی)۔ (الکافی، کلینی، جلد 2، ص 8)

[1] . قرآنِ کریم، سورۂ سبأ، آیت 13۔

ہیں)۔ اور افسوس کہ بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ کی پکار سے منہ موڑ لیتے ہیں اور اس کی ان نعمتوں پر، جو شمار سے باہر ہیں اور اس کی مخلوقات میں ظاہر ہوتی ہیں، شکر ادا نہیں کرتے۔ نتیجتاً وہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاتے ہیں اور اپنی اَنا میں مشغول ہو جاتے ہیں اور یہ دنیاوی زندگی انہیں مشغول کر لیتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت مداخلت کرتی ہے اور ایسے افراد کو بھیجتی ہے جنہوں نے اس کی آواز سنی ہے اور اس کی پکار پر لبیک کہہ کر نجات پائی ہے، تاکہ وہ غافلوں کو یاد دہانی کرائیں، شاید وہ متوجہ ہو جائیں۔ لیکن افسوس کہ پھر بھی ان کی بات کا جواب دینے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان پر بخشش فرمائی ہے اور دوا بھی ان کے ساتھ بھیجی ہے، اور ممکن ہے کہ اس کے بھیجنے کو مراحل کے ساتھ مقرر کیا ہو۔

خداوند سبحان کی صفات کے بارے میں عقیدہ

اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت، یعنی اس کا کُنہ اور حقیقت (ھو)، وہی مطلق لاہوت ہے؛ اس لیے کہ آفرینش کی علت ہی شناخت یا معرفت ہے، اور چونکہ ناقص موجود کے لیے معرفت، کمال کے حصول تک محدود ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کا ان کے لیے کمالِ مطلق یا مطلق لاہوت کے ساتھ تجلّی کرنا لازمی ہے تاکہ مطلوب، جو کہ معرفت ہے، تحقق پذیر ہو۔ نام (اللہ) جو مطلق لاہوت پر اطلاق کیا جاتا ہے، مشتق ہے، اور اس کا ذاتِ الٰہی کے ساتھ خاص ہونا اسی کے استعمال اور رواج کی وجہ سے ہے۔[1] اس کی مثال نام (رحمان) کی مانند ہے۔

یہ صفت یا یہ نام، ایسی صفات رکھتا ہے جو درحقیقت وہ کمالات ہیں جن کا ہم صرف ایک حصہ ہی ادراک کرتے ہیں، اور وہ بھی اس وجہ سے کہ ان صفات کا تجلّی ہم میں ہوتا ہے یا ان صفات کا تجلّی ایسے فرد میں ہوتا ہے جو ہم سے برتر ہوتا ہے، اور اس لیے بھی کہ وہ صفت، ہمارے نقص اور فقر کے مقابلے میں کمال اور بے نیازیِ

---

[1] . لفظ «اللہ» بغیر کسی قید کے صرف ذاتِ الٰہی کے لیے استعمال ہوتا ہے؛ لیکن اگر کلام کے سیاق میں کوئی قید آ جائے تو اس لفظ کو ذاتِ الٰہی کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اس صورت میں یہ لفظ اپنی اصل کی طرف لوٹ آتا ہے جو کہ اسمِ مشتق اور صفت ہے۔ مثلاً جملہ «میں نے دیکھا کہ اللہ چل رہا ہے» سے یہ مراد نہیں لی جا سکتی کہ اس سے اللہ تعالیٰ مقصود ہے۔ اسی طرح آیت (هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ) (سورۂ بقرہ، آیت 210) (کیا وہ اس کے سوا کسی چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بادلوں کے سائے میں اور فرشتے ان کے پاس آ جائیں اور فیصلہ کر دیا جائے، اور تمام امور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں) سے بھی یہ مراد نہیں لی جا سکتی کہ اس سے اللہ تعالیٰ مقصود ہے، کیونکہ یہاں اللہ کو آنے کے ساتھ مقید کیا گیا ہے، وہ بھی سفید بادلوں کے سایوں میں، جبکہ اللہ تعالیٰ نہ صرف ان جسمانی اوصاف سے بلند ہے بلکہ ہر حد اور قید سے منزہ ہے۔

مطلق ہے۔ یہ صفات انسان میں ظاہر ہوتی ہیں، اس لیے کہ انسان کو خداوند کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی انسان مخلوقات میں لاہوت کا تجلّی ہے، اور انسان کی فطرت اسے یہ صلاحیت دیتی ہے کہ مخلوق میں اللہ بن جائے۔

محمد (ص) نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا)[1]

عہدِ قدیم میں آیا ہے:

(اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم انسان کو اپنی صورت پر اور اپنی مشابہت پر بنائیں گے)[2]

(اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی ہی صورت اور تصویر پر پیدا کیا، اسے اللہ تعالیٰ کی صورت پر پیدا کیا)[3]

یہی وہ صورت ہے جو پیدا کی گئی ہے، اور اس سے مراد محمد (ص) ہیں جو مخلوقات میں لاہوت کا تجلّی ہیں، اور انسانِ اوّل، لاہوت اور مخلوقات کے درمیان برزخ اور واسطہ ہے۔

محمد بن مسلم بیان کرتے ہیں: میں نے امام باقر (ع) سے روایت (اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا) کے بارے میں سوال کیا۔ آپ (ع) نے فرمایا: (وہ صورت اور تصویر ایجاد کی گئی اور مخلوق تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے اسے منتخب فرمایا اور مختلف صورتوں میں سے اسے چن لیا اور اسے اپنی طرف منسوب کیا، جس طرح اس نے کعبہ اور روح کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: « بیتی» (میرا گھر) اور (وَ نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي) (اور میں نے اس میں اپنی روح میں سے پھونک دی))[4]

لہٰذا صفاتِ لاہوت، جیسے رحمت، علم، قدرت، زندگی، قائم بالذات ہونا وغیرہ، جب ہم ان صفات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ صفات مطلق ہیں؛ یعنی رحمتِ مطلق، علمِ مطلق، قدرتِ مطلق وغیرہ، اور ان صفات کے لیے کوئی ذاتی یا خارجی قید اور حد موجود نہیں۔ ان صفات کے بارے میں ہماری معرفت، اللہ تعالیٰ کی طرف ہماری توجہ اور ان صفات کے ہم میں ہونے والے تجلّی کے مطابق ہوتی ہے۔

یہ صفات ہم میں مطلق نہیں ہو سکتیں، بلکہ ہماری کمی، حاجت اور فقر کے سبب، اور مجموعی طور پر ہماری ظلمت اور تاریکی کے ساتھ محدود ہو جاتی ہیں۔ ہماری زندگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اسی پر قائم ہے۔ اور

---

1. کافی، کلینی، جلد 1، ص 134؛ توحید، صدوق، ص 103۔
2. عہدِ قدیم، سفر پیدائش، باب اوّل۔
3. عہدِ قدیم، سفر پیدائش، باب اوّل۔
4. کافی، کلینی، جلد 1، ص 134؛ توحید، صدوق، ص 103۔

ہماری رحمت جہاں کہیں پہنچے، وہ کامل نہیں ہوتی بلکہ ہماری کمی کے ساتھ محدود رہتی ہے۔ اسی طرح ہمارا علم اور ہماری قدرت بھی ہمارے فقر اور اللہ تعالیٰ کے محتاج ہونے کے ساتھ مقید ہے۔

انسان زندہ ہے اور اپنے ساتھ موت اور فنا، یا ظلمت اور تاریکی کو لیے ہوئے ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ایسا زندہ ہے جو موت یا ظلمت اور تاریکی کو اپنے ساتھ نہیں رکھتا۔ وہ ایسا زندہ ہے جو مرتا نہیں، کیونکہ وہ ایسا نور ہے جس میں کوئی ظلمت اور تاریکی نہیں۔ لیکن انسان جانتا بھی ہے اور نادانی بھی رکھتا ہے، اس لیے کہ وہ ظلمت اور تاریکی کے ساتھ مخلوط ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور اس میں کوئی نادانی نہیں، اس لیے کہ وہ ایسا نور ہے جس میں ظلمت اور تاریکی کو کوئی راہ نہیں۔ انسان بعض امور پر قدرت رکھتا ہے اور بعض دوسرے امور میں ناتوان ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ایسا قادر ہے جو ناتوان نہیں ہوتا، کیونکہ وہ ایسا نور ہے جس میں ظلمت اور تاریکی نہیں۔

کتابِ توحید میں میں نے اُن صفات کو بیان کیا ہے جن کی شناخت کا امکان موجود ہے:

جو کچھ گزر چکا اس کے مطابق یہ بات روشن ہو گئی کہ توحید تسبیح میں ہے، نہ کہ وصف میں؛ [1] یعنی حقیقی توحید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے کنہ اور حقیقت تک رسائی اور شناخت سے منزہ قرار دیا جائے، اور یہ کہ اللہ کی معرفت کی انتہا دراصل اس کی معرفت تک پہنچنے سے عاجزی اور ناتوانی کا ادراک ہے۔ لہٰذا انسان صفات یا اسماءِ ذاتیِ کمال میں سے جو کچھ حاصل کرتا ہے اس کی غایت اس درجے کی معرفت تک پہنچنا ہے، یعنی معرفت تک پہنچنے سے عاجزی اور ناتوانی کی معرفت، اور اسی (شناخت) کے درمیان سے انسان پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حقیقی توحید تسبیح میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ * إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ)[2] (اللہ تعالیٰ پاک ہے اُن باتوں سے جو وہ بیان کرتے ہیں، سوائے اللہ کے خالص کیے ہوئے بندوں کے)؛ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کے مُخلَص بندے جانتے ہیں کہ صفات درحقیقت نقص سے تنزیہ، یا تسبیح و تقدیس ہی کی طرف لوٹتی ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ ہر قسم کے نقص اور عیب سے پاک ہے، اور دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ ایسا نور ہے جس میں کوئی ظلمت نہیں۔

---

[1] . جیسا کہ «صمد» کی توضیح میں بیان کیا گیا ہے کہ ذات کے لیے تنزیہ اور تسبیح، اور اس کے کمالِ مطلق کا بیان، اس سے ہر طرح کے نقص کی نفی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

[2] . قرآنِ کریم، سورۂ صافات، آیات 159 اور 160۔

امام ابو عبداللہ (ع) سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ ایسا علم ہے جس میں جہل کی کوئی راہ نہیں، اور ایسی حیات ہے جس میں موت کی کوئی راہ نہیں، اور ایسا نور ہے جس میں ظلمت کی کوئی راہ نہیں)[1] یونس بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں: میں نے ابوالحسن رضا (ع) کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم تک یہ روایت پہنچی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا علم ہے جس میں جہل نہیں، اور ایسی حیات ہے جس میں موت نہیں، اور ایسا نور ہے جس میں ظلمت نہیں۔ حضرت نے فرمایا: (وہ اسی طرح ہے)[2]

حقیقت یہ ہے کہ لاہوت کو پہچاننے میں (ہماری ناتوانی کی شناخت)، وہ چیز ہے جو ہمارے لیے ممکن اور قابلِ حصول ہے، اور اسی کے ذریعے ہم اس امر کا ادراک کرتے ہیں کہ ہم حقیقی معرفت تک رسائی سے عاجز ہیں، کیونکہ ہم خداوندِ سبحان کی حقیقت کی معرفت میں اپنی ناتوانی تک نہیں پہنچ سکتے، مگر اس شناخت کے ذریعے کہ ہم مطلق لاہوت کی معرفت سے عاجز ہیں۔ یہ مسئلہ اس بناپر ہے کہ مطلق لاہوت ہمارے سامنے اور بالمقابل ہے اور ہمارے حال و احوال سے مناسبت بھی رکھتا ہے، اور ہم اس کی معرفت کے میدان میں اُس نقص کے ذریعے غوطہ زن ہو سکتے ہیں جسے ہم پہچانتے ہیں،[3] کیونکہ مطلق لاہوت ہی وہ مطلق کمال ہے جس کی طرف ہم اپنی کمی کو دور کرنے کے لیے متوجہ ہوتے ہیں، لیکن کیامثال کے طور پر یہ ممکن ہے کہ ہم مطلق رحمت کی معرفت میں اپنی ناتوانی کو پہچان لیں، بغیر اس کے کہ ہمیں یہ معلوم ہی نہ ہو کہ رحمت کیا ہے؟ اس کا قطعی جواب یہ ہے: نہیں۔

لہٰذا ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم رحمتِ مطلق (یا خدایِ رحمان و رحیم) کی معرفت تک پہنچنے میں اپنی ناتوانی کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ جانیں کہ رحمت کیا ہے۔ جتنی وہ رحمت جس کے بارے میں ہم نے شناخت حاصل کی ہے بڑی ہو گی، اور جتنی ہماری اس کے بارے میں شناخت عظیم ہو گی، اتنی ہی رحمتِ مطلق کی معرفت سے ہماری ناتوانی کی شناخت بھی بڑی ہو جائے گی؛ اور اس کے نتیجے میں اُس حقیقت کی معرفت سے ہماری ناتوانی کا ادراک بھی زیادہ عظیم ہو جائے گا جس کے ذریعے ہم رحمتِ مطلق کے مقابل آتے ہیں۔ رحمتِ مطلق کی شناخت، مخلوق میں اس کی تجلّی کے ذریعے انجام پاتی ہے، اور لاہوتِ مطلق کی شناخت بھی اسی طرح ہے، یعنی

---

1. توحید، شیخ صدوق، ص 137۔
2. توحید، شیخ صدوق، ص 138۔
3. امام صادق (ع) فرماتے ہیں: (العبودية جوهرٌ كُنهُها الربوبية) (بندگی ایک ایسا گوہر ہے جس کی گہرائی ربوبیت ہے)۔ (مصباح الشریعۃ، ص 7؛ تفسیر صافی، ج 6، ص 348، معمولی اختلاف کے ساتھ)۔

مخلوق میں اس کی تجلی کے ذریعے انجام پاتی ہے؛ اسی طرح حقیقت کی شناخت بھی لاہوتِ مطلق کی شناخت کے ذریعے ممکن ہوتی ہے۔

لہٰذا ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ ہم زمین میں خدا کے جانشینوں کو پہچانیں اور ان کے بارے میں معرفت حاصل کریں، کیونکہ یہی مخلوق میں خدا کی تجلی ہیں، اور ان کی معرفت کے ذریعے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے، یعنی اس کی معرفت سے عاجزی کا ادراک پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد حقیقت کی معرفت سے عاجزی پہچانی اور جانی جاتی ہے، اور یہی وہ توحید ہے جو فرزندِ آدم سے مطلوب ہے؛ اور یہی انبیاء اور رسولوں کی بعثت کی حقیقی دلیل اور اصل راز ہے؛ یعنی ان کی بعثت لازم اور ضروری ہے، کیونکہ معرفت انہی کے ذریعے اور انہی کے واسطے سے حاصل ہوتی ہے۔

یہاں حقیقتِ توحید پوشیدہ رہتی ہے؛ اور وہ یہ کہ: خداوندِ سبحان و متعال نے اپنی مخلوق پر لاہوتِ مطلق کے ساتھ تجلی فرمائی ہے تاکہ وہ صرف اسی کو پہچانیں، اور اس کام کو مخلوق کی حالت اور کیفیت کے مطابق انجام دیا ہے؛ کیونکہ وہ فقیر اور محتاج مخلوقات ہیں اور اپنی کمی کو دور کرنے کے لیے غنیِ مطلق کی طرف رجوع کرتی ہیں؛ یعنی لاہوت، حقیقت نہیں بلکہ حقیقت کی وہ صورت ہے جو مخلوق کے مناسبِ حال ہے؛ اور در حقیقت خداوندِ سبحان و متعال کا ظہور ہمارے لیے ہے تاکہ ہم اسے پہچان سکیں۔ لہٰذا لاہوت، حقیقت نہیں بلکہ حقیقت تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ البتہ اس بات کا یہ مطلب نہیں کہ لاہوتِ مطلق خداوندِ متعال کے سوا کوئی اور چیز ہے؛ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر مخلوقات موجود نہ ہوتیں تو لاہوت نام کی کوئی چیز بھی موجود نہ ہوتی۔ خداوندِ تعالی ہمارے لیے لاہوت ہے کیونکہ ہم فقیر ہیں اور ہمیں اپنی کمی اور ضرورت کے پورا ہونے کی حاجت ہے؛ لہٰذا ہم اس کی ذاتِ سبحان و متعال کی طرف رخ کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، مخلوق کے لیے خداوندِ سبحان کی لاہوتِ مطلق کے ساتھ تجلی، اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کا مخلوق کے لیے ظہور، ان کی حالت کے تقاضے کے مطابق ہو؛ یعنی لاہوت، حقیقت کو حقیقی اور کامل طور پر آشکار کرنے والا نہیں ہے بلکہ لاہوت، صرف حقیقت کی پہچان کروانے والا ہے، وہ بھی مخلوقات کی حالت اور ضرورت کے مطابق۔

ابنِ سنان بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام رضا (ع) سے پوچھا: (کیا خداوندِ عزوجل مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے اپنی ذات کا عارف تھا؟) آپ نے فرمایا: (ہاں)۔ میں نے عرض کیا: (کیا وہ اسے دیکھتا اور سنتا تھا؟) آپ نے فرمایا: (اسے اس کی کوئی ضرورت نہ تھی؛ کیونکہ نہ اس کے بارے میں کوئی سوال تھا اور نہ کوئی درخواست، وہ

خود ہی تھا اور وہی خود تھا، اس کی قدرت نافذ تھی؛ لہٰذا وہ اس بات سے بے نیاز تھا کہ اپنی ذات کا نام لے۔ لیکن اس نے اپنے لیے نام اختیار کیے تاکہ دوسرے لوگ انہی ناموں کے ذریعے اسے پکاریں؛ کیونکہ اگر اسے اس کے نام سے نہ پکارا جاتا تو وہ پہچانا نہ جاتا۔ اور پہلا نام جو اس نے اپنے لیے اختیار کیا (علی عظیم) تھا، کیونکہ وہ ہر چیز سے برتر ہے؛ اس کا معنی (اللہ) ہے، اور اس کا نام (علی عظیم) ہے، جو اس کے اولین ناموں میں سے ہے کہ وہ ہر چیز سے برتر ہے)[1]

پہلے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ہشام بن حکم کہتے ہیں کہ میں نے امام صادق (ع) سے خدا کے ناموں اور ان کے اشتقاق کے بارے میں سوال کیا کہ (اللہ) کس سے مشتق ہے؟ حضرت (ع) نے فرمایا: (اے ہشام! اللہ (اِلٰہ) سے مشتق ہے، اور اِلٰہ کے لیے ایک مألوہ (یعنی عبادت کیا جانے والا) ہونا لازم ہے، اور نام، نام والے کے سوا ہوتا ہے۔ پس جو شخص نام کی عبادت کرے بغیر نام والے کے، وہ یقینا کافر ہے اور اس نے کسی چیز کی عبادت نہیں کی؛ اور جو نام اور نام والے دونوں کی عبادت کرے، اس نے شرک کیا اور دو چیزوں کی عبادت کی؛ اور جو نام والے (معنی) کی عبادت کرے نہ کہ نام کی، تو یہی توحید ہے)[2]

روایات میں ائمہ (ع) کا کلام بالکل واضح طور پر بیان ہوا ہے؛ بس انسان کو چاہیے کہ امام رضا (ع) کے اس فرمان میں کچھ دیر تدبر اور غور کرے: (اس کی قدرت نافذ تھی، لہٰذا وہ اس بات سے بے نیاز تھا کہ اپنی ذات کا نام لے، لیکن اس نے اپنے لیے نام منتخب کیے تاکہ دوسرے لوگ انہی ناموں کے ذریعے اسے پکاریں؛ کیونکہ اگر اسے اس کے نام سے نہ پکارا جاتا تو وہ پہچانا نہ جاتا)۔ اور اسی طرح امام صادق (ع) کے اس قول میں بھی کہ آپ نے فرمایا: (اے ہشام! اللہ (اِلٰہ) سے مشتق ہے، اور اِلٰہ کے لیے ایک مألوہ، (یعنی عبادت کیا جانے والا) ہونا لازم ہے)۔

مزید وضاحت کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ خداوندِ سبحان و متعال کی کامل اور حقیقی معرفت تک اس کی صفات کے ذریعے پہنچنا ناممکن ہے، اور اس کی دو وجوہ ہیں:

پہلی: تمام الٰہی صفات، بلکہ ان سب کی جامع یعنی لاہوت (اللہ)، محض وہ صورت ہے جس کے ذریعے خدا ہمارے سامنے جلوہ گر ہوا ہے، ایسے انداز میں جو ہمارے حال کے مطابق ہے۔ لہٰذا لاہوت حقیقت نہیں بلکہ حقیقی

---

[1] .کافی، کلینی، ج1، ص113۔

[2] . کافی، کلینی، ج1، ص87، ح2۔

معرفت تک پہنچنے کا ایک راستہ ہے؛ اس لیے لاہوت پر ٹھہر جانا اور (اس کی معرفت) کو ہی (حقیقت کی معرفت) سمجھ لینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص منزل کی طرف جانے والے راستے کے بیچ میں کھڑا ہو جائے اور یہ دعویٰ کرے کہ وہ مقصد تک پہنچ گیا ہے۔

دوسری: جب صفات کو خداوندِ سبحان و متعال کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ مطلق ہو جاتی ہیں، پس غیر مطلق کس طرح مطلق کے بارے میں کامل معرفت حاصل کر سکتا ہے، جبکہ کامل معرفت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس شے پر احاطہ حاصل کرے اور اس پر پوری طرح محیط ہو جائے؛ اور کسی چیز پر احاطہ حاصل کرنا ممکن نہیں، مگر اس کے لیے جو اس سے برتر اور بلند ہو یا کم از کم اس کے برابر ہو۔ لہٰذا صفاتِ الٰہی کی کامل شناخت کا دعویٰ کرنا، مطلق لاہوت کے متعدد ہونے کے دعوے کے مانند ہے، اور اسی طرح پہچاننے والے کو، جو کہ مخلوق ہے، مطلق لاہوت قرار دینے کے مترادف ہے، اور یہ بات باطل ہے۔

لہٰذا ہم صفات کے بارے میں جس قدر پہچان اور معرفت حاصل کر سکتے ہیں، وہ ان کی مخلوق میں ظاہر ہونے والی تجلیات ہی ہیں، اور یقیناً صفات کی سب سے قریب اور نزدیک ترین تجلیات، مخلوق پر اللہ کی حجتیں اور اس کی زمین میں اس کے جانشین ہوتے ہیں۔[1]

اگر مثال کے طور پر ہم صفتِ رحمت کو پیشِ نظر رکھیں اور یہ چاہیں کہ رحمت کے بارے میں ہر ممکن چیز جان لیں، تو ہم اس مقصد تک انبیاء اور اوصیاء (ع) کے دیگر انسانوں کے ساتھ تعلق اور ان کے طرزِ تعامل (برتاؤ) کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔ اگر ہم اس تعلق کو ہر ایک نبی اور وصی (ع) کی حالت کے مطابق 80 سے 99 فیصد کے درمیان فرض کریں، (ہمیں یہ جان لینا چاہیے) کہ انبیاء اور اوصیاء (ع) میں سے کسی ایک میں بھی یہ درجہ سو فیصد تک نہیں پہنچتا، کیونکہ ایسی صورت میں جس کے پاس ایسی صفت ہو وہ شخص کاملِ بے نقص اور بے فقر غنا کا حامل ہوگا، یعنی وہ ایسا نور ہوگا جس میں کسی قسم کی ظلمت نہ ہو، اور ایسا صرف خداوندِ سبحان ہی ہو سکتا ہے، نہ کہ اس کی مخلوق؛ لہٰذا رحمت کے بارے میں ہماری معرفت جہاں تک بھی پہنچے، وہ پھر بھی ناتمام ہی رہتی ہے، اور آخر کار ہم جس چیز تک پہنچتے ہیں وہ رحمتِ مطلق کی معرفت سے اپنی ناتوانی کی شناخت ہی ہوتی ہے۔

---

[1]. جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے: ان کی بعثت لازم اور ضروری ہے، کیونکہ معرفت انہی کے ذریعے اور انہی کے واسطے سے حاصل ہوتی ہے۔

اور اس کا مطلب مختصراً یہ ہے کہ یہ ایسی شناخت ہے جو نقص کی نفی پر قائم ہے،[1] یعنی یہ وہ معرفت ہے جو تنزیہ یا تسبیح پر قائم ہوتی ہے، اور اسی وجہ سے میں نے کہا اور وضاحت کی کہ توحید تسبیح میں ہے، نہ کہ وصف میں۔

اسی طرح یہ معرفت ان تمام مخلوقات کے لیے بھی ہے جو اللہ کے زمین میں خلفاء کے ساتھ ارتباط رکھتی ہیں۔ انہی کے ذریعے اللہ پہچانا جاتا ہے اور توحید کا تحقق ہوتا ہے، اور انہی کی رحمت کے ذریعے رحمتِ مطلقہ پہچانی جاتی ہے، اور مخلوق میں ان کی ربوبیت کے ذریعے ربوبیتِ مطلقہ پہچانی جاتی ہے، اور مخلوق میں ان کے لاہوت کے ذریعے لاہوتِ مطلق، سبحانہ و تعالیٰ پہچانا جاتا ہے، اور ان کے بغیر باقی مخلوقات کے لیے نہ کوئی معرفت باقی رہتی ہے اور نہ کوئی توحید۔

لہٰذا توحید کا اللہ کے جانشینوں کے ساتھ گہرا اور مضبوط تعلق ہے، اور اگر ہم اس معاملے کو مزید باریک بینی سے دیکھیں تو، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ اگر مخلوقِ اول یا عقلِ اول یا حضرت محمد (ص) جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو مخلوقات کے لیے پہچنوایا، موجود نہ ہوتے تو باقی انسانوں کے لیے معرفت اور توحید کا حاصل ہونا ناممکن ہو جاتا۔

عبدالسلام بن ہروی سے، امام رضا (ع) سے، ان کے والد موسیٰ بن جعفر (ع) سے، ان کے والد جعفر بن محمد (ع) سے، ان کے والد محمد بن علی (ع) سے، ان کے والد علی بن حسین (ع) سے، ان کے والد حسین بن علی (ع) سے، اور ان کے والد علی بن ابی طالب (ع) سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسولِ خدا (ص) نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی مخلوق پیدا نہیں کی جو مجھ سے بہتر ہو اور جو اس کے نزدیک مجھ سے زیادہ معزز ہو)۔ علی (ع) کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ اکرم (ص) سے عرض کیا: (اے رسولِ خدا، آپ بہتر ہیں یا جبرئیل؟) آپ نے فرمایا: (اے علی! اللہ تبارک و تعالیٰ نے بھیجے گئے انبیاء کو مقرب فرشتوں پر فضیلت دی ہے،

---

[1] . اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ عدل، ظلم کے مقابل ہے، اور یہ بھی فرض کریں کہ زمین میں خدا کے جانشینوں میں سے کسی ایک میں عدل 99 فیصد ہو، تو باقی رہ جانے والا 1 فیصد وہ ظلم ہوگا جو اس کے وجود کے صفحے میں موجود ہے، اور اگر ہم اس خلیفہ کی کامل شناخت حاصل کر لیں تو ہم 99 فیصد عدل کو بھی پہچان لیں گے اور اس کے وجود کے صفحے میں موجود ظلم کو بھی جان لیں گے۔ اب اگر ہم اپنی اسی شناخت پر بھروسا کرتے ہوئے عدلِ مطلق کو بیان کرنا چاہیں تو ہم ایسا نہیں کر سکتے اور عدلِ مطلق کے بارے میں بات نہیں کر سکتے، مگر یہ کہ وہ ایسا عدل ہے جس میں کسی قسم کا ظلم داخل نہیں ہو سکتا؛ دوسرے لفظوں میں ہم اپنی شناخت کی بنیاد پر عدلِ مطلق کے بارے میں صرف اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ عدلِ مطلق کے میدان سے ظلم کی نفی کر دیں، اور یہی ظلم کی نفی پوری وضاحت کے ساتھ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ہم عدلِ مطلق کی معرفت سے عاجز ہیں۔

اور مجھے تمام انبیاء اور رسولوں پر برتری عطا فرمائی ہے، اور اس کے بعد، اے علی! برتری تمہاری اور تمہارے بعد آنے والے اماموں کی ہے، اور فرشتے ہمارے خادم ہیں اور ہمارے دوستوں کے بھی خادم ہیں۔ اے علی! عرش کو اٹھانے والے اور وہ جو عرش کے گرد ہیں، ہماری ولایت کے سبب اپنے پروردگار کی حمد کرتے ہیں اور مؤمنوں کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اے علی! اگر ہم نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ آدم و حوا و جنت و جہنم و آسمان اور زمین کو پیدا نہ فرماتا، اور ہم فرشتوں سے برتر کیسے نہ ہوں جبکہ ہم نے اپنے پروردگار کی توحید و معرفت، اور اس کی تسبیح و تقدیس اور اس کی تہلیل میں ان پر سبقت حاصل کی ہے، کیونکہ سب سے پہلی چیز جسے اللہ عزوجل نے پیدا فرمایا وہ ہماری ارواح تھیں، لہٰذا اس نے ہمیں اپنی توحید اور اپنی حمد بیان کرنے والا بنا دیا؛ پھر اس نے فرشتوں کو پیدا فرمایا، اور جب انہوں نے ہماری ارواح کو اس حال میں دیکھا کہ وہ ایک ہی نور تھیں تو انہوں نے ہمارے مقام کو عظیم جانا؛ ہم نے تسبیح کی تاکہ فرشتے جان لیں کہ ہم پیدا کی گئی مخلوقات ہیں اور اللہ تعالیٰ ہماری صفات سے منزہ ہے، چنانچہ فرشتوں نے ہماری تسبیح کے ساتھ تسبیح کی اور اللہ کو ہماری صفات سے پاک و منزہ جانا۔ جب فرشتوں نے ہمارے شان کی بزرگی دیکھی تو انہوں نے ہماری تہلیل کی، ہم نے تہلیل کی تاکہ فرشتے جان لیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (لا الہ الا اللہ)، اور یہ بھی جان لیں کہ ہم چھوٹے بندے ہیں، نہ کہ ایسے خدا جن کی اس کے ساتھ یا اس کے برابر عبادت کی جائے، پس انہوں نے کہا: (لا الہ الا اللہ)؛ اور جب انہوں نے ہمارے مرتبے کی عظمت کو دیکھا تو ہم نے اللہ کی تکبیر کہی تاکہ فرشتے جان لیں کہ اللہ اس سے کہیں بڑا ہے (اللہ اکبر) کہ بزرگی اور عظمت (کی نسبت) اس کے سوا، کسی اور کے لیے سزاوار نہیں؛ اور جب انہوں نے وہ عزت اور قوت دیکھی جو اللہ نے ہمیں عطا فرمائی تھی تو ہم نے کہا: (لا حول ولا قوۃ الا باللہ)، تاکہ فرشتے جان لیں کہ ہمارے پاس کوئی قوت اور طاقت نہیں مگر اللہ کے وسیلے سے؛ اور جب انہوں نے اس نعمت کو دیکھا جو خداوند نے ہمیں عطا کی تھی اور اسے ہمارے لیے طاعت اور عبادت کے واجب کرنے کے مقابل واجب قرار دیا تھا تو ہم نے کہا: (الحمد للہ)، تاکہ فرشتے جان لیں کہ اللہ کے ان نعمتوں کے مقابلے میں جو اس نے ہمیں عطا فرمائی ہیں، اس کے حقوق ہیں، اور فرشتوں نے بھی کہا: (الحمد للہ)؛ لہٰذا ہمارے ہی وسیلے سے وہ اللہ تعالیٰ کی توحید کی معرفت، اور اس کی تسبیح و تہلیل و تحمید اور تمجید کی طرف رہنمائی پائے۔

پھر بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ نے آدم (ع) کو پیدا کیا، پس ہمیں ان کی صلب میں رکھا، اور فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ ان کے لیے سجدہ کریں، ہماری تعظیم اور اکرام کے لیے، اور ان کا سجدہ اللہ عزوجل کے لیے عبادت تھا اور

آدم کے لیے اکرام، اور یہ اس لیے تھا کہ ہم ان کی صلب میں تھے۔ ہم فرشتوں سے برتر کیوں نہ ہوں جبکہ ان سب نے آدم کو سجدہ کیا۔ اور جب مجھے آسمانوں کی طرف معراج پر لے جایا گیا تو جبرئیل نے دو دو مرتبہ اذان اور اقامت کہی، پھر کہا: اے محمد، آگے بڑھیں۔ میں نے کہا: اے جبرئیل! کیا میں آپ پر سبقت لے جاؤں؟ اس نے کہا: ہاں، کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو، اور بالخصوص آپ کو، تمام فرشتوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ پھر میں آگے بڑھا اور میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی، حالانکہ یہ کسی فخر کا سبب نہیں ہے، اور جب میں نور کے حجابات کو طے کر چکا تو جبرئیل (ع) نے کہا: اے محمد، آگے بڑھیں، اور وہ مجھ سے پیچھے رہ گئے۔ میں نے کہا: اے جبرئیل! کیا تم اس مقام پر مجھ سے جدا ہو جاتے ہو؟ اس نے کہا: اے محمد، یہی وہ آخری حد ہے جو اللہ تعالیٰ نے میرے لیے مقرر فرمائی ہے، اور اگر میں اس سے آگے بڑھوں تو ان حدود سے تجاوز کی وجہ سے جو میرے بزرگ پروردگار نے مقرر فرمائی ہیں، میرے پر جل جائیں گے۔

میں شدید نور میں ڈال دیا گیا، یہاں تک کہ وہاں تک پہنچا جہاں تک اللہ تعالیٰ نے اپنی ملکوت میں میرے لیے ارادہ فرمایا تھا، پھر ندا آئی: اے محمد، میں نے کہا: لبیک و سعدیک، اے میرے پروردگار! تو بابرکت ہے اور بلند و برتر ہے (تبارکتُ و تعالیتُ)۔ ندا آئی: اے محمد، تم میرے بندے ہو اور میں تمہارا پروردگار ہوں؛ لہٰذا صرف میری عبادت کرو اور مجھ ہی پر توکل کرو۔ تم میرے بندوں کے درمیان میرا نور ہو، اور میری طرف سے میری مخلوق کی جانب بھیجے گئے ہو، اور لوگوں پر میری حجت ہو۔ میں نے تمہارے لیے اور اس کے لیے جو تمہاری پیروی کرے میری جنت کو پیدا کیا ہے، اور میری آگ اس کے لیے ہے جو تمہاری مخالفت کرے، اور میں نے تمہارے اوصیاء کے لیے اپنی کرامت کو لازم قرار دیا ہے، اور ان کے شیعوں کے لیے اپنے ثواب کو مقرر کیا ہے۔

میں نے عرض کیا: اے پروردگار! میرے اوصیاء کون ہیں؟ ندا آئی: اے محمد! تمہارے اوصیاء وہ ہیں جن کے نام میرے عرش کے ساق پر لکھے ہوئے ہیں اور میں اس حال میں کہ اپنے پروردگار جل وجلالہ کے حضور تھا، عرش کے ساق کی طرف دیکھا تو مجھے 12 نور نظر آئے، اور ہر نور میں ایک سبز سطر تھی جس پر میرے ہر وصی کا نام لکھا ہوا تھا۔ ان میں سب سے پہلے علی بن ابی طالب (ع) تھے اور ان سب میں آخری میری امت کا مہدی تھا۔ میں نے عرض کیا: اے پروردگار! کیا یہی میرے اوصیاء ہیں؟ ندا آئی: اے محمد! وہ میرے اولیا، دوست، برگزیدہ بندے اور تمہارے بعد مخلوقات پر میری حجتیں ہیں، اور وہی تمہارے اوصیاء اور خلفا ہیں، اور تمہارے بعد بہترین مخلوق ہیں۔ مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم ہے کہ میں انہی کے ذریعے اپنے دین کو غالب کروں گا اور اپنے کلمے

کو بلند فرماؤں گا، اور ان میں سے آخری کے ہاتھوں زمین کو اپنے دشمنوں سے پاک کروں گا، اور مشرق و مغرب زمین کو اس کی ملکیت میں دے دوں گا، اور ہواؤں کو اس کے تابع کر دوں گا، اور سخت سرکشوں کو اس کے آگے رام کر دوں گا، اور اسے ترقی کی سیڑھیوں پر بلند کروں گا، اور اپنے لشکروں کے ذریعے اس کی مدد کروں گا، اور اپنے فرشتوں کے ساتھ اس کی نصرت فرماؤں گا، یہاں تک کہ وہ میری دعوت کو آشکار کرے گا اور لوگ میرے توحید کے گرد جمع ہو جائیں گے، پھر میں اس کی حکومت کو قائم و دائم کر دوں گا، اور قیامت کے دن تک حکومت اور اقتدار کے دنوں کو اپنے اولیا کے درمیان (باری باری) گردش میں رکھوں گا۔[1]،[2]

صفاتِ لاہوت کی تقسیم

اللہ سبحان نے اپنی مخلوقات کے لیے لاہوتِ مطلق یا کمالِ مطلق (اللہ) کے ذریعے تجلّی فرمائی، تاکہ مخلوقات اسے پہچان سکیں۔ لاہوتِ مطلق (اللہ) کے مقام میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اسی لیے وہ ہر طرح کے کمالِ مطلق سے موصوف ہے اور ہر قسم کی کمی سے منزّہ ہے۔ چنانچہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ کمال کی صفات کو صفاتِ ثبوتیہ کہا جائے اور اس کو ہر کمی سے پاک قرار دینے کو صفاتِ سلبیہ کہا جائے۔ یہ سب محض لفظی اصطلاحات ہیں جو ایک معین معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں؛ اصل بات وہی مقصود معنی ہے۔ لیکن اشکال یہ ہے کہ بعض لوگ صفاتِ ثبوتیہ کو صرف تین صفات، یعنی علم، قدرت اور حیات، تک محدود سمجھتے ہیں، یا ان صفات کے لیے کوئی معین تعداد مقرر کرتے ہیں۔ اسی طرح صفاتِ سلبیہ کو بھی کسی خاص اور محدود تعداد میں محصور کرنا محلِّ اشکال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح کے کمالِ مطلق سے موصوف ہے اور ہر قسم کی کمی اور نقص سے منزّہ ہے۔

لیکن صفاتِ فعلیہ کے بارے میں، صفات کو فعلیہ اور ذاتیہ میں تقسیم کرنے کے لیے وہ دو امور کو معیار قرار دیتے ہیں:

پہلا: وہ صفت جس کے ساتھ ممکن ہو کہ اللہ تعالیٰ کی توصیف کی جائے اور اس کے ضد کے ساتھ بھی، وہ صفتِ فعلیہ ہے؛ اس لیے کہ صفتِ ذاتیہ عینِ ذاتِ الٰہی ہوتی ہے اور اس سے جدا نہیں ہوتی، تاکہ یہ امکان ہو کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے ضد کے ساتھ بھی موصوف کیا جائے۔ اس کی مثال ارادہ (یا چاہنا) ہے؛ ممکن ہے کسی

---

1. علل الشرائع، صدوق، جلد 1، ص 5؛ کمال الدین و تمام النعمۃ، شیخ صدوق، ص 255۔
2. کتاب «توحید»۔

معاملے میں اللہ تعالیٰ کو چاہنے کے ساتھ موصوف کیا جائے اور کسی معاملے میں نہ چاہنے کے ساتھ۔ لیکن وہ صفت جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ موصوف ہوتا ہے اور اس کے ضد کے ساتھ موصوف نہیں ہوتا، وہ صفتِ ذاتیہ ہے؛ جیسے علم۔ وہ عالم ہونے کے ساتھ موصوف ہے اور کبھی بھی جاہل ہونے کے ساتھ موصوف نہیں ہوتا۔

دوسرا: ہر وہ صفت جسے جدا طور پر ثابت کرنے کے لیے ذاتِ الٰہی کے علاوہ کسی اور چیز کا فرض کرنا لازم آئے، صفتِ فعلیہ ہے؛ جیسے صفتِ خالق ہونا۔ وہ تخلیق سے پہلے خالق ہونے کے ساتھ موصوف نہیں ہوتا۔ اور ہر وہ صفت جو صرف ذات ہی کے فرض کرنے سے ثابت ہو جائے، صفتِ ذاتیہ ہے؛ جیسے صفتِ حیات۔

یہ اس موضوع کا خلاصہ ہے جس پر اس تقسیم کے لیے اعتماد کیا جاتا ہے۔ درحقیقت بعض صفات کو ان کے نزدیک صفاتِ فعلیہ کہنے کی وجہ اس معنی کی ایک خاص فہم ہے، جس کے مطابق وہ صفت فعل اور عمل سے مربوط ہوتی ہے اور اس کا وجود فعل اور عمل کے وجود کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسی حادث صفات موجود ہوتی ہیں جو فعل اور عمل کے وجود میں آنے کے ساتھ وجود میں آتی ہیں، اور انہیں صفاتِ ذاتیہ نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا صفاتِ فعلیہ وہ صفات ہیں جو ذات کے اعتبار سے اضافی ہوتی ہیں۔ صفات کے معنی کی اس فہم کی بنیاد پر اس بات میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

لیکن یہاں صفاتِ فعلی کے لیے ایک اور معنی اور فہم بھی بیان کیا جاتا ہے جسے ہم بیان کر سکتے ہیں اور جس کے باعث یہ صفات حادث نہ ہوں بلکہ نہ صفاتِ فعلی ہوں اور نہ ذات پر زائد صفات ہوں؛ چنانچہ اس نقطۂ نظر کے مطابق یہ صفات، ذاتیہ ہیں اور اسی ذات سے منشعب ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر صفتِ خالق سے ممکن ہے کہ ہم مخلوقات کے پیدا کرنے کے فعل اور عمل کو سمجھیں، اور اس صورت میں یہ صفت حادث اور فعلیہ قرار پاتی ہے؛ کیونکہ اسے اس کے ضد کے ساتھ بھی بیان کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ خدا خالق نہیں ہے، اور اس سے ہماری مراد مخلوقات کے پیدا کرنے سے پہلے کا مرحلہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے صفتِ فعلیہ کہا جاتا ہے جو ذات کے اعتبار سے اضافی سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ہم اس صفت سے آفرینش کی قدرت کا معنی سمجھیں، جس کے نتیجے میں یہ صفت ذاتیہ بن جاتی ہے اور حادث نہیں رہتی اور اس کے ضد کے ساتھ اس کی توصیف ممکن نہیں ہوتی؛ کیونکہ ایسی صورت میں اس کا معنی یہ ہو جائے گا کہ وہ آفرینش پر قادر نہیں ہے۔ یعنی صفتِ خالق کے بارے میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ صفتِ فعلیہ ہے، اگر اسے فعل اور عمل کی نسبت سے

سمجھا جائے، اور ہم اس کے بارے میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ صفتِ ذاتیہ ہے، اگر اسے ذات کی نسبت سے سمجھا جائے۔ اس میں کوئی اشکال نہیں کہ ایک ہی صفت ایک مرتبہ صفتِ فعلیہ ہو اور دوسری مرتبہ صفتِ ذاتیہ۔

لاہوت کی ذاتی صفات کی عینیت

اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفاتِ ذاتیہ، ذاتِ الٰہی یعنی اللہ ہی کے ساتھ ایک ہیں اور اسی میں سمائی ہوئی ہیں، اس طرح کہ اسماء اور ذات مل کر ایسی حقیقی یکتائی بن جاتی ہیں جس میں کسی قسم کی ترکیب کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ لہٰذا تمام نام اور صفاتِ ذاتیہ ذاتِ الٰہی یا اللہ کے ساتھ حقیقی یکتائی کی صورت میں متحد ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک اور یکتا ہے اور تمام نام اور صفات عینِ ذاتِ الٰہی ہیں ، نہ وہ کوئی ایسی عَرَضی چیزیں ہیں جن کے ذریعے ذات کو بیان کیا جائے اور نہ ہی وہ کوئی ایسے اجزاء ہیں جن سے ذات بنی ہو۔ یہ اسماء اور قدیم ذاتی صفات ایسی الوہیت نہیں ہیں جو اللہ سے جدا ہو؛ کیونکہ اس کی الوہیت ان جہات میں مطلق ہے جن میں وہ جلوہ گر ہے؛ بلکہ وہ ذاتِ الٰہی سے جدا نہیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ تمام اسماء اور صفات عین ذات ہیں۔ اللہ تعالیٰ قادر ہے اور قدرت ہی اس کی ذات ہے، وہ عالم ہے اور علم ہی اس کی ذات ہے، اور اسی طرح باقی تمام صفات بھی۔

توحید کے بلند ترین مرتبے میں یہ معرفت حاصل ہوتی ہے کہ تمام اسماء ذاتِ الٰہی میں سمٹ جاتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ رحمان اور رحیم ہے اور رحمت اس کی ذات ہی ہے، اور وہ قادر ہے اور قدرت اس کی ذات ہی ہے۔

کتاب (توحید) میں ذاتِ لاہوت اور صفاتِ ذاتیہ کے بارے میں اس بات کی وضاحت موجود ہے کہ اسماء اور صفات عینِ ذات ہیں، نیز توحید کے مراتب سے متعلق بھی گفتگو کی گئی ہے۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ جو شخص اس موضوع میں مزید وضاحت کا محتاج ہو، وہ اس کتاب کی طرف رجوع کرے۔

علم کی صفت اور بداء

جب ہم اللہ تعالیٰ کی مطلق لاہوتیت کو ثابت کر چکے ہیں تو کہتے ہیں کہ مطلق لاہوت کا مطلق علم کے ساتھ موصوف ہونا ضروری ہے، ورنہ اگر وہ کسی معاملے میں نادان ہو تو یہ نور اور ظلمت کے جمع ہو جانے کے مترادف ہوگا - کیونکہ نادانی کی وجہ ظلمت، تاریکی یا کمی ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو اس کی مطلق الٰہیت کی نفی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر اس میں نادانی پائی جائے تو وہ اپنے سوا کسی اور کا محتاج ہو جائے گا، اور اس کی مطلق لاہوتیت اس کی حاجت اور محتاجی کے ساتھ باطل ہو جاتی ہے۔

جو کچھ اس نے آفرینش کے عوالم میں ظاہر کیا ہے، وہ اس کے علم ہی کا حصہ ہے، تاکہ وہ جس مخلوق کو چاہے اس کے بارے میں آگاہ کرے۔ یہی لوح محو واِثبات ہے، اور اس میں ہر حادثہ اور واقعہ کے لیے کئی امکانات ہوتے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا وقوع بندے اور اس کے گرد موجود حالات پر منحصر ہوتا ہے۔ جب اس کا وقت آ پہنچتا ہے تو ان میں سے ایک واقع ہو جاتا ہے۔ اگر محو واِثبات نہ ہوتا تو دعا کا وجود ہی باقی نہ رہتا اور اس کا کوئی مطلب نہ ہوتا، سوائے اس کے کہ وہ ایک کھیل بن کر رہ جاتی۔ جو شخص محو و اِثبات کے وجود کو قبول نہیں کرتا، وہ درحقیقت اس بات کا قائل ہے کہ امور اللہ تعالیٰ کے اختیار سے نکل چکے ہیں، یا پھر معاملہ ویسا ہی ہے جیسا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو بیان کیا ہے:

(وَ قالَتِ الْيَهُودُ يدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتْ أَيديهِمْ وَ لُعِنُوا بِما قالُوا بَلْ يداهُ مَبْسُوطَتانِ ينْفِقُ كَيفَ يشاءُ وَ لَيزيدَنَّ كَثيراً مِنْهُمْ ما أُنْزِلَ إِلَيكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْياناً وَ كُفْراً وَ أَلْقَينا بَينَهُمُ الْعَداوَةَ وَ الْبَغْضاءَ إِلى يوْمِ الْقِيامَةِ كُلَّما أَوْقَدُوا ناراً لِلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ وَ يسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَساداً وَ اللَّهُ لا يحِبُّ الْمُفْسِدينَ)[1]

(یہود کہتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ انہی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں، اور جو بات انہوں نے کہی اس کے سبب ان پر لعنت کی گئی۔ بلکہ اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، وہ جیسے چاہے عطا کرتا ہے، اور جو آپ کی طرف آپ کے ربّ کی جانب سے نازل کی گئی ہے یقیناً ان میں سے اکثر لوگوں کو (حسداً) سرکشی اور کفر میں اور بڑھا دے گی اور ہم نے ان کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیا ہے۔ جب بھی وہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اسے بجھا دیتا ہے، اور یہ زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔

ارادہ کی صفت اور جبر اور تفویض

ارادہ کی صفت

اس کا مطلب یہ ہے کہ خداوند ارادہ کرنے والا بھی ہے اور ارادہ نہ کرنے والا بھی۔ اس نے بعض چیزوں کو وجود میں لایا ہے اور اس کے علاوہ کو وجود میں نہیں لایا ہے۔ کسی چیز کے وجود میں آنے یا نہ آنے کا تعین کرنے والا خداوند سبحان و متعال کا ارادہ ہے۔ خداوند سبحان حکم دیتا ہے اور منع کرتا ہے، اور اس کے امر و نہی کا تعین

---

[1] .قرآن کریم، سورۂ مائدہ، آیت 64۔

کرنے والا بھی خداوند سبحان کا ارادہ ہے۔ اس نے جس چیز کو وجود دیا ہے اسے ارادہ کیا ہے، اور جس کا حکم دیا ہے اسے بھی ارادہ کیا ہے، اور جس سے منع کیا ہے اسے ارادہ نہیں کیا ہے۔

نتیجتاً اللہ تعالیٰ کی ارادہ، خارجی دنیا میں اس کے وقوع کے اعتبار سے، اس کے اپنے فعل سے متعلق ہوتی ہے۔ لیکن بندوں کے افعال کے ساتھ اس کے ارادہ کا تعلق، اس لحاظ سے نہیں ہے کہ بندوں کے افعال کا وقوع اللہ تعالیٰ کے ارادہ ہی سے ہو؛ کیونکہ یہ اعمال اور افعال بندوں ہی کے افعال ہیں، اللہ تعالیٰ کے افعال نہیں ہیں۔ خارجی دنیا میں بندوں کے افعال کے وقوع کا تعین کرنے والی چیز، انہی افعال کو انجام دینے والوں یعنی خود بندوں کا ارادہ ہوتا ہے۔

انسان اور اس کے اعمال کے ساتھ ارادۂ الٰہی کا تعلق

پہلا: اللہ تعالیٰ نے انسان کا ارادہ فرمایا ہے، اسی سبب اسے پیدا کیا اور اسے حرکت اور قوت عطا کی۔

دوسرا: اللہ تعالیٰ نے انسان کے بعض اعمال کا ارادہ فرمایا ہے جنہیں انجام دینے کی صلاحیت اس نے اسے دی ہے، اسی سبب اس نے اسے ان کا حکم دیا ہے، اور انسان کے بعض اعمال کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ نہیں فرمایا، حالانکہ ان کو انجام دینے کی صلاحیت بھی اس نے اسے دی ہے، اسی سبب اس نے اسے ان سے منع فرمایا ہے۔

تیسرا: بندگان کے افعال کا خارج میں واقع ہونا اس معنی میں نہیں ہے کہ اللہ سبحان نے ان کا ارادہ فرمایا ہو؛ بلکہ زیادہ سے زیادہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جاری ہونے دیا ہے؛ اس سبب کہ بندگان خارج میں یہ افعال اس حرکت اور قوت کے ساتھ انجام دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں سونپی ہے؛ لیکن یہ اعمال ان کے اپنے ارادے سے انجام پاتے ہیں، اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کے ارادے کے خلاف ہوں؛ اس لیے کہ انہیں اختیار حاصل ہے اور وہ عالمِ امتحان میں ہیں۔

لہٰذا وہ سبحانہ اپنے بندوں کے افعال میں سے جو چاہے اور جو نہ چاہے، دونوں کو ایک عمومی کائناتی الٰہی قانون اور سنت کے مطابق جاری ہونے دیتا ہے یا جاری نہیں ہونے دیتا، لیکن اس کا جاری کرنا بندے کے افعال کو بندے کی اپنی ارادہ کے مطابق ہونے کے تحت ہوتا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے امور کو بندوں کے سپرد کر دیا ہے؛ اس لیے کہ خداوند سبحان نے ایک عمومی تکوینی قانون مقرر فرمایا ہے[1] جس کی بنیاد پر انسان

---

[1] . جیسے فطرت میں جاری بعض قوانین، اور بعض افعال کے دنیوی ثواب یا سزا سے متعلق قوانین، مثلاً قطعِ رحم، صلۂ رحم، صدقہ، اور بعض نفسانی افعال کے نتائج، جیسے حسد۔

جس نیک یا بد فعل کو چاہے انجام دے سکتا ہے، اور خداوند اسے اس سے نہیں روکتا، مگر یہ کہ حکمت اس قانون کے ٹوٹنے کا تقاضا کرے اور خداوند کسی بندے کو کسی فعل کے انجام دینے سے روک دے، جیسا کہ معجزے میں ہوتا ہے۔

اس مفہوم کے ساتھ جبر اور تفویض کے شبہے یا مغالطے کا جواب دیا جاتا ہے۔ انسان اپنے نیک یا بد افعال پر مجبور نہیں ہے۔ اور اللہ کا اس کا جاری کرنا یہی ہے کہ انسان کو اختیار، طاقت اور قوت عطا کی گئی ہے جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر ہے، اور انسان کو ہر لحہ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ خداوند وجود، حرکت اور قوت کے ذریعے اس کی مدد کرے؛ چاہے انسان نیکی یا بدی کے اختیار کی حالت میں ہو یا نیکی یا بدی کے انجام دینے کی حالت میں۔ لہٰذا یہاں تفویض کا کوئی تصور نہیں اور خدا نے امور کو انسان کے سپرد نہیں کیا ہے۔

لیکن بعض سلفیوں کا وہ شبہ یا مغالطہ، جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خداوند سبحان نے ہر وہ واقعہ اور حادثہ جس کا بیرونی دنیا میں وقوع ہوتا ہے، ارادہ کیا ہے اور وہ اس پر راضی بھی ہے، باطل ہے؛ کیونکہ وہ خداوند سبحان کے افعال اور بندگان کے افعال کے درمیان امتیاز نہیں کرتے اور ان دونوں کو آپس میں خلط کر دیتے ہیں۔ وہ بندگان کے ان اعمال کے درمیان فرق نہیں کرتے جو اس کی رضا کے مطابق ہیں اور ان اعمال کے درمیان جو اس کی رضا کے مطابق نہیں ہیں، بلکہ سب کو ایک ہی گروہ میں شامل کر کے اسے ارادۂ تکوینی کا نام دے دیتے ہیں۔ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ تمام افعال اس کی رضا کے مطابق ہیں اور اس نے ان سب کا ارادہ کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ ہر اس چیز کو جو خارج میں واقع ہوتی ہے، اپنی اصطلاح کے مطابق ارادۂ تکوینی کا نام دینا چاہیں، تو اس صورت میں انہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ارادۂ تکوینی اس کے امر یا نہی سے پردہ نہیں اٹھاتی اور نہ ہی خداوند کی رضا کو ظاہر کرتی ہے؛ بلکہ انہیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ ارادۂ تکوینی میں انہوں نے اس کے افعال اور بندگان کے افعال کو آپس میں خلط کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے یہ ایک عمومی موضوع ہے جو تمام خارجی واقعات کو شامل کرتا ہے؛ خواہ وقوع کے اعتبار سے وہ خداوند کے ارادے میں واقع ہوئے ہوں یا بندگان کے ارادے میں؛ یعنی اس تعریف کے مطابق ارادۂ تکوینی، ارادۂ الٰہی نہیں ہے؛ بلکہ یہ ارادۂ الٰہی اور بندگان کے ارادے کا ایک مرکب ہے؛ لہٰذا اس تعریف میں اس بات کا کوئی فائدہ نہیں کہ کسی فعل یا اس واقعے کے درمیان تمایز قائم کیا جائے جو خارج میں پیش آتا ہے، اس اعتبار سے کہ وہ خداوند کی رضا کے مطابق ہے یا نہیں، یا خداوند نے اسے ارادہ کیا ہے یا نہیں کیا۔ جو شخص اس تعریف کو اس مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے کہ خارج میں پیش آنے والے

کسی فعل یا واقعے کی صفت کے درمیان فرق ظاہر کرے، وہ دو حالتوں میں سے ایک میں ہوتا ہے: یا تو وہ سرے سے کچھ نہیں سمجھتا؛ یا سمجھتا ہے مگر ان لوگوں کو، جو نادانی کی بنا پر اس کی پیروی کرتے ہیں، ذلیل و پست کرنا چاہتا ہے۔

اس موضوع کو مزید سادہ کرنے کے لیے میں کہتا ہوں: بندوں کے وہ اعمال جو باہر واقع ہوتے ہیں، وقوع کے اعتبار سے خداوند کے ارادے سے نہیں ہوتے؛ اس لیے کہ وہ اس کے افعال نہیں ہیں، بلکہ اس کے بندوں کے افعال ہیں؛ لہٰذا اس جہت سے وہ بندوں کے ارادے سے ہوتے ہیں۔ لیکن امر یا نہی کے اعتبار سے وہ خداوند سبحان کے ارادے سے ہوتے ہیں۔

لیکن بعض نادان سلفیوں کے سوال کے بارے میں: کیا وہ بادشاہ جسے اللہ تعالیٰ نے مقرر نہیں کیا، اللہ تعالیٰ کی مشیت سے حکومت کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر؟ اور کیا چور اللہ تعالیٰ کی مشیت سے چوری کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر؟ یہ سوال ایک مغالطے پر مبنی ہے۔ وہ یہ فرض کرتے ہیں کہ چوری کا فعل، خارجی تحقق کے اعتبار سے، اللہ سبحان و تعالیٰ کی مشیت سے ہے؛ حالانکہ اس اعتبار سے وہ بندے کی مشیت سے ہے، نہ کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے۔ اس کا اللہ تعالیٰ کی مشیت سے تعلق صرف پروردگار کے امر یا نہی کے اعتبار سے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے صرف یہ حکم دیا ہے یا منع فرمایا ہے کہ یہ بادشاہ حکومت کرے، اور اللہ تعالیٰ نے یا تو چوری کا حکم دیا ہے یا چوری سے منع فرمایا ہے۔

اسی طرح عالمِ وجود میں کوئی بھی چیز واقع نہیں ہوتی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو روکنے پر قادر ہے، اور کوئی ممکن چیز ایسی نہیں کہ جس کے پیدا کرنے پر اللہ تعالیٰ قادر نہ ہو؛ لیکن اس نے اس عالم کے لیے قوانین مقرر کر رکھے ہیں۔ اس نے انسان کو حرکت، قوت اور اختیار عطا کیا ہے۔ وہ آخرت میں انسان سے اس کے اعمال اور اس کے انتخابوں کا حساب لے گا؛ لیکن اس دنیا میں اس پر جبر نہیں کرتا اور نہ ہی اسے زمین میں اللہ کے خلیفہ کی اطاعت کرنے اور اس کی حکومت کی مدد کرنے پر مجبور کرتا ہے؛ نہ اس پر غالب آتا ہے اور نہ اسے نماز، روزہ، چوری چھوڑنے وغیرہ پر مجبور کرتا ہے؛ کیونکہ اگر ایسا ہو تو انسان مجبور ہوگا، اور اس کا عمل کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا، اور پھر کسی معین کام کو انجام دینے یا اسے ترک کرنے پر سزا دینے یا ثواب عطا کرنے کا کوئی معنی باقی نہیں رہتا۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ اپنے خلیفہ کو مقرر کرتا ہے، اور لوگ زمین میں اللہ کے خلیفہ کی مدد کے حوالے سے آزمائش میں ڈالے گئے ہیں۔ اگر وہ اس کی مدد کریں تو دنیا اور آخرت میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اور اگر وہ اسے ذلیل کریں اور اس کے علاوہ کسی اور کی مدد کریں یا اس کے سوا کسی کی پیروی کریں تو ان کی آخرت خسارے میں پڑ جاتی ہے اور وہ اپنا حصہ ضائع کر بیٹھتے ہیں۔

زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کی صفات

حجتِ خداوند: اسی کے ذریعے اللہ تعالیٰ لوگوں پر اپنی حجت اور دلیل قائم کرتا ہے اور ان کا عذر ختم کر دیتا ہے۔

(رُسُلاً مُبَشِّرِينَ وَ مُنْذِرِينَ لِئَلاَّ يكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكانَ اللَّهُ عَزِيزاً حَكِيماً)[1]

(رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے، تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی حجت باقی نہ رہے، اور اللہ تعالیٰ زبردست، حکمت والا ہے)۔

رسول یا فرستادہ: وہ کسی بھیجنے والے کی طرف سے ایک رسالت لے کر آیا ہے۔

نبی یا پیغمبر: چونکہ اسے مقامِ نبوت اور پیغمبری حاصل ہے، اس لیے اسے رؤیا اور مکاشفہ کے ذریعے وحی کی جاتی ہے۔

لیکن یہ اشکال کہ محمد رسولُ اللہ (ص) کے بعد اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کو نبیِ مرسل کیوں کہا جاتا ہے، حالانکہ محمد رسولُ اللہ (ص) اللہ کی جانب سے بھیجے جانے والے آخری نبی اور مرسل ہیں، اس موضوع کو میں نے کتاب (نبوتِ خاتم) میں بیان کیا ہے۔ یہاں میں مختصراً کہتا ہوں: جس نبوتِ ارسال کا سلسلہ ختم ہوا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست بھیجی جانے والی نبوت ہے، اور محمد رسولُ اللہ (ص) کی جانب سے بھیجنے والی نبوت کا آغاز ہو چکا ہے؛ وہ ذات جو اللہ تعالیٰ کا حقیقی خلیفہ ہے اور تخلیق کا مقصد مخلوقات کا اس تک پہنچنا ہے؛ اور اسی تک پہنچنے سے اللہ تعالیٰ کی حقیقی جانشینی تحقق پاتی ہے، اور اس کے نتیجے میں حقیقی خلیفہ، یعنی محمد (ص)، جانشینی کا کامل کردار ادا کرتے ہیں؛ اور ان کرداروں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ (ص) اپنے بعد آنے والوں کے لیے خبر دینے والے اور بھیجنے والے ہیں۔ آلِ محمد کے ائمہ علیہم السلام کا علم محمد رسولُ اللہ (ص) سے ہے، اور وہ محمد (ص) کی جانب سے بھیجے گئے ہیں اور یہ سب اللہ سبحان و تعالیٰ کے حکم سے ہے۔

---

[1] . قرآنِ کریم، سورۂ نساء، آیت 165۔

وصی: وصی کا تصور اس وقت سامنے آتا ہے جب پہلے سے کوئی حجت موجود ہو، جس نے اپنے وصی کی پیروی اور اس کی مدد کرنے کی وصیت کی ہو۔ وصی، خداوند کی طرف سے ایک حجت اور زمین میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہوتا ہے، اور وہ سابقہ حجت کے بعد ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وصیت کرنے والا براہِ راست خود وصی کو وصیت کرے تاکہ وہ اس کا وصی قرار پائے۔ مثال کے طور پر امام باقر (ع) اور امام صادق (ع)، حضرت محمد رسولُ اللہ (ص) کے اوصیاء ہیں، اس لیے کہ آپ (ص) نے اپنی وصیت میں ان دونوں کے بارے میں وصیت فرمائی ہے۔

معصوم:

عصمت: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ جانا ہے، اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں سے۔

اور معصوم: وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ لیتا ہے۔

عصمت ایک باطنی امر ہے، اور اس کے بارے میں یقین حاصل کرنے کا بیرونی طور پر کوئی راستہ نہیں، سوائے اللہ تعالیٰ کی جانب سے نص کے یا اللہ تعالیٰ کے سابقہ خلفاء میں سے کسی خلیفہ کی جانب سے نص کے۔

اللہ تعالیٰ کا خلیفہ معصوم ہوتا ہے، وہ لوگوں کو ہدایت سے باہر نہیں نکالتا اور نہ ہی انہیں باطل میں داخل کرتا ہے۔

امام[1]: وہ شخص جسے مقرر کیا گیا ہو تاکہ وہ قیادت کرے اور اس دنیا میں دوسروں کا رہنما ہو۔

عالِم: وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ وحی کرتا ہے اور اسے ان امور کے بارے میں آگاہ کرتا ہے جو لوگوں کو گمراہی سے نکالتے ہیں اور انہیں ہدایت میں داخل کرتے ہیں، اور حق کو ان کے لیے واضح کرتا ہے۔ حق کی طرف اور صراطِ مستقیم کی جانب ہدایت کرنے والا صرف وہی ہے؛ کیونکہ اس کا علم اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے اور اس کی معرفت اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ جبکہ دوسرے لوگ اگرچہ کسی ایک لمحے میں حق اور صراطِ مستقیم کو پہچان بھی لیں، تو دوسرے ہی لمحے اس سے ناآشنا ہو جاتے ہیں؛ اس لیے کہ ان کا علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتا

---

[1]. اسی طرح امام کا لفظ خاص معنی میں بھی مراد ہو سکتا ہے، جس سے مقصود عوالمِ بالا میں ایک خاص مقام ہے، اور یہ مقام محمد (ص) اور آلِ محمد علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے، نیز بعض انبیاء علیہم السلام جیسے ابراہیم (ع) اور موسیٰ (ع) کو بھی عطا کیا گیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے: (وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ) (سورۂ بقرہ، آیت 124) (اور جب ابراہیم کو اس کے پروردگار نے چند باتوں کے ذریعے آزمایا اور اس نے انہیں پورا کر دیا تو فرمایا: میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ [ابراہیم نے] عرض کیا: اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا: میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچتا)۔

اور ان پر وحی نہیں کی جاتی۔ لہٰذا زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کے سوا کسی بھی انسان کو اس وصف کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حق یا صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کا علم

وہ علم جو زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کے پاس ہونا ضروری ہے، اُن امور کی معرفت ہے جن پر آخرت میں لوگوں کی نجات موقوف ہے، اور یہ علم عقائد اور تشریع کا علم ہے؛ لہٰذا اس پر وحی ہونا لازم ہے تاکہ آخری فیصلہ اسی کے پاس ہو، اور وہ حق عقیدہ، حق شریعت، اور وہ نئے امور جو تشریع میں پیدا ہوتے ہیں، بیان کرے۔ علم وہ چیز نہیں ہے جو تھا، بلکہ وہ چیز ہے جو بنتا ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کی پہچان پچھلے خلیفہ کی کتاب کے ذریعے کرنا یا اس کتاب کا محفوظ ہونا یا پچھلی شریعت کا محفوظ ہونا، یہ وہ اہم علوم نہیں ہیں جن کا زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کے پاس ہونا ضروری ہو؛ کیونکہ اس قسم کی باتیں لوگوں کے پاس موجود ہوتی ہیں اور ہر دوسرا انسان بھی انہیں حاصل کر سکتا ہے، اور ان کا ہونا اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کے لیے کوئی فضیلت نہیں ہے۔ بلکہ فضیلت اور برتری یہ ہے کہ وہ ایسی چیز جانتا ہو جو لوگ نہیں جانتے؛ اور یہ موضوع صرف وحی کے ذریعے، شب و روز کے لمحات میں، ممکن ہوتا ہے۔ تمام لوگ اس علم کے محتاج ہیں تاکہ نجات پا سکیں؛ جبکہ وہ اپنے زمانے کے کسی بھی انسان کا محتاج نہیں ہوتا؛ بالکل اسی طرح جیسے آدم اور فرشتوں کا معاملہ تھا۔ فرشتے آدم کے علم کے مقابلے میں نادان تھے اور اس کے علم کے محتاج تھے (یعنی ان کے ناموں کے بارے میں)؛ اسی وجہ سے آدم کو ان پر برتری حاصل ہے اور ان کے لیے اس سے سیکھنا اور اس کی اطاعت کرنا واجب ہے۔

یہ موضوع بیان کرتا ہے کہ اس میں کوئی اشکال نہیں کہ محمد رسول اللہ (ص) اُمّی ہوں اور پڑھتے اور لکھتے نہ ہوں؛ اور اس میں بھی کوئی اشکال نہیں کہ آپ تورات اور انجیل کے متون کو نہ جانتے ہوں یا وہ آپ کو حفظ نہ ہوں۔ جو کوئی اس کے خلاف دعویٰ کرے وہ غلو کرنے والا ہے اور اس نے خود کو ایک ایسے معاملے میں ڈال لیا ہے جس پر اس کے پاس کوئی دلیل نہیں، بلکہ محض ہوائے نفس ہی ایسے لوگوں کو اس قسم کی بات پر آمادہ کرتی ہے۔ لیکن وہ روایات جو یہ بیان کرتی ہیں کہ رسول میں پڑھنے اور لکھنے کی صلاحیت تھی، اس سے زیادہ نہیں کہ وہ صرف اس صلاحیت کے اثبات کے مرحلے میں ہیں، اور ان کا مقصد تطبیق دینا نہیں ہے۔ یعنی یہ ثابت نہیں ہوا کہ رسول اللہ (ص) پڑھتے اور لکھتے تھے؛ بلکہ اس کے برعکس ثابت ہوا ہے، اور تاریخ اس بات کی گواہی دیتی

ہے کہ آپ کو ایسے شخص کی ضرورت ہوتی تھی جو آپ کے لیے پڑھتا اور لکھتا ہو؛ جیسے وحی کے کاتبوں کا وجود اور علی (ع) کی ضرورت، تاکہ وہ آپ کے لیے صلح نامہ تحریر کریں۔

جو بات اس خارجی دنیا میں اُن افراد کے لیے ثابت ہوئی ہے جو محمد رسول اللہ (ص) کے ساتھ براہِ راست رابطے میں تھے، وہ یہ ہے کہ آپ نہ پڑھتے تھے اور نہ لکھتے تھے؛ کیونکہ آپ نے پڑھنے اور لکھنے کی کبھی مشق نہیں کی تھی۔

(وَ ما كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتابٍ وَ لا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذاً لَارْتابَ الْمُبْطِلُونَ)[1]

(اور آپ اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے، ورنہ باطل پرست لوگ ضرور شک میں پڑ جاتے۔)

اسی بناپر یہ بات روایت کی گئی ہے کہ کسی نے بھی آپ کو پڑھتے یا لکھتے ہوئے نہیں دیکھا؛ لہٰذا حتیٰ یہ ثابت کرنا بھی کہ آپ میں پڑھنے اور لکھنے کی صلاحیت موجود تھی، اس امکان کو ختم کرنے میں کوئی فائدہ نہیں دیتا کہ رسول، یا زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ، عملاً نہ پڑھتے تھے اور نہ لکھتے تھے (یعنی اُمی تھے)۔ محمد رسول اللہ (ص) توراتِ موسیٰ کی اُن صحیفوں کے محتاج تھے جو اُن کے لیے نقل کیے جائیں، اور وہ اور علی (ع) انہیں پڑھنے پر قادر نہ تھے؛ کیونکہ وہ صحیفے عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں تھے۔ یہ بات اُس اہم دعوے کی نفی کرتی ہے جو بعض لوگ کرتے ہیں کہ اللہ کی حجت کو ہمیشہ اور ہر حالت میں تمام زبانوں کا علم ہونا چاہیے۔

ہمیں ہمیشہ اس نکتے پر توجہ رکھنی چاہیے کہ ہم اس عالَمِ جسمانی میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں، اور ان کی روح اور اُس چیز کے بارے میں بات نہیں کر رہے جو اس میں بطور امانت رکھی گئی ہے۔ وہ اس دنیا میں دیگر لوگوں کی طرح بہت سی باتیں نہیں جانتے؛ اور صرف وہی بات جانتے ہیں جو انہوں نے حاصل کی ہو، یا وہ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا ہو کہ وہ وحی کے ذریعے اسے جانیں؛ اور یہ سب اللہ حکیمِ مطلق کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے، نہ کہ لوگوں کی کج فہمیوں اور مطالبات کی بنیاد پر۔ یہ امکان موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خلیفہ کو کسی ایسے امر کی معرفت عطا فرمائے جس کا جاننا اس کے لیے ناگزیر ہو، اور اسی بنیاد پر اُن بعض تعلیمات سے پردہ اٹھادے جو اس کے صفحۂ وجود میں بطور امانت رکھی گئی ہیں، وہ تعلیمات جنہیں یہ جسم، یہ عالَم اور اس کی کثرت اس سے اوجھل کیے ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ حجت کا علم، جیسا کہ میں نے بیان کیا،

---

[1] . قرآنِ کریم، سورۂ عنکبوت، آیت 48۔

ایک دائمی وحی ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنی حجت کی طرف ہوتی ہے، اُن تمام امور کے بارے میں جن کی انسانیت کو نجات پانے، حق کی شناخت کرنے، اور اس چیز کی معرفت حاصل کرنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ انسانوں سے چاہتا ہے۔ وہ علم جس کا جاننا اللہ کی حجت کے لیے لازم ہے، کسی طور بھی آسمانی کتابوں کی زبانوں یا دیگر زبانوں کا جاننا، یا آسمانی کتابوں کے جملات کو حفظ کر لینا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام آسمانی کتابوں میں وارد ہونے والے تمام معانی اور اُن حقائق کو اپنے اندر رکھتا ہو جن کی طرف ان کتابوں میں اشارہ کیا گیا ہے، بغیر اس کے کہ انہیں پڑھنے یا اپنے پاس تیار رکھنے کی ضرورت ہو۔ تمام آسمانی کتابیں معصوم کے وجودی صفحے میں بطور حقائق اور معانی، حقیقت اور معنی کے درجے میں امانت کے طور پر رکھ دی گئی ہیں ۔ہر حجت کے پاس اپنی کتاب، اپنی مخصوص معرفت، اپنے زمانے کے لوگوں کی پہچان، اور وہ سب کچھ موجود ہوتا ہے جس کی اُن لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے۔

دراصل وہ علم جو حجت پر واجب ہوتا ہے، مادی علوم کی آگاہی نہیں ہوتا؛ حتیٰ کہ وہ علوم بھی جو لوگوں کی زندگی کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں، جیسے طب۔ طالبِ حق کے لیے یہ بات کافی ہے کہ امیر المؤمنین (ع) کے علاج کے لیے حسن (ع) اور حسین (ع) کی جانب سے طبیب کو بلانے کی درخواست کی گئی۔

یہ وہ بعض احادیث ہیں جو زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کے علم کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

یہ روایات کتاب (کافی) میں (کلینی) سے، جلد اول، باب (ائمہ علیہم السلام، رسول اللہ اور تمام سابقہ انبیاء اور ان کے اوصیاء کے علم کے وارث ہوتے ہیں) کے تحت وارد ہوئی ہیں۔

امام صادق (ع) نے فرمایا: (سلیمان نے داؤد سے اور محمد نے سلیمان سے وراثت پائی، اور ہم محمد سے وراثت پاتے ہیں، اور تورات، انجیل، زبور اور ان کی تفسیر، اور جو کچھ الواح میں ہے اس کا علم ہمارے پاس ہے)۔ راوی کہتا ہے: میں نے عرض کیا: (یہی تو وہ علم ہے)۔ فرمایا: (یہ وہ علم نہیں ہے؛ بے شک علم وہ چیز ہے جو دن بہ دن اور لمحہ بہ لمحہ پیدا ہوتا رہتا ہے)[1]

ضریس کنّاسی کہتے ہیں: میں امام صادق (ع) کے پاس تھا اور ابو بصیر بھی ان کے پاس موجود تھے۔ امام صادق (ع) نے فرمایا: (داؤد نے انبیاء کا علم وراثت میں پایا، اور سلیمان نے داؤد سے وراثت پائی، اور محمد (ص) نے سلیمان سے وراثت پائی، اور ابراہیم کے صحیفے اور موسیٰ کی الواح ہمارے پاس ہیں)۔ ابو بصیر نے عرض کیا:

---

[1] .کافی، کلینی، جلد 1، صفحات 224 اور 225۔

(یہی تو وہ علم ہے)۔ فرمایا: (اے ابو محمد، یہ وہ علم نہیں ہے؛ علم وہ چیز ہے جو رات اور دن میں وجود میں آتا رہتا ہے، دن بہ دن اور لمحہ بہ لمحہ)[1]

کتاب (بصائر الدرجات)، تالیف محمد بن حسن صفّار، صفحہ 344 میں، اس باب کے تحت جس کا عنوان ہے (وہ چیز جو لگاتار، دن بہ دن اور لمحہ بہ لمحہ ظاہر ہوتی ہے)، یوں نقل ہوا ہے:

ضُریس بیان کرتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق (ع) سے سنا کہ آپ نے فرمایا: (علم وہ چیز ہے جو رات اور دن میں واقع ہوتی ہے، دن بہ دن اور لمحہ بہ لمحہ)۔

ضریس کہتے ہیں: ہم ابو بصیر کے ساتھ امام باقر (ع) کی خدمت میں حاضر تھے۔ ابو بصیر نے آپ سے عرض کیا: (آپ پر فدا ہو جاؤں، آپ کے عالم کو کس علم کا علم ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: (اے ابو محمد! ہمارا عالم غیب کو نہیں جانتا، اگر اللہ تعالیٰ ہمارے عالم کو اس کے حال پر چھوڑ دے تو وہ تم میں سے بعض لوگوں کی طرح ہو جائے، لیکن اس کے لیے لمحہ بہ لمحہ علم پیدا کیا جاتا ہے)۔

ابو بصیر کہتے ہیں: میں نے امام صادق (ع) کی خدمت میں عرض کیا: (آپ پر فدا ہو جاؤں، آپ کے پاس جو علم ہے وہ کیا ہے؟) آپ نے فرمایا: (وہ جو دن اور رات میں، ایک امر کے بعد ایک امر، اور ایک چیز کے بعد ایک چیز، قیامت کے دن تک پیدا ہوتی رہتی ہے)۔

ابو بصیر کہتے ہیں: میں نے امام صادق (ع) سے سنا کہ آپ نے فرمایا: (ابتدائی صحیفے، ابراہیم کے صحیفے اور موسیٰ کی تختیاں ہمارے پاس ہیں)۔ ضریس نے آپ سے عرض کیا: (کیا یہ وہی تختیاں نہیں ہیں؟) آپ نے فرمایا: (جی ہاں)۔ ضریس نے عرض کیا: (یہی تو علم ہے)۔ آپ نے فرمایا: (یہ علم نہیں ہے، یہ روایت ہے۔ علم وہ ہے جو رات اور دن میں پیدا ہوتا رہتا ہے، دن بہ دن اور لمحہ بہ لمحہ)۔

منصور بن حازم کہتے ہیں: میں نے امام صادق (ع) سے سنا کہ آپ نے فرمایا: (ہمارے پاس ایک صحیفہ ہے جس میں خراش کی دیت بھی درج ہے)۔ میں نے عرض کیا: (یہی تو علم ہے)۔ آپ نے فرمایا: (یہ علم نہیں ہے بلکہ موروثی کرامت ہے۔ علم وہ چیز ہے جو ہر دن اور ہر رات پیدا ہوتی ہے، اور وہ رسول اللہ (ص) سے اور علی بن ابی طالب (ع) سے ہے)۔

---

[1] . کافی، کلینی، جلد 1، ص 225۔

ضریس کنّاسی کہتے ہیں: ہم امام صادق (ع) کی خدمت میں حاضر تھے۔ آپ (ع) نے فرمایا: (ہمارے پاس ابراہیم کے صحیفے اور موسیٰ کی تختیاں ہیں)۔ ابو بصیر نے عرض کیا: (یہی تو علم ہے)۔ آپ نے فرمایا: (یہ علم نہیں ہے، یہ موروثی کرامت ہے)۔ پھر فرمایا: (علم وہ چیز ہے جو رات اور دن میں، دن بہ دن اور لحہ بہ لحہ پیدا ہوتی رہتی ہے)۔

امام صادق (ع) نے فرمایا: (ہم اس سب کو جانتے ہیں جو رات اور دن میں ہوتا ہے)۔

اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اور معجزانہ صفات[1]

بعض لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ معصوم کی صفات میں سے یہ ہے کہ اس کا سایہ نہیں ہوتا، اور اگر وہ پتھر پر چلے تو اس کے قدموں کے نشان پتھر پر رہ جاتے ہیں اور نرم زمین پر اس کے قدموں کے نشان نہیں رہتے، اور درندے معصوم کا گوشت نہیں کھاتے اور اس پر حملہ نہیں کرتے...

حقیقت یہ ہے کہ یہ عقیدہ باطل ہے، اور جو بھی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ معصوم ایک دائمی اور ہمیشگی صفت کے طور پر معجزہ رکھتا ہے، وہ عقیدے کے اعتبار سے منحرف ہے، اور اس کی حالت اس طرح ہے:

---

[1] . معجزانہ صفات سے مراد وہ صفات ہیں جن کے ذریعے اللہ کے خلیفہ کو اس کی پوری زندگی میں پہچانا جاتا ہے اور جو اس سے جدا نہیں ہوتیں۔ یہ اُن معجزات کے علاوہ ہیں جو کسی خاص وقت میں اللہ کے خلفاء میں سے کسی ایک خلیفہ کے لیے ظاہر ہوتے ہیں اور کسی دوسرے خلیفہ کے لیے یا کسی اور وقت میں موجود نہیں ہوتے؛ لہٰذا اگر مثال کے طور پر کوئی روایت ہو کہ اللہ کے خلیفہ کو گلی میں بغیر سائے کے دیکھا گیا، تو صحت فرض کر لینے کی صورت میں اس میں کوئی اشکال نہیں، کیونکہ یہ اس شخص کے لیے ایک معجزہ تھا جس نے اسے دیکھا، تاکہ وہ ایمان لائے یا اس کا ایمان مضبوط ہو، اور وہ اسے دوسروں تک بھی نقل کرے اور یہ ان کے لیے بھی فائدہ مند ہو۔ لیکن اگر اللہ کے خلیفہ کے بارے میں کوئی ایسی روایت نقل کی جائے کہ اللہ کے خلفاء کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ ان کا سایہ نہیں ہوتا، تو یہ روایت باطل ہے، اور جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے، اس پر عقیدہ رکھنے والے افراد عقیدے میں انحراف رکھتے ہیں۔ ایک اور مثال: اگر کوئی شخص نقل کرے کہ میں نے اللہ کے خلیفہ کو دیکھا کہ درندوں نے اس پر حملہ نہیں کیا بلکہ اسے سجدہ کیا اور اس کے سامنے جھک گئے، تو اس بات کی صحت فرض کر لینے کی صورت میں اس میں کوئی اشکال نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ ایک معجزہ واقع ہوا ہو؛ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اللہ کے خلیفہ کی دائمی خصوصیت یہ ہے کہ درندے اسے نہیں کھاتے، تو یہ قول باطل ہے، اور اس پر عقیدہ رکھنے والے افراد عقیدے میں انحراف رکھتے ہیں، اور ان کے عقیدے کے انحراف کی کم ترین حد یہ ہے کہ وہ امام حسین (ع) کے کافر ہیں۔ کیونکہ روایت میں آیا ہے کہ گھوڑوں نے آپ کے سینے کو پامال کیا اور درندوں نے آپ کے جسم سے کھایا۔ لہٰذا ان گمراہ افراد کے عقیدے کے مطابق حسین (ع) امام نہیں تھے، اور ان افراد نے اُن لوگوں کو جو حسین (ع) کی امامت پر اعتقاد نہیں رکھتے، یہ بہانہ فراہم کر دیا ہے کہ وہ آپ کی امامت کے کافر ہو جائیں۔

پہلا: یہ شخص قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن محمد (ص) کو، جو اللہ تعالیٰ کے سب سے برتر خلفاء ہیں، بشر اور جسمانی بشری صفات کا حامل قرار دیتا ہے، اور یہ بیان کرتا ہے کہ آپ کا امتیاز روحانی ہے اور آپ (ص) کے اخلاص کا نتیجہ ہے، نہ کہ کوئی جسمانی امتیاز۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(قُلْ إِنَّما أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يوحى إِلَى أَنَّما إِلهُكُمْ إِلهٌ واحِدٌ فَمَنْ كانَ يرْجُوا لِقاءَ رَبِّهِ فَلْيعْمَلْ عَمَلاً صالِحاً وَ لا يشْرِكْ بِعِبادَةِ رَبِّهِ أَحَداً)[1]

(کہہ دیجیے: میں تو تم ہی جیسا ایک بشر ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، تو جو شخص اپنے پروردگار سے ملاقات کی امید رکھتا ہو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے)۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(قُلْ إِنَّما أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يوحى إِلَى أَنَّما إِلهُكُمْ إِلهٌ واحِدٌ فَاسْتَقيمُوا إِلَيهِ وَ اسْتَغْفِرُوهُ وَ وَيلٌ لِلْمُشْرِكِينَ)[2]

(کہہ دیجیے: میں تو تم ہی جیسا ایک بشر ہوں، فرق صرف یہ ہے کہ میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، لہٰذا سیدھے اسی کی طرف رخ کرو اور اس سے بخشش طلب کرو، اور مشرکوں کے لیے ہلاکت ہے)۔

دوسرا: یہ شخص اللہ تعالیٰ پر عدل کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنے کا الزام عائد کرتا ہے۔ اس شخص کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے بعض مخلوقات کو آزمائش سے پہلے اور بعض کے فضیلت کا دوسروں پر عملی طور پر ظاہر ہونے سے قبل ہی برتری عطا کر دی ہے۔

تیسرا: انہوں نے اللہ تعالیٰ کو حکمت کے خلاف طرزِ عمل کا مرتکب ٹھہرایا ہے؛ کیونکہ ان افراد کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے خلفاء، اس کے باوجود کہ وہ معجزانہ صفات کے حامل ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے معجزات بھی عطا کیے ہیں کہ ان معجزات کا ظہور اُن معجزانہ صفات سے کم تر ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ (ع) کے قدم کا نشان پتھر پر باقی رہ جانا، جو ان فاسد عقائد کے مطابق حضرت موسیٰ (ع) کی ایک خصوصیت ہے، عصا کے سانپ بن جانے

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ کہف، آیت 110۔

[2] . قرآن کریم، سورۂ فصلت، آیت 6۔

کے معجزے سے بڑا سمجھا جاتا ہے، جو حضرت موسی (ع) لے کر آئے تھے۔ ان بے خرد لوگوں کے دعوے کے مطابق، جب موسی (ع) فرعون کے محل میں داخل ہوئے تو انہیں فرعون کے محل کی زمین کو منہدم کر دینا چاہیے تھا؛ کیونکہ وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خلیفۂ خدا کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے قدموں کا نشان پتھر پر باقی رہتا ہے۔ نیز اس کے بارے میں یہ کہنا بھی ممکن نہیں کہ یہ جادو ہے؛ پھر ان سب کے بعد موسی (ع) کو ایسی عصا کی کیا ضرورت تھی جو سانپ بن جائے؟ جبکہ فرعون اس کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ جادو ہے۔

چوتھا: ان گمراہ عقائد کے مطابق، جیسے یہ کہنا کہ درندے جانور معصوم یا امام کو نہ کھاتے ہیں اور نہ اس پر حملہ کرتے ہیں، یہ باتیں حسین (ع) کے قاتلوں کو ان کے قتل کی اجازت دیتی ہیں اور اُن لوگوں کو جو حسین (ع) پر ایمان نہیں رکھتے، حجت اور دلیل فراہم کرتی ہیں؛ اس لیے کہ اس عقیدے کے مطابق اُن کے نزدیک یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حسین (ع) امام نہیں تھے، کیونکہ گھوڑوں نے جو کہ پالتو جانور ہیں، ان کے سینے کو پامال کیا۔ اگر درندے جانور امامِ حق یا خلیفۂ خدا کو اذیت نہیں دیتے، تو بدرجۂ اولیٰ پالتو گھوڑوں کو بھی ان کے سینے کو پامال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس طرح وہ اپنے باطل عقیدے کے ذریعے اُن لوگوں کو جو آلِ محمد (ص) پر ایمان نہیں رکھتے، حجت اور دلیل فراہم کرتے ہیں تاکہ وہ ائمہ (ع) کی امامت پر طعن کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ بھی روایت ہوا ہے وہ اس عقیدے کے بالکل برعکس ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ درندہ جانوروں نے حسین (ع) کے جسد پر جرأت کی، جس طرح انسانوں نے جرأت کی اور جس طرح گھوڑوں نے جرأت کی۔ روایت یہ بھی ہے کہ جب حسین (ع) نے عراق کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا تو خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا:

(موت نوجوان لڑکیوں کے ہار کی مانند بنی آدم کے گلے میں آویزاں ہے، اور میں اپنے گزرے ہوئے لوگوں سے ملاقات کا ایسا ہی مشتاق ہوں جیسے یعقوب یوسف سے ملاقات کا مشتاق تھا! اور میرے لیے ایک جائے شہادت منتخب کر لی گئی ہے جس سے مجھے لازماً ملاقات کرنی ہے۔ گویا میں نواویس اور کربلا کے میدانوں کے لالچی بھیڑیوں کو دیکھ رہا ہوں جو میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں اور اپنے خالی پیٹوں اور خالی مشکیزوں کو اس سے بھر رہے ہیں۔ جو کچھ قلمِ تقدیرِ الٰہی سے لکھا جا چکا ہے اس سے کوئی فرار نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضا ہی ہم اہلِ بیت کی رضا ہے۔ ہم اس کی آزمائشوں پر صبر کرتے ہیں اور ہمیں صبر کرنے والوں کا اجر عطا کیا گیا ہے۔ رسولِ خدا (ص) کی ذریت اس سے ہرگز جدا نہ ہوگی۔ وہ سب اس کے جلال و کبریائی کے حریم میں اس کے پاس جمع

ہوں گے، وہ انہیں دیکھ کر خوش ہوگا اور ان کے حق میں اپنے وعدے کو پورا کرے گا۔ جو کوئی اپنا خون ہماری راہ میں، جو کہ اللہ کی راہ ہے، نچھاور کرنے کے لیے تیار ہے اور اللہ سے ملاقات کے لیے خود کو آمادہ کر چکا ہے، وہ ہمارے ساتھ روانہ ہو جائے، کیونکہ میں ان شاء اللہ کل روانہ ہو رہا ہوں)[1]

اور زینب بنتِ علی (س) نے فرمایا: (...اے یزید! کیا تو یہ گمان کرتا ہے کہ جب تو نے زمین کے کناروں اور آسمان کے آفاق کو ہم پر تنگ کر دیا اور ہمارے لیے کوئی راہِ نجات باقی نہ چھوڑی، یہاں تک کہ ہمیں لونڈیوں کی طرح قیدی بنا کر لے جایا گیا، تو ہم اللہ کے نزدیک ذلیل ہو گئے اور تو سرخرو ہو گیا اور تجھے قدر و منزلت حاصل ہو گئی؟۔۔۔ اللہ کی قسم، اے اللہ کے دشمن اور اس کے دشمن کے بیٹے! میں تیری قدر و حیثیت کو نہایت حقیر سمجھتی ہوں اور تجھے اس سے بھی کم تر جانتی ہوں کہ میں تجھے ملامت اور سرزنش کے لائق سمجھوں۔ لیکن کیا کروں کہ آنکھیں اشکبار ہیں اور سینے جل رہے ہیں؛ اور یہ سب کچھ نہ ہمارے لیے کافی ہے اور نہ ہمیں بے نیاز کرتا ہے۔ اب یہ حسین (ع) ہیں جو شہید کر دیے گئے ہیں، اور حزبِ شیطان ہمیں بے وقوفوں کے گروہ کے پاس لے جا رہا ہے تاکہ وہ اللہ کی حرمت کو پامال کرنے کے بدلے اللہ کے مال انہیں دے دیں۔ یہ ہاتھ ہمارے خون سے آلودہ ہیں اور یہ منہ ہمارے گوشت کو کھانے کے لیے للچا رہے ہیں؛ اور صحرا کے درندے ان پاک و پاکیزہ جسموں میں سے اپنا حصہ لے جا رہے ہیں۔ اگر تم ہمیں غنیمت سمجھتے ہو تو جان لو کہ جس دن تم اپنے اعمال کی سزا کو پہنچو گے، اس دن ہمیں تم کھویا ہوا پاؤ گے، اور اس وقت جب تم اپنے آگے بھیجے ہوئے اعمال کے سوا کچھ نہ پاؤ گے تو خود کو خسارے میں مبتلا دیکھو گے...)[2]

(اگرچہ تجھ سے گفتگو کرنا تیرے مخاطب ہونے کی مصیبتوں میں اضافہ ہی کرتا ہے، اس لیے کہ میں تیری قدر و منزلت کو حقیر سمجھتی ہوں اور تجھے اس سے بھی کمتر جانتی ہوں کہ ملامت اور سرزنش کے لائق سمجھوں، لیکن کیا کروں کہ آنکھیں اشکبار ہیں اور سینے سوزاں ہیں۔ کیسا تعجب خیز ہے کہ حزبِ خدا کے نجیب افراد، حزبِ شیطان کے آزاد چھوڑے گئے لوگوں کے ہاتھوں قتل کیے گئے! وہ ہاتھ ہمارے خون سے آلودہ ہیں اور وہ منہ ہمارے گوشت کھانے کے لیے للچائے ہوئے ہیں؛ اور ان پاک و مطہر جسموں پر درندے جوق در جوق آتے جاتے ہیں اور

---

[1] . اللہوف فی قتلی الطفوف، ابن طاؤس، ص 38؛ کشف الغمہ فی معرفۃ الائمہ، اربلی، جلد 2، ص 239؛ بحار الانوار، مجلسی، جلد 44، ص 366 سے 367 اور ص 397؛ مثیر الاحزان، ابن نما حلی، ص 29؛ نزہۃ الناظر و تنبیہ الخاطر، حلوانی، ص 86؛ العوالم، امام حسین (ع)، عبد اللہ بحرانی، ص 216؛ لوائح الاشجان، محسن امین، ص 70؛ موسوعۃ کلمات الامام الحسین (ع)۔

[2] . بلاغات النساء، ابن طیفور، ص 22؛ شرح احقاق الحق، مرعشی، جلد 33، ص 681۔

بوڑھے کفتار اسے زمین پر پٹختے ہیں۔ اگر تو ہمیں غنیمت سمجھتا ہے تو جان لے کہ جس دن تو اپنے اعمال کی سزا کو پہنچے گا، ہمیں کھویا ہوا پائے گا اور خود کو خسارے میں پائے گا! اور اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم نہیں کرتا)[1]

پہلے حصے میں تعبیر (عسلان الفلوات) کا مفہوم بیابان کے وحشی جانور اور درندے ہیں، یا خاص طور پر اُن میں سے بھیڑیے؛ اور دوسرے حصے میں (امہات الفراعل) سے مراد کفتار ہے، اور کلام کا ظاہر بالکل واضح ہے۔

(گویا میں اپنے جسم کے اعضا کو دیکھ رہا ہوں کہ نواویس اور کربلا کے درمیان بیابانوں کے بھیڑیے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں اور اپنے خالی اور بھوکے پیٹ مجھ سے بھر رہے ہیں۔ اس دن سے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے، بچا نہیں جا سکتا)۔

(ان پاک اور مطہر جسموں پر درندے جوق در جوق آتے جاتے ہیں اور بوڑھے کفتار انہیں زمین پر پٹختے ہیں)۔

بعض لوگ ان روایات کی تاویل کرنے کا قصد رکھتے ہیں، اور وہ بھی اس قدر کمزور کہ علمی نقد کے سامنے ٹھہر نہیں پاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ تاویل صرف ضرورت کے وقت کی جاتی ہے، اور یہاں تاویل کی کوئی ضرورت نہیں۔ کوئی ایسا قطعی عقلی یا نقلی دلیل، جو قطعی الصدور اور قطعی الدلالت ہو، موجود نہیں جو اس بات کی نفی کرے کہ غیر عاقل حیوانات کے لیے خلیفۂ خدا کے جسد پر تعرض کرنا ناممکن ہے۔ جبکہ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ عاقل انسانوں نے ان کے جسد پر تعرض کیا؛ یہاں تک کہ معاملہ اس حد تک پہنچ گیا کہ حسین (ع) کی انگلی کاٹ دی گئی۔ کاش ان کی انگلی کے بجائے مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا۔ میرے ماں باپ ان پر قربان ہوں![2]

حقیقت میں کم از کم اتنی بات تو ضرور کہی جا سکتی ہے کہ امام کا جسم بھی باقی انسانوں کے جسم کی طرح ہی ہوتا ہے۔ جو شخص امام یا اللہ کے زمین میں خلیفہ کے جسم کے لیے کوئی غیر معمولی صفت یا خصوصیت ثابت کرنا چاہے، اس پر دلیل پیش کرنا لازم ہے، ورنہ اس کی بات علمی اعتبار سے کوئی وزن نہیں رکھتی۔ اس کے علاوہ، اوپر بیان کی گئی روایت جو امام حسین (ع) اور ان کی عقیلہ بہن سلام اللہ علیہا سے منقول ہے، دلالت اور معنی کے لحاظ سے بالکل واضح ہے۔ کم از کم یہی مفہوم ہے جو اس کے ظاہر سے سمجھ میں آتا ہے، اور اس ظاہر یا اس بات کو جسے

---

[1]. اللہوف علی قتلی الطفوف، ابن طاؤس، ص 107؛ بحار الانوار، مجلسی، جلد 45، ص 134 اور 135؛ لوائح الاشجان، محسن امین، ص 230۔

[2]. کتاب کے ضمیمہ دوم کی طرف رجوع کریں۔

اس سے واضح طور پر سمجھا جاتا ہے، رد کرنے کی گنجائش نہیں ہے جب تک کوئی قطعی دلیل موجود نہ ہو جو اس واضح ظاہری معنی کو رد کرے۔

اسی طرح حضرت یوسف (ع) کے واقعے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(قالَ إِنِّی لَیحْزُنُنی أَنْ تَذْهَبُوا بِهِ وَ أَخافُ أَنْ یأْکُلَهُ الذِّئْبُ وَ أَنْتُمْ عَنْهُ غافِلُونَ)[1]

(انہوں نے کہا: مجھے اس بات کا رنج ہے کہ تم اسے لے جاؤ، اور مجھے ڈر ہے کہ تم اس سے غافل ہو جاؤ اور بھیڑیا اسے کھا جائے)۔

یعقوب (ع) اللہ کے خلفا میں سے ایک خلیفہ ہیں، اور یوسف (ع) بھی اسی طرح ہیں؛ اور قرآن میں یعقوب (ع) کا ظاہرِ کلام حجت اور دلیل ہے۔ لہٰذا قرآن کے مطابق یعقوب (ع) اس فاسد عقیدے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ یوسف (ع) کا بھیڑیے کے ذریعے کھایا جانا ممکن ہے، اسی بنا پر وہ بھیڑیوں سے ڈرے اور اپنی اولاد کو متنبہ کیا کہ کہیں بھیڑیا ان کے بھائی یوسف (ع)، جو اللہ کے زمین میں خلیفہ ہیں، کو نہ کھا جائے۔ یوسف (ع) کے بھائیوں نے یہ بات سمجھ لی اور اس پر یقین کر لیا کہ واقعی بھیڑیا یوسف (ع) کو کھا سکتا ہے، اسی لیے انہوں نے اسی بات کے ذریعے یعقوب (ع) کو جواب دیا۔

(قالُوا لَئِنْ أَکَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّا إِذاً لَخاسِرُونَ)[2]

(انہوں نے کہا: اگر اسے بھیڑیا کھا جائے حالانکہ ہم ایک قوی جماعت بھی (موجود) ہوں تو ہم تو بالکل ناکارہ ہوئے) ۔

لہٰذا یعقوب (ع) نے اپنے بیٹوں کو ایسی صورتِ حال میں رکھا کہ وہ آج کے گمراہوں کے عقیدے کے برخلاف یقین کریں، اور ان کے سامنے صاف اور واضح بات کے ساتھ یہ بات کہی کہ انہیں اس بات کا خوف ہے کہ کہیں اللہ کے خلیفہ کو بھیڑیا نہ کھا جائے۔ کیا اللہ کے نبی یعقوب (ع) سے یہ بات پوشیدہ تھی کہ بھیڑیا اللہ کے خلیفہ کو نہیں کھاتا؟ حالانکہ یہ مسئلہ ان باطل عقائد کے حامل لوگوں سے پوشیدہ نہیں رہا؟!!

لیکن یہ بات کہ یعقوب (ع) نے ایک باطنی معاملے کا ارادہ کیا تھا اور ان کا مقصد بھیڑیوں سے یوسف (ع) کے بھائی تھے، اس موضوع کے منافی نہیں ہے کہ یعقوب (ع) کے کلام کا ظاہر، اور وہ مفہوم جو سننے والا اس

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ یوسف، آیت 13۔

[2] . قرآن کریم، سورۂ یوسف، آیت 14۔

سے سمجھتا ہے، اور جو کچھ ان کے بیٹوں نے اس سے سمجھا، یہ سب واضح طور پر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ زمین میں اللہ کے خلیفہ، یعنی یوسف (ع) کو بھیڑیا کھا سکتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے بھیڑیا باقی لوگوں کو کھا سکتا ہے۔

زمین میں اللہ کا خلیفہ اور زبانیں

(وَ لَوْ جَعَلْناهُ قُرْآناً أَعْجَمِيا لَقالُوا لَوْ لا فُصِّلَتْ آياتُهُ ءَ أَعْجَمِي وَ عَرَبِي قُلْ هُوَ لِلَّذينَ آمَنُوا هُدى وَ شِفاءٌ وَ الَّذينَ لا يؤْمِنُونَ فِي آذانِهِمْ وَقْرٌ وَ هُوَ عَلَيهِمْ عَمًى أُولئِكَ ينادَوْنَ مِنْ مَكانٍ بَعيدٍ)[1]

(اور اگر ہم اسے عجمی قرآن بنادیتے تو وہ کہتے کہ اس کی آیتیں کھول کر کیوں بیان نہیں کی گئیں، کیا کتاب عجمی ہے اور رسول عربی ہے؟ کہہ دیجیے کہ یہ ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور شفا ہے، اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور یہ ان پر اندھا پن ہے، (گویا) وہ لوگ کسی دور کی جگہ سے پکارے جاتے ہیں)۔

کچھ لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تمام زبانوں کی شناخت زمین میں اللہ کے خلیفہ کی ایک دائمی خصوصیت ہے۔ یہ ایک باطل عقیدہ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔

اللہ کی حجت اس جسمانی عالم میں، زبانوں کی شناخت کے معاملے میں دوسرے لوگوں ہی کی طرح ہے۔ اس جسمانی عالم میں اس کے لیے تمام زبانوں کا جاننا ممکن نہیں، مگر معجزے کے ذریعے، اور یہ یقیناً ایک الگ مسئلہ ہے۔ ہم اُس معجزے کی بات نہیں کر رہے جو حکمتِ الٰہی کے تحت کبھی واقع ہوتا ہے اور کبھی واقع نہیں ہوتا، بلکہ ہم ایک ایسی معجزہ نما صفت کی بات کر رہے ہیں جو دائمی ہو؛ یعنی یہ کہ ہر حجت کو اس جسمانی عالم میں اور ہر زمانے میں تمام زبانوں کا علم ہونا چاہیے۔ بعید نہیں بعض نادان اور غلو کرنے والے لوگ اس غلط بات کے قائل ہیں۔ مزید یہ کہ یہ بات کسی دلیل سے ثابت نہیں، کیونکہ یہ تاریخی حقیقت، عقل اور قرآن کے خلاف ہے۔ اس موضوع کو واضح کرنے کے لیے درج ذیل نکات پر توجہ فرمائیں:

پہلا: اگر حجتیں تمام زبانوں میں گفتگو کر سکتی ہوتیں تو جن لوگوں سے ان کا سامنا ہوتا، وہ اسی بات کو دلیل بنا کر ان سے ایمان لانے کا مطالبہ کرتیں؛ اور کسی قطعی دلیل سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ اللہ کے خلفاء اپنی اقوام کے سامنے دوسری انسانی زبانوں کی معرفت کو بنیاد بنا کر ان سے استدلال کرتے تھے تاکہ وہ ان پر ایمان لے آئیں۔

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ فصلت، آیت 44۔

مزید یہ کہ اگر وہ تمام انسانی زبانیں جانتے ہوتے تو پھر دوسرے معجزات کی کیا ضرورت رہ جاتی؟ اگر موسیٰ (ع) بغیر کسی تعلیم کے متعدد زبانیں بول سکتے ہوتے تو پھر عصا کی کیا ضرورت تھی؟!

دوسرا: جیسا کہ قرآن میں واضح ہے، اللہ کے خلیفہ حضرت موسیٰ (ع) کسی بھی زبان میں صحیح اور فصیح انداز سے گفتگو کرنے کے قابل نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(وَ أَخِي هَارُونُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِساناً فَأَرْسِلْهُ مَعِي رِدْءاً يصَدِّقُنِي إِنِّي أَخافُ أَنْ يكَذِّبُونَ)[1]

(اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح زبان والا ہے، لہٰذا اسے میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیج دے تاکہ وہ میری تصدیق کرے، کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے)۔

(وَ يضِيقُ صَدْرِي وَ لا ينْطَلِقُ لِسانِي فَأَرْسِلْ إِلَى هَارُونَ)[2]

(اور میرا سینہ تنگ ہو جاتا ہے اور میری زبان نہیں کھلتی، لہٰذا ہارون کو میری طرف بھیج دے)۔

(وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسانِي * يفْقَهُوا قَوْلِي)[3]

(اور میری زبان کی گرہ کھول دے، تاکہ وہ میری بات سمجھ سکیں)۔

تورات، عہدِ قدیم میں آیا ہے:

موسیٰ نے کہا: اے پروردگار، میں ہر گز اچھا سخنور نہیں رہا، نہ پہلے اور نہ اب جب تُو نے مجھ سے کلام کیا ہے، بلکہ میں زبان کی لکنت رکھتا ہوں۔ خداوند نے فرمایا: انسان کو زبان کس نے دی؟ اور گونگے اور بہرے اور بینا اور نابینا کو کس نے پیدا کیا؟ کیا میں ہی نہیں جو خداوند ہوں؟ لہٰذا جا، اور میں تجھے قوتِ گویائی عطا کروں گا اور جو کچھ تجھے کہنا چاہیے وہ تجھے سکھاؤں گا۔ لیکن موسیٰ نے کہا: اے پروردگار، میں التجا کرتا ہوں کہ میرے بجائے کسی اور کو بھیج دے۔ لہٰذا پروردگار موسیٰ پر غضب ناک ہوا اور فرمایا: تیرا بھائی ہارون اچھا سخنور ہے، اور وہ اب آ رہا ہے تاکہ تجھے دیکھے، اور وہ تجھے دیکھ کر خوش ہوگا۔ جو کچھ تجھے بیان کرنا ہو وہ ہارون کو بتا دے تاکہ وہ تیری

---

1. قرآن کریم، سورۂ قصص، آیت 34۔
2. قرآن کریم، سورۂ شعراء، آیت 13۔
3. قرآن کریم، سورۂ طٰہٰ، آیات 27 اور 28۔

طرف سے بیان کرے۔ میں تم دونوں کو قوتِ بیان عطا کروں گا اور تمہیں بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔ وہ لوگوں کے سامنے تیرا ترجمان ہوگا، اور تو اس کے لیے خدا کی مانند ہوگا، اور جو کچھ تو اسے بتائے گا وہی بیان کرے گا۔[1]

موسیٰ نے پروردگار کے جواب میں کہا: جب بنی اسرائیل میری باتوں پر توجہ نہیں دیتے تو میں کیسے امید رکھوں کہ مصر کا بادشاہ میری بات سنے گا؟ میں اچھا سخنور نہیں ہوں۔[2]

لیکن موسیٰ نے پروردگار سے کہا: میں اچھا سخنور نہیں ہوں؛ پھر میں کیسے توقع رکھوں کہ مصر کا بادشاہ میری بات سنے گا؟[3]

تورات میں موسیٰ کی زبان کا مسئلہ حل نہیں ہوا، مگر ان کے بھائی ہارون (ع) کے مبعوث کیے جانے کے ذریعے۔ اس کے بعد کہ موسیٰ (ع) نے اپنی پہلی بات بیان کی، یہ جواب دیا گیا کہ ہارون کو مبعوث کیا جائے گا تاکہ وہ موسیٰ (ع) کی نیابت میں وہ بات کہے جو وہ کہنا چاہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے فرمایا: تم فرعون کے پاس میرے بھیجے ہوئے ہو اور تمہارا بھائی ہارون تمہارا ترجمان ہے۔ میں جو کچھ تم سے کہوں گا وہ ہارون کو بتانا، تاکہ وہ اسے فرعون تک پہنچائے اور اس سے بنی اسرائیل کو آزاد کرنے کا مطالبہ کرے۔[4]

یہ حضرت موسیٰ (ع) ہیں جو زمین میں اللہ کے خلفاء میں سے ایک خلیفہ اور انبیائے اولوالعزم میں شامل ہیں، اور قرآن اور تورات صراحت کے ساتھ اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی زبان میں لکنت تھی جو انہیں واضح الفاظ کو سامع کے لیے صاف اور قابلِ فہم انداز میں بیان کرنے سے روکتی تھی؛ اس کے باوجود اللہ سبحان و متعال نے انہیں مبعوث فرمایا اور ان کی زبان کی گرہ کو مکمل طور پر ختم نہیں کیا، بلکہ اس مشکل کا حل، جو پیغامِ رسالتِ الٰہی کی تبلیغ میں رکاوٹ بنتی تھی، موسیٰ (ع) کے لیے ایک مددگار بھیجنے میں رکھا، اور وہ ان کے بھائی ہارون تھے۔ اسی وجہ سے موسیٰ کی دعا قبول ہوئی اور ان کی زبان کی لکنت کا مسئلہ حل ہوا۔

---

1. عہدِ قدیم، کتابِ خروج، باب 4، آیات 10 سے 16۔
2. عہدِ قدیم، کتابِ خروج، باب 6، آیت 12۔
3. عہدِ قدیم، کتابِ خروج، باب 6، آیت 30۔
4. عہدِ قدیم، کتابِ خروج، باب 7، آیات 1 سے 2۔

(قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي * وَ يسِّرْ لِي أَمْرِي * وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي * يفْقَهُوا قَوْلِي * وَاجْعَلْ لِي وَزِيراً مِنْ أَهْلِي * هَارُونَ أَخِي * اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي * وَ أَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي * كَي نُسَبِّحَكَ كَثِيراً * وَ نَذْكُرَكَ كَثِيراً * إِنَّكَ كُنْتَ بِنا بَصِيراً * قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يا مُوسَى)[1]

(انہوں نے کہا: اے میرے رب! میرا سینہ کھول دے، اور میرے لیے میرا کام آسان کر دے، اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ میری بات سمجھ سکیں، اور میرے لیے میرے گھر والوں میں سے ایک مددگار مقرر کر دے، میرا بھائی ہارون، اس کے ذریعے میری کمر مضبوط کر دے، اور اسے میرے کام میں شریک کر دے، تاکہ ہم تیری بہت زیادہ تسبیح کریں، اور تجھے بہت زیادہ یاد کریں، بے شک تو ہم پر خوب نظر رکھنے والا ہے۔ فرمایا: اے موسیٰ! تجھے تیری مانگ عطا کر دی گئی)۔

قرآن، موسیٰ (ع) کی زبان کی گرہ اور بھاری پن کے باقی رہنے کو، ان کی رسالت کے بعد بھی، واضح طور پر بیان کرتا ہے۔ یہ بات فرعون کے کلام اور اس کی طرف سے موسیٰ (ع) کی زبان کی گرانی اور معنی کو واضح اور روشن انداز میں بیان نہ کر پانے پر کی گئی تنقید سے ظاہر ہوتی ہے:

(وَ نادى فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قالَ يا قَوْمِ أَ لَيسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَ هذِهِ الْأَنْهارُ تَجْرِي مِنْ تَحْتِي أَفَلا تُبْصِرُونَ * أَمْ أَنَا خَيرٌ مِنْ هذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ وَ لا يكادُ يبِينُ * فَلَوْلا أُلْقِي عَلَيهِ أَسْوِرَةٌ مِنْ ذَهَبٍ أَوْ جاءَ مَعَهُ الْمَلائِكَةُ مُقْتَرِنِينَ * فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَأَطاعُوهُ إِنَّهُمْ كانُوا قَوْماً فاسِقِينَ * فَلَمَّا آسَفُونا انْتَقَمْنا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْناهُمْ أَجْمَعِينَ * فَجَعَلْناهُمْ سَلَفاً وَ مَثَلاً لِلْآخِرِينَ)[2]

(اور فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا: اے میری قوم! کیا مصر کی بادشاہی اور یہ نہریں جو میرے محلوں کے نیچے بہتی ہیں، میری نہیں ہیں؟ کیا تم دیکھتے نہیں؟ کیا میں اس شخص سے بہتر نہیں ہوں جو حقیر ہے اور بات واضح طور پر بیان بھی نہیں کر پاتا؟ تو پھر کیوں اس پر سونے کے کنگن نہیں ڈالے گئے یا اس کے ساتھ فرشتے ساتھ ساتھ نہیں آئے؟ پھر اُس نے اپنی قوم کو بے وقوف بنا لیا، سو اُن لوگوں نے اُس کا کہنا مان لیا، بیشک وہ لوگ ہی نافرمان قوم تھے، بے شک وہ نافرمان لوگ تھے۔ پھر جب انہوں نے ہمیں غضب ناک کیا تو ہم نے ان

---

[1] . قرآنِ کریم، سورۂ طٰہٰ آیات 25 سے 36۔

[2] . قرآنِ کریم، سورۂ زخرف آیات 51 سے 56۔

سے انتقام لیا اور ان سب کو غرق کر دیا، اور ہم نے انہیں گئے گزرے اور پیچھے آنے والوں کے لیے عبرت اور مثال بنا دیا)۔

بد قسمتی سے فرعون نے اپنی قوم کو نہایت گھٹیا اور پست اعتراضات کے ذریعے ذلیل کیا، ایسے اعتراضات جو وہ بار بار دہراتا رہا، اور انہیں مسلسل اس لیے پیش کرتا رہا تاکہ وہ حضرت موسیٰ (ع) کا انکار کریں۔ فرعون کے حضرت موسی (ع) پر اعتراضات یہ تھے کہ موسی (ع) کی گفتگو فصیح اور واضح نہیں ہے اور یہ کہ وہ کوئی ایسی روشن نشانی لے کر نہیں آئے جس میں کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ (لا يكادُ يبينُ فَلَوْلا أُلْقِيَ عَلَيهِ أَسْوِرَةٌ مِنْ ذَهَبٍ أَوْ جاءَ مَعَهُ الْمَلائِكَةُ مُقْتَرِنِينَ) (وہ تو ٹھیک طرح سے بات بھی نہیں کر پاتا، تو پھر کیوں اس پر سونے کے کنگن نہیں ڈالے گئے یا اس کے ساتھ فرشتے ساتھ ساتھ نہیں آئے؟)

اس نے دو اعتراضات پیش کیے ہیں، اگر آپ تمام آسمانی رسالتوں کا مطالعہ کریں تو یہی دو اعتراضات آپ کو ملیں گے، اور اگر تمام منکرینِ رسالت کو تلاش کریں تو دیکھیں گے کہ وہ بھی یہی دو اعتراضات پیش کرتے ہیں۔ سبحان اللہ! کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے دل ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں:

(وَقالَ الَّذينَ لا يعلَمونَ لَولا يكَلِّمُنا اللَّهُ أَو تَأتينا آيةٌ كَذلِكَ قالَ الَّذينَ مِن قَبلِهِم مِثلَ قَولِهِم تَشابَهَت قُلوبُهُم قَد بَيَّنَّا الآياتِ لِقَومٍ يوقِنونَ)[1]

(اور نادان لوگوں نے کہا کہ اللہ ہم سے کیوں نہیں کلام کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی ایسی ہی بات کہی تھی۔ ان کے دل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ ہم نے یقین رکھنے والی قوم کے لیے نشانیاں خوب واضح کر دی ہیں)۔

یہ وہی اعتراضات ہیں جنہیں گمراہی کے امام اور وفقہای سوء (برے علما) ہمیشہ دہراتے آئے ہیں، اور انہی کے ذریعے اپنی قوم کو ذلیل کرتے ہیں اور انہیں ہلاکت کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگر حضرت موسی (ع) کی زبان میں کچھ گرانی تھی اور فرعون نے اسی پر اعتراض کیا، تو کیا حضرت محمد (ص) جن کی زبان میں کوئی گرانی نہ تھی، (اس اعتراض سے) محفوظ رہ سکے؟ اور کیا وہ قرآن جو حضرت محمد (ص) لے کر آئے، ان اعتراضات سے بچ سکا جو ہمیشہ گمراہی کے اماموں کے ساتھ رہے ہیں؟ اللہ کی قسم! ہر گز نہیں۔ عیسائی اور دوسرے لوگ آج تک قرآن پر یہ اعتراض کرتے آرہے ہیں کہ یہ عربی زبان کے قواعد، نحو اور بلاغت کے خلاف ہے...

---

[1] .قرآن کریم، سورۂ بقرہ، آیت 118۔

تیسرا: اگر اللہ کے خلفا تمام زبانیں جانتے ہوتے تو آسمانی کتابیں ان پر تمام زبانوں میں نازل کی جاتیں۔ اللہ قادر ہے اور یہ بات حکمت کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ اس صورت میں جو واحد مسئلہ باقی رہ جاتا ہے وہ قابل اور قبول کرنے والے کی صلاحیت میں رکاوٹ کا ہے۔ اور وہ رکاوٹ یہ ہے کہ رسول صرف اپنی ہی قوم کی زبان جانتے تھے۔ اگر حضرت محمد (ص) کئی زبانیں جانتے ہوتے تو قرآن ان پر متعدد زبانوں میں نازل ہونا چاہیے تھا وہ ان بادشاہوں کی زبانوں میں قرآن کے محتاج تھے جنہیں انہوں نے خطوط بھیجے اور ایمان کی دعوت دی۔ یہ کام کم از کم اس لیے ضروری تھا کہ وہ اس کلام کے ایک حصے سے آگاہ ہو سکیں جو حضرت محمد (ص) کی طرف وحی کیا گیا تھا، جس طرح اس زمانے میں عرب آگاہ ہوئے تھے۔ یقیناً قرآن کا یہ ترجمہ اُن تراجم سے کہیں بہتر ہوتا جو بعد میں آئے، اور یہ دلیل و حجت کو زیادہ مضبوط کرنے والا اور زیادہ فائدہ مند ہوتا۔ غیر معصوم افراد کے تراجم میں واقعی بہت سی مشکلات پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے تراجم معانی کو اس طرح منتقل کرتے ہیں جیسے قاری اور مترجم خود سمجھتے ہیں، نہ کہ اس اصل بولنے والے کے مقصود کے مطابق۔

اس وقت قرآن کے بے شمار تراجم انگریزی زبان میں موجود ہیں، اور ان کے درمیان الفاظ اور معانی میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ عقل یہ کہتی ہے کہ جب تک صورتِ حال ایسی ہے، محمد (ص) پر قرآن کو انگریزی زبان میں نازل کرنے کے موقع کا ضائع ہو جانا، جبکہ وہ انگریزی جانتے ہوں، حکمت کے خلاف ہے؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا کام انجام نہیں دیتا جو حکمت کے خلاف ہو۔ لہٰذا صرف ایک ہی حالت ممکن رہ جاتی ہے، اور وہ یہ کہ محمد (ص) عربی کو اپنی قوم کے لہجے کے ساتھ جانتے تھے اور انگریزی اور دیگر زبانوں کو نہیں جانتے تھے؛ اسی وجہ سے قرآن محمد (ص) اور ان کی قوم قریش کے لہجے میں نازل کیا گیا، اور حتیٰ کہ عربی کے وہ دوسرے لہجے بھی جن کا وجود محمد رسول اللہ (ص) کے زمانے میں تھا، ان میں بھی نازل نہیں کیا گیا۔

چوتھا: حضرت محمد (ص) نے دنیا کے بادشاہوں کو اپنے خطوط عربی زبان میں بھیجے۔ اگر حضرت محمد (ص) عربی کے علاوہ کوئی اور زبان جانتے ہوتے تو وہ ان بادشاہوں کو اپنے خطوط انہی کی اپنی زبان میں بھیجتے۔ یہ کام ان پر اور ان کے حق میں حجت اور دلیل قائم کرنے کے لیے زیادہ مؤثر ہوتا؛ خصوصاً اس زمانے میں مترجمین کی کمی کے باوجود، آپ (ص) کا مختلف زبانوں سے واقف ہونا بادشاہوں کے لیے ایک واضح معجزہ اور ان کے لیے ایک روشن دلیل ہوتا۔

پانچواں: اگر ائمہ زبانوں کو جانتے ہوتے تو کم از کم قرآن کی بعض آیات ہی کا ترجمہ ضرور کرتے؛ اگر یہ نہ کہیں کہ ان پر لازم تھا کہ پورے قرآن کا تمام زبانوں میں ترجمہ کرتے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے خلفا ہیں اور متکلم، سبحانہ و تعالیٰ، کے مقصود کو باقی تمام مخلوقات سے بہتر جانتے ہیں۔ اگر امام جعفر صادق (ع) فارسی جانتے ہوتے، جبکہ ان کے پاس ایرانیوں میں سے ہزاروں شیعہ موجود تھے جو حق پر ایمان رکھتے تھے، تو پھر کیا چیز مانع تھی کہ وہ کم از کم قرآن کی بعض آیات ہی ان کے لیے فارسی میں ترجمہ کر دیتے؟ بلکہ اگر یہ بھی نہ کہیں کہ ان پر لازم تھا کہ پورا قرآن ہی ان کے لیے ترجمہ کرتے، اس لیے کہ وہ اس کے محتاج تھے!

اس کے سوا کوئی جواب نہیں کہ وہ فارسی نہیں جانتے تھے، ورنہ قرآن کا ترجمہ کرنے سے ان کا اجتناب - جبکہ وہ فارسی زبان سے واقف ہوتے - حکمت کے خلاف ہوتا۔ آنحضرت (ع) تمام لوگوں سے بڑھ کر متکلمِ سبحان کے مقصود کو جانتے تھے۔

اس کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ارواح تمام زبانوں کو جانتی ہیں اور ہر جانور اور پرندے کی زبان سے بھی آگاہ ہیں؛ لیکن اس کا اس عالم میں ان کی حالت سے کوئی تعلق نہیں جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، کیونکہ ان کے اجسام نے انہیں اس مادی عالم کے حجاب میں رکھا ہوا ہے۔ اس عالم میں وہ اپنی قوم کی اسی زبان کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے جو انہوں نے سیکھی ہو۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی اپنی زبان کے علاوہ کسی اور زبان کے ساتھ مبعوث نہیں فرمایا۔

(وَما أَرْسَلْنا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللَّهُ مَنْ يَشاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ)[1]

(اور ہم نے کوئی رسول اس کی قوم ہی کی زبان کے سوا نہیں بھیجا، تاکہ وہ ان کے لیے [حقائق کو] واضح کر دے۔ پھر اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اور وہی غالب، حکمت والا ہے)

وہ ہر زبان کو یا تو تعلیم کے ذریعے سیکھتے تھے، اور یہ ایک فطری امر ہے، یا پھر معجزے کے ذریعے، اور اس صورت میں یہ بے مقصد نہ ہوتا بلکہ معجزہ کسی معین حکمت اور فائدے کے لیے ظاہر کیا جاتا تھا۔ جیسے جنّات کی زبان کا علم، اس وجہ سے کہ وہ مکلّف ہیں، یا کسی خاص زبان کا علم اس زبان کے ذریعے مخالفین پر حجت قائم کرنے کے لیے تاکہ وہ ایمان لے آئیں۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے سلیمان (ع) کو پرندوں سے گفتگو کرنا

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ ابراہیم، آیت 4۔

سکھایا، تو ایسا ہی کیا۔ انہوں نے پرندوں کی زبان کے علم کے ذریعے اپنے مخالفین پر استدلال کیا تاکہ وہ ان پر ایمان لے آئیں۔

(وَوَرِثَ سُلَيمانُ داوُدَ وَقالَ يا أَيهَا النَّاسُ عُلِّمْنا مَنْطِقَ الطَّيرِوَأُوتينا مِنْ كُلِّ شَيءٍ إِنَّ هذا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِينَ)[1]

(اور سلیمان نے داؤد کی وراثت پائی اور کہا: اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے اور ہمیں ہر چیز عطا کی گئی ہے، بے شک یہ کھلا ہوا فضل ہے)۔

گزشتہ مباحث کا نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ کا خلیفہ اس عالمِ جسمانی میں ہر زمانے میں تمام انسانی زبانوں کو پہچاننے کی قدرت رکھتا ہونا چاہیے، اس عقیدے کے لیے قطعی دلیل کا محتاج ہے، جبکہ ایسی کوئی دلیل موجود نہیں۔ زیادہ سے زیادہ جس چیز پر وہ استناد کرتے ہیں، اگر اسے خیال نہ بھی کہیں تو محض گمان اور اندازے ہیں جن کا ماخذ اکثر اوقات غلو کرنے والوں کی روایات ہوتی ہیں، اور قرآن، عقل، حکمت اور حقیقت ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، دلائل اس دعوے کے خلاف ہیں اور اس کی تائید نہیں کرتے۔

یہ ان روایات میں سے بعض ہیں جن سے ان افراد کے عقیدے کے بالکل برعکس مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے:

حَبّہ بن جوین عُرَنی بیان کرتے ہیں: میں نے امیر المؤمنین علی (ع) سے سنا، آپ نے فرمایا: (یوشع بن نون، موسی بن عمران کے وصی تھے، اور موسیٰ کی تختیاں سبز زمرد کی تھیں۔ جب موسیٰ غضب ناک ہوئے تو انہوں نے تختیاں اپنے ہاتھوں سے گرادیں، ان میں سے کچھ ٹوٹ گئیں اور کچھ باقی رہیں، اور کچھ اٹھالی گئیں۔ پھر جب موسی کا غضب ٹھنڈا ہوا تو یوشع بن نون نے عرض کیا: کیا تختیوں میں جو کچھ تھا اس کا بیان آپ کے پاس ہے؟ آپ (ع) نے فرمایا: ہاں۔ ایک گروہ کے بعد دوسرا گروہ ان کا وارث بنتا رہا، یہاں تک کہ وہ یمنیوں کے چار گروہوں کے ہاتھ آ گئیں، اور محمد (ص) تہامہ میں مبعوث ہوئے۔ ان تک خبر پہنچی تو انہوں نے کہا: یہ نبی (ص) کیا کہتے ہیں؟ کہا گیا: وہ شراب اور زنا سے روکتے ہیں اور اچھے اخلاق اور حسنِ ہمسائیگی کا حکم دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا: یہ اس چیز کے زیادہ حق دار ہیں جو ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اتفاق کیا کہ فلاں مہینے ان کے پاس جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو وحی فرمائی کہ وہ نبی (ص) کے پاس جائیں اور انہیں خبر دیں۔ وہ ان کے

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ نمل، آیت 16۔

پاس آئے اور عرض کیا: فلاں اور فلاں اور فلاں نے موسی کی تختیاں وراثت میں پائی ہیں اور وہ فلاں مہینے اور فلاں رات آپ کے پاس آئیں گے۔ اس رات آپ (ص) ان کے انتظار میں بیدار رہے۔ قافلہ آیا، انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور عرض کیا: اے محمد! آپ (ص) نے فرمایا: ہاں، اے فلاں بن فلاں، فلاں بن فلاں، فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں۔ وہ کتاب کہاں ہے جسے تم نے یوشع بن نون، موسیٰ بن عمران کے وصی سے وراثت میں پایا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں، اور آپ محمد (ص) اللہ کے رسول ہیں۔ خدا کی قسم! جب سے وہ تختیاں ہمارے پاس تھیں، آپ سے پہلے کوئی شخص ان کے بارے میں آگاہ نہ تھا۔ آپ (ع) نے فرمایا: پھر نبی (ص) نے اسے لیا، اس میں عبرانی زبان کی نہایت دقیق تحریر تھی، اور انہوں نے وہ مجھے دے دی۔ میں نے اسے اپنے سرہانے رکھ دیا، اور صبح جب میں نے اس کتاب کو دیکھا تو وہ ایک عظیم عربی کتاب تھی جس میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا علم آسمانوں اور زمین کے قائم ہونے سے لے کر قیامت کے قائم ہونے تک درج تھا۔ میں اس کے علم سے آگاہ ہو گیا)[1]

امام صادق (ع) نے فرمایا: (جفر میں یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جب موسی (ع) کے لیے تختیاں نازل کیں تو اس حال میں نازل کیں کہ ان میں ہر چیز کا بیان تھا اور ہر وہ چیز جو قیامت قائم ہونے تک پیش آنے والی ہے۔ جب موسی (ع) کا زمانہ اختتام کو پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ تختیوں کو پہاڑ میں امانت کے طور پر رکھ دیں، اور یہ تختیاں زبرجد کی تھیں اور جنت سے تھیں۔ موسی (ع) پہاڑ کے پاس آئے تو پہاڑ ان کے لیے شگاف ہو گیا، انہوں نے تختیوں کو لپیٹی ہوئی حالت میں اس میں رکھ دیا۔ جب انہوں نے انہیں وہاں رکھ دیا تو پہاڑ نے انہیں ڈھانپ لیا۔ یہ تختیاں ہمیشہ پہاڑ میں رہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد (ص) کو مبعوث فرمایا۔ یمن سے ایک قافلہ، جو رسول (ص) کی طرف جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا، روانہ ہوا۔ جب وہ پہاڑ کے پاس پہنچے تو پہاڑ کھل گیا اور تختیاں لپٹی ہوئی اسی حالت میں باہر آ گئیں جس طرح موسی (ع) نے انہیں رکھا تھا۔ اس گروہ نے اسے لے لیا۔ جب وہ ان کے ہاتھوں میں آ گئی تو ان کے دلوں میں یہ بات پیدا ہوئی کہ اس پر نظر نہ ڈالیں، اور وہ اس سے خوف زدہ تھے، یہاں تک کہ اسے رسول اللہ (ص) کے پاس لے آئے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو اپنے نبی (ص) کے پاس بھیجا اور انہیں اس گروہ کے عمل اور اس حالت سے آگاہ کیا جس میں وہ مبتلا ہوئے تھے۔ جب وہ نبی (ص) کے پاس پہنچے تو رسول اللہ (ص) نے آغاز کیا اور ان سے اس چیز کے بارے میں

---

[1] . بصائر الدرجات، صفّار، ص 146۔

پوچھا جو انہوں نے پائی تھی۔ انہوں نے عرض کیا: آپ کو اس چیز کی خبر کیسے ہے جو ہم نے پائی؟ آپ (ص) نے فرمایا: میرے پروردگار نے مجھے خبر دی، اور وہ تختیاں تھیں۔ انہوں نے عرض کیا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ رسول اللہ ہیں۔ پھر انہوں نے انہیں باہر نکالا اور آپ (ص) کے حوالے کر دیا۔ آپ (ص) نے ان پر نظر ڈالی اور پڑھا، اور ان کی تحریر عبرانی تھی۔ پھر آپ (ص) نے امیر المؤمنین (ع) کو بلایا اور فرمایا: اسے لے لو۔ اس میں علمِ اوّلین بھی ہے اور علمِ آخرین بھی۔ یہ موسی کے الواح ہیں۔ میرے پروردگار نے مجھے حکم دیا کہ میں اسے تمہارے حوالے کر دوں۔ انہوں نے عرض کیا: اے رسولِ اللہ (ص)! میں اسے اچھی طرح نہیں پڑھ سکتا۔ آپ (ص) نے فرمایا: جبرئیل نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم آج رات اسے اپنے سرہانے رکھ دو، کیونکہ تم صبح بیدار ہو گے تو اسے پڑھنا جان لو گے۔ چنانچہ انہوں نے اسے اپنے سرہانے رکھ دیا، پھر صبح بیدار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس میں موجود ہر چیز کا علم عطا فرما دیا۔ اس کے بعد رسولِ اللہ (ص) نے انہیں حکم دیا کہ اس کی ایک نقل تحریر کریں۔ انہوں نے اسے بکری کی کھال پر نقل کیا، اور یہی جفر ہے، اور اس میں علمِ اوّلین و آخرین ہے، اور وہ ہمارے پاس ہے۔ نیز موسی کے الواح اور ان کا عصا بھی ہمارے پاس ہے، اور ہم رسولِ اللہ (ص) کے وارث ہیں)[1]

امام صادق (ع) نے فرمایا: (جفر میں ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جب موسی (ع) کی طرف الواح بھیجے تو اس حال میں بھیجے کہ ان میں ہر چیز کی وضاحت موجود تھی اور وہ تمام امور بھی درج تھے جو قیامت قائم ہونے تک پیش آنے والے ہیں۔ جب موسی (ع) کا زمانۂ حیات اختتام کو پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ وہ ان الواح کو پہاڑ میں بطور امانت رکھ دیں۔ یہ الواح زبرجد کے تھے اور جنت سے تعلق رکھتے تھے اور انہیں زینت کہا جاتا تھا۔ موسی (ع) پہاڑ کے پاس آئے تو پہاڑ ان کے لیے شگافتہ ہو گیا، چنانچہ انہوں نے ان الواح کو لپیٹی ہوئی حالت میں اس کے اندر رکھ دیا۔ جب انہوں نے انہیں وہاں رکھ دیا تو پہاڑ نے انہیں ڈھانپ لیا۔ یہ الواح ہمیشہ اسی پہاڑ میں رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد (ص) کو مبعوث فرمایا۔ یمن سے ایک قافلہ رسول اللہ (ص) کی طرف آنے کے ارادے سے روانہ ہوا۔ جب وہ اس پہاڑ کے پاس پہنچے تو پہاڑ کھل گیا اور الواح اسی طرح لپیٹی ہوئی حالت میں، جس طرح موسی (ع) نے رکھے تھے، باہر آ گئے۔ اس گروہ نے انہیں اٹھا لیا۔ جب وہ ان کے ہاتھوں میں آئے تو ان کے دلوں میں ایسا خوف پیدا ہوا کہ وہ انہیں دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے اور ان سے

---

[1] . بصائر الدرجات، صفّار، ص 140۔

خوف زدہ رہے، یہاں تک کہ وہ انہیں رسول اللہ (ص) کے پاس لے آئے۔ اس دوران اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو اپنے نبی کے پاس بھیجا اور انہیں اس گروہ کے معاملے اور اس چیز سے آگاہ فرمایا جس سے وہ دوچار ہوئے تھے۔ جب وہ رسول اللہ (ص) کے پاس پہنچے تو رسول اللہ (ص) نے گفتگو کا آغاز کیا اور ان سے اس چیز کے بارے میں سوال فرمایا جو انہوں نے پائی تھی۔ انہوں نے عرض کیا: آپ کو اس چیز کا کیسے علم ہے جو ہم نے پائی ہے؟ آپ (ص) نے فرمایا: میرے پروردگار نے مجھے اس کی خبر دی ہے، اور وہ (موسی کی) الواح ہیں۔ انہوں نے عرض کیا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ رسول اللہ ہیں۔ پھر انہوں نے انہیں باہر نکالا اور آپ (ص) کے حوالے کر دیا۔ آپ (ص) نے ان پر نظر ڈالی اور انہیں پڑھا، اور ان کی تحریر عبرانی زبان میں تھی۔ اس کے بعد آپ (ع) نے امیر المؤمنین (ع) کو بلایا اور فرمایا: اسے لے لو، اس میں اولین اور آخرین کا علم ہے، یہ موسی (ع) کی الواح ہیں۔ میرے پروردگار نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں انہیں تمہارے حوالے کر دوں۔ امیر المؤمنین (ع) نے عرض کیا: یارسولَ اللہ! میں اسے اچھی طرح نہیں پڑھ سکتا۔ آپ (ص) نے فرمایا: جبرئیل نے مجھے حکم دیا ہے کہ آج رات اسے اپنے سرہانے رکھو، کیونکہ تم صبح بیدار ہو گے تو اسے پڑھنا جان لو گے۔ چنانچہ انہوں نے اسے اپنے سرہانے رکھ دیا، اور جب صبح بیدار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس میں موجود ہر چیز کا علم عطا فرما دیا۔ رسولُ اللہ (ص) نے انہیں حکم دیا کہ اس کی ایک نقل لکھیں۔ انہوں نے اسے بھیڑ کی کھال پر نقل کیا، اور یہی جفر ہے، اور اس میں اولین اور آخرین کا علم ہے، اور وہ ہمارے پاس ہے۔ اور موسی (ع) کی الواح اور عصا بھی ہمارے پاس ہیں، اور ہم انبیاء کے وارث ہیں۔ پھر فرمایا: امام باقر (ع) نے فرمایا: وہ چٹان جس نے موسی (ع) کی الواح کی حفاظت کی، ایک درخت کے نیچے اس سرزمین میں ہے جو فلاں نام سے جانی جاتی ہے۔)[1]

معصوم کا سہو اور نسیان

سہو کیا ہے اور نسیان کیا ہے؟

سہو وہ حالت ہے جس میں یاد نہ رہنے کے سبب کسی کام کا انجام پانا یا کسی چیز کا ترک ہونا غفلت اور لاعلمی کی بنیاد پر واقع ہو جاتا ہے۔

---

[1] . تفسیر عیاشی، جلد 2، ص 77۔

اور نسیان یا فراموشی دراصل وہی بھول جانا ہے جو لاعلمی کی حالت میں کسی چیز کے ترک کیے جانے[1] اور یاد نہ رہنے کا سبب بنتا ہے۔ نیز لفظ نسیان یا فراموشی بعض اوقات کسی چیز کے ترک کرنے یا اس میں کوتاہی کرنے کے لیے جان بوجھ کر اور علم کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے، لیکن اس معنی کے لیے کسی قرینے کی ضرورت ہوتی ہے جو لفظ کو اسی مفہوم کی طرف لوٹائے، کیونکہ فراموشی کی اصل بنیاد غفلت کے تحت ترک کرنا ہے، نہ کہ دانستہ علم کے ساتھ ترک کرنا اور عمداً بے پرواہی اختیار کرنا۔ یہ آخری معنی اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف منسوب کیا جاتا ہے:

(الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَهْوًا وَلَعِبًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ نَنْسَاهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هَذَا وَمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ)[2]

(وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا لیا اور دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکے میں ڈال دیا، لہٰذا آج ہم بھی انہیں اسی طرح بھلا دیں گے جیسے انہوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور وہ ہماری آیات کا انکار کیا کرتے تھے) ۔

«نَنْسَاهُمْ» (ہم انہیں بھلا دیں گے) سے مراد یہ ہے کہ ہم انہیں چھوڑ دیں گے اور ان کے بارے میں بے اعتنائی اختیار کریں گے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيدِيهُمْ نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيهُمْ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ)[3]

(منافق مرد اور منافق عورتیں ایک ہی جیسے ہیں، وہ برے کام کا حکم دیتے ہیں اور اچھے کام سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو (انفاق سے) روکے رکھتے ہیں، انہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا، بے شک یہی منافق لوگ نافرمان ہیں)۔

«نَسِيهُمْ» سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں چھوڑ دیا ہے اور ان کے بارے میں بے اعتنائی اختیار کی ہے۔

---

1 . کسی ایسی چیز کو یاد نہ کرنا جسے انسان جانتا ہو، غفلت کی بنا پر کسی چیز کو ترک کرنا بھی ہے۔

2 . قرآن کریم، سورۂ اعراف، آیت 51۔

3 . قرآن کریم، سورۂ توبہ، آیت 67۔

یہ نسیان جو یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جیسا کہ بعض لوگ گمان کرتے ہیں، محض ترک کرنا نہیں ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتا: «نَتْرُكَهُم» (ہم انہیں چھوڑ دیتے ہیں)، بلکہ اس سے مراد علم کے ساتھ ترک کرنا ہے جو بے اعتنائی اور عدمِ اہتمام کے ساتھ ہو۔

خلاصہ یہ کہ فراموشی کے دو معنی ہیں:

اول: غفلت کے ساتھ ترک کرنا۔ یہی وہ فراموشی ہے جسے ہم جانتے ہیں، اور جب لفظ «نَسِی» «اس نے فراموش کیا» سنا جاتا ہے تو یہی معنی فوراً ذہن میں آتا ہے۔

دوم: جان بوجھ کر بے اعتنائی کی غرض سے ترک کرنا۔ اس معنی کے لیے کسی قرینے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ لفظ اسی مفہوم کی طرف لوٹ سکے۔

عموماً لفظ نسیان محض ترک کرنے کے معنی میں نہیں آتا، کیونکہ اس معنی کے لیے ایک خاص لفظ موجود ہے اور وہ «تَرَکَ» (ترک کرنا) ہے۔

جس موضوع پر ہم بحث کر رہے ہیں وہ فراموشی کی پہلی قسم ہے، یعنی غفلت کے ساتھ ترک کرنا۔

سہو اور نسیان

حقیقت میں اور مجموعی طور پر انسان کے ہاں سہو اور نسیان کا مسئلہ ایک پہلو سے نفسِ انسانی سے مربوط ہے اور دوسرے پہلو سے دماغ سے، جو ہر کامل انسان کے جسم میں ایک حیاتیاتی آلہ ہے۔ یہ حیاتیاتی آلہ محدود صلاحیتیں رکھتا ہے، جیسے دماغ کی توجہ مرکوز کرنے کی صلاحیت۔ انسانی دماغ میں توجہ مرکوز کرنے اور یاد رکھنے کی صلاحیت محدود ہوتی ہے۔ یہ بالکل فطری بات ہے کہ دماغ ایک ہی وقت میں انتہائی دقت کے ساتھ مختلف امور پر توجہ مرکوز نہیں کر سکتا اور نہ ہی انہیں بیک وقت پیروی کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔ یہ بھی فطری ہے کہ کوئی بھی انسان نسیان اور سہو سے، بالخصوص مرکب، پیچیدہ یا پے در پے کاموں میں محفوظ نہیں رہ سکتا، کیونکہ یہ ایک لازمی امر ہے جو ہمارے مادی دماغ کے ساتھ ہے اور اس سے بچنے کی کوئی راہ نہیں۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگ اپنے طے شدہ امور اور انجام دینے والے کاموں کو لکھ کر رکھنے کے ذریعے خود کو نسیان اور سہو سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور وہ افراد جن کے ذمہ اہم کام ہوتے ہیں، ایسے اشخاص کو ملازم رکھتے ہیں جو ان کے معاملات اور وعدوں کو درج کریں، ان کی پیروی کریں اور انہیں یاد دہانی کراتے رہیں۔

اسی وجہ سے بعض آلات کے بنانے والے، جنہیں انسان استعمال کرتا ہے، ان میں نوری، بصری یا صوتی یاد دہانی کے نظام شامل کر دیتے ہیں؛ کیونکہ ان آلات میں عموماً متعدد امور ہوتے ہیں جن کی نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ تجربے کی بنا پر جانتے ہیں کہ انسان بعض مسائل پر توجہ مرکوز کرنے کے نتیجے میں دوسرے بعض مسائل کے بارے میں نسیان اور سہو کا شکار ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات انسان کسی چیز کو لینے کے لیے کسی جگہ جاتا ہے، لیکن جب وہاں پہنچتا ہے تو آنے کی وجہ ہی بھول جاتا ہے؛ کیونکہ راستے میں اس کے خیالات ایسی چیزوں میں مشغول ہو جاتے ہیں جو اس کے دماغ کو اصل موضوع پر توجہ مرکوز رکھنے سے باز رکھتی ہیں۔

کبھی انسان کسی مخصوص مسئلے کے بارے میں بات کر رہا ہوتا ہے، لیکن اس کے خیالات کسی دوسرے موضوع میں الجھ جاتے ہیں اور وہ تھوڑی دیر اسی موضوع پر توجہ مرکوز کر لیتا ہے؛ مگر جب وہ دوبارہ اصل بحث کی طرف لوٹنا چاہتا ہے، جو اس کی گفتگو کا موضوع تھا، تو اسے بھول جاتا ہے اور بسا اوقات سننے والوں میں سے گفتگو کے موضوع کے بارے میں پوچھ لیتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کسی معین موضوع پر بات کرنا چاہتا ہے، لیکن مخاطب کسی دوسرے موضوع پر گفتگو شروع کر دیتا ہے، اور نتیجتاً انسان اپنی بات کے اصل موضوع کو بھی بھول جاتا ہے۔

ان تمام حالتوں میں بھول جانے کی دلیل یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں متعدد امور پر توجہ مرکوز رکھنے کی انسانی دماغ کی صلاحیت محدود ہوتی ہے؛ اور وہ ہر وقت صرف ایک ہی معین موضوع پر توجہ مرکوز کر سکتا ہے۔ یہ مسئلہ انسانی مادی جسم کے حوالے سے ایک فطری امر ہے اور اس کا اس کی روح یا نفس سے کوئی تعلق نہیں کہ روحانی مقام میں ترقی یا بلندی کی صورت میں اس کی توجہ مرکوز کرنے کی صلاحیت بہتر ہو جائے۔ یہ کہ انسان کی طبیعت نسیان اور سہو کا شکار ہو جاتی ہے، ایک تجربی امر ہے۔ ہر کوئی اسے دیکھ سکتا ہے اور کسی ایک شخص کے حالات کا جائزہ لے کر اور اسے دوسروں کے ساتھ تطبیق دے کر اسے قریب سے مشاہدہ کر سکتا ہے۔ یہ موضوع علمی اعتبار سے ثابت شدہ ہے اور معصوم فرد بھی ایک انسان ہی ہے۔

سہو ایک فطری حالت ہے جو معصوم فرد پر بھی دوسرے تمام انسانوں کی طرح طاری ہوتی ہے، لہٰذا سہو سے عصمت کا فرض کرنا، چاہے مطلق طور پر ہو یا صرف عبادت میں سہو سے عصمت، قطعی دلیل کا محتاج ہے؛ اور یہ قطعی دلیل یا تو کوئی محکم آیت ہے یا اسی موضوع کے بارے میں، ایسی روایت جو قطعی الصدور اور قطعی

الدلالت ہو، یا پھر کوئی کامل عقلی دلیل ہو۔ لیکن جو لوگ معصوم کے سہو اور نسیان سے مطلق طور پر یا عبادت میں محفوظ ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں، ان کے پاس ان قطعی دلائل میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ معصوم کے سہو اور نسیان کے مسئلے میں شیعہ متکلمین اور فقہاء کسی ایک متفقہ رائے پر متفق نہیں ہیں؛ چہ جائیکہ تمام اسلامی متکلمین اور فقہاء (شیعہ اور غیر شیعہ) اس پر اتفاقِ رائے رکھتے ہوں۔

اللہ کے فضل سے، اہلِ ایمان اور حق کے طالب افراد حقیقت تک پہنچ کر اور ایک واضح و روشن نتیجہ حاصل کر کے، جس میں کوئی شبہ نہ ہو، معصوم کے سہو اور نسیان کے مسئلے سے آگے بڑھ جائیں گے۔

سہو اور نسیان کے مسئلے کے بارے میں وہ حقیقت جو قرآنِ محکم اور صریح کے خلاف نہیں ہے، یہ ہے کہ موسیٰ اور یوشعؑ نے اپنی مچھلی کو بھلا دیا:

(فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا)[1]

(پھر جب وہ دونوں دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر پہنچے تو اپنی مچھلی کو بھول گئے، تو اس نے سمندر میں سرنگ کی طرح اپنا راستہ بنالیا اور چلی گئی)

یعنی وہ دونوں اپنی مچھلی کو بھول گئے؛ اس وجہ سے کہ انہوں نے اسے یاد نہ رکھا اور اس سے غافل ہو گئے؛ نیز اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کے مقام کی حفاظت کے لیے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نمونہ اور مبلغ ہوتا ہے، بعض امور میں اسے بیرونی یاد دہانی کے ذریعے معصوم اور باز رکھا جانا چاہیے۔

ابتدا میں میں اس تحریر کو نقل کرتا ہوں جو میں نے کتاب « رحلۃ موسی (علیہ السلام) » میں نسیان کے بارے میں لکھی ہے؛ اس لیے کہ یہ ایک مقدمہ ہے جو اس موضوع پر گفتگو سے پہلے مفید ثابت ہو سکتی ہے:

نسیان اور فراموشی

ابتدا ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ انسان میں حافظہ اور معلومات کس طرح ہوتی ہیں، تاکہ اس کے بعد ہم اُن چیزوں کو پہچان سکیں جو حافظے پر اثر انداز ہوتی ہیں، یعنی پورے حافظے یا اس کے کسی حصے سے فراموشی یا غفلت۔

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ کہف، آیت 61۔

انسان کے پاس موجود بعض معلومات اور اعداد و شمار اس مادی عالم سے حاصل ہوتے ہیں، مثلاً آنکھ اور کان کے ذریعے، اور ان میں سے کچھ ملکوتِ اعلیٰ سے آتے ہیں۔ اُن معلومات کی مثال جو ملکوتِ اعلیٰ سے سر چشمہ لیتی ہیں، انبیاء (ص) پر وحی اور رؤیائے صادقہ ہے۔

یہ معلومات انسان کے وجودی صفحے پر، یا اُس جگہ پر جسے حافظے یا معلومات کا محل کہا جا سکتا ہے، اثر اور نقش چھوڑتی ہیں۔ بہت سے لوگوں کے تصور کے برخلاف، یہ محل نفسِ انسانی (روح) میں واقع ہے، نہ کہ دماغ میں۔ دماغ کی کارکردگی فیکس مشین یا ٹیلیفون کی مانند ہے اور یہ معلومات کے دائمی ذخیرے کی جگہ نہیں ہے، بلکہ یہ انسان کے وجود سے اور اس (انسان کے وجود) کی طرف اس مادی دنیا میں معلومات کی منتقلی کا ایک ذریعہ شمار ہوتی ہے۔

جب تک انسان اس دنیا میں موجود رہتا ہے، یہ معلومات مسلسل بڑھتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر جو کچھ آپ کی آنکھ دیکھتی اور سمجھتی ہے، اور جو کچھ آپ کا کان سنتا اور درک کرتا ہے، اور جو کچھ آپ مطالعہ کرتے ہیں، یہ سب نفسِ انسانی میں جمع ہونے والے اعداد و شمار ہیں۔ یاد کرنا اور خاطر میں لانا، ان ہی معلومات کو نکالنے اور جب انسان چاہے اس مادی عالم میں انہیں اس کے سامنے حاضر کرنے کا نام ہے۔

لیکن کئی عوامل ایسے ہیں جو اس یادداشت یا معلومات کے حصول اور انہیں حافظے سے نکالنے پر اثر انداز ہوتے ہیں:

پہلا: معلومات کا حجم۔ معلومات کی مقدار کا کسی بات کو یاد رکھنے پر اثر، روزمرہ زندگی کے اُن واقعات میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے جن سے ہم واسطہ رکھتے ہیں؛ مثال کے طور پر بچے کی یاد رکھنے کی صلاحیت، بالغ افراد کی نسبت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ حافظے میں محفوظ کرنا دراصل معلومات کو یاد رکھنا ہی ہے۔ بچے کی زیادہ یادداشت کی وجہ یہ ہے کہ یاد رکھنے کے آغاز میں اس کا حافظہ تقریباً معلومات سے خالی ہوتا ہے، لہٰذا وقت کے ساتھ ساتھ جمع ہونے والی معلومات کا حجم ابتدا میں اس کے قابو میں رہتا ہے، جس کے نتیجے میں معلومات کی درجہ بندی اور اُن تک رسائی آسان ہوتی ہے، برخلاف بالغ فرد کے کہ جو معلومات کی کثرت اور حافظے میں اُن کے زیادہ انباشتہ ہونے کی وجہ سے اُن پر قابو اور احاطہ مشکل سے حاصل کر پاتا ہے۔ مزید وضاحت کے لیے: فرض کریں آپ کسی چیز کی تلاش میں ہیں۔ اگر آپ دس چیزوں میں سے کسی شے کو تلاش کریں تو آپ اسے زیادہ آسانی

اور سہولت کے ساتھ پا سکتے ہیں، اس کے مقابلے میں جب آپ اسی چیز کو سو دیگر چیزوں کے درمیان تلاش کریں۔

دوسرا: معلومات کی کیفیت یا نوعیت۔ آسان اور سادہ معلومات، پیچیدہ اور مرکب معلومات جیسی نہیں ہوتیں۔ دوسری قسم کی معلومات، اُن کا کلی اور مکمل ادراک نہ ہونے کی وجہ سے ممکن ہے حافظے میں بے ترتیب اور اتفاقی طور پر جگہ پا لیں، اور نتیجتاً اُنہیں درست طور پر یا اُن کی تمام جزئیات اور لوازمات کے ساتھ یاد کرنا مشکل ہو۔ حتیٰ کہ اگر اس نوع کی معلومات کو سمجھ لیا جائے اور انہیں کسی منظّم اور دقیق انداز میں محفوظ بھی کر لیا جائے، تب بھی اُنہیں یاد کرنا سادہ معلومات کے مقابلے میں زیادہ دشوار ہوتا ہے؛ کیونکہ اُنہیں یاد کرنے کے لیے اُن کے تمام اجزا کو یکجا طور پر یاد رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

تیسرا: جسم یا جسد۔ جو ایک حجاب اور پردہ ہے جو انسان کی قوتِ یادآوری پر اثر انداز ہوتا ہے اور معلومات پر پڑنے والے پردے کی مانند ہے۔ جتنا زیادہ اس کی ضروریات پوری کرنے پر توجہ دی جائے اور اس کے ساتھ ناسازگار چیزوں کو دور کیا جائے، یہ حجاب اتنا ہی موٹا ہو جاتا ہے؛ اور جتنا اس سے غفلت برتی جائے اور معلومات پر توجہ مرکوز کی جائے، یہ ایک باریک پردے کی مانند ہو جاتا ہے۔ لیکن انسان جتنی بھی (اس سے) غفلت برتے، پھر بھی ایک حجاب باقی رہتا ہے جس سے کوئی چارہ نہیں اور جو اثر انداز رہتا ہے؛ جیسے جسمانی ضروریات پوری کرنے کے لیے کھانا پینا۔

چوتھا: نفسِ انسانی میں نور اور ظلمت۔ جتنا نور زیادہ ہوتا ہے، انسان کی یادآوری کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے، اور جتنا یہ نور کم ہو جائے اور ظلمت بڑھ جائے، معلومات کو واپس بلانے کی قوت کم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یوشعؑ جیسے پاکیزہ نبی سے اس کے سوا کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ خود کو قصور اور کوتاہی کا موردِ الزام ٹھہرائیں؟

(قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنْسَانِيهُ إِلا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ)[1]

(انہوں نے کہا: کیا آپ نے دیکھا، جب ہم اس چٹان کے پاس ٹھہرے تھے تو میں مچھلی کو بھول گیا، اور مجھے اسے یاد رکھنے سے شیطان کے سوا کسی نے غافل نہیں کیا)۔

اور یہاں شیطان عین ظلمت ہے۔

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ کہف، آیت 63۔

پانچواں: دماغ؛ اس اعتبار سے کہ یہ اس عالم تک اور اس عالم سے معلومات کی ترسیل کا آلہ ہے۔ دماغ کا حافظے اور باتوں کو یاد کرنے پر اثر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر دماغ میں خون کی درست گردش اور اس تک مناسب غذا کا پہنچنا اس کی کارکردگی کو بہتر بناتا ہے، اور اس میں کسی خرابی، نقص یا بیماری کا پیدا ہونا، معلومات کو یاد کرنے کی صلاحیت کے مکمل یا جزوی طور پر، اور عارضی یا دائمی طور پر ختم ہو جانے کا سبب بن سکتا ہے۔

یہاں ایک نکتہ قابلِ توجہ ہے جس کی طرف دھیان دینا ضروری ہے؛ ایک دادہ (معلومات) وہ چیز ہے جو کسی عمل کے ذریعے حاصل کی گئی ہو؛ یعنی انسان نے اسے حاصل کرنے کا ارادہ کیا ہو؛ نہ یہ کہ مثلاً اتفاقاً، سنے جانے کا قصد کیے بغیر، وہ اس کے کان تک پہنچ گئی ہو، یا اس نے کسی چیز کو بغیر توجہ دیے سن لیا ہو۔ جیسے کوئی شخص کسی جگہ سے گزرتا ہے اور اس جگہ کو دیکھ لیتا ہے، لیکن جو کچھ اس نے دیکھا ہے اسے یاد رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا؛ ایسے مواقع پر یادآوری میں کوئی چیز یاد نہیں آتی؛ کیونکہ درحقیقت کوئی ایسی حاصل شدہ معلومات موجود ہی نہیں ہوتیں جو یاد رکھنے کے ارادے سے لی گئی ہوں، یا ایسی معلومات کہی جا سکیں جن سے آدمی غافل ہوا ہو اس لیے کہ اس نے انہیں بھلا دیا ہو۔

جن امور کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، اُن کا حافظے پر براہِ راست سلبی یا ایجابی (مثبت یا منفی) تعلق ہوتا ہے؛ لیکن عموماً کسی ایک معین شخص کے لیے ان کی اثر پذیری کی مقدار یکساں نہیں ہوتی:

مثال کے طور پر ایک انسان میں بیک وقت کئی امور جمع ہو سکتے ہیں: ممکن ہے وہ اپنے جسم پر بہت زیادہ توجہ دے، اور یہ امر ملکوت سے معلومات حاصل کرنے کی اس کی صلاحیت پر منفی اثر ڈالے، چہ جائیکہ مستقبل میں اُنہیں یاد کرنا۔ جبکہ انسان کے وجودی صفحے میں نور کا اضافہ، معلومات کو یاد رکھنے کے علاوہ، اُنہیں حاصل کرنے کی انسان کی صلاحیت پر بھی مثبت اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس مشغولیت (جسم کے ساتھ) کی مقدار اور اس نور کی مقدار، یادآوری کے معادلے میں مکمل طور پر دخیل ہوتی ہے۔[1]

لہٰذا معلومات کی یادآوری کا مسئلہ دراصل ایک معادلہ ہے جس میں کئی متغیرات کردار ادا کرتے ہیں۔ اوپر بیان کیے گئے پانچ امور بھی انہی متغیرات میں شامل ہیں۔ صرف ایک یا دو متغیرات کی حقیقی یا اندازاً مقدار جان

---

[1] . مثال کے طور پر: ایک صالح اور عبادت گزار مؤمن بندہ جو کبھی کبھار اپنا پیٹ کھانے سے بھر لیتا ہے۔ ایمان اور صالح ہونا اور عبادت سے حاصل ہونے والا نور اس پر مثبت اثر ڈالتا ہے اور جتنی اس کی عبادت زیادہ ہوتی ہے، اتنا ہی اس کا نور بھی بڑھتا جاتا ہے۔ تاہم اس معاملے کی کوئی مقرر اور ثابت حد نہیں ہے۔۔۔ اس دوران جب انسان اپنا پیٹ کھانے سے بھر لیتا ہے تو یہ یادآوری پر منفی اثر ڈالتا ہے، اور جتنی زیادہ بار پیٹ بھرا جائے اتنا ہی اس کا منفی اثر بڑھتا جاتا ہے، اور جتنا زیادہ پیٹ بھر جائے اس کا منفی اثر بھی اسی قدر مزید بڑھ جاتا ہے۔

کر اس معادلے کے نتیجے کو جاننا اور سمجھنا نہایت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔ حتمی نتیجہ حاصل کرنے کے لیے تمام متغیرات کی مقدار معلوم ہونا ضروری ہے؛ دوسرے لفظوں میں، ہم کسی نیک مؤمن کے بارے میں صرف اس بناپر کہ ہمیں معلوم ہے وہ ایک نیک مؤمن ہے، قطعی طور پر یہ حکم نہیں لگا سکتے کہ وہ نہایت طاقتور حافظے کا مالک ہے؛ یا کسی بدکردار غیر مؤمن کے بارے میں بھی محض اس وجہ سے کہ ہمیں اس کے غیر مؤمن ہونے کا علم ہے، یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا حافظہ کمزور ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص مؤمن نہ ہو اور اس سے متعلق نور کا متغیر مثلاً پانچ فیصد ہو، لیکن اس کے دوسرے متغیرات کی مقدار معلومات کو واپس بلانے اور یادآوری کے لحاظ سے اعلیٰ درجے کی ہو۔ اس صورت میں یہ غیر مؤمن انسان یادآوری کے معادلے میں بلند قدر کا حامل ہوگا اور اگرچہ وہ مؤمن نہیں، پھر بھی باتوں کو یاد رکھنے میں بہت زیادہ قوت رکھتا ہوگا۔

ایک نہایت اہم موضوع جس کی طرف ہمیں لازماً توجہ دینی چاہیے اور اسے اچھی طرح سمجھنا چاہیے، یہ ہے کہ اس معادلے میں یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی مخلوق پوری اور کامل مقدار تک پہنچ جائے، اس طرح کہ اس کی حافظے کی قوت سو فیصد ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی مخلوق تمام متغیرات میں سو فیصد مقدار تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔ مثال کے طور پر اگر نور کے متغیر کی مقدار فرض کریں سو فیصد تک پہنچ جائے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مخلوق ایسا نور ہے جس میں ظلمت کا کوئی راستہ نہیں، اور ایسا ہونا محال ہے؛ کیونکہ ظلمت کے بغیر نور صرف خداوندِ سبحان و متعال ہی ہے۔[1]

اس طرح یہ بات واضح ہو گئی کہ کوئی ایسی مخلوق موجود نہیں جو حافظے کے معادلے میں سو فیصد تک پہنچ سکے، اس طرح کہ اس کے حافظے کو مکمل اور کامل کہا جا سکے اور نتیجتاً اس کی فراموشی اور غفلت صفر کے برابر ہو جائے، یعنی نہ وہ بھولے اور نہ ہی غفلت کرے۔ یہ ممکن نہیں کہ اللہ سبحان کوئی ایسی مخلوق پیدا کرے جس کا حافظہ سو فیصد ہو اور جس کی فراموشی اور غفلت صفر ہو۔ یہ اس وجہ سے نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کام پر قادر نہیں،

---

[1] .ابو عبداللہ امام جعفر صادق (ع) سے روایت ہے: " اللہ تعالیٰ ایسا علم ہے جس میں جہالت نہیں، ایسی حیات ہے جس میں موت نہیں، اور ایسا نور ہے جس میں کوئی ظلمت نہیں"۔ یونس بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں: میں نے ابو الحسن امام رضا (ع) کی خدمت میں عرض کیا: "ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا علم ہے جس میں جہالت نہیں، ایسی حیات ہے جس میں موت نہیں، اور ایسا نور ہے جس میں کوئی ظلمت نہیں"۔ آپ (ع) نے فرمایا: " ایسا ہی ہے"۔ (توحیدِ صدوق، ص 137)۔

اور یہاں مسئلہ اللہ کی قدرت کا نہیں ہے؛ بلکہ اس لیے کہ ایسی چیز ممکن ہی نہیں، اور اگر ممکن ہو تو اس کا مطلب مطلق لاہوت کی کثرت ہوگا؛ اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند اور برتر ہے۔ (تعالی اللہ علواً کبیراً)[1]

خداوند کے خلیفہ اور یاد آوری، سَہو اور نسیان

خداوند کے خلیفہ اور جانشین کا یاد آوری، سَہو اور نسیان کے ساتھ تعلق کے بارے میں کئی مفروضات کو پیشِ نظر رکھا جاسکتا ہے:

پہلا فرض: یہ کہ خداوند کے خلیفہ میں مطلقاً اور بذاتِ خود کسی بھی صورت میں نسیان اور سَہو کا کوئی راستہ نہیں۔ اس فرض کا باطل ہونا واضح ہے؛ کیونکہ معصوم فرد ایک مادی جسم رکھتا ہے جو کیمیائی اجزا سے مرکب ہے اور اس کی توانائی محدود ہے۔ نتیجتاً وہ جسمانی اعتبار سے ایسا ہے کہ دوسرے انسانوں کی طرح اس میں بھی سَہو پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس فرض کا لازمہ یہ ہے کہ معصوم فرد ایسا نور ہو جس میں ظلمت اور تاریکی کا کوئی راستہ نہ ہو؛ اور یہ مطلق کمال کے مترادف ہے جس میں کسی نقص کی گنجائش نہیں۔ یہ بات غلو ہے اور اس کا بطلان واضح ہے، اور اس کا لازمی نتیجہ مطلق لاہوت کی کثرت ہے۔

دوسرا فرض: یہ کہ خداوند کا خلیفہ بعض اوقات امور کو یاد کرتا ہے اور بعض اوقات غفلت برتتا ہے۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس میں تمام لوگ مشترک ہیں۔ اگر ایسا ہو اور ہم یہ کہنا چاہیں کہ خداوند کا خلیفہ مطلقاً اور کسی بھی چیز میں سَہو اور نسیان کا شکار نہیں ہوتا، یا کسی خاص موضوع میں سَہو نہیں کرتا، تو لازماً اس کے لیے ایک بیرونی یاد دہانی کرنے والا ہونا چاہیے۔ یہ یاد دہانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست وحی کے ذریعے ہو سکتی ہے، یا کسی فرشتے کے ذریعے جو واسطہ بنے اور اسے یاد دلائے، یا کسی اور طریقے سے جسے اللہ تعالیٰ اس کی یاد دہانی کے لیے چاہے۔ اس بیرونی یاد دہانی کرنے والے کے بارے میں دو فرض ہیں: یا وہ اسے ہر قسم کے سَہو اور نسیان سے مطلقاً روک دیتا ہے، یا حکمت کے مطابق اسے سَہو اور نسیان کی بعض اقسام سے محفوظ رکھتا ہے۔

نتیجتاً اور گزشتہ مطالب کو مد نظر رکھتے ہوئے، خداوند کے خلیفہ کے سَہو اور نسیان کے بارے میں چار احتمالات پائے جاتے ہیں، جو یہ ہیں:

* خداوند کا خلیفہ مطلقاً اور بذاتِ خود نسیان اور سَہو نہیں رکھتا۔

---

[1] . کتاب « رحلۃ موسی (ع) » سے منقول۔

*خداوند کا خلیفہ کسی بیرونی یاد دلانے والے کی وجہ سے مطلقاً نسیان اور سَہو نہیں رکھتا۔

*خداوند کا خلیفہ ہر دوسرے انسان کی طرح نسیان اور سَہو رکھتا ہے۔

*خداوند کا خلیفہ ہر دوسرے انسان کی طرح بعض مواقع پر نسیان اور سَہو کا شکار ہو سکتا ہے، اور بعض دیگر مواقع پر کسی حکمت کی بناپر اس کے لیے نسیان اور سَہو کا امکان نہیں ہوتا اور وہ ان مواقع پر نسیان اور سَہو سے معصوم ہوتا ہے۔

پہلا فرض

اس فرض کے مطابق اللہ تعالیٰ کا خلیفہ مطلقاً اور بذاتِ خود نسیان اور سہو سے پاک ہوتا ہے۔ یہ بات باطل اور غلو پر مبنی ہے؛ کیونکہ اس فرض کا لازمہ یہ ہے کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ایسا نور ہو جس میں ظلمت اور تاریکی کی کوئی گنجائش نہ ہو اور وہ کمالِ مطلق کا حامل ہو۔ یہ بات باطل ہے، اس لیے کہ وہ نور جس میں کسی قسم کی ظلمت نہ ہو، وہی لاہوتِ مطلقِ سبحانہ ہے، اور اس صفت کا حامل اس کے سوا کوئی اور نہیں۔

اسی طرح سہو اور نسیان سے ذاتی طور پر عصمت کا عقیدہ اس طرح ممکن نہیں کہ وہ صرف ایک ہی جہت تک محدود ہو، تاکہ یہ کہا جائے کہ معصوم ذاتی طور پر تبلیغ اور عبادت میں تو سہو سے محفوظ ہو، لیکن دنیاوی امور میں معصوم نہ ہو؛ کیونکہ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ معصوم کی ذات خود حفاظت کرنے والی اور باز رکھنے والی ہو۔ اگر یہ عقیدہ رکھا جاسکے کہ سہو اور نسیان سے ذاتی عصمت ایک جہت سے، (مثلاً دنیاوی امور کی جہت سے)، موجود نہ ہو، تو اس صورت میں یہ بات کہ معصوم کی ذات عاصم اور باز رکھنے والی ہے، ختم ہو جاتی ہے، اور نتیجتاً سہو اور نسیان سے ہر قسم کی ذاتی عصمت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ان میں سے بعض کی بات پر توجہ کرنی چاہیے؛ اس بارے میں کہ سہو سے ذاتی عصمت کے قائل نہ ہونا ایک لحاظ سے، ہر لحاظ سے ذاتی عصمت کے قائل نہ ہونے کے مترادف ہے۔ یہ مفہوم صرف اسی صورت میں قابلِ طرح ہے جب معصوم کا نسیان اور سہو سے محفوظ ہونا ذاتی ہو۔ لہٰذا یہ فرض باطل ہے؛ کیونکہ جو شخص ذاتی لحاظ سے معصوم اور مطلق عصمت کا حامل ہو، وہی ذاتی لحاظ سے کاملِ مطلق ہوتا ہے، اور وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

دوسرا فرض

اس فرض کے مطابق اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کو مطلقاً نسیان اور سہو لاحق نہیں ہوتا، اس لیے کہ اس کے پاس ایک یاد دلانے والا ہوتا ہے جو اسے مطلق طور پر سہو اور نسیان سے باز رکھتا ہے۔ البتہ عموماً معصوم کے سہو اور

نسیان کے منکرین، پہلا فرض اور دوسرا فرض کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ لیکن ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ سہو اور نسیان سے معصوم ہونے سے ان کی مراد دوسرا فرض ہے، تاکہ ہم انہیں غلو کے الزام کے دائرے میں داخل نہ کریں۔ نتیجے کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ یہ ایک اعتقادی فرض ہے، اور اسی بناپر اس کے لیے قطعی اور یقینی دلیل پیش کرنا ضروری ہے۔ جبکہ ان کے اقوال میں ہمیں کوئی مکمل عقلی یا نقلی دلیل نظر نہیں آتی جس پر عقائد کے باب میں اعتماد کیا جا سکے۔[1] زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ اپنے اس عقیدے کے اثبات کے لیے مخالف عقائد کے بارے میں بعض اشکالات پیش کرتے ہیں۔ وہ عموماً ان آیات پر اشکال کرتے ہیں جن میں بعض انبیاء کے نسیان کا ذکر آیا ہے، اور ان روایات پر اعتراض وارد کرتے ہیں جن میں نبی یا ائمہ کے سہو کا ذکر ہے، اور اس کے بعد، عبادت میں معصوم کے سہو کے مسئلے پر عقلی اشکالات پیش کرتے ہیں۔ ہم ان اشکالات کے رد میں دلائل بیان کریں گے اور واضح کریں گے کہ یہ مقدمات ان کے عقیدے کے اثبات کے لیے کافی نہیں ہیں۔

تیسرا فرض

اس فرض کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہر دوسرے انسان کی طرح سہو اور نسیان رکھتا ہے۔ اس فرض کا مطلب یہ ہے کہ ممکن ہے وہ دینِ الٰہی کے کسی حصے کی تبلیغ میں نسیان اور سہو کا شکار ہو جائے اور کسی ایسی چیز کو، جو درحقیقت دین کا حصہ نہ ہو، دین کا حصہ سمجھ کر تبلیغ کر دے؛ یا یہ کہ وہ کسی ایسی چیز کی تبلیغ کرنا چاہے جو واقعی دینِ الٰہی کا حصہ ہو، لیکن اس کی تبلیغ کے راستے میں سہو کا شکار ہو جائے، اور کوئی یاد دلانے والا موجود نہ ہو، خواہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست وحی ہو یا فرشتوں کی وساطت ہو یا کوئی بھی ایسا ذریعہ ہو جسے اللہ تعالیٰ وحی کی ترسیل کے لیے اختیار کرے۔ یہ بات قرآن کے خلاف ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں واضح طور پر ایک الٰہی یاد دلانے والے کے وجود کی تصریح کی ہے، جو مکلفین تک الٰہی رسالت کو صحیح اور کامل صورت میں پہنچانے کی ضمانت دیتا ہے۔

---

[1] . یہاں تک کہ اس عقیدے کے ماننے والے جس اجماع کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ بھی محض وہم ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں، کیونکہ شیعہ علما کے بعض بزرگوں، جیسے صدوق، ان کے استاد محمد بن حسن بن ولید، اور نیز شیخ طبرسی، اس عقیدے کے مخالف تھے۔

(إِلَّا مَنِ ارْتَضَى مِن رَّسُولٍ فَإِنَّهُ يسْلُكُ مِن بَيْنِ يدَيهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَداً * لِيعْلَمَ أَنْ قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيهِمْ وَأَحْصَى كُلَّ شَيءٍ عَدَدًا)[1]

(سوائے اس رسول کے جسے وہ پسند فرمالے، تو بے شک وہ اس کے آگے اور اس کے پیچھے نگہبان مقرر کر دیتا ہے، تاکہ معلوم کر دے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے ہیں، اور وہ اس چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو ان کے پاس ہے، اور اس نے ہر چیز کو گنتی کے ساتھ شمار کر رکھا ہے)۔

یہ فاسد عقیدہ بعض سلفی وہابیوں کا عقیدہ ہے۔ انہوں نے اس بات کو اس لیے اختیار کیا ہے تاکہ خاص طور پر عمر اور اس کے پیروکاروں کی جانب سے رسول اللہ (ص) پر ہذیان باندھنے کے الزام کا دفاع کیا جا سکے۔ وہ عمر کے عمل کے لیے کوئی دلیل قائم کرنا چاہتے ہیں، خواہ وہ قرآن کے صریح نص کے خلاف ہی کیوں نہ ہو؛ خواہ یہ عقیدہ دینِ اسلام پر طعن کا باعث بنے یا محمد رسول اللہ (ص) پر طعن کے مترادف ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ محمد (ص) ہذیان کہیں یا اپنی بات نہ سمجھیں، اس حالت میں کہ وہ (ص) امت کو ایسی وصیت پہنچانا چاہتے ہوں جو انہیں قیامت کے دن تک گمراہی سے بچا دے؛ کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق محمد (ص) کے لیے ہر معاملے میں سہو اور نسیان جائز ہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ میں بھی۔ ان کے عقیدے کے مطابق حضرت محمد (ص) حالتِ نزع میں بھی ہو سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں: لکھنے کا سامان لاؤ تاکہ میں تمہارے لیے اپنی وصیت لکھ دوں جو تمہیں قیامت کے دن تک گمراہی سے بچا دے؛ لیکن اس کے باوجود وہ سہو اور غلطی کرتے ہیں، انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، ان کی عقل زائل ہو چکی ہے، وہ ہذیان کہہ رہے ہیں اور بیماری ان پر غالب آ گئی ہے؛ یہ وہ بات ہے جو عمر اور اس کے ساتھیوں نے کہی۔

ابنِ عباس کہتے ہیں: جمعرات کا دن، اور کیا ہی جمعرات کا دن تھا۔ پھر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، یہاں تک کہ ان کے رخساروں تک پہنچ گئے، گویا موتیوں کے دانوں کی مانند تھے۔ انہوں نے کہا: رسول اللہ (ص) نے فرمایا: (کتف اور دوات، یا تختی اور دوات لے آؤ، تاکہ میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دوں کہ اس کے بعد تم کبھی بھی ہمیشہ کے لیے گمراہ نہ ہو)۔ تو انہوں نے کہا: "رسول اللہ (ص) ہذیان کہہ رہے ہیں"۔[2]

---

1. قرآن کریم، سورۂ جن، آیات 27 اور 28۔
2. صحیح مسلم، کتابِ وصیت۔

چوتھا فرض

اس فرض کے مطابق ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بعض موارد میں، ہر انسان کی طرح، نسیان اور سہو کا شکار ہو جائے، اور بعض دیگر موارد میں مطلق طور پر نسیان اور سہو کا امکان نہ ہو؛ اور یہ سب ایک خارجی یاد دلانے والے اور حکمت کی بناپر ہو۔

یہ چوتھا فرض آلِ محمد (علیہم السلام) کا عقیدہ ہے؛ لیکن بعض افراد یہاں اپنی طرف سے ایسے موارد کو بھی ان امور میں شامل کر دیتے ہیں جن میں معصوم کے لیے سہو اور نسیان ناممکن قرار دیا جاتا ہے، جیسے عبادات کی بعض تفصیلات میں سہو، مثلاً رکعات کی تعداد۔ حالانکہ اہلِ سنت اور شیعہ دونوں کے طرق سے ایسی روایات وارد ہوئی ہیں جو نبی (ص) کے سہو کو بیان کرتی ہیں۔

طبعی طور پر ان میں سے بعض لوگ ناآگاہی کی بناپر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ معصوم سے سہو کی نفی کے عقیدے پر علمائے شیعہ کا اجماع ہے۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا کوئی اجماع موجود نہیں؛ بلکہ شیعہ کے بڑے علماء میں ایسے افراد پائے جاتے ہیں جنہوں نے عبادت میں نبی یا معصوم کے سہو کے جواز کی تصریح کی ہے، یا اس کی نفی پر کسی قطعی دلیل کے نہ ہونے کو بیان کیا ہے۔ ان میں شیخ صدوق اور ان کے استاد محمد بن حسن شامل ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے۔

شیخ صدوق کہتے ہیں:

"اس کتاب کے مؤلف، اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے، کہتے ہیں: غُلات[1] اور مُفوّضہ[2]، اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کرے، نبی (ص) کے سہو کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر یہ جائز ہو کہ آپ (ص) کو نماز میں سہو لاحق ہو تو تبلیغ میں بھی سہو کا جائز ہونا لازم آئے گا؛ اس لیے کہ جس طرح تبلیغ آپ (ص) پر واجب ہے اسی طرح نماز بھی آپ (ص) پر واجب ہے۔ یہ بات ہمیں لازم نہیں آتی، اور یہ اس لیے ہے کہ تمام مشترک حالات میں نبی پر بھی وہی امر واقع ہوتا ہے جو دوسروں پر ہوتا ہے۔ وہ دیگر افراد کی طرح جو نبی نہیں ہیں نماز ادا کرتے ہیں، لیکن دیگر افراد جو نبی نہیں ہیں وہ ان جیسے نہیں ہیں۔ وہ حالت جو ان کے ساتھ خاص ہے وہ نبوت ہے اور تبلیغ اس کے لوازم

---

[1] .«غُلات» لفظ «غالی» کی جمع ہے، جس کے معنی حد سے بڑھنے والے کے ہیں، اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت محمد (ص) اور آلِ محمد (ص) کے مقام کے بیان میں غلو کرتے ہیں اور ان کی طرف مطلق الوہیت کا مقام منسوب کرتے ہیں۔ (مترجم)

[2] .«مفوّضہ» اُن لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اس عقیدے کے قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا کیا، اور پھر کائنات کے بعض تکوینی امور نیز دین کی تشریع حضرت محمد (ص) اور آلِ محمد (ع) کے سپرد کر دی۔ (مترجم)

میں سے ہے۔ اور جو چیز ان کے لیے نماز میں پیش آتی ہے، اس کا ان کے لیے تبلیغ میں پیش آنا جائز نہیں ہے؛ اس لیے کہ تبلیغ ایک مخصوص عبادت ہے اور نماز ایک مشترک عبادت ہے۔ اور اسی کے ذریعے ان کے لیے عبودیت ثابت ہوتی ہے، اور ان پر نیند کے غلبے کا ثابت ہونا اور یہ کہ اس حالت میں وہ اللہ عزوجل کی عبادت میں نہیں ہوتے، ان سے ربوبیت کی نفی کرتا ہے؛ اس لیے کہ جسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، وہی اللہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے۔ نبی (ص) کا سہو ہمارے سہو کی مانند نہیں ہے؛ اس لیے کہ ان کا سہو اللہ عزوجل کی طرف سے ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ انہیں سہو میں ڈالتا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ وہ بشر اور مخلوق ہیں اور ان کے سوا کوئی رب اور معبود نہ بنایا جائے؛ اور تاکہ لوگ جب بھی سہو کریں تو ان کے سہو کے ذریعے سہو کے حکم کو جان لیں۔ ہمارا سہو شیطان کی طرف سے ہوتا ہے، اور شیطان کو نبی (ص) اور اماموں پر کوئی تسلط حاصل نہیں۔ (إِنَّما سُلْطانُهُ عَلَى الَّذينَ يتَوَلَّوْنَهُ وَ الَّذينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُون)۔ (اس کا اقتدار تو صرف انہی لوگوں پر ہے جو اسے اپنا سرپرست بناتے ہیں اور جو اس کے ذریعے شرک کرتے ہیں)؛ اور اسی طرح ان دھوکے میں پڑنے والوں پر بھی جو اس کی پیروی کرتے ہیں۔ جو لوگ نبی (ص) کے سہو کا دفاع کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ صحابہ کے درمیان کوئی ایسا شخص نہیں تھا جسے ذوالیدین کہا جاتا ہو؛ اور یہ شخص اور یہ روایت کوئی اصل نہیں رکھتے اور یہ بات گھڑی ہوئی ہے؛ اس لیے کہ یہ شخص معروف ہے، اور وہی ابو محمد بن عمیر بن عبد عمرو ہے جو ذوالیدین کے نام سے پہچانا جاتا ہے، اور مخالف و موافق سب نے اس کے بارے میں روایات نقل کی ہیں۔ ان سے کتاب «وصف القتال القاسطین بصفین» میں روایات نقل ہوئی ہیں۔

ہمارے استاد محمد بن حسن بن احمد بن ولید، اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے، کہتے ہیں: غلو کا پہلا درجہ یہ ہے کہ نبی (ص) سے سہو کی نفی کی جائے؛ اور اگر اس بارے میں وارد ہونے والی روایات کو رد کرنا جائز ہو تو تمام روایات کو رد کرنا بھی جائز ہوگا، اور ان کو رد کرنے سے دین اور شریعت باطل ہو جائے گی۔ بندہ ان شاء اللہ تعالیٰ نبی (ص) کے سہو کے اثبات اور اس کے منکرین کے جواب میں ایک علیحدہ کتاب لکھنے کو باعثِ اجر شمار کرتا ہوں"[1]

لیکن شیخ طوسی، اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے:

شیخ طوسی نے قرآن کی اس آیت کے ذیل میں اپنا نظریہ بیان کیا ہے:

---

[1] . من لایحضرہ الفقیہ، صدوق، جلد 1، صفحات 359 اور 360۔

(وَ إِذا رَأَيتَ الَّذينَ يخُوضُونَ فى آياتِنا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى يخُوضُوا فى حَديثٍ غَيرِهِ وَ إِمَّا ينْسِينَّكَ الشَّيطانُ فَلا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرى مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ)[1]

(اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیات میں [غلط ثابت کرنے کی نیت سے] الجھتے ہیں تو ان سے منہ پھیر لو، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں؛ اور اگر شیطان تمہیں [اس بارے میں] بھلا دے، تو یاد آ جانے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو)۔

شیخ طوسی، اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے، کہتے ہیں:

"اسی طرح جبّائی نے بھی اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ انبیاء کے لیے سہو اور نسیان جائز ہے۔ اس نے رافضیوں کے قول کے برخلاف بات کہی ہے، جو اس گمان میں ہیں کہ انبیاء کے لیے کسی قسم کا سہو جائز نہیں۔ یہ بات بھی درست نہیں ہے؛ اس لیے کہ ہم کہتے ہیں کہ جن امور کو انبیاء اللہ تعالیٰ کی طرف سے انجام دیتے ہیں، ان میں ان کے لیے سہو اور نسیان کا امکان درست نہیں۔ لیکن اس کے علاوہ امور میں ان کے لیے نسیان اور سہو کا امکان ہے، اور وہ بھی ایسے امور میں جو عقل کے کمال میں خلل پیدا نہ کریں۔ پھر یہ بات ان کے لیے کیسے ناجائز ہو سکتی ہے؟ حالانکہ وہ سوتے ہیں، بیمار ہوتے ہیں اور کمزور بھی ہو جاتے ہیں۔ نیند سہو ہے، اور اسی طرح ان کے بہت سے کاموں میں نسیان بھی ہوتا ہے، اور جو امور ان کے ساتھ پیش آ چکے ہیں وہ اسی بات کی نشان دہی کرتے ہیں، اور اس عقیدے کے علاوہ کوئی اور گمان فاسد ہے"[2]

محمد بن حسن، فرزندِ شہیدِ ثانی، اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے:

وہ اپنی گفتگو میں نماز میں اضافات کے باب کی ایک حدیث کے ضمن میں کہتے ہیں:

"لیکن پانچواں: وہ مسئلہ ہے جس کے بارے میں میرا گمان ہے کہ اس میں قرار داد کی نشانیاں پائی جاتی ہیں؛ نہ اس وجہ سے کہ یہ نبی (ص) کے سہو پر مشتمل ہے، کیونکہ معتبر روایات کے وارد ہو جانے کے بعد اس مسئلے کی نفی محلِ بحث ہے۔"[3]

---

1. قرآن کریم، سورۂ انعام، آیت 68۔
2. التبیان فی تفسیر القرآن، شیخ طوسی، جلد 4، ص 165۔
3. إستقصاء الإعتبار فی شرح الاستبصار، محمد بن حسن، جلد 6، ص 215۔

سید خوئی، اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے، صراحت کرتے ہیں کہ کوئی ایسی دلیل موجود نہیں جو خارجی موضوعات میں معصوم سے سہو کی نفی کو قطعی اور یقینی طور پر ثابت کرے؛ جیسے نماز اور حج کے اعمال وغیرہ، اور رکعات کی تعداد جن کا روایات میں ذکر آیا ہے، یا طواف کے شوطوں کی تعداد۔ سید خوئی کہتے ہیں:

"سوال 1294: نمازِ فجر میں نبی (ص) کے سہو کے مسئلے کی حقیقت کیا ہے؟ کیا یہ لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی (ص) کو سہو میں ڈالے تاکہ ہم یقین کریں کہ وہ معبود نہیں ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(وَقالُوا ما لِهذَا الرَّسُولِ يأْكُلُ الطَّعامَ وَيمْشِي فِي الأَسْواقِ)[1]

(اور انہوں نے کہا: یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟)۔

اس کے علاوہ اور بھی آیات ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ بشر ہیں، اور یہ کہ وہ (ص) پیدا ہوئے اور دنیا سے رخصت ہوئے۔ کیا یہ لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول (ص) کو سہو میں ڈالے تاکہ یہ لوگوں کے لیے رحمت ہو، اور اگر کوئی شخص نماز کے وقت سو جائے تو کوئی دوسرے پر اعتراض نہ کرے؟ اللہ سبحان نے بہت سے احکام دیگر لوگوں کے لیے مقرر کیے ہیں، نہ کہ خود رسول (ص) کے لیے۔ البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ انہیں "سلا دیا جائے" نہ کہ یہ کہ وہ "خود سوئیں"؛ کیا ان دونوں حالتوں کے درمیان فرق واضح نہیں ہے؟ کیا یہ بات درست ہے کہ ذوالیدین، جس کے گرد سہو میں ڈالنے اور سہو کی روایات گھومتی ہیں، اس کی کوئی اصل نہیں اور وہ ایک گھڑا ہوا شخص ہے؟ جیسا کہ شیخ حر عاملی، قدّس سرہ، نے اپنی تحریر «التنبیہ بالمعلوم من البرہان علی تنزیہ المعصوم عن السہو والنسیان» میں انہوں نے خود ہی یہ بات بیان کی ہے؟

خوئی کہتے ہیں: معصوم کی طرف جس سہو کا نسبت دینا ممنوع ہے، اس کا یقینی دائرہ، خارجی موضوعات کے علاوہ سہو ہے۔ اور اللہ ہی بہتر جاننے والا ہے"[2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اعتقادی مباحث میں کسی عقیدے کے بارے میں یقین حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ خارجی موضوعات میں معصوم کے سہو کے مسئلے میں یقین کے نہ ہونے پر سید خوئی کی صراحت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس عقیدے کے قائل نہیں ہیں جس کے بعض لوگ قائل ہیں۔ یہاں سید خوئی کہتے ہیں کہ

---

1. قرآن کریم، سورۂ فرقان، آیت 7۔
2. صراط النجاۃ، حصہ اول، مسائل فی العقیدہ، سید خوئی۔

خارجی موضوعات میں معصوم سے سہو کی نفی یقینی نہیں ہے، یعنی اس پر ایسی کوئی دلیل موجود نہیں جو یقین اور اعتقاد کا سبب بنے۔

طبعًا ان کے علاوہ بھی شیعہ علما میں ایسے افراد موجود ہیں جو عبادت میں نبی یا امام کے سہو سے عصمت کے قائل نہیں ہیں؛ لیکن جو موارد میں نے ذکر کیے ہیں وہ اس شخص کی غلطی واضح کرنے کے لیے کافی ہیں جو اس عقیدے پر شیعہ علما کے اجماع کا دعویٰ کرتا ہے۔[1]

کیا معصوم کے بارے میں سہو اور نسیان ممنوع ہے؟

یہاں مخاطبِ سخن وہ افراد بھی ہیں جو ہر حال میں معصوم کے سہو اور نسیان کو محال سمجھتے ہیں، اور وہ لوگ بھی جو عبادت میں معصوم کے سہو کے منکر ہیں اور اہلِ سنت اور شیعہ کی اُن روایات کو رد کرتے ہیں جو نبی کے سہو کے بارے میں ہیں، یا شیعہ کی اُن روایات کو جو ائمہ کے سہو کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ میں اُن اشکالات کو بیان کرتا ہوں جو میں نے خداوند کے خلیفہ سے سہو اور نسیان کی نفی کے بارے میں پائے ہیں؛ کیونکہ اس عقیدے کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں، بلکہ وہ اس کے مقابلے میں صرف اشکالات پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان شاء اللہ، ہم ان باتوں اور اشکالات کو علمی معیار پر پرکھیں گے؛ تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ آیا ان کی کوئی علمی قدر و قیمت ہے یا یہ محض ایسے اشکالات ہیں جو مغالطے کی بنیاد پر قائم کیے گئے ہیں، یا یہ کہ محض عوام کے عقیدے کی پیروی ہے۔

اس کے علاوہ، معصوم سے سہو اور نسیان کی نفی کے بارے میں اپنے عقیدے کے اثبات کے لیے (خواہ مطلق طور پر ہو یا خصوصاً عبادت میں) انہیں قطعی دلیل کی ضرورت ہے، جبکہ ایسی کوئی دلیل ان کے پاس موجود

---

[1] . اللہ کے کلام میں حضرت موسی (ع) کی زبانی آیا ہے: قالَ لاَ تُؤَاخِذْنِی بِمَا نَسِیتُ وَلَا تُرْهِقْنِی مِنْ أَمْرِی عُسْرًا (سورۂ کہف، آیت 73) (کہا: جو میں بھول گیا ہوں اس پر مجھے مؤاخذہ نہ کرنا اور میرے معاملے میں مجھ پر سختی نہ کرنا)۔

تفسیر طبرسی میں اس آیت کے بارے میں آیا ہے: "جو میں بھول گیا ہوں اس پر مجھے مؤاخذہ نہ کرنا" یعنی میں تیرے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور تیرے انکار کو چھوڑنے سے غافل ہو گیا، اور یہ اس نسیان کے سبب ہے جو یاد آوری کے خلاف ہے۔

تفسیر طباطبائی میں آیا ہے: عبارت قالَ لاَ تُؤَاخِذْنِی بِمَا نَسِیتُ وَلَا تُرْهِقْنِی مِنْ أَمْرِی عُسْرًا میں لفظ "رہق" کے معنی زبردستی تے دلانے کے ہیں، اور ارہاق کا مطلب ایسے زائد کام پر مجبور کرنا ہے جس کی طاقت انسان میں نہ ہو۔ اس کا معنی یہ ہے کہ جو وعدہ میں بھول گیا ہوں اور اس سے غافل ہو گیا ہوں اس پر مجھے باز خواست نہ کرنا، اور مجھے ایسے مشکل کام پر مجبور نہ کرنا جس کی میں طاقت نہیں رکھتا۔

تفسیر قمی میں آیا ہے: "مگر یہ کہ اللہ چاہے" پھر استثناء کیا گیا ہے، اس وجہ سے کہ وہ بھول سے محفوظ نہیں ہے، کیونکہ جو ہستی نسیان سے پاک ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

نہیں۔ نہ ان کے پاس کوئی کامل عقلی دلیل ہے، نہ کوئی ایسی روایت جو یقینی طور پر معصوم سے صادر ہوئی ہو اور قطعاً اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہو، اور نہ ہی کوئی ایسی آیت ہے جو یقین کے ساتھ اس معنی پر دلالت کرے؛ بلکہ جو کچھ موجود ہے وہ ان کے عقیدے کے بالکل برعکس ہے۔

معصوم کے سہو کے بارے میں روایات بھی بہت سی ہیں اور وہ صحیح ہیں۔ آیات بھی اسی طرح ہیں جو معصوم کے سہو کو بیان کرتی ہیں، اور ہم قرآنی، روایی اور عقلی طور پر پیش کیے گئے مسائل کا جائزہ لیں گے۔

پہلا: آیاتِ قرآن

ہم بعض اُن قرآنی آیات کا جائزہ لیں گے جن میں بعض خلفائے خدا کی طرف فراموشی کی نسبت دی گئی ہے، اور یہ واضح کریں گے کہ یہ فراموشی اور ترک، غفلت کی بناپر ہوتا ہے۔ نیز ہم اُس لفظ کا بھی جائزہ لیں گے جو سہو اور نسیان کے معنی کو بیان کرتا ہے، اور اس مفہوم میں اس کی صراحت پر گفتگو کریں گے۔

لاتُؤاخِذنی بِما نَسیتُ

(فَلَمَّا بَلَغا مَجْمَعَ بَينِهِما نَسِيا حُوتَهُما فَاتَّخَذَ سَبيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَباً * فَلَمَّا جاوَزا قالَ لِفَتاهُ آتِنا غَداءَنا لَقَدْ لَقينا مِنْ سَفَرِنا هذا نَصَباً * قالَ أَرَأَيتَ إِذْ أَوَينا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسيتُ الْحُوتَ وَ ما أَنْسانيهُ إِلاَّ الشَّيطانُ أَنْ أَذْكُرَهُ وَ اتَّخَذَ سَبيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَباً)[1]

(پھر جب وہ دونوں دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر پہنچے تو اپنی مچھلی کو بھول گئے، تو اس نے سمندر میں سرنگ کی طرح اپنا راستہ بنالیا اور چلی گئی۔ جب وہ دونوں آگے بڑھ گئے تو اس نے اپنے نوجوان ساتھی سے کہا: ہمارا کھانا لے آؤ، ہمیں اس سفر میں بڑی تھکن لاحق ہوئی ہے۔ اس نے کہا: کیا آپ نے دیکھا، جب ہم چٹان کے پاس ٹھہرے تھے تو میں مچھلی کو بھول گیا؟ اور مجھے اسے یاد دلانے سے شیطان کے سوا کسی نے نہیں بھلایا، اور اس نے سمندر میں اپنا راستہ عجیب طور پر بنالیا)۔

یہاں فراموشی کرنے والے افراد، خداوند کے خلفا میں سے دو خلیفے، یعنی دو معصوم ہیں۔ ان میں سے ایک موسیٰ بن عمران ہیں اور دوسرے ان کے وصی، یوشع بن نون ہیں۔

---

[1] . قرآنِ کریم، سورۂ کہف، آیات 61 سے 63۔

بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ نَسِيا حُوتَهُمَا (انہوں نے اپنی مچھلی کو بھول گئے) کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر اور آگاہی کے ساتھ اپنی مچھلی کو چھوڑ دیا تھا، درست نہیں ہے؛ کیونکہ اگر معاملہ اس طرح ہوتا تو اس کے بعد آنے والی بات اور مچھلی کے بارے میں سوال کا کوئی مفہوم باقی نہ رہتا، بلکہ یہ لغو اور بے معنی ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں، ان کے اس قول کی بنیاد پر مچھلی کے بارے میں سوال کرنے کی وجہ وہی نسیان اور سہو ٹھہرتا جو ایک ایسے کام کے بارے میں ہو جسے پہلے ہی عمداً انجام دیا جا چکا تھا، یعنی چٹان کے پاس مچھلی کو چھوڑ دینا۔

اسی طرح اگلی آیت میں یوشع بن نون اپنی فراموشی پر زور دیتے ہیں، اور یہ واضح کرتے ہیں کہ مچھلی کو بھول جانا اور چھوڑ دینا غفلت کی بنا پر تھا، نہ کہ جان بوجھ کر؛ کیونکہ وہ بیان کرتے ہیں کہ مچھلی کو بھول جانے کا سبب شیطان تھا، یعنی وہی تاریکی یا نقص جو اس کے وجود کے صفحے میں موجود ہے۔ وہ کمالِ مطلق نہیں ہے؛ اسی وجہ سے وہ بھول جاتا ہے اور غفلت اور لاعلمی کی حالت میں مچھلی کو چھوڑ دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی اسی سابقہ معنی پر دلالت کرتا ہے:

(وَ إِذا رَأَيتَ الَّذينَ يخُوضُونَ فِى آياتِنا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى يخُوضُوا فِى حَديثٍ غَيرِهِ وَ إِمَّا ينْسِينَّكَ الشَّيطانُ فَلا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرى مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمينَ)[1]

(اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیات میں [غلط ثابت کرنے کی نیت سے] الجھتے ہیں تو ان سے منہ پھیر لو، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں؛ اور اگر شیطان تمہیں [اس بارے میں] بھلا دے، تو یاد آ جانے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو۔)

یہاں شیطان سے مراد بھی وہی ظلمت اور نقص ہے۔ وہ نور جس میں کسی قسم کی کوئی ظلمت نہیں اور جو کمالِ مطلق ہے، صرف اللہ سبحان تعالیٰ ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(قالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطيعَ مَعِى صَبْراً * وَكَيفَ تَصْبِرُ عَلى ما لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْراً * قالَ سَتَجِدُنِى إِنْ شاءَ اللَّهُ صابِراً وَ لا أَعْصى لَكَ أَمْراً * قالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنى فَلا تَسْئَلْنى عَنْ شَىءٍ حَتَّى أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْراً * فَانْطَلَقا

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ انعام، آیت 68۔

حَتَّى إِذا رَكِبا فِي السَّفينَةِ خَرَقَها قالَ أَخَرَقْتَها لِتُغْرِقَ أَهْلَها لَقَدْ جِئْتَ شَيئاً إِمْراً * قالَ أَ لَمْ أَقُلْ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطيعَ مَعِي صَبْراً * قالَ لا تُؤاخِذْني بِما نَسيتُ وَ لا تُرْهِقْني مِنْ أَمْري عُسْراً)[1]

(اس نے کہا: تم ہر گز میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے۔ اور تم اس چیز پر کیسے صبر کر سکتے ہو جس کا تمہیں پورا علم نہیں ہے؟ اس نے کہا: ان شاء اللہ تم مجھے صابر پاؤ گے اور میں کسی معاملے میں تمہاری نافرمانی نہیں کروں گا۔ اس نے کہا: اگر تم میرے پیچھے آتے ہو تو مجھ سے کسی چیز کے بارے میں سوال نہ کرنا، یہاں تک کہ میں خود اس کا ذکر تمہارے سامنے کروں۔ پھر دونوں چل پڑے، یہاں تک کہ جب وہ کشتی میں سوار ہوئے تو اس نے اس میں سوراخ کر دیا۔ موسیٰ نے کہا: کیا تم نے اسے اس لیے سوراخ کیا کہ اس کے سواروں کو غرق کر دو؟ یقیناً تم نے بہت ناپسندیدہ کام کیا ہے۔ اس نے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے؟ موسیٰ نے کہا: مجھے میری بھول پر مؤاخذہ نہ کرنا اور میرے معاملے میں مجھ پر سختی نہ کرنا)۔

ان آیات میں اُس بندۂ خدا (عبداً من عبادنا) نے اللہ کے نبی موسی (ع) سے یہ درخواست کی کہ وہ اس سے کسی بات کے بارے میں سوال نہ کریں، یہاں تک کہ وہ خود ہی اس معاملے میں موسی کو آگاہ کرنا شروع کرے۔ موسی (ع) نے بھی صبر کرنے کا عہد کیا؛ یعنی راستے میں پیش آنے والے امور کے بارے میں اس بندۂ خدا سے سوال نہ کریں گے۔ لیکن جو کچھ پیش آیا وہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ موسی (ع) نے، جیسا کہ انہوں نے وعدہ کیا تھا، صبر نہ کیا۔ اور پہلے ہی واقعے میں اس نے نہ صرف بندۂ خدا سے سوال کرنا شروع کر دیا، بلکہ اس پر اور اس کے عمل پر اعتراض بھی کیا؛ حالانکہ موسی نے یہ کہا تھا کہ وہ بندۂ خدا کی اطاعت کریں گے اور اس کی نافرمانی نہیں کریں گے: وَلا أَعْصي لَكَ أَمْراً (اور میں کسی کام میں تیری نافرمانی نہیں کروں گا)۔ یہاں ذہن میں دو مفروضے آتے ہیں:

پہلا فرض: یہ کہ موسی (ع) نے بندۂ خدا کے ساتھ کیے گئے اپنے وعدے پر عمل کرنے کو پوری آگاہی اور کامل توجّہ کے ساتھ ترک کیا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ موسی نے ایک ممنوع عمل کا ارتکاب کیا اور جان بوجھ کر بندۂ خدا کے ساتھ اپنے وعدے اور عہد کی خلاف ورزی کی، اور اُس خدا کی نافرمانی کی جس نے انہیں اس بندے سے سیکھنے کے لیے بھیجا تھا، نہ کہ اس پر اعتراض کرنے یا اس سے مجادلہ کرنے کے لیے؛ اُس بندے کو جسے اللہ نے (عَبْدًا مِنْ عِبَادِنَا) یعنی (ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ) کے الفاظ کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ (فَوَجَدا

---

[1]. قرآن کریم، سورۂ کہف، آیات 67 سے 73۔

عَبْداً مِنْ عِبادِنا آتَيناهُ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنا وَ عَلَّمْناهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْماً قالَ لَهُ مُوسى هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلى أَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْداً)۔ (پھر وہ دونوں ہمارے بندوں میں سے ایک بندے سے ملے، جسے ہم نے اپنی جانب سے رحمت عطا کی تھی اور اپنے پاس سے ایک علم سکھایا تھا۔ موسی نے اس سے کہا: کیا میں اس شرط پر تمہاری پیروی کروں کہ تم مجھے اس میں سے کچھ ہدایت سکھاؤ جو تمہیں سکھایا گیا ہے؟) اور داستان کے آخر میں بندۂ خدا صراحت کے ساتھ کہتا ہے: (وَ ما فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي) (اور میں نے یہ کام اپنی طرف سے نہیں کیے)۔ موسی (ع) اچھی طرح جانتے تھے کہ اُس بندۂ خدا کا علم، اللہ کی طرف سے ہے، اور انہوں نے خود اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کے پیچھے چلیں تاکہ اللہ نے جو کچھ اسے سکھایا ہے، وہ انہیں بھی سکھائے۔ لہٰذا اس فرض کی بنیاد پر یہ لازم آتا ہے کہ موسی (ع) یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کا سوال اور اعتراض در حقیقت اللہ پر اعتراض ہے، پھر بھی بندۂ خدا سے سوال کرتے رہے اور اس پر اعتراض کرتے رہے، اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہ اپنے وعدے اور عہد کے خلاف عمل کر رہے ہیں۔ حقیقت میں یہ اُن لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے جو اپنے دعوے کے مطابق موسی (ع) یا بالعموم معصوم کو سہو اور نسیان سے منزہ اور بری ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ موسی (ع) کو، جو ایک الٰہی پیشوا اور اولوالعزم نبی ہیں، ایسے بڑے الزامات کی طرف منسوب کرتے ہیں جن کی کسی بھی حالت میں موسی (ع) پر نسبت نہیں دی جاسکتی۔

دوسرا فرض: یہ ہے کہ موسی (ع) نے غفلت کی بنا پر اپنے وعدے اور عہد کو چھوڑ دیا، یا اسے بھول گئے، یا اللہ کے بندے کے ساتھ اپنے وعدے اور ذمہ داری سے غافل ہو گئے۔ چنانچہ وہ معذور تھے اور کسی ممنوع عمل کے مرتکب نہیں ہوئے۔ یہی وہ بات ہے جس کی موسیٰ (ع) نے خود صراحت کے ساتھ وضاحت کی ہے: (قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ) (موسیٰ نے کہا: میری بھول پر مجھے مؤاخذہ نہ کرنا) حالانکہ موسی اس وقت نماز، روزہ اور حج جیسی عبادت میں مشغول تھے، کیونکہ اللہ کے بندے کے ساتھ موسی کی رفاقت ایک تعبدی اور الٰہی حکم کی بنا پر تھی، اور اسی طرح اس مقام پر وعدے اور عہد کی وفا بھی موسیٰ (ع) کے لیے عبادت شمار ہوتی تھی۔

سَنُقْرِئُكَ فَلا تَنْسى

(سَنُقْرِئُكَ فَلا تَنْسى * إِلاَّ ما شاءَ اللَّهُ إِنَّهُ يعْلَمُ الْجَهْرَ وَ ما يخْفى)[1]

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ اعلیٰ، آیات 6 سے 7۔

(ہم تمہیں عنقریب اپنی آیات پڑھوا دیں گے، پھر تم نہیں بھولو گے، سوائے اس کے جو اللہ چاہے، یقیناً وہ ظاہر کو بھی جانتا ہے اور اس کو بھی جو پوشیدہ ہے)۔

اس آیت کی تفسیر میں مختصر بصائر الدرجات میں ایک روایت وارد ہوئی ہے:

سعد بن طریف خفاف بیان کرتے ہیں: میں نے امام باقر (ع) سے عرض کیا: (آپ کی کیا رائے ہے اس شخص کے بارے میں جو آپ سے کوئی علم حاصل کرے پھر اسے بھول جائے؟ آپ نے فرمایا: اس پر کوئی دلیل نہیں۔ دلیل تو اس شخص کے خلاف ہے جو ہم سے کوئی حدیث سنے پھر اس کا انکار کرے، یا اس تک بات پہنچے مگر وہ اس پر ایمان نہ لائے اور کافر ہو جائے۔ البتہ بھول جانے کا گناہ تم سے اٹھا لیا گیا ہے۔ سب سے پہلی سورت جو رسول اللہ (ص) پر نازل ہوئی وہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى تھی، اور آپ (ص) اسے بھول گئے تھے، اور آپ کے بھول جانے میں آپ کے خلاف کوئی دلیل نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تائید فرمائی، پھر فرمایا: سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ (ہم تمہیں عنقریب پڑھوا دیں گے، پھر تم نہیں بھولو گے))[1]

اسی طرح اس آیت کے بارے میں تفسیرِ امام حسن عسکری (ع) میں بھی ایک روایت وارد ہوئی ہے۔ امام (ع) نے فرمایا: محمد بن علی بن موسیٰ الرضا (ع) نے فرمایا: (ما نَنْسَخْ مِنْ آيةٍ) (یعنی ہم جس آیت کو منسوخ کرتے ہیں)، اس سے مراد اس کا حکم اٹھا لینا ہے، (أَوْ نُنْسِها) (یعنی یا ہم اسے بھلا دیتے ہیں)، اس سے مراد اس کی تحریر کو اٹھا لینا اور دلوں سے، بلکہ اے محمد! تمہارے دل سے بھی اس کی حفاظت کو ختم کر دینا ہے؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَنُقْرِئُكَ فَلا تَنْسى إِلاَّ ما شاءَ اللَّهُ، (یعنی ہم عنقریب تمہیں پڑھا دیں گے، پھر تم نہیں بھولو گے، مگر جو اللہ چاہے) یعنی تم اسے بھول جاؤ گے [اور اللہ] اس کی یاد کو تمہارے دل سے اٹھا لے گا)[2]

بعض لوگوں نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے کہ معصوم مطلقاً کسی بھی چیز میں سہو نہیں کرتا، حالانکہ آیت ان کے اس عقیدے پر کوئی دلالت نہیں کرتی۔ آیت بالکل واضح ہے: سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ (ہم جلد ہی تمہیں پڑھوا دیں گے، پھر تم نہیں بھولو گے)، یعنی جو تمہیں پڑھایا جائے گا اسے تم نہیں بھولو گے، لہٰذا جو شخص اس کے علاوہ کسی اور چیز کے بارے میں دعویٰ کرے - یعنی جو ہم آپ کو پڑھاتے ہیں یا وحیِ الٰہی کے علاوہ - اسے اپنے قول پر

---

1. مختصر بصائر الدرجات، حسن بن سلیمان حلی، ص 93۔
2. تفسیر امام حسن عسکری (ع)، ص 491۔

دلیل پیش کرنا ہوگی، کیونکہ جو ہم آپ کو پڑھاتے ہیں اس میں قرآن اور وحیِ الٰہی دونوں شامل ہیں۔ اور اس بنا پر یہ آیت صرف «تبلیغ میں معصوم کے عدمِ سہو» پر دلالت کرتی ہے، یا پھر «اس چیز کی حفاظت پر جسے اللہ سبحان و متعال اس آیت کے نزول کے بعد اس پر پڑھتا ہے» ، اور یہ بات نہ عبادت کو شامل ہے اور نہ اس کے علاوہ کسی اور چیز کو۔ تبلیغ میں معصوم کا سہو نہ ہونا اللہ سبحان کی طرف سے محلِ اختلاف نہیں ہے؛ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اللہ متعال نے فرمایا: إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ (سوائے اس کے جو اللہ چاہے) یہ بات ایک استثنا ہے اور اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ معصوم بھی دیگر انسانوں کی طرح سہو اور نسیان میں مبتلا ہو سکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بعض مواقع پر، ضرورت اور عدمِ سہو کی حاجت کے پیشِ نظر، اسے سہو اور نسیان سے محفوظ رکھتا ہے۔ چنانچہ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ (سوائے اس کے جو اللہ چاہے) کا معنی یہ ہے: سوائے اُن دیگر امور کے جنہیں اللہ تعالیٰ چاہے کہ آپ انہیں بھول جائیں، اور ایسی باتوں میں اللہ تعالیٰ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ آپ کو بھولنے اور سہو سے محفوظ رکھے؛ جیسے باقی انسانوں پر سہو اور نسیان طاری ہوتا ہے۔ [فرمایا:] قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ (کہہ دیجیے: میں تو تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے)۔

دوسرا: روایات

ان روایات پر وارد کیے گئے اعتراضات جن میں معصوم کے سہو اور نسیان کا ذکر آتا ہے، بے اہمیت ہیں؛ کیونکہ اس باب میں موجود متعدد روایات کے رد کے لیے، جن کا کوئی معارض بھی نہیں، بعض روایات پر صرف سندی اشکال کرنا، یا یہ کہنا کہ یہ بات تقیہ کی بنیاد پر کہی گئی ہے، اس کے علاوہ کوئی اور عذر موجود نہیں۔ مزید یہ کہ، جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، یہ مسئلہ قرآنی اعتبار سے مسلّم ہے، اور اس طرح کے اعتراضات قرآنی دلائل کے بارے میں پیش نہیں کیے جا سکتے۔ اور اگر بالفرض یہ اعتراضات روایات پر وارد بھی ہوں، حالانکہ ایسا نہیں ہے، تو ان سے زیادہ سے زیادہ یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی عقیدے کے اثبات کے لیے ان روایات پر بطورِ مستقل دلیل اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور یہ روایات ان کے عقیدے کو کسی بھی طرح ثابت نہیں کرتیں؛ کیونکہ وہ ایسے دلیل کے محتاج ہیں جو اللہ کے خلیفہ یا معصوم کے عدمِ سہو کو ثابت کرے، خواہ مطلق طور پر ہو یا ان کے عقیدے کے مطابق عبادت میں۔ اس مسئلے کا اصل یہ ہے کہ معصوم یا خلیفۂ خدا دیگر انسانوں کی طرح ایک بشر ہے اور بغیر دلیل کے وہ کسی بھی معاملے میں ان سے ممتاز نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ مخالفین کے پاس ایسی روایات کا کوئی مجموعہ بھی موجود نہیں جو عبادت میں معصوم کے سہو کی نفی کرتا ہو۔ صرف ایک روایت ہے جس کی وہ اس باب میں تاویل کرتے ہیں، اور ہم بیان کریں گے کہ اس کی دلالت کامل نہیں ہے اور اس معنی پر، جس کے وہ قائل ہیں، یقین پیدا نہیں کرتی۔ بلکہ صحیح روایات کی بڑی تعداد کے مقابلے میں، جنہیں ہم ذکر کریں گے، اس روایت کو ترجیح دینا ممکن نہیں ہے۔

وہ روایات جو معصوم کے سَہو اور نسیان کو بیان کرتی ہیں

وہ روایات جو نبی اکرم (ص) کے سَہو کا ذکر کرتی ہیں

تہذیب الاحکام: ابو بصیر کہتے ہیں: (میں نے امام صادق (ع) سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا جس نے (چار رکعت والی) نماز کو غلطی سے دوسری رکعت پر ہی ختم کر دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر چلا گیا۔ امام نے فرمایا: اسے نماز دوبارہ پڑھنی چاہیے۔ میں نے امام سے عرض کیا: پھر لوگ رسول اللہ (ص) سے منسوب کیا کہتے ہیں؟ امام نے جواب میں حدیثِ ذوالشمالین کا حوالہ دیا اور فرمایا: چونکہ رسول اللہ (ص) اپنی جگہ سے نہیں اٹھے تھے اور نماز کی صورت کو خراب نہیں کیا تھا، اس لیے آپ (ص) نے اپنی نماز کو مکمل کر لیا)[1]

تہذیب الاحکام: ابو بصیر بیان کرتے ہیں کہ (میں نے امام صادق (ع) سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا جس نے (چار رکعت والی) نماز کو غلطی سے دوسری رکعت پر ہی ختم کر دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے کام میں لگ گیا۔ امام (ع) نے فرمایا: اس پر لازم ہے کہ نماز کو دوبارہ ادا کرے۔ میں نے امام (ع) سے عرض کیا: پھر رسول اللہ (ص) نے دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد نماز کو دوبارہ کیوں ادا نہیں کیا؟ امام (ع) نے فرمایا: اس لیے کہ رسول اللہ (ص) اپنی جگہ سے نہیں اٹھے تھے)[2]

تہذیب الاحکام: حارث بن مغیرہ نصری کہتے ہیں: (میں نے امام صادق (ع) سے عرض کیا: ہم نے نمازِ مغرب ادا کی، لیکن امام سے سہو اور غلطی ہو گئی اور انہوں نے دو رکعت پر سلام پھیر دیا۔ ہم نے نماز دوبارہ پڑھ

---

[1] . تہذیب الاحکام، طوسی، جلد 2، صفحات 245 اور 346۔

[2] . تہذیب الاحکام، طوسی، جلد 2، ص 346۔

لی۔ امام (ع) نے فرمایا: تم نے نماز دوبارہ کیوں پڑھی؟ کیا رسول اللہ (ص) نے دو رکعت پر نماز ختم نہیں کی تھی، پھر مزید دو رکعت کے ذریعے اسے مکمل نہیں کیا تھا؟ تم نے اسے مکمل کیوں نہ کیا؟!)[1]

تہذیب الاحکام: ابو بکر حضرمی کہتے ہیں: (میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ نمازِ مغرب ادا کر رہا تھا۔ جب میں نے دو رکعتیں پڑھ لیں تو سلام پھیر دیا۔ ان میں سے بعض نے کہا: تم نے صرف دو رکعتیں پڑھی ہیں۔ چنانچہ میں نے نماز دوبارہ ادا کی اور اس واقعے کی خبر امام صادق (ع) کو دی۔ امام (ع) نے فرمایا: تم نے نماز دوبارہ پڑھی؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں۔ امام (ع) مسکرائے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہیں اس صورت میں اجر دیتا کہ تم کھڑے ہو جاتے اور ایک رکعت اور پڑھ لیتے۔ رسول اللہ (ص) سے بھی سہو اور غلطی ہو گئی تھی اور آپ (ص) نے دو رکعت پر سلام پھیر دیا تھا، پھر آپ (ع) نے حدیثِ ذوالشمالین کا ذکر فرمایا اور کہا کہ: اس کے بعد آپ (ص) نے دو رکعتیں اس میں شامل کر لیں)[2]

تہذیب الاحکام: امیر المؤمنین علی (ع) نے فرمایا: (رسول اللہ (ص) نے نمازِ ظہر پانچ رکعت ادا کیں اور [اپنی جگہ سے] ہٹ گئے۔ بعض لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ (ص) کیا نماز میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے؟ آپ (ص) نے فرمایا: وہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: آپ نے ہمیں پانچ رکعت نماز پڑھائی ہے۔ اس پر آپ (ص) بیٹھے ہوئے قبلہ رُخ ہوئے اور تکبیر کہی، پھر دو سجدے بجالائے جن میں نہ قراءت تھی اور نہ رکوع، اس کے بعد سلام پھیرا، اور آپ (ص) ہمیشہ فرمایا کرتے تھے: یہ دونوں (سجدے) ناک کو مٹی میں رگڑ دیتے ہیں)[3]

تہذیب الاحکام: زید شحّام ابو اسامہ کہتے ہیں: میں نے اس شخص کے بارے میں سوال کیا جس نے نمازِ عصر پانچ یا چھ رکعتیں پڑھ لی ہوں۔ امام (ع) نے فرمایا: (اگر اسے یقین ہو کہ اس نے پانچ یا چھ رکعتیں پڑھی ہیں تو وہ نماز دوبارہ پڑھے، اور اگر اسے معلوم نہ ہو کہ اس نے اضافہ کیا ہے یا کمی کی ہے تو بیٹھے ہوئے تکبیر کہے اور اپنی نماز کے آخر میں سورۂ فاتحہ پڑھے، پھر تشہد کہے۔ اور اگر اسے یقین ہو کہ اس نے دو یا تین رکعتیں پڑھی ہیں اور نماز ختم کر دی اور بات بھی کر لی، اور اسے معلوم نہ تھا کہ اس نے نماز حالتِ قیام میں ختم کی تھی، تو اس پر لازم

---

1. تہذیب الاحکام، طوسی، جلد 2، ص 180۔
2. تہذیب الاحکام، طوسی، جلد 2، ص 180۔
3. تہذیب الاحکام، طوسی، جلد 2، صفحات 349 اور 350۔

ہے کہ جتنی نماز باقی رہ گئی تھی اسے مکمل کرے، کیونکہ رسول اللہ (ص) نے لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھائی، پھر آپ (ص) بھول گئے اور اسی دوسری رکعت پر نماز ختم کر دی۔ اس پر ذوالشمالین نے عرض کیا: یا رسول اللہ (ص)! کیا نماز میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے؟ آپ (ص) نے فرمایا: اے لوگو! کیا ذوالشمالین سچ کہہ رہا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: جی ہاں، آپ (ص) نے صرف دو رکعت نماز پڑھی ہے۔ پس آپ (ص) کھڑے ہوئے اور جتنی نماز باقی رہ گئی تھی اسے مکمل فرمالیا)[1]

کافی: سماعہ بن مہران کہتے ہیں کہ امام صادق (ع) نے فرمایا: (جو شخص اپنے سَہو اور غلطی کو یاد رکھے اور اسے مکمل کر لے، اس پر سجدۂ سہو لازم نہیں ہوتا۔ رسول اللہ (ص) نے لوگوں کو نمازِ ظہر دو رکعت پڑھائی، پھر سَہو اور غلطی ہو گئی اور سلام پھیر دیا۔ اس پر ذوالشمالین نے عرض کیا: کیا نماز میں کچھ اضافہ کر دیا گیا ہے؟ آپ (ص) نے فرمایا: کیا چیز؟ اس نے عرض کیا: آپ نے دو رکعت نماز پڑھی ہے۔ رسول اللہ (ص) نے فرمایا: کیا تم بھی اسی کی بات کہتے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا: جی ہاں۔ پھر رسول اللہ (ص) کھڑے ہوئے اور ان کے ساتھ نماز کو مکمل کیا اور ان کے ساتھ دو سجدۂ سہو انجام دیے۔ راوی کہتا ہے: میں نے عرض کیا: کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے دو رکعت نماز پڑھی اور یہ گمان کیا کہ چار رکعت پڑھ لی ہیں، چنانچہ اس نے سلام پھیرا اور نماز ختم کر دی، پھر وہاں سے جانے کے بعد اسے یاد آیا کہ اس نے تو صرف دو رکعت نماز پڑھی تھی؟ امام (ع) نے فرمایا: وہ نئے سرے سے قبلہ رُخ ہو گا۔ میں نے عرض کیا: پھر رسول اللہ (ص) نے قبلہ رُخ کیوں نہیں ہوئے اور اپنی نماز کی باقی مقدار کو کیوں مکمل کر لیا؟ امام (ع) نے فرمایا: اس لیے کہ رسول اللہ (ص) اس جگہ سے نہیں گئے تھے؛ اگر وہ اپنی جگہ سے نہ گئے ہوں اور پہلی دو رکعتیں ادا کر چکے ہوں تو ان پر لازم ہے کہ نماز کی جتنی مقدار باقی رہ گئی ہے اسے پورا کریں)[2]

کافی: حسن بن صدقہ کہتے ہیں: (میں نے ابوالحسن اوّل [امام موسیٰ کاظم (ع)] سے عرض کیا: کیا رسول اللہ (ص) نے پہلی دو رکعتوں میں سلام پھیرا تھا؟ آپ نے فرمایا: جی ہاں۔ میں نے عرض کیا: اس شخص کی حالت بھی انہی کی مانند ہے۔ آپ نے فرمایا: اللہ عزوجل نے یہ چاہا ہے کہ انہیں سمجھا دے)[3]

---

1. تہذیب الاحکام، طوسی، جلد 2، ص 352۔
2. کافی، کلینی، جلد 3، صفحات 355 اور 356۔
3. کافی، کلینی، جلد 3، ص 356۔

کافی: سعید اعرج کہتے ہیں: میں نے امام صادق (ع) سے سنا کہ آپ (ع) نے فرمایا: (رسول اللہ (ص) نے نماز ادا کی، پھر دوسری رکعت میں سلام پھیر دیا۔ جو لوگ آپ (ص) کے پیچھے تھے، انہوں نے آپ سے پوچھا: یا رسول اللہ (ص)، کیا نماز میں کوئی بات پیش آ گئی ہے؟ آپ (ص) نے فرمایا: کیا بات؟ انہوں نے عرض کیا: آپ (ص) نے دو رکعت نماز پڑھی ہے۔ آپ (ص) نے فرمایا: اے ذوالیدین! کیا واقعی ایسا ہی ہے؟ اسے ذوالشمالین بھی کہا جاتا تھا۔ اس نے عرض کیا: جی ہاں۔ پھر رسول اللہ (ص) نے اسی رکعت کو بنیاد بنا کر نماز کو مکمل کیا اور اسے چار رکعت تک پہنچا دیا۔ امام صادق (ع) نے اس کے بعد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے امت پر لطف و مہربانی کے سبب نبی (ص) کو فراموشی میں مبتلا کیا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اگر کوئی اور شخص یہ کام کرتا تو اس پر عیب لگایا جاتا اور کہا جاتا کہ تمہاری نماز قبول نہیں ہوئی؟ لیکن آج اگر کوئی شخص اس معاملے سے دوچار ہو تو وہ کہتا ہے کہ رسول اللہ (ص) نے ایک سنت قائم کی ہے اور وہ اس میں نمونہ ہیں، اور نماز کے دوران گفتگو کرنے کے بدلے دو سجدے ادا کیے جاتے ہیں)[1]

ابو صَلت ہَروی کہتے ہیں: میں نے امام رضا (ع) سے عرض کیا: (اے فرزندِ رسول اللہ (ص)! کوفہ والوں میں ایک گروہ ایسا ہے جو یہ گمان کرتا ہے کہ نبی (ص) سے نماز میں سَہو واقع نہیں ہوا۔ امام (ع) نے فرمایا: وہ جھوٹ کہتے ہیں، اللہ ان پر لعنت کرے۔ جسے سَہو نہیں ہوتا وہ صرف اللہ ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں)[2]

امام صادق (ع) نے اپنے والد (ع) سے روایت کی ہے کہ: (نبی اکرم (ص) نے نماز ادا کی اور اس میں قراءت بلند آواز سے کی۔ جب نماز مکمل ہو گئی تو آپ (ص) نے اپنے صحابہ سے فرمایا: کیا قراءت میں سے کوئی چیز چھوٹ گئی ہے؟ وہ خاموش رہے۔ نبی اکرم (ص) نے فرمایا: کیا تم میں اُبی بن کعب موجود ہیں؟ عرض کیا گیا: جی ہاں۔ آپ (ص) نے فرمایا: کیا نماز میں سے کچھ چھوٹ گیا تھا؟ اُبی بن کعب نے عرض کیا: جی ہاں، یا رسول اللہ (ص)! ایسا ہی ہوا تھا۔ اس پر نبی اکرم (ص) ناراض ہوئے، پھر فرمایا: اس قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ ان کے سامنے اللہ کی کتاب پڑھی جاتی ہے اور جو آیات ان پر پڑھی جاتی ہیں اور چھوٹ جاتی ہیں، وہ انہیں معلوم نہیں ہوتیں؟

---

[1] . کافی، کلینی، جلد 3، ص 357۔

[2] . عیون اخبار الرضا (ع)، صدوق، جلد 2، ص 219۔

بنی اسرائیل اسی طرح ہلاک ہوئے تھے؛ ان کے جسم تو حاضر تھے مگر ان کے دل حاضر نہ تھے، اور اللہ تعالیٰ اس بندے کی نماز قبول نہیں کرتا جس کا دل اس کے جسم کے ساتھ حاضر نہ ہو)[1]

من لایحضرہ الفقیہ: حسن بن محبوب، سعید اعرج[2] سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام صادق (ع) سے سنا، آپ (ع) نے فرمایا: (اللہ تبارک و تعالیٰ نے نمازِ فجر کے وقت اپنے رسول (ص) کو نیند میں مبتلا کر دیا یہاں تک کہ سورج طلوع ہو گیا۔ پھر آپ (ع) بیدار ہوئے اور فجر سے پہلے کی دو رکعتیں ادا کیں، اس کے بعد نمازِ فجر پڑھی، اور اللہ نے آپ (ع) کو نماز میں سہو اور غلطی میں مبتلا کیا، چنانچہ آپ (ع) نے دو رکعت پر سلام پھیر دیا۔ پھر آپ (ع) نے ذوالشمالین کے کہے ہوئے کلام کو بیان فرمایا۔ یہ سب اس لیے کیا گیا تاکہ جب کوئی مسلمان اپنی نماز سے سو جائے یا اس میں سہو ہو جائے تو گھبرا نہ جائے، پھر جب اسے اس بارے میں بتایا جائے تو کہا جائے: یہ تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ) کو بھی پیش آیا تھا)[3]

وہ روایات جو ائمہ (ع) کے سَہو کا ذکر کرتی ہیں

ایسی روایات موجود ہیں جن میں ائمہ (ع) کے عبادت میں سہو کا ذکر آیا ہے، اور یہاں ہم ان میں سے چند کو ان افراد کے ذکر کے ساتھ بیان کرتے ہیں جنہوں نے انہیں صحیح قرار دیا ہے:

استبصار میں زرارہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ امام باقر (ع) نے فرمایا: (علی (ع) نے واجب طواف آٹھ مرتبہ انجام دیا، سات کو ترک کیا اور ایک پر بنا رکھی، پھر اس پر چھ مرتبہ اضافہ کیا، پھر مقام کے پیچھے دو رکعت نماز ادا کی، پھر صفا و مروہ کی طرف گئے، جب ان دونوں کے درمیان سعی سے فارغ ہوئے تو واپس آئے اور وہ دو

---

1. محاسن، برقی، جلد 1، ص 260۔

2. صدوق نے حسن بن محبوب سے اس روایت کے طریقِ نقل کے بارے میں کہا ہے: میں حسن بن محبوب کی روایات محمد بن موسیٰ بن متوکل کے واسطے سے، وہ عبداللہ بن جعفر حِمیَری اور سعد بن عبداللہ سے، وہ احمد بن محمد بن عیسیٰ سے، اور وہ حسن بن محبوب سے نقل کرتا ہوں۔

سید خوئی نے معجم میں کہا ہے: یہ طریق صحیح ہے۔ (معجم رجال الحدیث، جلد 5، ص 91) شیخ طوسی نے اپنی فہرست اور رجال میں حسن بن محبوب کو موثق قرار دیا ہے۔ نجاشی نے بھی کہا ہے کہ کشی نے انہیں ان فقہاء میں شمار کیا ہے جن کی روایات کے صحیح ہونے پر ہمارے اصحاب کا اجماع ہے، اور رباطی نے بھی انہیں موثق کہا ہے۔ سید خوئی کہتے ہیں: بظاہر میں نے علی بن حسن بن رباط کے حالاتِ زندگی ذکر کیے ہیں، اور ان کے حالات کے بیان میں کہتے ہیں کہ نجاشی نے کہا ہے: ابوالحسن علی بن حسن بن رباط بجلی کوفی ثقہ ہیں۔ سعید اعرج کے بارے میں بھی نجاشی کہتے ہیں: سعید بن عبدالرحمٰن قیل بن عبداللہ اعرج سمان ابو عبداللہ تمیمی، اہلِ کوفہ ہیں اور ثقہ ہیں۔ مرزائے قمی نے بھی مناہج الاحکام، ص 677 میں، اور شیخ عبداللہ مامقانی نے نہایۃ المقال فی تکملۃ غایۃ الامال، ص 318 میں اس روایت کی صحت پر تصریح کی ہے۔

3. من لایحضرہ الفقیہ، صدوق، جلد 1، صفحات 358 سے 359 تک۔

رکعت نماز جو پہلے مقام پر ترک ہو گئی تھی، ادا کی)۔ امام صادق (ع) نے فرمایا: (علی (ع) نے آٹھ مرتبہ طواف کیا، پھر اس پر چھ مرتبہ اضافہ کیا، پھر چار رکعت نماز ادا کی) [1]،[2]

وسائل الشیعہ میں فضیل کہتے ہیں: میں نے امام صادق (ع) سے سہو کے بارے میں عرض کیا۔ آپ (ع) نے سوالیہ انداز میں فرمایا: (کیا کوئی اس سے بچ سکتا ہے؟ بسا اوقات میں کسی خادم کو اپنے پیچھے بٹھاتا ہوں تاکہ وہ میری نماز کی حفاظت کرے) [3]،[4]

تہذیب الاحکام میں عبید اللہ حلبی کہتے ہیں: میں نے امام صادق (ع) کو دو سجدۂ سہو میں یہ کہتے ہوئے سنا: (بِسْمِ اللَّهِ وَ بِاللَّهِ وَ صَلَّى اللَّهُ عَلَى مُحَمَّدٍ وَ عَلَى آلِ مُحَمَّدٍ۔ راوی کہتے ہیں: میں نے ایک اور مرتبہ بھی سنا کہ آپ (ع) دو سجدۂ سہو میں یہ کہتے تھے: بِسْمِ اللَّهِ وَ بِاللَّهِ وَ السَّلَامُ عَلَيكَ أَيهَا النَّبِي) [5]،[6]

---

[1]. تہذیب الاحکام، طوسی، ج5، ص112۔

[2]. ان افراد میں سے جنہوں نے روایتِ معاویہ بن وہب کے صحیح ہونے کی تصریح کی ہے، درج ذیل ہیں:
1. محقق اردبیلی، مجمع الفائدۃ والبرہان، ج7، ص110۔
2. محمد تقی مجلسی اول، روضۃ المتقین فی شرح من لایحضرہ الفقیہ، ج4، ص546۔
3. محقق سبزواری، ذخیرۃ المعاد، ج1، ص636۔
4. محقق بحرانی، حدائق الناضرہ، ج13، ص201۔
5- محقق نراقی، مستند الشیعہ، ج12، ص290۔

[3]. وسائل الشیعہ، شیخ حر عاملی، ج8، ص252۔

[4]. وہ شخص جس نے روایتِ فضیل کے صحیح ہونے کی تصریح کی ہے:
1. سید عبد الاعلی سبزواری، رحمہ اللہ، کتاب مہذّب الاحکام، ج8، ص377۔

[5]. تہذیب الاحکام، شیخ طوسی، ج2، ص196۔

[6]. ان افراد میں سے جنہوں نے روایتِ حلبی کے صحیح ہونے کی تصریح کی ہے، درج ذیل ہیں:
1-علامہ حلی، منتہی المطلب، ج7، ص78۔
2-فرزندِ علامہ، محمد بن حسن بن یوسف بن مطہر حلی، ایضاح الفوائد، ج1، ص144۔
3-سید محمد عاملی، مدارک الاحکام، ج4، ص284۔
4-محمد تقی مجلسی اول، روضۃ المتقین فی شرح من لایحضرہ الفقیہ، ج2، ص412۔
5-علامہ مجلسی، ملاذ الاخیار، ج4، ص161۔
6- محقق بحرانی، حدائق الناضرۃ، ج9، ص334۔
7- میرزای قمی، مناہج الاحکام، ص587۔
8-سید عبد الاعلی سبزواری، مہذب الاحکام، ج8، ص357۔

اسی طرح یہاں «عیون اخبار الرضا» میں شیخ صدوق کی ایک روایت بھی موجود ہے جو بغیر تفصیل کے یہ بیان کرتی ہے کہ امام کو نسیان اور سہو لاحق ہوتا ہے:

صدوق امام رضا(ع) سے روایت کرتے ہیں: (امام کو روح القدس کے ذریعے تائید حاصل ہے، اور اس کے اور خداوند کے درمیان نور کا ایک ستون ہے جس میں وہ بندوں کے اعمال کو دیکھتا ہے۔ اور جب بھی ہدایت کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے تو اسے اس سے آگاہ کر دیا جاتا ہے اور اسے اس کے لیے وسعت دے دی جاتی ہے ، لہٰذا وہ جان لیتا ہے، اور جب اس سے لے لیا جاتا ہے تو وہ نہیں جانتا۔ امام پیدا ہوتا ہے اور اولاد والا ہوتا ہے، صحت مند رہتا ہے اور بیمار ہوتا ہے، کھاتا ہے اور پیتا ہے، پیشاب اور پاخانہ کرتا ہے، نکاح کرتا ہے اور سوتا ہے، بھولتا ہے اور اس سے سہو اور غلطی واقع ہوتی ہے، خوش ہوتا ہے اور غمگیں ہوتا ہے، ہنستا ہے اور روتا ہے، زندہ ہوتا ہے اور وفات پاتا ہے، قبر میں داخل ہوتا ہے اور اس کی زیارت کی جاتی ہے، محشور کیا جاتا ہے اور کھڑا کیا جاتا ہے، اس پر اعمال پیش کیے جاتے ہیں اور اس سے سوال کیا جاتا ہے، اسے ثواب دیا جاتا ہے اور اسے کرامت عطا کی جاتی ہے، اور وہ شفاعت کرتا ہے۔ اور اس کی نشانی دو خصوصیات میں ہے: علم میں اور دعا کے قبول ہونے میں۔ اور جو بھی واقعہ وہ اس کے وقوع سے پہلے خبر دیتا ہے، وہ اس عہد کی بنا پر ہے جو رسول اللہ (ص) سے لیا گیا ہے، جسے اس نے رسول اللہ (ص) اور اپنے آباء (ع) سے وراثت میں پایا ہے۔ اور یہ معاملہ ان امور میں سے ہے جن پر خداوند علام الغیوب عزوجل نے جبرئیل (ع) سے عہد و پیمان لیا ہے)[1]

ایک اور روایت بھی موجود ہے جسے اللہ کے خلیفہ یا معصوم کے سہو یا فراموشی کے حوالے سے، اور اس کے نتیجے کو سمجھنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ روایت کا ظاہر واضح ہے اور وضاحت کا محتاج نہیں۔

محمد بن مسلم کہتے ہیں: میں نے امام صادق (ع) سے سنا کہ آپ (ع) نے فرمایا: (سفیانی اپنے ظہور کے بعد عورت کے حمل کی مدت کے برابر پانچ سرزمینوں پر حکومت کرے گا۔ پھر فرمایا: میں اللہ سے مغفرت طلب کرتا ہوں، اونٹنی کے حمل کی مدت کے برابر۔ اور یہ ان حتمی امور میں سے ہے جن کا ٹلنا ممکن نہیں)[2],[3]

---

[1] . عیون اخبار الرضا، صدوق، جلد 1، ص 193؛ بحار الانوار، مجلسی، جلد 25، ص 117۔

[2] . غیبت، طوسی، ص 449 اور 450۔

[3] . حر عاملی کہتے ہیں: "میرے نزدیک یہ ابہام پیدا کرنا اور تردد میں ڈالنا ہے، نہ کہ شک اور غلطی، اگرچہ راوی کی غلطی کا احتمال بھی موجود ہے"۔ (اثبات الہداۃ، جلد 3، ص 729)۔

کیا ایسی روایات موجود ہیں جو معصوم سے سہو اور نسیان کی نفی کرتی ہوں؟

کوئی بھی ایسی روایت موجود نہیں جو مطلق طور پر، اور نہ عبادت میں، خلیفۂ خدا یا معصوم سے سہو اور نسیان کی نفی کرے، تاکہ یہ بحث کی جائے کہ آیا یہ روایات یقین اور اعتقاد کا سبب بنتی ہیں یا نہیں۔ درحقیقت ایسی کوئی روایت سرے سے موجود ہی نہیں۔ بلکہ صرف ایک روایت پائی جاتی ہے جو رسولِ خدا محمد (ص) سے دو سجدۂ سہو کے انجام دینے کی نفی کرتی ہے۔ لیکن دو سجدۂ سہو کی نفی لازماً عبادت میں سہو کی نفی (عمومی طور پر) کو ثابت نہیں کرتی۔

زرارہ کہتے ہیں: میں نے امام باقر(ع) سے پوچھا: (کیا رسولِ اللہ (ص) نے کبھی دو سجدۂ سہو انجام دیے ہیں؟ آپ (ع) نے فرمایا: نہیں۔ فقیہ شخص دو سجدۂ سہو انجام نہیں دیتا)۔[1]

بلا شبہ ہماری گفتگو اس بارے میں نہیں ہے کہ آیا رسولِ اللہ (ص) نے دو سجدۂ سہو انجام دیے ہیں یا نہیں۔ اگر رسولِ اللہ (ص) نے کسی خاص مورد میں (جیسے رکعات کی تعداد میں سہو) دو سجدۂ سہو انجام نہیں دیے، تو اس میں کوئی اشکال نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ نماز میں یا رکعات کی تعداد میں ہر سہو ہمیشہ سجدۂ سہو کا موجب بنے، تاکہ یہ کہا جائے کہ رسولِ خدا محمد (ص) سے کسی ایک مسئلے میں "سجدۂ سہو کی نفی"، اور "عبادت میں سہو کی نفی" کے درمیان کوئی براہِ راست تعلق موجود ہے۔

اتفاقاً یہی مذکورہ بالا روایت، فقیہ سے بھی ہمیشہ کے لیے دو سجدۂ سہو کی نفی کرتی ہے، اور یہ صرف رسولِ خدا (ص) اور ائمۂ معصومین کے بارے میں نہیں ہے؛ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس سجدۂ سہو کی نفی کی گئی ہے، وہ ایسے عمل کے بارے میں ہے جسے دین میں فقیہ ہونے والا شخص کسی دوسرے ایسے عمل کی ضرورت کے بغیر پورا کر سکتا ہے جو سجدۂ سہو کا باعث بنے۔ مثال کے طور پر، جو شخص دوسری اور چوتھی رکعت کے درمیان شک کرے، وہ چار رکعت کا بنا رکھتا ہے اور تشہد پڑھتا ہے اور سلام دیتا ہے اور دو رکعت کھڑے ہو کر پڑھتا ہے، اور سجدۂ سہو کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

مجلسی کہتے ہیں: "ممکن ہے کہ بعض روایات میں سفیانی کی حکومت کی مدت تقیہ پر محمول ہو، کیونکہ وہ ان کی روایات میں مذکور ہے، یا ممکن ہے مقصود یہ ہو کہ اس کی مقدار میں بداء واقع ہو سکتا ہے، یا ممکن ہے مقصود اس کی حکومت کے استقرار کی مدت ہو، اور اختلاف اس استقرار کی تعریف کے اختلاف کی وجہ سے ہو"۔ بحار الانوار، مجلسی، جلد 52، ص 216۔

[1] . تہذیب الاحکام، شیخ طوسی، جلد 2، ص 350 سے 351۔

مزید یہ کہ یہ صرف ایک روایت ہے اور اس یقین کا باعث نہیں بنتی جو اعتقاد میں لازم ہوتا ہے۔ یہ روایت خبرِ واحد ہے، اور جو لوگ اس سے استدلال کرتے ہیں وہ دراصل اس روایت کے بارے میں اپنی ہی غلط فہمی کی بنیاد پر استدلال کرتے ہیں۔ بعید نہیں کہ یہ مسئلہ فقہی احکام کی جزئیات میں سے کسی ایک جز کو بھی ثابت نہ کرتا ہو، چہ جائیکہ زیرِ بحث مسئلہ ایک اعتقادی امر ہے اور اس کے لیے قطعی دلیل درکار ہوتی ہے، جس سے وہ لوگ محروم ہیں۔ نہ ان کے پاس مکمل اور تمام عقلی دلیل ہے، نہ متواتر روایات یا ایسی روایات جو قطعی طور پر صحیح ہوں، اور نہ ہی کوئی محکم قرآنی دلیل؛ بلکہ جو کچھ موجود ہے وہ اس عقیدے کے خلاف ہے۔ میں نے اس روایت کے علاوہ کوئی اور روایت نہیں پائی جو یہاں زیرِ بحث موضوع (یعنی عبادت میں معصوم سے سہو کی نفی) سے متعلق ہو؛ لیکن کچھ افراد ایسے ہیں جو زبردستی کے طریقے سے اسے ثابت کرنا چاہتے ہیں (دور کے ڈھول سُہانے) اور اسی مقصد کے لیے انہوں نے ایسی روایات کا سہارا لیا ہے جو حقیقتاً عبادت میں خلیفۂ خدا یا معصوم سے سہو کی نفی کے موضوع سے دور ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے ان کی طرف سے کوئی ایسی چیز نہیں پائی جو علمی اعتبار سے قابلِ قدر ہو کہ اس کا جواب دیا جائے؛ صرف اندھی سردرگمی اور کلام کو حد سے زیادہ معنی پہنانا ہے۔ یہ ان کے کلام کے بارے میں میری رائے ہے۔

حقیقت میں یہ انتہائی شرمناک بات ہے کہ انسان اپنے عقیدے کے اثبات میں اس قدر پست سطح تک گر جائے کہ یہ کہنے لگے: روح القدس سَہو سے پاک ہے، اور معصوم شخص روح القدس کے ذریعے تائید یافتہ ہے، اور اسی کو اس بات کی دلیل بنادے کہ معصوم عبادت میں سَہو سے محفوظ ہے۔

یہ درحقیقت ایک قسم کی سفسطہ ہے؛ کیونکہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ امام کی روح (جو مجرد ہے) یا روح القدسِ مجرد کی عصمت، یعنی ایسی روح جو سَہو سے منزہ ہو، کے بارے میں گفتگو کی جائے۔ بلکہ گفتگو اس بات پر ہے کہ دنیاوی زندگی میں امام کی حالت کیا ہے۔ امام دنیاوی زندگی میں ایک گھنا اور مادی، غیر لطیف جسم رکھتا ہے، اور اس کے دماغ کی قوت دیگر انسانوں کی طرح محدود ہوتی ہے، اور یہی جسم اسے دیگر عوالم سے پردے اور حجاب میں رکھتا ہے۔ یہی جسم ہر انسان میں سَہو اور نسیان کی اصل وجہ ہوتا ہے۔ لہٰذا مجرد روح کی عصمت یا مجرد روح کا سہو سے محفوظ ہونا اس سبب سے ہوتی ہے کہ وہ، مثلاً، مادی مشاغل میں مبتلا نہیں ہوتی۔ یہ بالکل بھی اس انسان کی عصمت کے معنی میں نہیں ہے جو اس مادی عالم میں روح اور جسم کے مرکب کی صورت میں موجود ہے۔

تیسرا: عقلی اشکالات

پہلا: شیخ مفید کے اشکالات

شیخ مفید، اللہ تعالیٰ اس پر رحمت فرمائے، کہتے ہیں:

(ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ نماز کے اوقات میں یہ ممکن ہو کہ نیند انبیاء پر غالب آ جائے یہاں تک کہ وقت گزر جائے اور وہ نماز قضا کر لیں۔ اس میں ان کے لیے کوئی عیب یا کمی نہیں ہے؛ اس لیے کہ انسان نیند کے غالب آ جانے سے جدا نہیں ہوتا اور اس وجہ سے سوئے ہوئے شخص پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سَہو ایسا نہیں ہے؛ کیونکہ سَہو انسان میں کمال کی کمی ہے، اور یہ ایک ایسا عیب ہے جس میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات سَہو خود سَہو کرنے والے شخص کی وجہ سے ہوتا ہے اور بعض اوقات دوسروں کے افعال کی بنا پر ہوتا ہے۔ لیکن نیند اللہ تعالیٰ کے فعل سے ہوتی ہے اور کسی بھی حالت میں اس سے بچنا بندوں کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ اگر یہ ان کے اختیار میں ہوتا تو اس شخص کے لیے کوئی کمی یا عیب نہ ہوتا؛ اس لیے کہ نیند سے اجتناب کی عدم قدرت میں تمام انسان مشترک ہیں۔ لیکن سَہو ایسا نہیں ہے؛ کیونکہ اس سے بچنا ممکن ہے، اور اس لیے بھی کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دانا لوگ اپنے مال اور راز ایسے افراد کے پاس امانت رکھنے سے گریز کرتے ہیں جو سَہو اور نسیان میں مبتلا ہوتے ہیں؛ لیکن اس شخص کے پاس امانت رکھنے سے پرہیز نہیں کرتے جس پر کبھی کبھار نیند غالب آ جاتی ہے؛ اور ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء اُن افراد کی حدیث کو ترک کر دیتے ہیں جو سَہو میں مبتلا ہوتے ہیں، الا یہ کہ بیدار، تیز فہم، چوکنے اور مضبوط حافظے والے دوسرے لوگ بھی، ان کے علاوہ، اسی حدیث کو بیان کریں۔ لہٰذا سَہو اور نیند کے درمیان فرق، اس بات کے ذریعے واضح ہو جاتا ہے جسے ہم نے بیان کیا ہے۔ اگر یہ جائز قرار دیا جائے کہ نبی (ص) جو ہمارے لیے نمونہ ہے، اپنی نماز میں سَہو کرے، اگر نماز مکمل کرنے سے پہلے سلام پھیر دے اور اسے ترک کر دے، اور لوگ اس کے گواہ ہوں اور انہیں نبی کی خطا کا پورا علم حاصل ہو جائے، تو پھر روزے میں بھی اس کے لیے سَہو جائز ہو جائے گا، اور نتیجتاً وہ ماہِ رمضان کے دن میں اپنے اصحاب کے درمیان کھائے پیئے گا اور وہ سب اسے دیکھیں گے اور اس کی غلطی کی نشاندہی کریں گے اور اسے اس گناہ سے روکیں گے جس میں وہ مبتلا ہے؛ اور ماہِ رمضان کے دن عورتوں سے ہم بستری بھی اس کے لیے جائز ہو جائے گی، اور ایسے امور میں وہ سَہو سے محفوظ نہیں رہے گا۔ یہاں تک کہ وہ حرام عورتوں سے بھی ہم بستری کر سکتا ہے اور اس بارے میں سَہو اور غلطی کر بیٹھے اور یہ گمان کرے کہ وہ اس کی بیویاں ہیں؛ اور یہ معاملہ مزید پھیل جائے

اور اس کا سبب بنے کہ وہ غلطی سے اپنے محارم کے ساتھ بھی ہم بستری کر بیٹھے؛ اور زکوٰۃ ادا کرنے میں بھی غلطی کرے، اسے اس کے وقت سے مؤخر کر دے، اور غلطی سے اسے ایسے شخص کو دے دے جو اس کا مستحق نہیں، اور بھول کر بعض مستحقینِ زکوٰۃ کو اس میں سے محروم کر دے اور حج میں بھی غلطی کرے اور حالتِ احرام میں ہم بستری کر بیٹھے، اور طواف سے پہلے سعی کر لے، اور رَمیِ جمرات کے طریقے سے آگاہ نہ ہو، اور یہ معاملہ مزید امور تک سرایت کر جائے اور شریعت کے تمام اعمال میں غلطی کرتا چلا جائے؛ یہاں تک کہ انہیں ان کی حد و حدود سے خارج کر دے، اور ان اعمال کی ادائیگی کو ان کے مقررہ وقت میں باطل کر دے، اور انہیں غیر حقیقی صورت میں انجام دے۔ نیز اس بات کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شراب کی حرمت کے بارے میں بھی غلطی کرے اور بھول کر اسے پی لے یا یہ گمان کرے کہ وہ حلال شراب ہے، پھر اس کے بعد، اپنی اس خاص صفت کے باعث، متوجہ ہو جائے...)[1]

شیخ مفید کے پہلے اشکال کی وضاحت

"سَہو انسان کے نزدیک کمال کی کمی ہے اور ایک ایسا عیب ہے جو اسی شخص کے ساتھ خاص ہوتا ہے جو اس میں مبتلا ہو؛ کیونکہ اس سے بچنا ممکن ہے۔ اشکال کا مفہوم یہ ہے کہ خلیفۂ خدا سب سے پہلا شخص ہوتا ہے جو اُن عیوب سے اجتناب کرتا ہے جن سے انسان بچ سکتا ہے۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ خلیفۂ خدا یا امام کی طرف سَہوی عیب کے ارتکاب کی نسبت دی جائے، جبکہ انسان کے لیے اس سے دوری اختیار کرنا ممکن ہے؟"

جواب: شیخ مفید کا یہ قول درست نہیں ہے۔ سَہو سے مکمل اور مطلق طور پر بچنا انسان کے لیے ممکن نہیں؛ اور اس کی وجہ انسان کا حیاتیاتی دماغ اور اس کی توجہ مرکوز رکھنے اور محفوظ کرنے کی محدود صلاحیت ہے۔ چنانچہ جیسے جیسے اُن امور کی تعداد بڑھتی جاتی ہے جن پر انسان کو توجہ مرکوز کرنی ہوتی ہے، ویسے ویسے ایک ہی امر پر اس کی توجہ کم ہوتی جاتی ہے۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز میں خشوع پر توجہ مرکوز ہونا، نماز کی رکعتوں کو بھلا دینے کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ شخص جو نماز میں پڑھی گئی رکعتوں کی تعداد بھول جائے، اُس شخص سے بہتر ہے جو اپنی نماز کی رکعتوں کو گنتا تو رہے مگر اس کی نماز ذکر اور خشوع سے خالی ہو۔ لہٰذا یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ رکعتوں کی تعداد بھول جانا کوئی ایسا عیب ہے جو صرف فرد ہی کے ساتھ خاص ہو؛ خصوصاً اس بنیاد پر کہ

---

[1]. عدم سہو نبی، شیخ مفید۔

پیش کیے گئے اشکال کے مطابق اس سے بچنا ممکن ہے۔ اسی طرح عقلی اعتبار سے یہ ممکن نہیں کہ انسان مطلق طور پر سَہو اور نسیان سے محفوظ رہے۔ اگر ایسا مان لیا جائے تو انسان نورِ محض بن جاتا ہے جس میں کسی قسم کی ظلمت اور تاریکی کا داخلہ نہیں رہتا؛ یعنی وہ کاملِ مطلق اور انسان، لاہوتِ مطلق بن جاتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس سے کہیں بلند تر ہے، اور اس صورت میں لاہوتِ مطلق کی کثرت لازم آتی ہے۔ لہٰذا ہر وہ مسئلہ جو اس بنیاد پر قائم ہو کہ "سَہو ایک ایسی چیز ہے جس سے بچنا ممکن ہے" درست نہیں ہے۔ لیکن ان کی مثال کہ سَہو کے شکار افراد کی باتوں پر توجہ نہیں دی جاتی اور دانا لوگ اپنی امانتیں ان کے سپرد نہیں کرتے، یہ بات اس شخص کے بارے میں ہے جو سَہو اور نسیان کی طبعی حد سے تجاوز کر چکا ہو۔ یہ خلطِ مبحث اور ایک اندھی غلطی ہے۔ گفتگو اس بارے میں نہیں ہے؛ بلکہ سَہو اور نسیان کے واقع ہو جانے کے بارے میں ہے، چاہے وہ ایک یا دو مرتبہ ہی کیوں نہ ہو؛ یعنی وہ طبعی حالت جس میں ہر انسان مبتلا ہوتا ہے۔ یہ ایسی بات ہے کہ اگر کسی فرد کے ساتھ پیش آ جائے تو یہ اس امر کی رکاوٹ نہیں بنتی کہ دوسرے لوگ اس کی بات پر اعتماد کریں یا اپنی امانتیں اس کے سپرد کریں۔ عقل مند لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر کوئی شخص نماز میں سَہو کا شکار ہو جائے، یا مثلاً طواف میں غلطی سے آٹھویں چکر میں داخل ہو جائے، یا کوئی چھپائی ہوئی چیز بھول جائے اور بعد میں اسے پالے، تو وہ شخص امانت داری کی اہلیت نہیں رکھتا یا اس کی بات قابلِ اعتماد نہیں رہتی۔

شیخ مفید کے دوسرے اشکال کی وضاحت

"خلیفۂ خدا ایک ایسا نمونہ ہے جس کی مؤمنین پیروی کرتے ہیں۔ اگر خلیفۂ خدا نماز یا عبادت میں سَہو کرے تو اس کی نمونہ ہونے کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی اگر خلیفۂ خدا یا امام کے لیے سَہو اور نسیان جائز مان لیا جائے تو یہ درست نہیں رہتا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ہر حال میں ان کی اقتدا کا حکم دے۔"

جواب: یہ اشکال دقیق نہیں ہے؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو خلیفۂ خدا کے اعمال کی اقتدا کا حکم اسباب اور وجوہات کو نظرانداز کرتے ہوئے نہیں دیا۔ وہ بعض اوقات کسی واجب کو، جس کا وقت آ چکا ہو، کسی وجہ کی بنا پر ترک کر دیتے ہیں؛ جیسے ان کی طرف سے وقت آ جانے کے بعد واجب نماز کا ترک کرنا، اس سبب سے کہ وہ ایسی زمین سے گزر رہے ہوتے ہیں جس پر اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب نازل ہو چکا ہو۔ یہ معاملہ رسولِ اللہ (ص) اور امام علی (ع) کے ساتھ پیش آ چکا ہے۔ بعض اوقات وہ ایسا کام انجام دیتے ہیں جس کا انجام دینا دوسروں کے لیے جائز نہیں ہوتا بلکہ شریعت میں حرام ہوتا ہے؛ کیونکہ وہ عمل خاص انہی کے ساتھ مخصوص

ہوتا ہے؛ جیسے رسولِ اللہ (ص) کا ایک وقت میں چار سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنا۔ اور بعض اوقات وہ ایسی بیماری کی وجہ سے افطار کرتے ہیں جسے صرف وہ خود محسوس کرتے ہیں؛ مثلاً زخم، زہر لگ جانا یا کوئی اور بیماری جو انہیں لاحق ہو جائے۔ تو کیا باقی مؤمنین کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ بھی افطار کریں، صرف اس وجہ سے کہ معصوم نے افطار کیا ہے اور وہ مؤمنین کے لیے نمونہ ہیں؟ کیا معصوم پر یہ لازم ہے کہ وہ کوئی تختی لگائیں اور اس پر لکھیں: "میں بیمار ہوں اور افطار کرنے پر مجبور ہوں؟"

نتیجہ: معصوم ہر حال اور ہر عمل میں، حالت کو ملحوظ رکھے بغیر یا اس کے عمل کے بارے میں سوال کیے بغیر، مطلق طور پر قابلِ اقتدا نہیں ہوتا؛ خاص طور پر اس صورت میں جب وہ عمل دیکھنے والے کے لیے مشتبہ ہو۔ بالخصوص سَہو اور نسیان کے معاملے میں، مکلّف افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس بات کا اطمینان کریں کہ معصوم کا یہ عمل واقعی سَہو یا نسیان کا نتیجہ تھا، تاکہ اس عمل میں اس کی اقتدا کے ناجائز ہونے کو پیشِ نظر رکھا جا سکے۔ انسان کے اعمال میں اصل یہ ہے کہ وہ صحیح ہوں اور سَہو و نسیان سے صادر نہ ہوئے ہوں، جب تک اس کے برعکس ثابت نہ ہو جائے؛ ورنہ انسان کے اعمال کا محاسبہ درست طور پر ممکن نہیں رہتا۔

لہٰذا خلیفۂ خدا کے کسی بھی عمل کو سَہو یا نسیان کا نتیجہ نہیں سمجھا جائے گا، جب تک دلیل کے ساتھ یہ واضح نہ ہو جائے کہ وہ عمل سَہو یا نسیان ہی سے صادر ہوا ہے۔ معصوم کی پیروی کے بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ان کی پیروی یقینی ہے اور پیروی کرنے والے کے لیے نجات کا سبب ہے؛ اور اگر محمد رسولُ اللہ (ص) نمازِ فجر چار رکعت یا نمازِ ظہر دو رکعت پڑھ لیں تو ان کی پیروی ہی زیادہ درست اور ہدایت اور رہنمائی کے زیادہ قریب ہے، اور ان پر اعتراض کرنا اعتراض کرنے والے کی نا سمجھی اور اس کے یقین کی کمزوری سے پیدا ہوتا ہے۔ نماز صرف وہی رکعتیں اور سجدے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جائے۔

شیخ مفید کے تیسرے اشکال کی وضاحت

"اگر یہ جائز ہو کہ خلیفۂ خدا اپنی نماز میں سَہو کرے تو یہ بھی جائز ہو جائے گا کہ وہ ہر اطاعت میں سَہو کرے، حتیٰ کہ ہر حرام کام بھی سَہواً انجام دے۔"

جواب: یہ اشکال ایک مغالطے پر قائم ہے؛ اس لیے کہ سَہو اور نسیان کی حالت میں معصیت یا حرام نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ نافرمانی اور حرام کام کے تحقق کے لیے قصد اور عمداً ہونا لازم ہے۔، جبکہ سَہو اور نسیان کی حالت میں قصد اور عمداً ہونا موجود نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ یہ اشکال درست نہیں؛ کیونکہ یہ اس بنیاد پر قائم ہے

کہ خلیفۂ خدا بھی ہر انسان کی طرح نسیان اور سَہو رکھتا ہے اور پروردگار کے حکم کی نافرمانی سے معصوم نہیں ہے۔ یہ ایسی بات ہے جس کے قائل محمد اور آلِ محمد (ص) کے پیروکاروں میں سے کوئی نہیں؛ یا ممکن ہے اشکال کرنے والے حجتِ خدا کی ذاتی عصمت پر سَہو و نسیان سے مطلقاً ایمان رکھتے ہوں، تو اس صورت میں سَہو و نسیان سے عصمت کا انکار ان کے نزدیک عصمت کے تمام پہلوؤں کے انکار کا سبب بن جاتا ہے۔ اور ذاتی عصمت کے بطلان کے بارے میں بھی، جیسا کہ ہم نے بیان کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں لاہوتِ مطلق کی کثرت لازم آتی ہے۔

لہٰذا سَہو سے عصمت ذاتی نہیں ہے، بلکہ عصمت کسی باز رکھنے والے (یا عاصم) اور بیرونی یاد دہانی کرانے والے عامل کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہ بات بے معنی نہیں، بلکہ حکمتِ الٰہی کے عین مطابق ہے۔ خلیفۂ خدا کو سَہو سے باز رکھنا ضروری نہیں، مگر ان امور میں جو اللہ سبحان و متعال کے دین سے متعلق ہوں؛ البتہ دیگر معاملات میں اسے بیرونی طور پر نہیں روکا جاتا۔ رہی بات سَہو سے معصوم کی عام اور ہمہ گیر عصمت، یعنی وہی ذاتی عصمت جو معصوم سے سَہو کے وقوع کو روکتی ہے، تو میں نے بیان کر دیا ہے کہ یہ ذاتی عصمت کن امور پر قائم ہے۔ میں نے واضح کیا ہے کہ معصوم اپنی ذات میں کامل نہیں ہوتا۔[1] یعنی مثلاً سَہو کے مقابلے میں 70 فیصد یا 80 فیصد یا 90 فیصد ذاتی عصمت رکھتا ہے۔ اگرچہ اس ذاتی عصمت کی مقدار متعین ہے، لیکن مخصوص موارد میں یہ اس قدر کافی ہوتی ہے کہ ان میں سَہو کے وقوع کو روک دے۔ یعنی اگرچہ وہ کامل نہیں ہوتا، لیکن ان موارد میں سَہو سے عصمت کے تحقق کے لیے کسی بیرونی بازدارندے کی ضرورت نہیں ہوتی تاکہ اس معاملے میں سہو سے عصمت حاصل ہو سکے۔ اس بات کی دلیل بھی انسان کے اندر اس مسئلے کے ظہور کی مقدار کی طرف لوٹتی ہے۔ اس آخری بات کی وضاحت کے لیے نماز کی رکعتوں کی تعداد کے مسئلے پر غور کریں، جس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ درحقیقت نماز، نماز کے اعمال کے مجموعے کا نام ہے، جن میں اذان، اقامت، تکبیر، قراءت، رکوع اور اس کا ذکر، سجدہ اور اس کا ذکر، قنوت اور تشہد شامل ہیں۔ یہ اعمال زیادہ ہیں، لہٰذا نماز میں رکعتوں کی تعداد کا واضح ہونا ایسا نہیں ہے جیسے روزے کے اعمال میں کھانے پینے سے پرہیز کا واضح ہونا، کہ روزہ دار بالکل ہی یہ کام انجام نہیں دیتا، بلکہ بسا اوقات کوئی اور کام انجام دے دیتا ہے۔ اسی وجہ سے عام لوگوں کے نزدیک نماز میں سَہو بہت زیادہ پیش آتا ہے، جبکہ روزہ دار کا سَہواً کھا لینا یا پی لینا کم ہی واقع ہوتا ہے۔ لیکن نماز میں کسی ایک عمل میں زیادہ

---

[1] . اس موضوع کے بارے میں کتاب «رحلۃ موسی (ع)» کا ایک حصہ موجودہ کتاب میں نقل کیا گیا ہے۔

دیر تک مشغول رہنا، نماز کے کسی دوسرے عمل میں سَہو کا سبب بن جاتا ہے۔ سجدے کا طول پکڑ جانا یا ذکر میں خشوع، بعض اوقات انسان کے لیے پڑھی گئی رکعتوں کی تعداد بھلا دینے کا باعث بن جاتا ہے؛ کیونکہ خشوع اور اللہ تعالیٰ میں تفکر کی وجہ سے انسانی دماغ رکعتوں کی گنتی پر توجہ مرکوز نہیں رکھ پاتا۔ ذکرِ الٰہی میں مشغول ہونا اور خشوع اختیار کرنا، پڑھی گئی رکعتوں کی تعداد بھول جانے کے امکان کو بڑھا دیتا ہے۔ یقیناً ذکر اور خشوع میں مشغول ہونا زیادہ افضل ہے، چاہے اس کے نتیجے میں رکعتوں کی تعداد بھول جانے کا امکان بڑھ ہی کیوں نہ جائے۔ یقیناً ایسی نماز میں جس میں خشوع نہ ہو کوئی خیر نہیں ہوتی، چاہے نماز پڑھنے والا اپنی رکعتوں کی تعداد بالکل درست طور پر ہی کیوں نہ گنتا رہے۔ اسی طرح مثلاً طواف میں بھی ایسا ہوتا ہے: کوئی شخص خشوع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہوتا ہے اور روتا ہے، یا نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ طواف کرتا ہے۔ اس صورت میں ممکن ہے کہ خشوع اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغولیت، یا طواف کے وقت کا طویل ہو جانا، اسے طواف کے چکروں کی تعداد بھلا دے، اور یوں ساتویں چکر کے اختتام پر رکنے کے بجائے آٹھویں چکر میں داخل ہو جائے۔[1]

میرا خیال ہے کہ یہاں تک یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ سَہو کا مسئلہ کئی متغیّرات سے وابستہ ہوتا ہے؛ لہٰذا ہم یہ حکم نہیں لگا سکتے کہ سَہو ہمیشہ انسان کے کمال حاصل کرنے میں کوتاہی پر دلالت کرتا ہے۔ نیز یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی ایک خاص سَہو کو دوسرے سَہو کے ساتھ موازنہ کیا جائے یا یہ کہا جائے کہ جو شخص یہاں سَہو کرتا ہے، اسے وہاں بھی سَہو کرنا ہی چاہیے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں کہ جو شخص کسی خاص صورت میں سَہو کا شکار نہیں ہوا، وہ دوسرے سے برتر ہے، محض اس وجہ سے کہ دوسرے شخص کو اسی صورت میں سَہو لاحق ہو گیا۔ اگر ہم اس مسئلے کی پیچیدگی کی مقدار کا تصور کرنا چاہیں تو ہمیں اُن تمام متغیّرات کو مدّ نظر رکھنا ہو گا جنہیں میں نے اب تک سَہو اور نسیان کے مسئلے میں بیان کیا ہے۔ لہٰذا عقلی طور پر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم سَہو اور نسیان کے مسئلے میں اس اشکال کو قبول کر لیں، جبکہ ان متغیّرات کے باہمی تعلق کو پیشِ نظر ہی نہ رکھا جائے، حالانکہ اس مسئلے کا حل واضح ہے۔

درحقیقت یہ مسئلہ خود اشکال کرنے والوں کی طرف سے ہے؛ اگر وہ مسئلے میں موجود تمام متغیّر عوامل کو مدّ نظر رکھتے تو یہ اشکال سرے سے پیش ہی نہ کرتے۔

---

[1] . جیسا کہ امیر المؤمنین علی (ع) سے منقول روایت میں آیا ہے۔

دیگر عقلی اشکالات

پہلا اشکال

اگر خلیفۂ خدا کے لیے سَہو اور نسیان جائز ہوں تو شریعت کی تبلیغ میں بھی اس کے لیے سَہو اور نسیان جائز ہو جائیں گے، اور اسی بناپر اس کے مبعوث کیے جانے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

جواب: درحقیقت یہاں ان دونوں مسئلوں کے درمیان کوئی لازم ربط موجود نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ معصوم کو بعض مواقع میں سَہو اور نسیان سے باز رکھا جاتا ہے اور بعض مواقع میں باز نہیں رکھا جاتا؛ کیونکہ معصوم کو ایک بیرونی یاد دہانی کرانے والے عامل کے ذریعے روکا جاتا ہے۔ لازم ربط صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب خلیفۂ خدا اپنی ذات میں سَہو اور نسیان رکھتا ہو، نہ یہ کہ اس کی عصمت کا سبب کوئی بیرونی بازدارندہ عامل ہو۔ جبکہ ہم نے سَہو اور نسیان سے مطلق ذاتی عصمت کے قول کے بطلان کو بیان کر دیا ہے، اور یہ بھی کہا ہے کہ عصمتِ ذاتی کا نظریہ غُلات کے قول کے مطابق ہے؛ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لاہوتِ مطلق متعدد ہو جائے، جو باطل ہے۔

دوسرا اشکال

اگر سہو اور نسیان اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کے لیے جائز ہوں، تو لوگ اس سے متنفر ہو جائیں گے، اور یہ مسئلہ اس کے مبعوث کیے جانے کے مقصد کے نقض غرض کا سبب بنے گا، جبکہ اس کا مقصد لوگوں کی ہدایت ہے۔

جواب: کسی مسلمان کا یہ استدلال کہ لوگوں کی نادانی کی وجہ سے وہ نفرت کرنے لگیں گے، درست نہیں؛ چہ جائیکہ وہ شخص جو خود کو عالم کہتا ہو۔ بالخصوص اس بات کو نقضِ غرض قرار دینا (درست نہیں)؛ کیونکہ اس لغو قاعدے کی بنیاد پر تو اسلام ہی کے مٹ جانے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس بات کی ایک مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ہجرت سے پہلے، اُس وقت جب وہ مکہ میں تھے، یہ حکم دیا کہ مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدسِ شام ہو۔ یہ حکم احناف (یعنی دینِ حنیفِ ابراہیمی کے پیروکاروں) کے لیے باعثِ نفرت بنتا تھا؛ کیونکہ ان کا قبلہ کعبہ تھا۔ محمد (ص) کس طرح ان کے گھروں میں آکر انہیں یہ فرماتے کہ جس قبلے کی طرف تم سجدہ کرتے ہو اور جس کے گرد طواف کرتے ہو، اسے چھوڑ دو اور اپنی نماز میں یہودیوں کے قبلے کی طرف رخ کرو؟ کیا یہ بات کھلی ہوئی نفرت کا سبب نہیں بنتی؟ اور اسی خود ساختہ قاعدے کے مطابق کہ لوگوں کا دینِ خدا سے متنفر ہونا نقضِ غرض ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ نے نقضِ غرض کیا اور اسلام دینِ الٰہی نہیں رہتا۔ یہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا؛ کیونکہ

جب محمد رسول (ص) مدینہ ہجرت کر گئے، اُس وقت جبکہ یہودیوں کا قبلہ بیت المقدس تھا، اسلام کا قبلہ تبدیل کر دیا گیا اور کعبہ مسلمانوں کا قبلہ قرار پایا۔ یہ بات بھی یہودیوں کے لیے اس نئے دین میں داخل ہونے سے نفرت کا سبب بننی چاہیے تھی جس کا قبلہ ان کے قبلے کے سوا کچھ اور ہے۔ اسی سابقہ قاعدے کے مطابق یہاں بھی اللہ تعالیٰ لوگوں کے متنفر ہونے کا سبب بنے اور ان کے ایمان لانے میں رکاوٹ پیدا کی، اور محمد (ص) کی بعثت میں نقضِ غرض لازم آتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کا حق سے متنفر ہونا، حق کے بارے میں ان کی نادانی کی وجہ سے ہوتا ہے، اور یہ ہر گز نقضِ غرض کا سبب نہیں بنتا۔ مزید یہ کہ وہ اس بات کو بھی نظرانداز کر دیتے ہیں کہ دو قبلے ہونا اور قبلے کا بدل جانا خود بعض لوگوں کے لیے نفرت کا باعث بن سکتا ہے، اور اس سے وہ رسول (ص) کی رسالت پر اعتراض کریں، اسے غیر مستحکم قرار دیں، اور کہیں کہ وہ صحیح قبلے کے بارے میں آگاہ نہیں ہیں۔ اسی طرح یہ بات بعض لوگوں کی طرف سے بے جا نتیجہ نکالنے اور محمد (ص) کی رسالت کے باطل ہونے کا دعویٰ کرنے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔

تیسرا اشکال

اگر خلیفۂ خدا کے لیے نماز میں سَہو اور نسیان جائز ہوں، جیسا کہ روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ (ص) کو نماز میں سَہو ہوا اور انہوں نے رکعتوں میں کمی بیشی کی، تو پھر وہ نماز میں خاشع نہیں ہوں گے؛ اور یہ ایک قبیح بات ہے جو زمین پر خلیفۂ خدا، امام یا رسول سے صادر نہیں ہو سکتی۔

جواب: یہ اشکال اس مفروضے پر قائم ہے کہ جو شخص نماز میں رکعتوں کی تعداد سے غافل ہو جائے وہ اپنی نماز میں خاشع نہیں ہوتا اور اس کی توجہ اللہ سبحان و متعال کی طرف نہیں ہوتی۔ حالانکہ یہ مفروضہ درست نہیں؛ کیونکہ اگر بندہ خشوع کے ساتھ اور (سب سے) کٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو، تو ممکن ہے کہ اسی توجہ اور اللہ سبحان و متعال کے سامنے خشوع کی وجہ سے وہ نماز کی رکعتوں کی گنتی سے غافل ہو جائے۔ جس طرح دنیاوی امور میں غور و فکر کی وجہ سے نماز کی رکعتوں کی تعداد بھول جانا ممکن ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حضور رونا بھی انسان کو ایسی حالت میں ڈال سکتا ہے کہ وہ نماز کی رکعتوں کی گنتی سے غافل ہو جائے۔ لہٰذا اس امر کو صرف خشوع نہ ہونے اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ نہ ہونے تک محدود کرنا ممکن نہیں؛ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ نماز میں سَہو اور نسیان صرف خشوع کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ نتیجتاً خلیفۂ خدا سے سَہو کی نفی اس موہوم دلیل کی بنا پر درست نہیں ہے۔

خلاصہ : ایسی آیات بیان کی گئیں جو زندگی کے راستے میں معصوم کے سَہو پر دلالت کرتی ہیں، اور بہت سی احادیث و روایات موجود ہیں جو عبادات میں معصوم کے سَہو کی صراحت کرتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ خلیفۂ خدا یا معصوم انسان ہے، اور جن امور کا عام انسان کو سامنا ہوتا ہے، وہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہوتا؛ مگر یہ کہ اس کے بارے میں کوئی قطعی دلیل موجود ہو۔ انسان کی خصوصیات میں سے سَہو اور نسیان بھی ہیں۔ لہٰذا اصل قاعدہ یہ ہے کہ معصوم کے لیے بھی، دیگر انسانوں کی طرح، سَہو اور نسیان کا امکان موجود ہے؛ سوائے ان موارد کے جنہیں دلیل کے ساتھ مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ مثلاً خدا کی جانب سے تبلیغِ دین میں معصوم کے لیے نسیان اور سَہو کا امکان نہیں؛ کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ اس کے بھیجے جانے کے مقصد کا نقض غرض ہے۔ پس اس صورت میں اللہ تعالیٰ کو معصوم کو یاد دہانی کرانی چاہیے اور اسے سَہو و نسیان سے باز رکھنا چاہیے، تاکہ وہ اللہ سبحان و متعال کی رسالت کو درست طور پر پہنچا سکے۔

(إِلاَّ مَنِ ارْتَضى مِنْ رَسُولٍ فَإِنَّهُ يسْلُكُ مِنْ بَينِ يدَيهِ وَ مِنْ خَلْفِهِ رَصَداً لِيعْلَمَ أَنْ قَدْ أَبْلَغُوا رِسالاتِ رَبِّهِمْ وَ أَحاطَ بِما لَدَيهِمْ وَ أَحْصى كُلَّ شَيءٍ عَدَداً)[1]

(سوائے اس رسول کے جس سے وہ راضی ہو، تو بے شک وہ اس کے آگے اور اس کے پیچھے نگہبان مقرر کر دیتا ہے، تاکہ یہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے ہیں؛ اور وہ اس چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو ان کے پاس ہے، اور اس نے ہر چیز کو گنتی کے ساتھ شمار کر رکھا ہے)۔

نیز یہ بھی بیان کیا گیا کہ کوئی ایسی آیت موجود نہیں جو معصوم کے سَہو نہ کرنے پر دلالت کرتی ہو، اور نہ ہی اس بارے میں کوئی روایت پائی جاتی ہے، اور نہ کوئی کامل اور قطعی عقلی دلیل موجود ہے؛ سوائے بعض نادرست دلائل اور ایسے اشکالات کے جو دراصل مغالطے پر مبنی ہیں، اور جن کا جواب بآسانی دیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا وہ خلاصہ جس تک ہر صاحبِ عقل پہنچ سکتا ہے یہ ہے: حتیٰ اگر یہ تمام دلائل، زندگی اور عبادات کے امور میں معصوم کے سَہو کے امکان پر استدلال کے لیے کافی نہ بھی ہوں، تب بھی مخالفین پر لازم ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ دلیل کا نہ ہونا، مطلق طور پر یا عبادت میں معصوم کے سَہو نہ ہونے کا نتیجہ کیسے دے سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اس عقیدے پر بغیر کسی دلیل کے قائم ہیں؛ نہ کوئی محکم آیت، نہ قطعی الصدور اور قطعی الدلالت روایت، اور نہ ہی کوئی کامل اور تام عقلی دلیل ان کے پاس موجود ہے۔

---

[1] . قرآنِ کریم، سورۂ جن، آیات 27 اور 28۔

یہ وہ مسئلہ ہے جس تک بہت سے علمائے عقائد پہنچے ہیں؛ ان میں سے ایک سید خوئی ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے، جنہوں نے اپنے سابقہ قول میں فرمایا ہے: "سَہو اور غلطی کی وہ یقینی مقدار جو معصوم کے حق میں ناممکن ہے، وہ سَہو ہے جو بیرونی موضوعات کے علاوہ دیگر امور میں ہو۔

رجعت

رجعت ایک اور عالم ہے۔ جس طرح اجسام کا وہ عالم جس میں ہم اس وقت زندگی کر رہے ہیں بھی امتحان کا عالم ہے، ہم اس میں موجود ہیں اور اسی میں آزمائے جارہے ہیں۔

رجعت وہ عالم ہے جس میں اللہ تعالیٰ بعض اشخاص کو دوبارہ لوٹاتا ہے اور انہیں امتحان میں ڈالتا ہے۔ اور وہ عالمِ رجعت میں ان پچھلے عوالم سے جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ان کا امتحان لیا تھا، غافل ہوتے ہیں؛ اس لیے کہ وہ اسی عالم کے واسطے سے دوسرے عوالم سے پردے اور حجاب میں ہوتے ہیں، جس طرح لوگ اس جسمانی عالم میں اجسام کے ساتھ پردے اور حجاب میں ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے عالمِ ذر میں ہونے والے ان کے امتحان کو ان کی یاد سے محو کر دیا ہے۔

(نَحْنُ قَدَّرْنا بَينَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ * عَلى أَنْ نُبَدِّلَ أَمْثالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِي مَا لاَ تَعْلَمُونَ * وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولى فَلَوْلا تَذَكَّرُونَ)[1]

(ہم نے تمہارے درمیان موت کو مقرر کیا ہے اور ہم عاجز نہیں ہیں، اس بات پر کہ تمہاری جگہ تم جیسے اور لوگوں کو لے آئیں اور تمہیں ایسی حالت میں دوبارہ پیدا کریں جسے تم نہیں جانتے، اور تم پہلی پیدائش کو تو جان چکے ہو، تو پھر تم نصیحت کیوں نہیں پکڑتے؟)۔

" اور تمہیں ایسی حالت میں دوبارہ پیدا کریں جسے تم نہیں جانتے، اور تم پہلی پیدائش کو تو جان چکے ہو، تو پھر تم نصیحت کیوں نہیں پکڑتے؟" یعنی: تمہیں ایک اور عالم میں پیدا کریں جس کے بارے میں تمہیں کوئی آگاہی نہیں۔ تم پہلی پیدائش میں عالمِ ذر میں زندگی کر چکے تھے اور اس سے آگاہ بھی تھے، لیکن اب جب ہم نے تمہیں دوسری پیدائش میں، اس مادی اور جسمانی عالم میں جس میں تم موجود ہو، پیدا کیا ہے تو تم نے اسے فراموش کر دیا ہے اور اس عالم میں اپنی حالت کو یاد نہیں کرتے۔

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ واقعہ، آیات 60 سے 62

رجعت میں پیدا کیے جانے والے افراد تمام لوگوں میں سے نہیں ہوتے بلکہ بعض مخصوص لوگ ہوتے ہیں۔ یہ وہ افراد ہیں جنہوں نے ایمان میں بلند درجے حاصل کیے، اور وہ افراد بھی جنہوں نے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ اور اس کے اولیاء کے کفر و انکار کے انتہائی دور دراز مقام میں قدم رکھا اور اسی خصوصیت کے ساتھ اس دنیا میں پہچانے جاتے ہیں۔

رجعت کیوں؟

اس سے پہلے کہ ہم یہ سمجھیں کہ "رجعت کیوں ہے؟" ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ ہم یہاں جسمانی عالم میں دوسرے امتحان میں ہیں، اور رجعت تیسرا امتحان ہے۔ یہی سوال اس امتحان کے بارے میں بھی پیدا ہوتا ہے جس میں ہم اس وقت ہیں: جسمانی زندگی کیوں؟ یہ دوسرا امتحان کس لیے ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ عالمِ ذر میں ہمارا امتحان لیا جا چکا اور معاملہ ختم ہو چکا تھا؟

اس سوال کا جواب وہی ہے جو امام جعفر بن محمد صادق (ع) کا فرمان ہے:

عبداللہ بن فضل ہاشمی بیان کرتے ہیں: (میں نے امام صادق (ع) کی خدمت میں عرض کیا: (اللہ تعالیٰ نے، اس کے بعد کہ ارواح اس کے ملکوتِ اعلیٰ میں بلند ترین مقام پر تھیں، انہیں جسموں میں کیوں قرار دیا؟ آپ (ع) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ انسانوں کی ارواح اپنے مقام کے شرف اور برتری کے باوجود، اگر انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو ان کی اکثریت دعوائے ربوبیت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ جھگڑنے لگے گی۔ لہٰذا ان پر رحم اور ان کی مصلحت کے پیشِ نظر، اس نے اپنی قدرت سے انہیں ان بدنوں میں قرار دیا جنہیں اس نے ان کے لیے تخلیق کے آغاز ہی میں مقدر فرمایا تھا؛ اور ان میں سے بعض کو بعض کا محتاج بنایا، بعض کو دوسروں پر انحصار کرنے والا قرار دیا، اور بعض کو درجات میں بعض سے بلند رکھا، اور بعض کو بعض کے ذریعے بے نیاز کر دیا؛ اور ان کی طرف اپنے رسول بھیجے، اور اپنی حجتوں کو ڈرانے اور خوشخبری دینے کے لیے مقرر فرمایا۔ یہ حجتیں انسانوں کو اپنے معبود کی بندگی اختیار کرنے اور اس کے حضور عاجزی و فروتنی ظاہر کرنے کا حکم دیتی تھیں، اُن مختلف طریقوں کے ساتھ جو اُن کے لیے مقرر کیے گئے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے بھی لوگوں کے لیے قلیل مدت میں سزائیں مقرر کیں اور آئندہ کے لیے بھی سزائیں، اور قلیل مدت میں انعامات رکھے اور آئندہ کے لیے بھی انعامات مقرر کیے تاکہ اس طرح انہیں خیر کی طرف راغب کرے اور شر سے بے رغبت بنا دے، اور مزید یہ کہ روزی کی تلاش اور کسبِ معاش میں مشغول کر کے انہیں عاجز بنائے اور اس ذریعے سے وہ جان لیں کہ وہ اللہ تعالیٰ

کی پرورش کے محتاج ہیں اور مخلوق بندے ہیں، اور اس کے نتیجے میں اس کی عبادت کی طرف متوجہ ہوں، اور اس طرح دائمی نعمت کے اجر اور ہمیشہ کی جنت کے مستحق بنیں، اور ایسی چیز میں جھگڑے سے محفوظ رہیں جس کے وہ مستحق نہیں ہیں۔ پھر امام (ع) نے فرمایا: اے فضل کے بیٹے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے بارے میں ان کی اپنی ذات کے مقابلے میں زیادہ حسنِ نظر رکھنے والا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ لوگوں میں کوئی ایسا نہیں جس میں دوسروں پر برتری جتانے کا میلان نہ ہو، یہاں تک کہ ان میں سے بعض ربوبیت کے دعوے میں جھگڑتے ہیں، اور بعض نبوت کے دعوے میں بغیر کسی استحقاق کے نزاع کرتے ہیں، اور بعض امامت کے دعوے میں اس حال میں جھگڑتے ہیں کہ وہ حق پر نہیں ہوتے، جبکہ وہ خود اپنی ذات میں نقص اور ناتوانی اور کمزوری اور پستی اور احتیاج اور فقر اور پے در پے آنے والے درد، اور اس موت کو دیکھتے ہیں جو سب پر غالب اور قاہر ہے، اس کے باوجود ایسے بے جا دعوے کرتے ہیں۔ اے فضل کے بیٹے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ اس کے سوا کچھ نہیں کرتا جو ان کے لیے زیادہ صلاح والا ہو، اور وہ ہر گز لوگوں پر ظلم نہیں کرتا، لیکن لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں...)[1]

امام صادق (ع) نے اس دنیاوی جسمانی عالم میں امتحان کے تکرار کی وجہ بیان فرمائی ہے۔

لیکن عالمِ رجعت میں بالخصوص خالص ایمان والوں اور خالص کفر والوں کے لیے امتحان کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں گروہ غیر معمولی اور ممتاز ہیں۔ خالص ایمان رکھنے والوں کی بخشش عظیم ہے اور عنقریب ان کا اجر اس سے بھی زیادہ عظیم ہوگا۔ لہٰذا ان پر امتحان کو دوبارہ جاری کیا جاتا ہے، تاکہ وہ اسی نتیجے کو پھر سے ظاہر کریں، اور باقی لوگ جان لیں کہ وہ واقعی اس عظیم بخشش کے مستحق ہیں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انہیں دوسرے لوگوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔

لیکن خالص کفر رکھنے والوں کا عذاب بھی نہایت سخت اور عظیم ہے؛ یہاں تک کہ اہلِ جہنم بھی ان کے عذاب سے بھاگتے ہیں۔ اسی سبب رجعت میں تیسرا امتحان رکھا گیا ہے، تاکہ وہ بھی اپنے اسی منفی اور سلبی نتیجے کو دوبارہ ظاہر کریں، تاکہ تمام مخلوقات جان لیں کہ وہ اس عظیم عذاب کے واقعی مستحق ہیں۔

---

[1] . علل الشرائع، شیخ صدوق، جلد 1، ص 15 اور 16، باب « العلة التی من أجلها جعل الله عز وجل الأرواح فی الأبدان بعد أن كانت مجردة عنها فی أرفع محل» (وہ سبب جس کی بنا پر اللہ عزوجل نے ارواح کو اجسام میں قرار دیا، جبکہ وہ اس سے پہلے بلند ترین مقام پر جسموں سے جدا تھیں) ۔

یہاں ایک اشکال اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ جب عالمِ ذر کا نتیجہ دوبارہ ظاہر ہونے والا ہے اور ہر شخص اپنے اسی سابقہ نتیجے کو دہرادے گا، تو پھر اس امتحان کی کیا ضرورت ہے؟ ایسے امتحان کی حکمت کیا ہے جس کا نتیجہ پہلے ہی معلوم اور متعین ہے؟!

جواب: مہلت دینا حقیقی ہے، خیالی اور فرضی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو واقعی اور سچی مہلت عطا فرمائی ہے تاکہ اگر عالمِ ذر کا نتیجہ بُرا تھا تو وہ اسے بدل سکیں۔ لیکن چونکہ ان کی حقیقتیں بدصورت اور ناپاک ہیں، اس لیے وہی نتیجہ دوبارہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا، مہربان اور نہایت شفیق ہے۔ یہ ایک اور مہلت دراصل اللہ سبحانہ کی بخشش، کرم اور رحمت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ مزید یہ کہ امام صادق (ع) نے اس بارے میں بیان فرمایا ہے کہ ارواح کا اس محدود جسمانی عالم میں اُتارا جانا اس لیے ہے تاکہ اس کی حدود اور قیود کے ذریعے ارواح کی کمزوری کو ظاہر کیا جائے۔ رجعت کے بارے میں جس سبب کا میں نے ذکر کیا، اس کے علاوہ ایک اور سبب بھی ہے جسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے اور جو اس کی مہربانی اور بخشش سے متعلق ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ لوگ عنقریب دوسری مہلت کا مطالبہ کریں گے۔ چنانچہ ان کے سوال کرنے سے پہلے ہی اس نے یہ مہلت انہیں عطا کر دی۔ اس تکرار اور اپنی جانب سے اس بخشش کے باوجود، ہم دیکھیں گے کہ آخرت میں بھی وہ مطالبہ کریں گے کہ ان کا امتحان دوبارہ لیا جائے، اور ان مہلتوں کے علاوہ جو پہلے ہی انہیں دی جا چکی ہیں، ایک اور مہلت کی درخواست کریں گے:

(قالُوا رَبَّنا أَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ أَحْيَيتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنا بِذُنُوبِنا فَهَلْ إِلى خُرُوجٍ مِنْ سَبيلٍ)[1]

(وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو بار موت دی اور دو بار ہمیں زندہ کیا، پس ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا، تو کیا اب [آگ سے] نکلنے کی کوئی راہ ہے؟)۔

رجعت کیسے ہو گی؟

یہ ایسے امور میں سے ہے جنہیں پہلے سمجھنا ضروری ہے، تاکہ ہم جان سکیں کہ رجعت کیسے واقع ہو گی۔

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ غافر، آیت 11۔

پہلا: تبدیلی کا احساس ایک نسبی معاملہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم مختلف مکانی یا زمانی تغیرات سے گزرتے ہیں تو ہم تبدیلی کو محسوس کرتے ہیں۔ لیکن جب ہم اور ہمارے ارد گرد کی اشیاء، زمان و مکان کی حدود سے باہر کسی حرکت کے زیرِ اثر ہوں، یعنی اُن ابعاد میں جو ان چار معروف ابعاد کے علاوہ ہوں جنہیں ہم جانتے اور محسوس کرتے ہیں، تو ہم اپنے ارد گرد کسی بھی تبدیلی کو حسی طور پر محسوس نہیں کرتے؛ اور خواہ یہ تبدیلی کتنی ہی عظیم اور تیز رفتار کیوں نہ ہو، باوجود اس کے کہ تبدیلی واقع ہو رہی ہوتی ہے، ہم اسے ناپ نہیں سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تبدیلی ہمیں اور ہمارے ارد گرد کی اشیاء کو یکساں طور پر اپنے احاطے میں لے لیتی ہے۔

اس لیے کہ مسئلہ زیادہ واضح ہو جائے، آیئے یہ تصور کریں کہ ہم کسی متحرک جسم کے اندر موجود ہیں۔ ہم اپنے ارد گرد کی اشیاء کی حرکت کو محسوس نہیں کرتے اور انہیں ساکن ہی سمجھتے ہیں، بشرطیکہ ہماری حرکت جاری رہے اور اس متحرک جسم کی حرکت بھی ہماری حرکت کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ اسی طرح ہم اس جسم کے اندر اور اس میں موجود اشیاء کے درمیان کسی تبدیلی کو محسوس نہیں کرتے، جب تک کہ وہ تبدیلی اس جسم کے اندر موجود تمام اشیاء، حتیٰ کہ خود ہمیں بھی، یکساں طور پر شامل کیے رکھے۔

یہ تصور کریں کہ آپ کا قد 1.7 میٹر ہے اور آپ کسی ایسے جسم کے اندر موجود ہیں جہاں ایک پیمائش کا آلہ بھی ہے جس سے آپ اپنا قد ناپ سکتے ہیں۔ اگر آپ کے ابعاد، پیمائش کے پیمانے اور آپ کے ارد گرد کی تمام اشیاء کے ابعاد دوگنا ہو جائیں، اور پھر آپ اسی آلے سے اپنا قد ناپیں، تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کا قد بدستور 1.7 میٹر ہی ہے اور آپ کو اپنے قد کے بڑھنے کا احساس نہیں ہوگا؛ حالانکہ حقیقت میں اب آپ کا اصل قد 3.4 میٹر ہو چکا ہے۔

اگر ہم اس بات کو سمجھ لیں تو ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ہم اور وہ جہان جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، سب کے سب عالمِ رجعت میں، یعنی آسمانِ اوّل میں، داخل ہو سکتے ہیں؛ بغیر اس کے کہ ہم اپنے اجسام یا حتیٰ کہ اس دنیا میں، جس میں ہم رہتے ہیں، کسی بڑے تغیر کو محسوس کریں۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم اس بات کو سمجھ لیں کہ ہم اور یہ سارا جہان مسلسل تبدیلی کے عمل میں ہیں، اور شاید یہ بھی جان لیں کہ یہ تبدیلی بہت عظیم ہے، لیکن ہم اسے محسوس نہیں کرتے؛ اس لیے کہ ہر چیز ایک ہی نسبت سے تبدیل ہو رہی ہوتی ہے۔

دوسرا: ہم عالمِ ذر میں آسمانِ اوّل میں تھے اور ہم عالمِ رجعت کی طرف گامزن ہیں جو وہ بھی آسمانِ اوّل ہی میں ہے۔ یعنی فلکِ اعظم ایک حرکت رکھتا ہے[1] جو ان جہانوں اور عوالم کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جن میں سے ایک میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور ہمیں اس بات پر توجہ دینی چاہیے کہ یہ حرکت زمان و مکان کی حدود سے باہر ہے اور ایسے دیگر ابعاد میں واقع ہے جنہیں ہم محسوس نہیں کرتے؛ لیکن وہ حقیقی ہے اور اس کا وجود ہے۔ اس حرکت کا اثر ان جہانوں اور ان کے اندر موجود ہر چیز پر واقعی بہت زیادہ ہے؛ اور جب تک ہم خود ان جہانوں کا حصہ ہیں، ہمارے لیے ممکن نہیں کہ ہم اس اثر کی وسعت کو جان سکیں۔ ان تبدیلیوں سے آگاہ ہونے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم ان جہانوں سے باہر ہوں۔ اسی وقت ہم اس حقیقت کو دیکھ سکتے ہیں جو اس حقیقت سے بالکل مختلف ہے جسے ہم ابھی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت ہم انہی جہانوں کے اندر موجود ہیں۔

تیسرا: روایاتِ معصومین (ع) میں بیان کردہ رجعت کی خصوصیات اس مادی دنیا سے مناسبت نہیں رکھتیں جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم یہ تسلیم کریں کہ عالمِ رجعت ایک اور عالم ہے، جس کے قوانین اس مادی عالم سے مختلف ہیں جس میں ہم اس وقت رہتے ہیں۔

مختصر بصائر الدرجات: موسی حناط کہتے ہیں: میں نے امام صادق (ع) سے سنا کہ آپ نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ کے دن تین ہیں: ایک وہ دن جس دن قائم (ع) قیام کریں گے، دوسرا رجعت کا دن اور تیسرا قیامت کا دن)[2]

مختصر بصائر الدرجات: حمران بن اعین کہتے ہیں: امام باقر (ع) نے ہم سے فرمایا: (عنقریب تمہارے ہمسایہ حسین بن علی (ع) ہزار سال تک دوبارہ واپس آئیں گے اور حکومت کریں گے، یہاں تک کہ بڑھاپے کی وجہ سے ان کی بھنویں ان کی آنکھوں پر آ گریں گی)[3]

مختصر بصائر الدرجات: عمر خثعمی کہتے ہیں: میں نے امام صادق (ع) سے سنا کہ آپ نے فرمایا: (...اور امیر المؤمنین (ع) چوالیس ہزار سال حکومت کریں گے، یہاں تک کہ علی (ع) کے شیعوں میں سے ایک شخص

---

[1] . یہ ایک تدریجی انتقال ہے، لیکن میں نے اسے حرکت سے تعبیر کیا ہے؛ حالانکہ حرکت کا مفہوم ان چار ابعاد کی حدود تک محدود ہوتا ہے۔ مگر لوگوں کو سمجھانے اور اس انتقال کو بیان کرنے کے لیے ہمارے پاس انہی الفاظ کے سوا کوئی اور لفظ نہیں جو ان چار محدود ابعاد کے دائرے میں رائج اور قابلِ فہم ہیں۔

[2] . مختصر بصائر الدرجات، ابن سلیمان حلی، ص 18۔

[3] . مختصر بصائر الدرجات، ابن سلیمان حلی، ص 22۔

اپنی نسل سے ایک ہزار بیٹوں کو دیکھے گا۔ اسی وقت مسجد کوفہ کے پہلو میں اور اس کے ارد گرد دو نہایت سر سبز جنتیں، اس کے ساتھ جو اللہ تعالی چاہے گا، ظاہر ہوں گی)[1]

مختصر بصائر الدرجات: جب امام صادق (ع) سے اس دن کے بارے میں پوچھا گیا جس کی مقدار 50 ہزار سال ہے، تو آپ نے فرمایا: (یہ رسول اللہ (ص) کی رجعت ہے کہ اپنی رجعت میں ان کی حکومت 50 ہزار سال ہو گی اور امیر المؤمنین (ع) اپنی رجعت میں 44 ہزار سال حکومت کریں گے)[2]

بحار الانوار: عبداللہ بن نجیح یمانی کہتے ہیں: (میں نے امام صادق (ع) کی خدمت میں عرض کیا: (كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ * ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ) (ہر گز نہیں، عنقریب تم جان لوگے۔ پھر ہر گز نہیں، عنقریب تم جان لوگے)۔ تو آپ نے فرمایا: (ایک مرتبہ رجعت میں اور دوسری مرتبہ قیامت میں)[3]

مختصر بصائر الدرجات: علی بن ابراہیم «تفسیر القرآن العزیز» میں کہتے ہیں: رجعت کا انکار کرنے والے کے لیے جواب اللہ عزوجل کا یہ فرمان ہے: وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا (اور اس دن ہم ہر امت میں سے ایک گروہ کو اٹھائیں گے)۔ میرے والد نے ابن ابی عمیر سے، انہوں نے حماد سے، انہوں نے امام صادق (ع) سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا: (لوگ اس آیت وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا (اور اس دن ہم ہر امت میں سے ایک گروہ کو اٹھائیں گے) کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ میں نے عرض کیا: وہ کہتے ہیں کہ یہ قیامت کے بارے میں ہے۔ فرمایا: ایسا نہیں ہے جیسا وہ کہتے ہیں، یہ رجعت ہے۔ کیا اللہ قیامت کے دن ہر امت میں سے ایک گروہ کو اٹھائے گا اور باقی کو چھوڑ دے گا؟ قیامت کی آیت یہ ہے: وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا (اور ہم انہیں اٹھائیں گے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے))[4]

قرآن

وہ قرآن جو اس جسمانی عالم میں ہمارے سامنے موجود ہے، دراصل اس قرآن کا ظہور اور تجلی ہے جو بالاتر عوالم میں ہے، البتہ ایسے الفاظ کے ساتھ جو اس عالم کے مناسب ہیں۔ بالاتر عوالم میں قرآن لفظی صورت میں نہیں

---

1. مختصر بصائر الدرجات، ابن سلیمان حلی، ص 27۔
2. مختصر بصائر الدرجات، ابن سلیمان حلی، ص 49۔
3. بحار الانوار، مجلسی، ج 53، ص 120۔
4. مختصر بصائر الدرجات، ابن سلیمان حلی، ص 41 سے 42۔

ہے، کیونکہ الفاظ اسی مادی عالم کے لوازم میں سے ہیں، اور اس عالم میں قرآن کا ظہور اسی قدر ہے جتنی اس کے ظاہر کرنے والے محمد (ص) کی وسعت ہے اور نیز جتنی اس مادی عالم کی گنجائش ہے۔

محمد (ص) اللہ تعالیٰ کی بہترین مخلوق ہیں۔ وہ معنی جو قرآنِ لفظی کی صورت میں محمد (ص) نے اس عالمِ جسمانی میں ظاہر فرمایا ہے، وہ قرآن کے لفظی معانی میں سب سے عظیم معنی ہے جو اس عالمِ جسمانی میں ظاہر ہو سکتا ہے۔

تورات اور انجیل جو موسی (ع) اور عیسی (ع) پر نازل کی گئیں، وہ قرآن کے سوا کچھ نہیں ہیں، بلکہ وہ بھی اسی قرآن کی اس عالمِ جسمانی میں تجلی اور ظہور ہیں۔ ان کے درمیان فرق اس قابل اور قبول کرنے والے مقام کا ہے جس نے اس عالم میں قرآن کو ظاہر کیا، یعنی محمد (ص)، عیسی (ع) اور موسی (ع)۔ چونکہ محمد (ص) کا مقام اخلاص کے اعتبار سے زیادہ عظیم ہے اور مرتبے کے لحاظ سے اس سے بلند ہے جو انہوں نے ظاہر فرمایا، لہٰذا آپ (ص) کا شأن اور درجہ اس چیز سے بڑا، برتر، کامل اور تمام تر ہے جسے موسی (ع) یا عیسی (ع) نے ظاہر کیا۔ اسی وجہ سے تورات اور انجیل قرآن کے اجزا میں سے ہیں، اور قرآن ان پر اور ان کے مضامین پر حاکم ہے۔

(وَ أَنْزَلْنا إِلَيكَ الْكِتابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِما بَينَ يدَيهِ مِنَ الْكِتابِ وَ مُهَيمِنًا عَلَيهِ فَاحْكُمْ بَينَهُمْ بِما أَنْزَلَ اللَّهُ وَ لا تَتَّبِعْ أَهْواءَهُمْ عَمَّا جاءَكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلْنا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَ مِنْهاجًا وَ لَوْ شاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً واحِدَةً وَ لكِنْ لِيبْلُوَكُمْ فی ما آتاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيراتِ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَميعًا فَينَبِّئُكُمْ بِما كُنْتُمْ فيهِ تَخْتَلِفُونَ)[1]

(اور ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ آپ (ص) کی طرف نازل کی، اس حال میں کہ وہ اپنے سے پہلے والی کتابوں کی تصدیق کرنے والی اور ان پر نگہبان ہے۔ لہٰذا آپ (ص) ان کے درمیان اسی کے مطابق فیصلہ کیجیے جو اللہ نے نازل کیا ہے اور جو حق آپ (ص) کے پاس آ چکا ہے، اس سے ہٹ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیے۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک واضح راستہ مقرر کیا ہے، اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن اس نے چاہا کہ جو کچھ اس نے تمہیں دیا ہے، اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ پس نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ تم سب کا لوٹنا اللہ ہی کی طرف ہے، پھر وہ تمہیں ان باتوں سے آگاہ کر دے گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے)۔

---

[1] .قرآنِ کریم، سورۂ مائدہ، آیت 48۔

مزید وضاحت کے لیے اس مثال پر غور کریں: فرض کریں کہ آپ کے سامنے ایک باغ ہے جس میں مختلف قسم کے پھلدار درخت موجود ہیں، اور آپ کے پاس چند تصویر کشی کے آلات ہیں اور آپ اس باغ کی حقیقت کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔

ان آلات میں سے ایک دور فاصلے پر رکھا گیا ہے، اس طرح کہ وہ باغ اور درختوں کی تصویر تو دکھا دیتا ہے، لیکن درختوں اور ان کے پھلوں کی نوعیت کو پہچانا نہیں جا سکتا۔

دوسرا آلہ قریب تر ہے اور اس کی دقت بھی زیادہ ہے، اور وہ باغ اور درختوں کی تصویر ظاہر کرتا ہے، اور اس کی تصویر میں بعض درختوں کی اقسام اور کچھ پھلوں کو پہچانا جا سکتا ہے، خاص طور پر بڑے اور نمایاں پھلوں کو۔

تیسرا آلہ خود باغ کے اندر رکھا ہوا ہے اور سب سے زیادہ دقیق ہے، اس طرح کہ اس کی تصویر درختوں اور ان کے پھلوں کو واضح طور پر ظاہر کرتی ہے، اور تصویر میں ہر درخت یا ہر پھل کی تعیین ممکن ہے۔ حتیٰ کہ پھل کی حالت اور اس کے پکے ہونے کو بھی پہچانا جا سکتا ہے۔

یہ مثال محمد (ص) کی حالت کو، ان کے بلند مقام کی وجہ سے، واضح کرتی ہے۔ اس لیے کہ قرآنِ الٰہی ان کے دل میں موجود ہے اور وہ خود قرآنِ الٰہی کے دل میں ہیں۔ آپ (ص) نے اس عظیم ترین حقیقت کو آشکار کیا ہے جو اس مادی عالم میں قرآن سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ لیکن عیسی (ع) اور موسی (ع) نے قرآنِ الٰہی میں سے اسی قدر ظاہر کیا جتنی ان کی حالت نے، قرآنِ الٰہی سے قرب اور بُعد کے اعتبار سے، اجازت دی۔ ابراہیم (ع)، نوح (ع) اور دیگر انبیا (ع) کے بارے میں بھی معاملہ اسی طرح ہے۔

وہ قرآن جو قرآن سے پہلے نازل کیا گیا، وہ بھی قرآن ہی ہے، لیکن وہ اس قرآن کا ایک جلوہ ہے جو محمد (ص) پر نازل ہوا۔ تورات اور انجیل بھی قرآن ہیں، لیکن جو قرآن محمد (ص) پر نازل ہوا وہ ان سے زیادہ جامع، زیادہ کامل، زیادہ عظیم اور ان پر غالب ہے۔ اسی وجہ سے وہ لوگ جو تورات یا انجیل کو جانتے تھے یا اس میں موجود بعض امور سے واقف تھے، قرآن کو سنتے ہی سمجھ جاتے تھے کہ یہی تورات اور انجیل ہے، لیکن یہ ان دونوں سے بڑا ہے اور اس کا منبع بھی انہی دونوں کے منبع کے ساتھ ایک ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(قُلْ آمِنُوا بِهِ أَوْ لا تُؤْمِنُوا إِنَّ الَّذينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذا يتْلى عَلَيهِمْ يخِرُّونَ لِلْأَذْقانِ سُجَّدًا * وَ يقُولُونَ سُبْحانَ رَبِّنا إِنْ كانَ وَعْدُ رَبِّنا لَمَفْعُولًا * وَ يخِرُّونَ لِلْأَذْقانِ يبْكُونَ وَ يزِيدُهُمْ خُشُوعًا)[1]

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ اسراء، آیات 107 سے 109۔

(کہہ دیجیے: تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، یقیناً وہ لوگ جنہیں اس سے پہلے علم دیا گیا تھا، جب یہ ان پر پڑھا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ اور کہتے ہیں: پاک ہے ہمارا رب، بے شک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہونے والا ہے۔ اور وہ ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں، روتے ہیں اور یہ ان کی عاجزی کو اور بڑھا دیتا ہے)۔

قرآن کا ایک جلوہ (تورات) موسی (ع) پر نازل کیا گیا اور اسی کا ایک جلوہ (انجیل) عیسی (ع) پر نازل کیا گیا، اور پورا قرآن، یعنی زیادہ کامل اور زیادہ جامع صورت میں، محمد (ص) پر نازل کیا گیا، کیونکہ قابل زیادہ بڑا اور زیادہ طاقتور ہے؛ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ مکمل اور زیادہ جامع قرآن کا محمد (ص) کے سوا کسی اور پر نازل ہونا ناممکن ہے؛ بالکل اسی طرح جیسے ایک مکعب میٹر پانی کو ایسے برتن میں انڈیلنا جس کی گنجائش ایک لیٹر ہو۔ اسی سبب قرآن کا نزول صرف اسی ظرف میں ممکن تھا جو اس کو قبول کرنے کے لیے آمادہ اور اس کی پذیرائی کی قدرت رکھتا ہو۔ تورات اور انجیل قرآن ہیں یا اس کا ایک جلوہ ہیں، اگرچہ وہ محتوا اور الفاظ میں اس سے مختلف ہیں، کیونکہ وہ ایک ہی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ ایک ہی حقیقت کی طرف رہنمائی نہ صرف مختلف الفاظ کے ذریعے ممکن ہے بلکہ مختلف معانی کے ذریعے بھی ہو سکتی ہے۔ پس اصل مطلوب وہی حقیقت ہے، نہ اس کا لفظ اور نہ حتیٰ اس کا معنی۔

حقیقتِ قرآنی، اس سے پہلے کہ محمد (ص) پر الفاظ کی صورت میں، پڑھے جانے والے قرآن کے ساتھ نازل کی جاتی، محمد (ص) میں جلوہ گر ہوئی۔ حتیٰ کہ آپ کے اوصیاء (ع) میں بھی جلوہ گر ہوئی، اگرچہ نسبتاً نچلے درجے میں۔

اسی لیے اس میں کوئی اشکال نہیں کہ محمد (ص) اُس بات کو، جو جبرئیل (ع) کہنے والے ہوں، اُس کے مکمل ہونے سے پہلے ہی جان لیں۔

(لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ * إِنَّ عَلَينا جَمْعَهُ وَ قُرْآنَهُ * فَإِذا قَرَأْناهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ)[1]

([وحی کے مکمل ہونے سے پہلے] اپنی زبان کو اس (قرآن) کے لیے جلدی کرنے کی خاطر حرکت نہ دو، بے شک اسے جمع کرنا اور اسے پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے۔ لہٰذا جب ہم اسے پڑھ چکیں تو اس کے پڑھنے کی پیروی کرو)۔

---

[1]. قرآنِ کریم، سورۂ قیامت، آیات 16 سے 18۔

یہی قرآن، تورات اور تمام آسمانی کتابوں کو آپ (ص) کے ذریعے محفوظ کیے جانے کا حقیقی معنی ہے، اور یہ بات اس دنیا میں آپ (ص) کا ان کتابوں کے تحریری الفاظ سے ناواقف ہونا کے ساتھ کسی بھی طرح متصادم نہیں ہے۔

(وَ ما كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتابٍ وَ لا تَخُطُّهُ بِيمينِكَ إِذاً لارْتابَ الْمُبْطِلُونَ)[1]

(اور آپ اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ ہی اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے، ورنہ باطل پرست لوگ ضرور شک میں پڑ جاتے)۔

رسولِ اللہ (ص) اور علی (ع) اُن تحریروں سے مستفید ہوئے جو تورات میں سے اُن تک پہنچی تھیں، حالانکہ وہ نہ اس کے الفاظ جانتے تھے اور نہ ہی اس کی زبان؛ اس لیے کہ تورات عربی کے علاوہ ایک دوسری زبان میں نازل کی گئی تھی، اور اس بارے میں روایات پہلے ذکر کی جاچکی ہیں:

(...اسے باہر نکالا اور اُن کے حوالے کر دیا۔ آپ نے اس کی طرف دیکھا اور اسے پڑھا، حالانکہ اس کی تحریر عبرانی زبان میں تھی۔ پھر امیر المؤمنین (ع) کو بلایا اور فرمایا: اسے لے لو۔ اس میں اولین اور آخرین کا علم ہے۔ یہ موسیٰ کی تختیاں ہیں۔ میرے پروردگار نے مجھے حکم دیا ہے کہ اسے تمہارے سپرد کر دوں۔ انہوں نے عرض کیا: یارسولَ اللہ! میں اسے اچھی طرح نہیں پڑھ سکتا۔ فرمایا: جبرئیل نے مجھے حکم دیا ہے کہ آج رات اسے اپنے سرہانے رکھو، کیونکہ تم صبح بیدار ہو گے تو اس کی قراءت جانتے ہو گے۔ پس انہوں نے اسے اپنے سرہانے رکھ لیا، پھر صبح بیدار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اُس میں موجود ہر چیز کا علم عطا فرما دیا۔ رسولِ اللہ نے انہیں حکم دیا کہ اس سے ایک نقل تیار کریں۔ چنانچہ انہوں نے اسے بھیڑ کی کھال پر نقل کیا، اور یہی جفر ہے، جس میں اولین و آخرین کا علم ہے، اور وہ ہمارے پاس ہے۔ اور موسیٰ کی تختیاں اور اُن کا عصا بھی ہمارے پاس ہے، اور ہم نبی (ع) کے وارث ہیں)[2]

---

[1] . قرآنِ کریم، سورۂ عنکبوت، آیت 48۔

[2] . بصائر الدرجات، صفار، ص 140۔

وہ آپ سے
روح کے بارے میں
پوچھتے ہیں۔

وہ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

(وَ یسْئَلُونَکَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِرَبِّی وَ ما أُوتیتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلاَّ قَلیلاً)[1]

(اور وہ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے: روح میرے رب کے امر میں سے ہے، اور تمہیں علم میں سے بہت ہی تھوڑا دیا گیا ہے)۔

لفظ «روح» ہر زندہ مخلوق پر، اس عالمِ جسمانی کے علاوہ، اطلاق کیا جاتا ہے۔ انسانوں اور جنات کے نفوس ارواح ہیں اور تمام فرشتے بھی ارواح کہلاتے ہیں۔ جس طرح اس عالم میں ہوا اشیاء کو حرکت دیتی ہے، اسی طرح ارواح بھی جس چیز میں داخل ہوتی ہیں اور جس کے ساتھ ملتی ہیں، اسے حرکت میں لے آتی ہیں۔

(وَ هُوَ الَّذی یرْسِلُ الرِّیاحَ بُشْراً بَینَ یدَی رَحْمَتِهِ حَتَّی إِذا أَقَلَّتْ سَحاباً ثِقالاً سُقْناهُ لِبَلَدٍ مَیتٍ فَأَنْزَلْنا بِهِ الْماءَ فَأَخْرَجْنا بِهِ مِنْ کُلِّ الثَّمَراتِ کَذلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتی لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُونَ)[2]

(اور وہی ہے جو اپنی رحمت سے پہلے خوشخبری دینے والی ہوائیں بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ بھاری بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں تو ہم انہیں کسی مردہ زمین کی طرف لے جاتے ہیں، پھر اس سے پانی برساتے ہیں، پھر اس کے ذریعے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں، اسی طرح ہم مردوں کو نکالیں گے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو)۔

سب سے پہلی چیز جسے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا، انسان تھا۔

(الرَّحْمنُ * عَلَّمَ الْقُرْآنَ * خَلَقَ الْإِنْسانَ)[3]

([وہ] رحمان ہی ہے۔ اس نے قرآن سکھایا۔ اس نے انسان کو پیدا کیا)۔

پھر لوگوں کو پہلے انسان سے پیدا کیا۔ یہ پہلا انسان مخلوق میں لاہوت کا ظہور ہے، اور وہی عقلِ اول اور روح اول ہے جسے پیدا کیا گیا، اور وہی اللہ کی روح ہے:

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ اسراء، آیت 85۔

[2] . قرآن کریم، سورۂ اعراف، آیت 57۔

[3] . قرآن کریم، سورۂ الرحمٰن، آیات 1 تا 3۔

(وَكَذلِكَ أَوْحَينا إِلَيكَ رُوحاً مِنْ أَمْرِنا مَاكُنْتَ تَدْرى مَا الْكِتابُ وَ لاَالْإيمانُ وَلكِنْ جَعَلْناهُ نُوراً نَهْدى بِهِ مَنْ نَشاءُ مِنْ عِبادِنا وَإِنَّكَ لَتَهْدى إِلى صِراطٍ مُسْتَقيمٍ)[1]

(اور اسی طرح ہم نے اپنے امر میں سے ایک روح آپ کی طرف وحی کی۔آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان کیا ہے، لیکن ہم نے اسے ایک نور بنادیا، جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں، اور بے شک آپ سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں)۔

احول کہتے ہیں: میں نے امام صادق (ع) سے اس روح کے بارے میں سوال کیا جو اس آیت کے مطابق آدم (ع) میں تھی: فَإِذا سَوَّيتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي (پھر جب میں اسے درست کر لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں)۔آپ (ع) نے فرمایا: (یہ روح خلق کیا گیا ہے، اور وہ روح جو عیسیٰ میں تھی، وہ بھی خلق کیا گیا تھا)۔[2]

حمران کہتے ہیں: (میں نے امام صادق (ع) سے اللہ عزوجل کے اس فرمان کے بارے میں پوچھا: وَرُوحٌ مِنْهُ (اور ایک روح اس کی طرف سے)۔آپ (ع) نے فرمایا: وہ اللہ کی روح ہے جو خلق کیا گیا ہے، اور اللہ نے اسے آدم اور عیسیٰ میں خلق کیا)۔[3]

اللہ کی روح، یا وہ روح جو اس وقت پھونکی گئی جب بلند کیے گئے آدم کی مٹی میں پھونکی گئی، اور اس کی صُلب میں جلوہ گر ہوئی، اور فرشتوں نے اس کے لیے سجدہ کیا، وہی روح اعظم محمد (ص) ہیں۔

(فَإِذا سَوَّيتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ ساجِدِينَ)[4]

(پھر جب میں اسے درست کر لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو اس کے آگے سجدہ میں گر جاؤ)۔

یہ سجدہ روح اعظم یعنی محمد (ص) کے لیے تھا۔وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا اولین قبلہ ہیں۔فرشتوں کا آدم (ع) کو سجدہ کرنا، روح اول یعنی محمد (ص) کے پھونکے جانے کے بعد تھا۔جس روح کے بارے میں لوگ نبی (ص)

---

1. قرآن کریم، سورۂ الشوریٰ، آیت 52۔
2. کافی، کلینی، جلد 1، ص 133، باب «الروح»۔
3. کافی، کلینی، جلد 1، ص 133، باب «الروح»۔
4. قرآن کریم، سورۂ حجر، آیت 29 اور سورۂ ص، آیت 72۔

سے سوال کرتے تھے، وہ اسی عالم میں ان کے سامنے آتی تھی، اور وہ اس کے ساتھ، محمد (ص) کے جسم کے ساتھ روبرو ہوتے تھے، لیکن وہ جانتے نہ تھے۔

(وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِرَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا)[1]

(اور وہ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دیجئے: روح میرے رب کے امر میں سے ہے، اور تمہیں علم میں سے بہت تھوڑا ہی دیا گیا ہے)۔

جابر بن یزید کہتے ہیں: امام باقر (ع) نے مجھ سے فرمایا: (اے جابر! اللہ نے سب سے پہلی چیز جو پیدا کی وہ محمد (ص) اور ان کی ہدایت یافتہ اور ہدایت کرنے والی عترت تھی۔ وہ اللہ کے سامنے نورانی اشباح تھے۔ میں نے عرض کیا: اشباح کیا ہیں؟ فرمایا: نور کا سایہ[2]، نورانی اجسام بغیر ارواح کے۔ اور انہیں ایک روح کے ذریعے تقویت دی گئی تھی اور وہ روح القدس ہے۔ اسی کے ذریعے[3] اللہ اور اس کی عترت کی عبادت کی جاتی ہے اسی وجہ سے اس نے انہیں صبر کرنے والا، دانا، نیکوکار اور نیک پیدا فرمایا کہ وہ نماز، روزہ، سجدہ، تسبیح اور تہلیل کے ذریعے اللہ کی بندگی کرتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں، حج کرتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں۔[4]

انسانی نفس کی تخلیق

(الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِنْ طِينٍ)[5]

(وہی ہے جس نے ہر چیز کو جو پیدا کی، خوب بنایا، اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا)۔

---

1. قرآن کریم، سورۂ اسراء، آیت 85۔
2. نور کا سایہ ،اس کا تاریک اثر ہے جو اس کی نشانی ہوتا ہے۔ اور حدیثِ شریف میں آیا ہے کہ نور ہی اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسا نور ہے جس میں کوئی تاریکی نہیں، اور اس کا سایہ لوگوں میں اس کا تجلّی ہے۔ آپ (ص) نور کے سائے ہیں، یعنی مخلوق میں اللہ تعالیٰ کے اثر ہیں۔ اثر ہی کے ذریعے مؤثر پہچانا جاتا ہے، اور انہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔
3. روحُ القدس ان میں ہے، بلکہ وہی ان کی روح ہے جو ساتویں کلی آسمان، یعنی آسمانِ عقل میں ہے۔
4. کافی، کلینی، جلد 1، ص 442۔
5. قرآن کریم، سورۂ سجدہ، آیت 7۔

آدم کی مٹی کو زمین سے آسمان اول تک، عالمِ ذر میں رفع[1] کیا گیا۔ پھر اس میں روح ایمان پھونکی گئی اور اس میں پہلی انسانی نفس وجود میں آئی۔ پھر اس میں روحُ القدس پھونکی گئی اور فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اسے سجدہ کریں۔

---

[1]. رفع اور اوپر جانا: کسی چیز کے مبدا یا منبع کی طرف ایک قدم یا اس سے زیادہ لوٹنا ہے۔ اس معنی میں کہ اگر ہم فرض کریں کہ انسان (یا دیگر مخلوقات) عدم میں لاہوت کا تجلّی اور وجود کا قبول کرنے والا ہے، تو اس صورت میں وہ ایک معین مرتبہ اور درجہ رکھتا ہوگا، اور جوں جوں ہم تجلّی کے مصدر سے معرفتی اعتبار سے دور ہوتے جائیں گے، یہ معین مرتبہ (جتنی مقدار میں عدم اس میں داخل ہو چکا ہے) کم نور اور زیادہ ظلمانی ہوتا جائے گا۔

فرض کریں کہ مادی عالم جس میں ہمارا جسم موجود ہے، 10 فیصد نور اور 90 فیصد ظلمت (عدم) پر مشتمل ہے، اور نور کا ہر قدم جو وہ ظلمتِ مطلق (مکمل نیستی، معرفت اور ادراک کا نہ ہونا) کی طرف بڑھاتا ہے، ایک صحیح عدد سے ظاہر کیا جائے۔ مادی جسم (جیسے آدم (ع) کی مٹی) کا ایک قدم اٹھانا یہ ہے کہ وہ ایک ایسے متوازی عالم کی طرف حرکت کرے جس میں نور کا تناسب 11 فیصد اور ظلمت (عدم) کا تناسب 89 فیصد ہو، یعنی ایسا عالم جو پہلے عالم سے ایک درجہ آگے ہو۔

عوالم کو ان کے کامل ہونے کی مقدار (مبدا کے قریب ہونے) کی بنیاد پر تقسیم کرنا چاہیے۔ چونکہ عوالم کا پیدا کرنے والا مطلق ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ یہ پیدا کرنے والا جہاں تک ممکن ہو مطلق کے قریب ہو؛ کیونکہ یہ اس پہلی چیز کی نمائندگی کرتا ہے جو اس سے صادر ہوئی ہے (محمد = تمام عوالم)۔ معنی کے قریب ہونے کے لیے ہم ریاضیات کے نقطۂ نظر سے مدد لیتے ہیں۔ ایک اِلمان یا تفاضلی جزو (differential element)، ہر اُس چیز سے چھوٹا ہوتا ہے جس کا تصور کیا جا سکتا ہے، یعنی اسے صفر کے قریب ترین عدد سمجھا جا سکتا ہے، لیکن اسے کسی اعشاری (ڈیسمل) عدد کی صورت میں متعین نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی کہے کہ یہ عدد 0.0001 ہے تو درحقیقت 0.00001 اس سے بھی چھوٹا ہے، اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے یہاں تک کہ ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ ایسا عدد موجود ہے اور ہم اس کی کچھ خصوصیات کو پہچان سکتے ہیں لیکن خود اس کی معرفت سے مکمل طور پر عاجز ہیں۔ اگر یہ عدد مقسوم علیہ (divisor) کے طور پر کسی بھی تقسیم میں آ جائے تو حاصلِ تقسیم لامحدود کے قریب ہو جائے گا کیونکہ مقسوم علیہ صفر کے قریب ترین عدد ہے۔ اس کلام کا مفہوم یہ ہے کہ اگر ہم کسی شخص کو دیکھیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے رفع یا اوپر اٹھایا جا رہا ہو، تو ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ بتدریج نظروں سے اوجھل ہوتا جاتا ہے، یعنی پہلے ہم اس کا جسم دیکھتے ہیں، پھر اس کا ایک سایہ سا باقی رہتا ہے، اور آخر میں وہ مکمل طور پر چھپ جاتا ہے۔ درحقیقت وہ بالکل بھی غائب نہیں ہوا ہوتا، بلکہ سارا معاملہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسے عالم میں منتقل ہو گیا ہے جو ہمارے عالم کے ساتھ متوازی ہے اور نور کے اعتبار سے ہمارے عالم سے برتر ہے۔ یا ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک یا چند قدم مبدا یا منبع کی طرف واپس لوٹ گیا ہے (اس مادی جسم کے اوپر اٹھنے کی حالت کے مطابق)، اور ہر حال میں منبعِ نور یا وجود کے باہر، نور اور ظلمت کا مجموعہ یا وجود اور عدم (نیستی) کا مجموعہ صفر کے برابر ہے؛ دوسرے لفظوں میں، مصدر کے باہر کوئی بھی حقیقی چیز موجود نہیں ہے۔

مثال: ایک منبعِ نور کا تصور کریں جس سے نور ایک معین سمت میں پھیلتا ہے۔ ہر قدم جو نور آگے بڑھتا ہے، اس کی کچھ شعاعیں ایک مادی سطح کی صورت میں مرتکز ہو جاتی ہیں اور اس سطح سے بعض شعاعیں دوبارہ منتشر ہوتی ہیں۔ اس طرح منبعِ نور کے سامنے ایسی سطحیں بنتی ہیں جو نور ہی کی جنس سے ہیں اور ان سے نور منتشر ہوتا ہے۔ یہ نوری سطحیں ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہوتی ہیں کہ ان کی تعداد شمار نہیں کی جا سکتی۔ ان نوری سطحوں کے درمیان ایک فضا ہے جو ضد ذرات سے بھری ہوئی ہے اور یہ ان سطحوں کے مجموعی محتوا اور شدتِ نور کے برابر ہے؛ دوسرے لفظوں میں منبعِ نور کے باہر مادہ اور شدتِ نور کا مجموعہ صفر کے برابر ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ منبعِ نور کے باہر کوئی بھی حقیقی چیز موجود نہیں ہے۔ (کتاب «وہم الحاد» سے نقل)

(فَإِذا سَوَّيتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ ساجِدِينَ)[1]

(پھر جب میں اسے درست کر لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو اس کے آگے سجدہ میں گر جاؤ)۔

اس طرح پہلی انسانی نفس بلند کی گئی مٹی سے اور اس روح سے جو اس میں پھونکی گئی تھی، وجود میں آئی۔ پھر اسی پہلی انسانی نفس سے دوسری نفوس لی گئیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے جدا کی گئیں۔ اور یہ دوسری انسانی نفس، یعنی حوا (ع) کی نفس، آدم (ع) کی زوجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا) [2]

(اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں، اور اللہ سے ڈرو جس [کے نام] پر تم ایک دوسرے سے مانگتے ہو، اور قرابتوں [میں بھی تقوی اختیار کرو]، بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے)[3]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِ فَلَمَّا أَثْقَلَتْ دَعَوَا اللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ)[4]

(وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اس سے سکون حاصل کرے، پھر جب وہ اس کے قریب ہوا تو وہ ہلکے حمل سے حاملہ ہوئی اور اس کے ساتھ چلتی رہی، پھر جب وہ بوجھل ہو گئی تو دونوں نے اللہ، اپنے رب کو پکارا کہ اگر تو ہمیں صالح اولاد عطا کرے تو ہم ضرور شکر گزاروں میں سے ہوں گے)۔

پھر بنی آدم کی نفوس، آدم اور ان کی اولاد کی نفوس سے نکالی گئیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس عالم میں آزمائش میں ڈالا۔ یہ وہی پہلی آزمائش تھی جو اس جسمانی عالم کی آزمائش سے پہلے ہوئی تھی:

---

1. قرآن کریم، سورۂ حجر، آیت 29 اور سورۂ ص، آیت 72۔
2. قرآن کریم، سورۂ نساء، آیت 1۔
3. بلند ترین مرتبے میں پہلی روح، محمد (ص) کی روح ہے، اور اسی سے نچلی روحیں خلق کی گئیں جو علی (ع) اور فاطمہ (س) کی روحیں ہیں۔
4. قرآن کریم، سورۂ اعراف، آیت 189۔

(وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ)[1]

(اور جب آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد نکالی اور انہیں خود ان پر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں، ہم گواہی دیتے ہیں، تاکہ قیامت کے دن تم یہ نہ کہو کہ ہم اس بات سے غافل تھے)۔

نتیجتاً بنی آدم کی تمام نفوس مرفوع (بلند کی گئی) مٹی اور روحُ الایمان اور روحُ القدس کے تجلّی سے تشکیل پائی ہیں، جنہیں ہم روحُ الایمان اور روحُ القدس کی صورت کہہ سکتے ہیں۔ اسی سبب ہر انسان فطری طور پر بلند ترین مقامات تک پہنچ سکتا ہے اور عالمِ اعلیٰ کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ انسان فطرتاً اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے پاس ایک ایسا وسیلہ بھی ہے جس کے ذریعے وہ ارتقا حاصل کر سکتا ہے، اور وہی روح ایمان اور روحُ القدس کی صورت ہے۔ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اس صورت کے ذریعے جو اس میں بطور امانت رکھی گئی ہے، اپنی حقیقت کو پہچان سکتا ہے اور اس کی طرف بڑھ سکتا ہے۔ لیکن افسوس کہ بعض لوگ اس کے بجائے کہ اپنے آئینے میں منعکس اس تصویر سے فائدہ اٹھائیں، اسے ختم کرنے کا اقدام کرتے ہیں اور خود کو پست سمجھنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ ان میں صرف جسم کی حیوانیت باقی رہ جاتی ہے، جو انہیں جانوروں، بندروں اور خنزیروں کے ساتھ مشترک کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا)[2]

(کیا آپ یہ گمان کرتے ہیں کہ ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں؟ وہ تو محض چوپایوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں)۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِنْ ذَلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللَّهِ مَنْ لَعَنَهُ اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَوَعَبَدَ الطَّاغُوتَ أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَكَانًا وَأَضَلُّ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ)[3]

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ اعراف، آیت 172۔

[2] . قرآن کریم، سورۂ فرقان، آیت 44۔

[3] . قرآن کریم، سورۂ مائدہ، آیت 60۔

(کہہ دیجئے: کیا میں تمہیں اس شخص سے آگاہ کروں جو سزا کے اعتبار سے اللہ کے نزدیک اس سے (بھی) برا ہے (جسے تم برا سمجھتے ہو، اور یہ وہ شخص ہے) جس پر اللہ نے لعنت کی ہے اور اس پر غضب ناک ہوا ہے اور ان میں سے بندر اور خنزیر بنا دیے، اور وہ جنہوں نے طاغوت کی عبادت کی۔ یہی لوگ درجے میں بدتر اور سیدھے راستے سے زیادہ گمراہ ہیں)۔

انسان کی تخلیق اور جسم میں نفس کا پھونکا جانا

اللہ سبحان و تعالیٰ نے آدم کی تخلیق کو آسمان اول میں، یعنی آسمانِ انفس میں آغاز فرمایا؛ لیکن اس لیے کہ آدم اور ان کی اولاد اس قابل ہو سکیں کہ زمین پر اتریں اور اجسام کے ساتھ متصل ہوں، ضروری تھا کہ مٹی کو آسمان اول تک بلند کیا جائے اور آدم (ع) اور دیگر لوگوں کی نفوس اسی سے پیدا کی جائیں۔ یہ امر اس لیے لازم تھا کہ روح اسی مرفوع (بلند کی گئی) مٹی میں پھونکی گئی، اور یہی مٹی روح کے جسم سے اتصال کا ذریعہ بنی۔

یہ ممکن نہیں کہ روح جسم کے ساتھ تماس رکھے، اس لیے کہ وہ دونوں دو مختلف عالموں میں ہیں اور دو جداگانہ جہانوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کے درمیان اور بھی عالم ہیں، لہٰذا ایک ایسا ذریعہ ہونا چاہیے جو تمام مراتب اور درمیانی مقامات میں، اور آسمانِ جسمانی اور پہلے آسمان کے درمیان موجود تمام عالموں میں وجود رکھتا ہو اور جب جسم بلند کیا جائے تو وہ ان مقامات میں قرار پا سکے اور ان کے درمیان حرکت کر سکے۔

لہٰذا وہ مٹی جو بلند کی گئی، اور جو زمین میں موجود تمام چیزوں کا جلوہ ہے، اسے عالمِ اجسام اور عالمِ ارواح کے درمیان حرکت کرنے کی صلاحیت حاصل ہو گئی؛ یا یوں کہیے کہ عالمِ اجسام میں آسمان اول کے آغاز سے لے کر آسمان دوم کے نقطۂ اتصال تک، یا عالمِ ارواح میں آسمان دوم کے آغاز تک، یعنی آسمانِ روح اور ملکوتی جنت تک، حرکت کرنے کی قدرت اسے مل گئی۔

اسی طرح آدم کی تخلیق کی ابتدا زمین کی مٹی اور اس کے پانی سے ہوئی، تاکہ ان کی وہ نفس جو جلد آسمان اول میں پیدا کی جانے والی تھی، قوت اور شہوت کو اپنے ساتھ لے، جو اسے کثرت اختیار کرنے اور زمین کے تمام علاقوں میں زندگی بسر کرنے کے لیے آمادہ کرے اور اسے زمین پر غلبہ پانے کے لیے تیار کرے۔ فرشتوں نے اللہ سبحان کے حکم سے زمین کی کچھ مٹی اور پانی لیا اور اسے آسمان اول تک بلند کیا، اور اسی سے آسمان اول میں آدم کے لطیف جسم کا خاکہ ڈالا گیا اور اسے جنتِ دنیوی میں، جو آسمان اول کے انتہا پر ہے، رکھا گیا۔ یعنی ملکوتی آسمان کے دروازے پر، یا آسمان دوم پر جو پہلی ملکوتی جنت ہے جہاں سے فرشتے گزرے تھے۔

امام صادق (ع) نے فرمایا: (فرشتے آدم (ع) کے پاس سے گزرتے تھے، یعنی ان کی صورت اور تصویر کے پاس، جبکہ وہ جنت میں رکھے گئے تھے اور مٹی سے تھے، اور وہ کہتے تھے: تم کس لیے پیدا کیے گئے ہو؟)[1]

یعنی وہ اس جنت میں رکھے گئے تھے جو آسمان اول میں موجود ہے۔

امام باقر (ع) نے فرمایا: (اللہ تعالی نے آدم کو پیدا فرمایا۔ وہ ایک تصویر کی صورت میں تھے، یہاں تک کہ ابلیسِ ملعون ان کے پاس سے گزرتا اور کہتا تھا: تم کس مقصد کے لیے پیدا کیے گئے ہو؟)۔

(فَقُلْنا يا آدَمُ إِنَّ هذا عَدُوٌّ لَكَ وَلِزَوْجِكَ فَلا يخْرِجَنَّكُما مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقى)[2]

(پھر ہم نے کہا: اے آدم! بے شک یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے، لہٰذا ایسا نہ ہو کہ یہ تم دونوں کو جنت سے نکال دے، پھر تم مشقت میں پڑ جاؤ)۔

پھر جب زمین آدم (ع)، جو اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے، کے استقبال اور پذیرائی کے لیے تیار ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے آسمانِ اوّل میں موجود آدم کے مثالی جسم میں روح ایمان پھونک دی۔ پھر اس طرح پہلا انسانی نفس وجود میں آیا؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: (... فَإِذا سَوَّيتُهُ) (پھر جب میں اسے درست کر لوں) اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: (وَلَقَدْ خَلَقْناكُمْ) (اور بے شک ہم نے تمہیں پیدا کیا)۔ یہ مرحلہ عالمِ نفوس میں، آسمانِ اوّل پر واقع ہوا۔

پھر آدم میں روحُ القدس پھونکی گئی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: (... وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي) (...میں نے اسے درست کیا اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دی) اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: (ثُمَّ صَوَّرْناكُمْ) (پھر ہم نے تمہاری صورت گری کی) یعنی تمہیں اللہ تعالیٰ کی صورت اور تصویر پر بنایا؛ جیسا کہ تورات میں مذکور ہے:

(خداوند نے فرمایا: ہم انسان کو اپنی صورت پر اور اپنی مشابہت پر بنائیں گے)[3]

---

1 . قصص الانبیاء، راوندی، ص 41۔

2 . قرآن کریم، سورۂ طٰہٰ، آیت 117۔

3 . عہدِ قدیم، سفر پیدائش، باب 1، آیت 26۔

(خداوند نے انسان کو اپنی صورت اور اپنی تصویر پر پیدا کیا۔ اسے اللہ تعالیٰ کی صورت پر اور مرد اور عورت کی شکل میں پیدا کیا)[1]

روایت میں ہے:

محمد بن مسلم کہتے ہیں: (میں نے امام باقر(ع) سے اس روایت کے بارے میں پوچھا کہ "اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔" تو آپ (ع) نے فرمایا: وہ صورت ایک پیدا کی ہوئی اور مخلوق صورت تھی، جسے اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا اور مختلف صورتوں میں سے اسے چن لیا، پھر اسے اپنی طرف منسوب کیا، جس طرح کعبہ اور روح کو اپنی طرف نسبت دی۔ چنانچہ فرمایا: بیتی (میرا گھر) اور فرمایا: (وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي) (اور میں نے اس میں اپنی روح میں سے پھونک دیا)[2]

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ اس کے سامنے سجدہ کریں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے:

(فَقَعُوا لَهُ ساجِدِينَ) (تو اس کے لیے سجدے میں گر جاؤ) اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: (ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ) (پھر ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو)۔ پھر جس نے سجدہ کیا، اس نے سجدہ کیا، اور جس نے تکبر کیا، اس نے تکبر کیا اور وہ مردود ٹھہرا۔

(فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ)[3]

(پھر جب میں اسے درست کر لوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو اس کے سامنے سجدے میں گر جاؤ)۔

(وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ لَمْ يَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ)[4]

(اور بے شک ہم نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہاری صورت گری کی، پھر ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہ تھا)۔

---

1. عہدِ قدیم، سفر پیدائش، باب 1، آیت 27۔
2. کافی، کلینی، جلد 1، ص 134؛ توحید، صدوق، ص 103۔
3. قرآن کریم، سورۂ حجر، آیت 29۔
4. قرآن کریم، سورۂ اعراف، آیت 11۔

یہیں سے اللہ تعالیٰ نے حواعلیھا السلام کے نفس کو آدم (ع) کے نفس سے پیدا فرمایا[1]۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

(یا أَیھَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّکُمُ الَّذی خَلَقَکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَ خَلَقَ مِنْھا زَوْجَھا وَ بَثَّ مِنْھُما رِجَالاً کَثیراً وَ نِسَاءً وَ اتَّقُوا اللَّہَ الَّذی تَسَائَلُونَ بِہِ وَ الْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّہَ کانَ عَلَیکُمْ رَقِیباً)[2]

(اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں زمین میں پھیلا دیے۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، اور رشتہ داریوں کا خیال رکھو۔ بے شک اللہ تعالیٰ تم پر نگہبان ہے)۔[3]

امام صادق (ع) نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور حوّا کو آدم سے پیدا کیا)۔[4]

اس کے بعد ان دونوں کی اولاد کو نکالا اور سب کو پہلے امتحان میں، عالمِ ذر یا عالمِ اَنفُس میں آزمایا۔ یہ امتحان ایک ہی سوال کے ذریعے تھا:

(وَ إِذْ أَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنی آدَمَ مِنْ ظُھُورِھِمْ ذریتَھُمْ وَ أَشْھَدَھُمْ عَلی أَنْفُسِھِمْ أَ لَسْتُ بِرَبِّکُمْ قالُوا بَلی شَھِدْنا أَنْ تَقُولُوا یوْمَ الْقِیامَةِ إِنَّا کُنَّا عَنْ ھَذا غافِلِینَ) [5]

(اور (یاد کرو) جب تمہارے رب نے اولادِ آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا اور اُنہیں اُنہی کے نَفسوں پر گواہ بنایا (اور فرمایا): کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں، ہم گواہی دیتے ہیں۔ تاکہ قیامت کے دن تم یہ نہ کہو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے)۔

---

1. نفسِ حوا کو مستقل طور پر، اس طرح نہیں پیدا کیا گیا جس طرح نفسِ آدم (ع) پیدا کیا گیا تھا، اور یہ اس لیے تھا کہ ان دونوں کے درمیان محبت اور مہربانی قائم ہو۔ محبت اور اطاعت حوا کی طرف سے آدم کے لیے ہے اور رحمت آدم کی طرف سے حوا کے لیے ہے: (وَمِنْ آیَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ) (روم، 21) (اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی، بے شک اس میں غور کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں)۔

2. قرآن کریم، سورۂ نساء، آیت 1۔

3. سب سے بلند مرتبہ میں پہلی روح، روح محمد (ص) ہے اور اسی سے نچلی ارواح پیدا کی گئیں، جو روح علی (ع) اور فاطمہ سلام اللہ علیہا ہیں۔

4. قصص الانبیاء، راوندی، ص 42۔

5. قرآن کریم، سورۂ اعراف، آیت 172۔

آیت واضح ہے؛ وَ أَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ، (اُنہیں اُن کے نفسوں پر گواہ بنایا)، یعنی یہ عالمِ اَنفُس میں تھا۔ اس امتحان میں وہی آگے بڑھتا ہے اور سبقت لے جاتا ہے جو پہلے دیکھے، پہلے سنے اور پہلے جواب دے۔

جب یہ امتحان مکمل ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آدم (ع) کو زمین پر اُتارنے اور زمین میں اُن کے امتحان کو، جو اس کے علم میں تھا، نافذ فرمائے۔ چنانچہ آدم (ع) کا امتحان آسمان اول یا جنتِ دنیوی میں پیش آیا، اور جیسا اُن کے لیے مقدر تھا، وہ اس امتحان میں ناکام ہو گیا۔

(فَأَكَلا مِنْها فَبَدَتْ لَهُما سَوْآتُهُما وَ طَفِقا يخْصِفانِ عَلَيهِما مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ وَ عَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى)[1]

(پھر وہ دونوں اس درخت سے کھا بیٹھے تو اُن پر اُن کی شرم گاہیں ظاہر ہو گئیں، اور وہ جنت کے پتّے اپنے اوپر چپکانے لگے، اور آدم (ع) نے اپنے رب کی نافرمانی کی، لہٰذا وہ راہ سے ہٹ گئے)۔

وہ (آدم (ع)) اور ہماری ماں حوّا (س) زمین پر اُتارے گئے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں پر درود بھیجے اور ہمیں دنیا و آخرت میں اُن دونوں کی شفاعت نصیب فرمائے۔

قرآنی نص واضح ہے کہ آدم اور حوّا ابتدا میں اُس جنت میں پیدا کیے گئے اور وہیں مقیم رہے جو آسمان اول میں ہے۔ یہ جنت دنیوی ہے، زمین میں نہیں، بلکہ آسمان اول یا عالمِ نفوس میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(وَ قُلْنا يا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلا مِنْها رَغَداً حَيثُ شِئْتُما وَ لا تَقْرَبا هذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونا مِنَ الظَّالِمينَ)[2]

(اور ہم نے کہا: اے آدم! تم اور تمہاری زوجہ اس جنت میں رہو اور اس میں سے جہاں سے چاہو فراخی کے ساتھ کھاؤ، اور اس درخت کے قریب نہ جانا، ورنہ تم ظلم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے)۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(وَ يا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلا مِنْ حَيثُ شِئْتُما وَ لا تَقْرَبا هذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونا مِنَ الظَّالِمينَ)[3]

---

1. قرآن کریم، سورۂ طٰہٰ، آیت 121۔
2. قرآن کریم، سورۂ بقرہ، آیت 35۔
3. قرآن کریم، سورۂ اعراف، آیت 19۔

(اور اے آدم! تم اور تمہاری بیوی اس باغ میں رہو، پھر جہاں سے چاہو کھاؤ، اور اس درخت کے قریب نہ جانا، کہ تم دونوں ظلم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے)۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(فَقُلْنا يا آدَمُ إِنَّ هذا عَدُوٌّ لَكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلا يخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقى * إِنَّ لَكَ أَلاَّ تَجُوعَ فِيها وَ لا تَعْرى * وَ أَنَّكَ لا تَظْمَؤُا فِيها وَ لَا تَضْحى * فَوَسْوَسَ إِلَيهِ الشَّيطَانُ قالَ يا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لا يبْلى * فَأَكَلا مِنْها فَبَدَتْ لَهُما سَوْآتُهُما وَ طَفِقا يخْصِفانِ عَلَيهِما مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ وَ عَصى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوى)[1]

(پھر ہم نے کہا: اے آدم! یقیناً یہ (ابلیس) تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے، تو پھر ایسا نہ ہو کہ یہ تم دونوں کو جنت سے نکال دے، کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ۔ بیشک تمہارے لیے وہاں یہ ہے کہ نہ تم بھوکے رہو گے اور نہ ننگے ہو گے۔ اور یہ بھی کہ تم وہاں نہ پیاسے ہو گے اور نہ دھوپ سے پریشان ہو گے۔ پھر شیطان نے اسے وسوسہ ڈالا، کہنے لگا: اے آدم! کیا میں تمہیں ہمیشگی کے درخت اور ایسی بادشاہی کی طرف رہنمائی کروں جو کبھی ختم نہ ہو؟ پھر دونوں نے اس میں سے کھا لیا، تو ان پر ان کی شرمگاہیں ظاہر ہو گئیں اور وہ جنت کے پتوں کو اپنے اوپر چپکانے لگے۔ اور [اس طرح] آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی، لہٰذا وہ بھٹک گئے)۔

ان آیات میں واضح ہے کہ آدم (ع) زمینی نہیں تھے، اور ابتدا میں زمین میں پیدا نہیں کیے گئے تھے؛ بلکہ وہ آسمانِ اوّل کی جنت میں تھے اور یہ جنت، دائمی جنت کے علاوہ ہے۔ فَلا يخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقى (تو پھر ایسا نہ ہو کہ یہ تم دونوں کو جنت سے نکال دے، کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ) یہ جنت زمین کی مانند نہیں ہے کہ اگر انسان اس میں کام نہ کرے، اور پھل نہ توڑے اور کھیتی باڑی نہ کرے اور جانوروں کا شکار نہ کرے یا انہیں نہ پالے اور ضرر کے ازالے کے لیے نکات کی رعایت نہ کرے وہ بھوک، ننگے پن، پیاس اور دھوپ کی شدت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور سورج اور موسمی حالات اسے تکلیف پہنچاتے ہیں؛ لہٰذا یہ جنت زمینی نہیں ہے۔

پھر ان آیات میں آدم کی مختلف حالت پر غور کریں کہ کیا وہ زمین اور اس میں موجود اجسام کی حالت کے مطابق ہے؟ اگر زمین پر انسان کے جسم کا کوئی حصہ لباس سے نہ ڈھانپا جائے تو وہ ظاہر ہو جاتا ہے اور یقیناً اس کا ساتھی اور دوسرے لوگ اسے دیکھ لیتے ہیں۔ اگر آدم زمینی لباس پہنے ہوئے ہوتے تو اللہ کے مقابل نافرمانی اور

---

[1] .قرآنِ کریم، سورۂ طٰہٰ، آیات 117 سے 121۔

سرکشی کرنے سے وہ لباس ختم نہ ہو جاتا۔ اور اگر آدم اور حوا زمین پر ہوتے اور ابتدا ہی سے ننگے ہوتے تو وہ شروع ہی سے اپنی حالت سے آگاہ ہوتے، نہ کہ نافرمانی کے وقت۔ اور اگر وہ زمین میں ہوتے اور لباس پہنے ہوئے ہوتے تو صرف معصیت کی بناپر وہ لباس ان سے پوشیدہ نہ ہو جاتا۔

لہٰذا یہ معاملہ زمینی نہیں ہے اور یہ قصہ زمین سے متعلق نہیں ہے، اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس موضوع کو قرآن میں بیان فرمایا ہے، یہ بالکل بھی زمین اور اس کے رہنے والوں کی حالت کے مطابق نہیں ہے؛ جبکہ اگر آدم اور حوا معصیت کے وقت آسمانِ اوّل کی دنیوی جنت میں تھے تو یہ بات فطری ہے کہ نافرمانی کے وقت ان کی برائیاں ان پر ظاہر ہوئیں، اس سے پہلے نہیں؛ اس لیے کہ وہاں جو چیز ستر اور برائی کو ڈھانپتی تھی وہ تقویٰ کا لباس تھا، اور وہ ایسا لباس تھا جو نفس، اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور خواہشِ نفس اور شیطان کی مخالفت کے فطری نتیجے کے طور پر پہنتا ہے۔ اور تقویٰ کا لباس جسم کے لباس سے زیادہ اہم اور برتر ہے؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے نفس اور روح اور اس پر موجود لباس کو دیکھتا ہے، نہ کہ انسان کے جسم اور اس لباس کو جو اسے ڈھانپتا ہے۔

(يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيكُمْ لِباساً يوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشاً وَلِبَاسُ التَّقْوى ذَلِكَ خَيرٌ ذَلِكَ مِنْ آياتِ اللَّهِ لَعَلَّهُمْ يذَّكَّرُونَ)[1]

(اے بنی آدم! بے شک ہم نے تم پر ایسا لباس نازل کیا جو تمہاری شرمگاہوں کو ڈھانپتا ہے اور زینت بھی ہے، اور تقویٰ کا لباس سب سے بہتر ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں)۔

نافرمانی کے وقت یہ لباس انسان سے جدا ہو گیا اور انسان کی شرمگاہ اس کے پروردگار کے سامنے ظاہر ہو گئی۔[2] یعنی آدم اور حوا علیہم السلام ابتدا ہی سے جنت میں جس لباس کو پہنے ہوئے تھے وہ تقویٰ کا لباس تھا۔ پھر یہ لباس ان سے جدا ہو گیا۔ وہ شروع سے ننگے نہ تھے، اور جو چیز ان پر ظاہر ہوئی وہ ان کی پہلی حالت نہ تھی؛ بلکہ جو ان پر ظاہر ہوئی وہ معصیت کے بعد کی حالت تھی، جب تقویٰ کا لباس ان سے جدا ہو چکا تھا:

---

[1] .قرآنِ کریم، سورۂ اعراف، آیت 26۔

[2] .یعنی انسان، نہ صرف آدم۔ فرشتے اسے تقویٰ سے خالی دیکھ رہے تھے اور جانتے تھے کہ وہ معصیت کرنے والا ہے۔ اسی وجہ سے آدم اور حوا نے پیش آنے والے واقعے میں تلافی کی کوشش شروع کی؛ کیونکہ یہ کم از کم ایک شرم کا معاملہ تھا جو اس آدم سے صادر ہوا جو فرشتوں کا استاد تھا۔ اسی لیے انہوں نے مغفرت طلب کرنا شروع کی تاکہ تقویٰ کا لباس دوبارہ انہیں عطا ہو جائے: فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ (تو ان کی شرمگاہیں ان پر ظاہر ہو گئیں اور وہ جنت کے پتوں کو اپنے اوپر چپکانے لگے)۔

(یا بَنی آدَمَ لا یفْتِنَنَّکُمُ الشَّیطانُ کَما أَخْرَجَ أَبَوَیکُمْ مِنَ الْجَنَّةِ ینْزِعُ عَنْهُما لِیرِیهُما سَوْآتِهِما إِنَّهُ یراکُمْ هُوَ وَ قَبیلُهُ مِنْ حَیثُ لا تَرَوْنَهُمْ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّیاطینَ أَوْلِیاءَ لِلَّذینَ لا یؤْمِنُونَ)[1]

(اے بنی آدم! کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں فتنے میں ڈال دے، جس طرح اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکال دیا تھا، وہ ان دونوں سے ان کا لباس اتروانا تھا تاکہ ان کی شرمگاہیں ان پر ظاہر کر دے۔ بے شک وہ اور اس کا گروہ تمہیں وہاں سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھتے۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست بنادیا ہے جو ایمان نہیں لاتے)۔

آیت واضح ہے کہ آدم سے ان کی نافرمانی کے سبب لباس اتار لیا گیا: یا بَنی آدَمَ لا یفْتِنَنَّکُمُ الشَّیطانُ کَما أَخْرَجَ أَبَوَیکُمْ مِنَ الْجَنَّةِ ینْزِعُ عَنْهُما لِباسَهُما لِیرِیهُما سَوْآتِهِما (اے فرزندان آدم! کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں فتنے میں ڈال دے، جس طرح اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکال دیا اور ان کا لباس ان سے اتروایا تاکہ ان کی شرمگاہیں ان پر ظاہر کر دے) اور یہ لباس طلبِ مغفرت کے ساتھ واپس ہوا: فَبَدَتْ لَهُما سَوْآتُهُما وَ طَفِقا یخْصِفانِ عَلَیهِما مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ (تو ان کی شرمگاہیں ان پر ظاہر ہو گئیں اور وہ جنت کے پتے اپنے اوپر چپکانے لگے)۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ آدم اور حوا کا ہبوط اور اترنا آسمانِ اول میں واقع دنیوی جنت سے زمین کی طرف تھا، نہ کہ کسی زمینی جنت سے زمین کی طرف۔ (قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْها جَمیعاً فَإِمَّا یأْتِینَّکُمْ مِنِّی هُدی فَمَنْ تَبِعَ هُدای فَلا خَوْفٌ عَلَیهِمْ وَ لا هُمْ یحْزَنُونَ)[2]

(ہم نے کہا: تم سب اس سے اتر جاؤ، پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے، ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگیں ہوں گے)۔

یہ اترنا آسمانِ اول سے عالمِ جسمانی کی طرف، اور خاص طور پر زمین کی طرف تھا۔ امام صادق (ع) بیان فرماتے ہیں کہ آدم نے اس جنت میں واپسی کی درخواست کی جس میں وہ تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ یہ بات واضح طور پر دلالت کرتی ہے کہ وہی جنت ہے جس میں انسان نفس کے بدن سے جدا ہونے کے بعد، موت کے ذریعے دوبارہ داخل ہوتا ہے اور پہلے کی طرح اس کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ اعراف، آیت 27۔

[2] . قرآن کریم، سورۂ بقرہ، آیت 38۔

امام صادق (ع) نے فرمایا: (حضرت آدم نے سو سال تک بیت اللہ کے گرد طواف کیا، اور حوا کی طرف نظر نہیں کرتے تھے، اور جنت کی جدائی میں اس قدر روئے کہ ان کے دونوں رخساروں پر دو بڑے نہروں کی مانند نشان ظاہر ہو گئے۔ پھر جبرئیل ان کے پاس آئے اور کہا: "اللہ تمہیں زندہ رکھے اور تمہیں ہنسائے"۔ جب انہوں نے کہا: "اللہ تمہیں زندہ رکھے"، تو ان کے چہرے پر خوشی کا اثر نمایاں ہو گیا اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا ہے، اور جب انہوں نے کہا: "تمہیں ہنسائے"، تو وہ ہنس پڑے۔ وہ بیت اللہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے، اس حال میں کہ اونٹ اور گائے کی کھالوں کے کپڑے پہنے ہوئے تھے، اور عرض کیا: "اے میرے رب! میری لغزش سے در گزر فرما، اور میرے گناہ کو بخش دے، اور مجھے اس جگہ واپس لوٹا دے جہاں سے تو نے مجھے نکالا تھا"۔ تو اللہ عزوجل نے فرمایا: "میں نے تیری لغزش معاف کر دی، اور تیرا گناہ بخش دیا، اور عنقریب میں تجھے اس جگہ واپس لوٹا دوں گا جہاں سے تجھے نکالا تھا") [1]

یہ آدم (ع) کی تخلیق کی داستان ہے، جو اس مٹی سے ہوئی جسے آسمان اول تک بلند کیا گیا اور پھر اس میں روح پھونکی گئی۔ لہٰذا آدم دنیاوی جنت میں جو آسمان اول [2] میں واقع ہے پیدا کیے گئے؛ لہٰذا ہم آسمانی ہیں اور ہماری نفس بھی اسی پھونکی گئی روح سے، جو اس بلند کی گئی مٹی میں داخل کی گئی تھی، پیدا ہوئی ہے، تاکہ ہمیں اس زمین میں آزمایا جائے اور ہمارا امتحان لیا جائے؛ اور دوسری جانب ارواح اس قابل ہوں کہ وہ زمینی بدنوں کے ساتھ، جو اس جسمانی عالم میں ہمارے امتحان کی جگہ ہیں، ملاپ کر سکیں۔ [3]

نفس، روح اور عقل

بیان کیا گیا کہ نفس بلند کی گئی مٹی اور روح کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔ اسی لیے وہ روح سے مختلف ہے؛ لیکن نام رکھنے کے اعتبار سے کبھی نفس کو روح بھی کہا جاتا ہے، اس وجہ سے کہ نفس روح سے پیدا ہوئی ہے، اور اس لیے بھی کہ نفس روح ایمان اور روح القدس کی صورت کو منعکس کرتی ہے، اور بعض اوقات روح کو بھی

---

1. معانی الاخبار، صدوق، ص 269۔
2. آسمانِ دنیا دو حصوں یا دو طبقات پر مشتمل ہے، جو یہ ہیں: جسمانی آسمان اور آسمان اول۔
جسمانی آسمان یہی مادی اور عینی آسمان ہے جس میں کہکشائیں، سورج، چاند اور وہ زمین جس پر ہم زندگی گزارتے ہیں، موجود ہیں۔
آسمان اول نفوس کا آسمان ہے، جہاں آدم کو پیدا کیا گیا، اور دنیاوی جنت، جس میں آدم اور حوا اپنی تخلیق کے آغاز میں اور اس سے پہلے کہ وہ معصیت کے صدور کے سبب زمین پر اترتے، قیام پذیر تھے، وہ بھی وہیں واقع ہے۔ آسمان اول ہی عالمِ ذر کا آسمان ہے۔
3. کتاب «وہم الالحاد» سے نقل کیا گیا۔

نفس کہا جاتا ہے۔ انسان جسم اور جسم کو حرکت دینے والی اس چیز سے مرکب ہے جو آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔ یہ حرکت دینے والی چیز اس اعتبار سے کہ وہ جسم کے ساتھ متصل ہے، کبھی نفس کہلاتی ہے، اگرچہ ممکن ہے کہ وہ ارتقاء پا چکی ہو اور روح القدس کی حامل ہو۔ اور اس اعتبار سے کہ یہی نفس جسم کی محرک ہے اور اس اعتبار سے کہ وہ ملکوتِ اعلیٰ، یعنی روح حقیقی کا مظہر ہے، کبھی روح کہلاتی ہے، خواہ اس نے ارتقاء حاصل نہ کیا ہو اور وہ روح ایمان اور روح القدس کی حامل نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے پاس روح حقیقی ہونے کے لیے کم از کم یہ ضروری ہے کہ اس کا کوئی حصہ اور وجود دوسرے ملکوتی آسمان میں ہو؛ اس لیے کہ دوسرا آسمان پہلا ملکوتی جنت ہے۔

اسی طرح یہی محرک اس اعتبار سے کہ وہ ساتویں آسمان میں عقل کا مظہر ہے، عقل کہلاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے پاس عقلِ حقیقی ہونے کے لیے لازم ہے کہ اس کا کوئی حصہ اور وجود ساتویں آسمان میں ہو۔

نفس

آغاز میں روحُ القدس اور روح ایمان کو بلند کی گئی مٹی کے ساتھ ملایا گیا اور پہلی انسانی نفس کو پیدا کیا گیا۔ پھر دیگر انسانی نفوس اسی پہلی نفس سے وجود میں آئے۔ دوسری نفوس دراصل پہلی انسانی نفس کی صورت اور تصویر ہیں۔ مٹی کی نفس میں اس کی خواہشات اور مادی قوتیں ظاہر ہوتی ہیں، اور نفس میں روح ایمان اور روحُ القدس بھی ظاہر ہوتے ہیں۔

(وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاها * فَأَلْهَمَها فُجُورَها وَتَقْواها * قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاها * وَقَدْ خابَ مَنْ دَسَّاها)[1]

(قسم ہے نفس کی اور اس ذات کی جس نے اسے درست کیا، پھر اس کو اس کی بدکاری اور اس کی پرہیزگاری کی سمجھ دی، بے شک وہ کامیاب ہوا جس نے اسے پاک کر لیا، اور وہ نامراد ہوا جس نے اسے آلودہ کر دیا)۔

ہر انسان کے پاس ایک نفس ہے اور یہ نفس اس مادی عالم میں ایک ایسے آئینے کی مانند ہے جس میں روح ایمان اور روحُ القدس منعکس ہوتے ہیں۔ اس نفس کی تین روحیں ہیں، جو یہ ہیں: روح حیات، روح قوت اور روح شہوت۔ یہ تینوں روحیں اس وجہ سے کہ اسی سمت میں قرار دی گئی ہیں اور اسی انعکاس کا سبب بنتی ہیں، نفسِ انسانی کا حصہ شمار ہوتی ہیں۔ اگر نفسِ انسانی کو ایک کارخانے کے طور پر تصور کیا جائے تو ان میں سے ہر روح اس

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ شمس، آیات 7 تا 10۔

کارخانے کا ایک حصہ ہے، اور بعض حصے دوسرے حصوں کے کام کو مکمل کرتے ہیں، اور ان تمام اجزا کے مجموعے سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر روح حیات کارخانے کی برقی توانائی کی مانند ہے، اور روح قوت وہ موٹریں ہیں جو برقی توانائی یا روح حیات کے ذریعے حرکت میں آتی ہیں، جبکہ روح شہوت وہ مشینیں ہیں جو ان موٹروں کے ذریعے چلتی اور گردش کرتی ہیں۔

نفس کا وجود بذاتِ خود اس بات کو لازم نہیں کرتا کہ انسان حقیقی روح رکھتا ہو۔ حقیقی روح دوسرے آسمان سے شروع ہوتی ہے، یعنی نفس کو دوسرے آسمان تک ارتقاء حاصل کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ حقیقی روح کا حامل بنے۔ نفس پہلے آسمان میں بھی روح کہلا سکتی ہے؛ اس لیے کہ وہ ملکوتِ اعلیٰ یا حقیقی روح سے تجلی پاتی ہے، اور اس لیے بھی کہ نفس اور اس کی تینوں ارواح (روح حیات، روح قوت اور روح شہوت) جسم کو حرکت دینے والی ہیں۔[1] جس طرح انسان کی نفس جتنا بھی ارتقاء حاصل کرے اور اس کا مقام بلند ہو جائے، تب بھی وہ اس کے جسم کو حرکت دینے والی رہے گی، اور اس سے "نفس" کا نام سلب نہیں ہوگا۔ لہٰذا اگر انسان ملکوتی آسمانوں میں ہو، اور انبیاء، اوصیاء اور اولیاء علیہم السلام کی طرح کلی ساتویں آسمان یا آسمانِ عقل سے بھی فیض حاصل کر چکا ہو، تب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ جسم کو حرکت دینے والی نفسِ انسانی ہی ہے، کیونکہ یہ نفس بلند کی گئی مٹی اور روح سے پیدا کی گئی ہے۔

نفسِ انسانی ایک آئینے کی مانند ہے جس میں روح ایمان اور روحُ القدس منعکس ہوتے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی طرف انسان کو لوٹنا چاہیے، اور یہی انسانی فطرت اسے ترغیب دیتی ہے کہ وہ ارتقاء حاصل کرے تاکہ بلند ترین انسانی مقام تک پہنچ سکے۔ اگر وہ اپنے راستے میں پھسل بھی جائے، لیکن خلوص کے ساتھ بلندی کی درخواست کرتا رہے، تو وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جس کی توفیق اللہ تعالیٰ نے اسے دی ہوتی ہے، اور وہ اپنی حالت کے مطابق اپنے پروردگار کو پہچانتا ہے۔ انسان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو حقیقی روح اور عقل کے مقام تک بلند کرے۔ جو شخص دوسرے آسمان تک ارتقاء حاصل نہیں کرتا، اس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ روح کا سایہ ہوتا ہے۔ عقل کے بارے میں بھی یہی بات ہے۔ جب تک انسان کلی ساتویں آسمان تک ارتقاء

---

[1] . چونکہ لفظ «روح» کا لغوی اور معنوی تعلق لفظ «ریح» یعنی ہوا کے ساتھ پایا جاتا ہے، اس لیے جو چیز جسم کی حرکت کا سبب بنتی ہے، اسے روح کہا جاتا ہے۔ (مترجم)

حاصل نہ کرے، اس کے پاس جو کچھ ہے وہ عقل کا سایہ ہے، (حقیقی) عقل نہیں۔ البتہ بعض اوقات اسے "روح" اور "عقل" اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ حقیقی روح اور عقل کا انعکاس کرتا ہے۔

جابر جعفی کہتے ہیں کہ امام صادق (ع) نے فرمایا: (اے جابر! اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو تین قسموں میں پیدا کیا، اور یہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے: (وَكُنْتُمْ أَزْواجاً ثَلاثَةً فَأَصْحَابُ الْمَيمَنَةِ ما أَصْحَابُ الْمَيمَنَةِ وَ أَصْحَابُ الْمَشْئَمَةِ مَا أَصْحَابُ الْمَشْئَمَةِ وَ السَّابِقُونَ السَّابِقُونَ أُولَئِكَ الْمُقَرَّبُونَ) [1] (اور تم تین گروہ ہو جاؤ گے: سو (ایک) دائیں جانب والے، دائیں جانب والوں کا کیا کہنا اور (دوسرے) بائیں جانب والے، کیا (ہی برے حال میں ہوں گے) بائیں جانب والے، اور سبقت لے جانے والے تو وہی آگے بڑھنے والے ہیں، یہی لوگ مقرب ہیں)۔ سبقت لے جانے والے اللہ تعالیٰ کے رسول اور اس کی مخلوق میں سے خاص بندے ہیں۔ ان میں پانچ روحیں رکھی گئیں[2]۔ انہیں روحُ القدس کے ساتھ تائید کی گئی، لہٰذا وہ اس کے ذریعے چیزوں کو پہچانتے ہیں۔ انہیں روح ایمان کے ساتھ تائید کی گئی، پس وہ اس کے ذریعے اللہ عزوجل سے ڈرتے ہیں۔ انہیں روح قوت کے ساتھ تائید کی گئی، لہٰذا وہ اس کے ذریعے اللہ کی اطاعت پر قادر ہوئے۔ انہیں روح شہوت کے ساتھ تائید کی گئی، لہٰذا وہ اس کے ذریعے اللہ عزوجل کی اطاعت کی رغبت رکھتے ہیں اور اس کی نافرمانی ان کے نزدیک ناپسندیدہ ہو جاتی ہے۔ اور ان میں روح مدرَج رکھی گئی جس کے ذریعے لوگ آتے جاتے ہیں۔ اور مؤمنین اور اصحابِ یمین میں روح ایمان رکھی گئی، پس وہ اس کے ذریعے اللہ سے ڈرتے ہیں۔ ان میں روح قوت رکھی گئی، پس وہ اس کے ذریعے اللہ کی اطاعت پر قادر ہوئے۔ ان میں روح شہوت رکھی گئی، پس وہ اس کے ذریعے اللہ کی اطاعت کی رغبت رکھتے ہیں، اور ان میں روح مدرَج رکھی گئی جس کے ذریعے لوگ آتے جاتے ہیں)[3]

جابر کہتے ہیں کہ میں نے امام باقر (ع) سے عالم کے علم کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے فرمایا: (اے جابر، انبیاء اور اوصیاء میں پانچ روحیں ہوتی ہیں: روحُ القدس، روح ایمان، روح حیات، روح قوت اور روح شہوت۔ اے جابر، روحُ القدس کے ذریعے وہ عرش کے نیچے سے لے کر زمین کے نیچے تک کی چیزوں کو جانتے ہیں۔ پھر

---

1. قرآن کریم، سورۂ واقعہ، آیات 7 سے 11۔
2. یہ روایت اور اس کے بعد آنے والی روایات بیان کرتی ہیں کہ روحُ القدس اسی گروہ میں ہے۔
3. کافی، کلینی، جلد 1، ص 271۔

فرمایا: اے جابر، یہ چار روحیں دو حالتوں سے دوچار ہوتی ہیں، سوائے روحُ القدس کے کہ وہ نہ لہو میں مبتلا ہوتی ہے اور نہ کھیل میں)[1]

مفضل بن عمر کہتے ہیں کہ میں نے امام صادق (ع) سے اس بارے میں سوال کیا کہ امام کو زمین کے مختلف علاقوں میں پیش آنے والے امور کا علم کیسے ہوتا ہے، جبکہ امام اپنے گھر میں پردے کے نیچے ہوتے ہیں۔آپ نے فرمایا: (اے مفضل! اللہ تعالیٰ نے نبی (ص) میں پانچ روحیں قرار دی تھیں: روح حیات، جس کے ذریعے وہ حرکت کرتے اور اوپر اٹھتا ہے؛ روح قوت، جس کے ذریعے وہ اٹھتے اور کوشش کرتے ہیں؛ روح شہوت، جس کے ذریعے وہ کھاتے، پیتے اور حلال عورتوں سے ازدواجی تعلق قائم کرتے ہیں؛ روح ایمان، جس کے ذریعے وہ ایمان لاتے اور عدل کرتے ہیں؛ اور روحُ القدس، جس کے ذریعے وہ نبوت کا بار اٹھاتے ہیں۔جب نبی (ص) کی روح قبض کی جاتی ہے تو روحُ القدس منتقل ہو کر امام کے پاس آ جاتی ہے۔ روحُ القدس نہ سوتی ہے، نہ غافل ہوتی ہے، نہ مشغول ہوتی ہے اور نہ تکبر کرتی ہے، جبکہ باقی چار روحیں سوتی ہیں، غافل ہوتی ہیں، تکبر کرتی ہیں اور مشغول ہو جاتی ہیں، اور روحُ القدس ان سب کو دیکھتی رہتی ہے)[2]

روح

اللہ سبحان و متعال نے جب پہلی بار لوگوں کو پیدا کیا تو وہ عالمِ ذر میں تھے، جو آسمان اول یا آسمانِ نفوس میں واقع تھا۔اس آسمان میں انسانی نفوس موجود تھیں اور ان کے ساتھ یہ تین روحیں (یعنی روح حیات، روح قوت اور روح شہوت) یا تین محرکات تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب دراصل نفسِ انسانی کے مراتب اور مقامات ہیں۔جب ہم نفسِ انسانی کو دیکھتے ہیں تو اسے ہی روح حیات، روح قوت اور روح شہوت کی صورت میں پاتے ہیں۔

مزید وضاحت کے لیے یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ روحیں دراصل نفسِ انسانی ہی کے نام ہیں، اس اعتبار سے کہ نفس انہی صفات کے ساتھ متصف ہوتی ہے، اور انسان کی نفس، چاہے وہ مؤمن ہو یا نہ ہو، ان تین روحوں کی حامل ہوتی ہے۔

---

[1] . کافی، کلینی، جلد 1، ص 272۔

[2] .کافی، کلینی، جلد 1، ص 272۔

لیکن روح ایمان اور روحُ القدس ایمان اور ایمان کے درجے کی بلندی سے وابستہ ہیں۔ عالمِ ذر میں جن لوگوں نے "ہاں" کہا یا نہیں کہا، سب کے پاس تینوں روحیں موجود تھیں۔ اور وہ لوگ جنہوں نے سچے قلبی ایمان کے ساتھ "ہاں" کہا، وہ اپنے مقام اور اپنے جواب کی رفتار کے مطابق درجوں میں تقسیم کیے گئے۔ ان میں سے بعض کے پاس صرف روح ایمان ہے اور بعض کے پاس روحُ القدس بھی ہے۔ جن کے پاس روحُ القدس ہے وہ بھی اپنے جواب میں سبقت کے اعتبار سے درجات میں تقسیم ہوئے، اور ہر ایک کے پاس اس کے مقام کے مطابق روحُ القدس کا ایک درجہ ہے۔ جو روحُ القدس عیسیٰ (ع) کے ساتھ ہے وہ اس روح سے مختلف ہے جو یونس (ع) کے ساتھ ہے، اور اسی طرح باقی سب کے مراتب بھی مختلف ہیں۔

محمد اور آلِ محمد علیہم السلام بھی روحُ القدسِ اعظم کے ساتھ ہیں، لیکن روحُ القدسِ اعظم بھی ایک ہی درجہ نہیں رکھتی۔ ان میں سے ہر ایک اپنے مقام کے مطابق روحُ القدسِ اعظم کا خاص درجہ رکھتا ہے۔

روح ایمان اور روحُ القدس

آسمانِ دنیا دو حصوں پر مشتمل ہے:

- آسمانِ جسمانی، جسے دوسرے آسمانوں کے مقابلے میں زمین کہا جاتا ہے۔
- آسمان اول دراصل جسمانی آسمان کا ہی ملکوت ہے، جو اس کے ساتھ براہِ راست تعلق رکھتا ہے اور اسی کے نظم و نسق کو سنبھالنے اور اسے جاری رکھنے کا تعلق رکھتا ہے۔

اس آسمان اول میں بہت سے مراتب ہیں، اور ہر انسان کی نفس اپنے مقام اور درجے کے مطابق وہاں موجود ہے۔ جس نفس کا وجود اس آسمان کے نچلے ترین مراتب میں ہو، اس کا حصہ صرف اسی قدر ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا کی جسمانی زندگی کے ظاہر کو سمجھ سکے۔

(يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ)[1]

(وہ دنیا کی زندگی کا صرف ظاہر جانتے ہیں اور وہ آخرت سے غافل ہیں).

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ روم، آیت 7۔

اور جو نفس اس آسمان کے بلند ترین درجے تک ارتقاء حاصل کر لیتی ہے، وہ دوسرے ملکوتی آسمان کی طرف صعود کے لیے تیار ہو جاتی ہے، اور یہ ملکوتی جنتوں میں سے پہلی جنت ہے۔ جس شخص کا اس میں حصہ ہو، وہ آخرت میں اہلِ جنت میں سے ہو گا۔

جب نفسِ انسانی ملکوتی دوسرے آسمان کے نچلے ترین درجے تک ارتقاء حاصل کر لیتی ہے تو وہ اس کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے اور روح ایمان کی حامل بن جاتی ہے۔ یعنی اس نفس کی حقیقت اس میں نورِ ایمان کے تجلی کرنے سے بدل جاتی ہے اور اس میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ ایسی نفس میں چار روحیں ہوتی ہیں: روح حیات، روح قوت، روح شہوت اور روح ایمان۔

روح ایمان کے بہت سے مراتب ہیں جو دوسرے آسمان کے آغاز سے لے کر چھٹے آسمان کے اختتام تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر مؤمن انسان اپنے عمل اور اخلاص کے مطابق ان آسمانوں میں اپنا مقام رکھتا ہے، اور روح ایمان ان آسمانوں میں اس کے ساتھ رہتی ہے۔

پھر جب نفس ساتویں آسمان کے نچلے ترین درجے تک ارتقاء حاصل کر لیتی ہے تو روحُ القدس اس کے ساتھ ہو جاتی ہے اور اس میں قرار پاتی ہے۔ اور جتنا زیادہ نفس بلند ہوتی جاتی ہے، اس کے ساتھ موجود روحُ القدس بھی اتنی ہی عظیم ہوتی جاتی ہے۔ یہ ساتواں آسمان آسمانِ عقل ہے۔ جس قدر اس آسمان تک پہنچنے والی نفس میں روحُ القدس عظیم ہو، اسی قدر اس کی عقل بلند اور برتر ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ میں نے کتاب «متشابہات» میں بیان کیا ہے، عقل کے نچلے ترین مراتب بھی اسی کلی ساتویں آسمان سے شروع ہوتے ہیں۔ اس سے نیچے کے مراتب میں، حتیٰ کہ چھٹے ملکوتی آسمان میں بھی، عقل کی صرف ایک سایہ موجود ہوتی ہے۔

اسی طرح نفس کے ارتقاء کے ساتھ اس کی حقیقت بدلتی اور تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ جب وہ دوسرے ملکوتی آسمان میں داخل ہوتی ہے تو روح ایمان اس کے ساتھ ہو جاتی ہے اور عقل کا سایہ نورِ عقل کی طرف متوجہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

اور جب نفس ساتویں آسمان میں داخل ہوتی ہے تو روحُ القدس اور عقل اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام میں سے کوئی بھی نبی مبعوث نہیں ہوتا مگر یہ کہ کلی ساتویں آسمان میں اس کا ایک مقام ہوتا ہے، اور اسی طرح وہ عقل جو عصمت کا سبب بنتی ہے کامل ہو جاتی ہے۔ نیز روحُ القدس بھی اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔

رسول اللہ (ص) نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں عقل سے بڑھ کر کوئی چیز تقسیم نہیں کی۔ عاقل کی نیند جاہل کی سحر خیزی سے بہتر ہے، اور عاقل کا گھر میں رہنا جاہل کے باہر نکلنے سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی نبی یا رسول کو مبعوث نہیں کرتا مگر یہ کہ اس کی عقل کامل کر دی جاتی ہے اور اس کی عقل اس کی امت کے تمام لوگوں کی عقلوں سے برتر ہوتی ہے۔ اور جو کچھ نبی (ص) کے باطن میں ہوتا ہے وہ کوشش کرنے والوں کی کوشش سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے اور جب تک بندہ اللہ تعالیٰ کے واجبات کے بارے میں تعقل نہ کرے، وہ انہیں ادا نہیں کرتا۔ اور تمام عبادت گزار اپنی عبادت کی فضیلت میں اس مقام تک نہیں پہنچے جو عاقل اور عقلا کو حاصل ہوا ہے۔ یہی لوگ صاحبانِ خرد ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ (اور نصیحت صرف اہلِ عقل ہی قبول کرتے ہیں)[1]

اصحابِ یمین اور مقربین

مؤمن انسان جب تک ملکوتی آسمانوں میں ہوتا ہے، وہ اصحابِ یمین میں شمار ہوتا ہے۔ اور جب وہ ساتویں آسمان تک ارتقاء حاصل کر لیتا ہے تو مقربین اور مقرب بندوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ سابقہ گفتگو سے واضح ہو چکا ہے کہ ملکوتی آسمانوں میں روح ایمان موجود ہوتی ہے، لیکن ساتویں آسمان میں روحُ القدس بھی ہے۔ لہٰذا روح ایمان اصحابِ یمین کے ساتھ اور ان میں ہوتی ہے، جبکہ روحُ القدس مقربین کے ساتھ اور ان میں ہوتی ہے۔

جب یہ بات سمجھ میں آ جائے تو ہمیں اس نتیجے کی علت بھی معلوم ہو جاتی ہے جو مقربین موت کے وقت حاصل کرتے ہیں؛ یعنی یہ کہ ان سے حساب نہیں لیا جاتا اور موت کے وقت بھی وہ عذاب میں مبتلا نہیں ہوتے، حالانکہ وہ ایسا دن ہوتا ہے جس میں کوئی شفاعت نہیں ہوتی۔

(وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ)[2]

(اور اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص کسی دوسرے کے کچھ کام نہ آئے گا، نہ اس کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا، نہ اسے کوئی شفاعت فائدہ دے گی، اور نہ ہی انہیں کوئی مدد پہنچے گی)۔

یہ معاملہ اس لیے ہے کہ وہ آسمانِ عقل میں داخل ہو چکے ہیں اور اہلِ عقل میں شمار ہو گئے ہیں، اور عقلِ کلی نے ان کے درجۂ ارتقاء کے مطابق انہیں خطا میں پڑنے سے محفوظ رکھا ہے۔[1] وہ آسمانِ روحُ القدس میں داخل ہو

---

[1] . کافی، کلینی، جلد 1، ص 12۔

[2] . قرآن کریم، سورۂ بقرہ، آیت 123۔

چکے ہیں اور ان کی ارواح مقدس اور پاکیزہ ہو گئی ہیں، البتہ جب تک وہ اس مقام پر باقی رہنے کو اختیار کیے رکھیں ۔ وہ معصوم جس کے بارے میں نص وارد ہوئی ہے، اس میں یہ فرق ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقام پر ثابت اور قائم رہتا ہے ، کیونکہ وہ کبھی بھی پاکی پر ناپاکی کو ترجیح نہیں دیتا۔ اسی بناپر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے جو اس کی پیروی کرتے ہیں، اس کے ہمیشہ حق پر قائم رہنے کی ضمانت دی ہے۔

لیکن اصحابِ یمین، اگرچہ روح ایمان ان کے ساتھ اور ان کے اندر ہوتی ہے، پھر بھی جب تک وہ ملکوتی آسمانوں میں ہیں اور کلی آسمانِ عقل یعنی ساتویں آسمان میں داخل نہیں ہوئے، ان کی عقلیں کامل نہیں ہوتیں۔ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ عقل کا سایہ ہے، اور جتنا ان کا مقام نیچا ہو گا اتنا ہی وہ عصمت سے دور اور خطا کے قریب ہوں گے۔ جتنا مؤمن کا ارتقاء زیادہ ہو گا اتنا ہی عقل کے سائے کا نور زیادہ ہو گا اور وہ عقلِ کامل سے زیادہ مشابہ ہو جائے گا، اور یہی چیز مؤمن کو عصمت کے قریب کرتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ عقل کی صورت اور عقلِ کامل کا ایک تجلی ہی رہتی ہے، اور معصیت کے وقوع کا امکان باقی رہتا ہے۔

احمد الحسن

---

[1] . ان میں سے ہر ایک اپنے اُس مقام کے مطابق معصوم ہے جس تک وہ پہنچا ہے، اور ہر شخص کی عصمت اس کے مقام سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر اس کا مقام اس کی عصمت سے بلند ہو جائے تو وہ یقیناً خطا میں پڑے گا اور معصیت کا ارتکاب کرے گا، جیسا کہ آدم (ع) کے ساتھ ہوا:

فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ (سورۂ طٰہٰ، آیت 121) (پھر دونوں نے اس میں سے کھایا تو ان کی شرمگاہیں ان پر ظاہر ہو گئیں اور وہ جنت کے پتے اپنے اوپر چپکانے لگے، اور (اسی طرح) آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو وہ راہ سے ہٹ گئے)؛ اور اسی طرح موسیٰ (ع) کے ساتھ بھی ایسا واقعہ پیش آیا، اور ان کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی تفصیلات بیان کی جا چکی ہیں۔

ملحقـــات

ملحقات

پہلا ملحقہ: زید بن علی (ع) کے بارے میں ایک وضاحت

جس روایت کا میں نے حوالہ دیا ہے، وہ بیان کرتی ہے کہ امام زین العابدین (ع) اور امام باقر (ع) نے زید کو امرِ خداوند کے بارے میں امید پر چھوڑ دیا تاکہ وہ اس کے حق میں شفاعت کر سکیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ زید بن علی اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے ہوں؛ کیونکہ زید اس حالت میں اور اپنے والد یا اپنے بھائی باقر (ع) کی زندگی میں وفات نہیں پائے تھے۔ بلکہ انہوں نے حق کو پہچانا، اس کا اقرار کیا، اسی کے لیے جہاد کیا اور اسی راہ میں شہادت پائی؛ اور یہ روشن روایت زید کی حق کے بارے میں معرفت، اپنے بھتیجے امام صادق (ع) کے زمانے میں، اور اس کے حق کے اقرار پر دلالت کرتی ہے:

معتب کہتے ہیں: (میرے مولا امام صادق (ع) کے دروازے پر دستک دی گئی تو میں باہر نکلا۔ وہ زید بن علی (ع) تھے۔ امام صادق (ع) نے وہاں بیٹھے ہوئے افراد سے فرمایا: اس کمرے میں داخل ہو جاؤ اور دروازہ بند کر دو اور تم میں سے کوئی ایک بھی بات نہ کرے۔ جب زید اندر آئے تو حضرت ان کے لیے کھڑے ہوئے، ان سے معانقہ کیا، اور کافی دیر تک بیٹھ کر باہمی مشورہ کرتے رہے۔ پھر ان دونوں کے درمیان گفتگو شدت اختیار کر گئی۔ زید نے عرض کیا: اے جعفر! اس بات کو چھوڑ دو۔ خدا کی قسم! اگر تم اپنا ہاتھ آگے نہ بڑھاؤ تاکہ میں تم سے بیعت کروں، یا تم میرے ہاتھ پر بیعت نہ کرو، تو میں یقیناً تمہیں تھکا دوں گا۔ اور وہ ذمہ داری تم پر ڈال دوں گا جس کی تم طاقت نہیں رکھتے۔ تم نے جہاد کو ترک کر دیا ہے اور ایک کونے میں سکون اختیار کر لیا ہے، اپنے اوپر پردہ ڈال لیا ہے اور مشرق و مغرب کا مال اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ صادق (ع) نے فرمایا: اے چچا! خدا تم پر رحم کرے۔ اے چچا! خدا تمہیں معاف فرمائے۔ اور زید یہ سن رہے تھے اور کہہ رہے تھے: ہمارا وعدہ صبح ہے۔ کیا صبح قریب نہیں؟ پھر وہ چلے گئے اور لوگ اس بارے میں باتیں کرنے لگے۔ امام صادق (ع) نے فرمایا: رک جاؤ۔ میرے چچا زید کے بارے میں صرف بھلائی کی بات کرو۔ اللہ تعالیٰ میرے چچا زید پر رحم فرمائے۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو ضرور وفا کرتے۔ جب سحر ہوئی تو دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ میں نے ان کے لیے دروازہ کھولا تو وہ روتے اور گریہ و زاری کرتے ہوئے اندر آئے اور عرض کرنے لگے: اے جعفر! مجھ پر رحم

کریں۔ اللہ آپ کو بخش دے۔ اے جعفر! مجھ سے راضی ہو جائیں، اللہ آپ سے راضی ہو۔ اے جعفر! مجھے معاف کر دیں، اللہ آپ کو معاف فرمائے۔ میں نے کہا: اللہ آپ کو بخش دے، آپ پر رحم فرمائے اور آپ سے راضی ہو۔ اے چچا! کیا خبر ہے؟ عرض کیا: میں سو گیا تھا اور میں نے رسول اللہ (ص) کو خواب میں دیکھا کہ وہ میرے پاس تشریف لائے، ان کے دائیں طرف حسن (ع) تھے، بائیں طرف حسین (ع) تھے، فاطمہ (س) ان کے پیچھے تھیں اور علی (ع) ان کے آگے تھے، اور ان کے ہاتھوں میں ایک ہتھیار تھا جو بہت بھڑک رہا تھا، گویا وہ آگ ہو۔ اور وہ فرما رہے تھے: اے زید! تم نے جعفر کو اذیت دے کر رسول اللہ (ص) کو اذیت دی ہے۔ خدا کی قسم! اگر وہ تم پر رحم نہ کریں اور تمہیں معاف نہ کریں اور تم سے راضی نہ ہوں تو میں اس ہتھیار سے تمہیں ماروں گا اور اسے تمہارے دونوں کندھوں کے درمیان گاڑ دوں گا، پھر اسے تمہارے سینے سے نکالوں گا۔ میں خوف اور دہشت کے عالم میں بیدار ہوا اور آپ کی طرف آیا ہوں۔ مجھ پر رحم کیجیے، اللہ آپ پر رحم کرے۔ میں نے کہا: اللہ تم سے راضی ہو اور تمہیں معاف فرمائے۔ مجھے وصیت کرو، کیونکہ تم قتل کیے جاؤ گے اور تمہیں آگ میں جلایا جائے گا۔ پس زید نے اپنے اہل و عیال، اپنی اولاد اور اپنے قرض کی ادائیگی کے بارے میں وصیت کی)[1]

زید بن علی ایک ایسے عالم تھے جن کے علم کا اعتراف مخالف و موافق سب کرتے ہیں، اور وہ اپنے بھتیجے کے ذریعے آزمائش اور امتحان میں ڈالے گئے، پس انہوں نے اس کی امامت کا اقرار کیا اور اس گھاٹی سے گزر گئے اور صادق (ع) کے بارے میں نہیں پھسلے؛ حالانکہ یہ امتحان ان کے لیے آسان نہ تھا۔ یہ زید (ع) کے لیے ایک بہت بڑی فضیلت ہے۔ اگر زید کا امتحان صرف اپنے بھائی باقر (ع) کے ساتھ ہوتا تو آسان تھا، اور اگر ان کا امتحان اپنے والد کے ساتھ ہوتا تو بھی آسان تھا؛ لیکن انہیں ایک بڑی گھاٹی کے ذریعے آزمایا گیا اور وہ اس سے گزر گئے۔ رسول اللہ (ص) اور علی (ع) نے زید کا ذکر فرمایا اور ان پر گریہ کیا، اور یہ ایک عظیم فضیلت ہے۔

شاید اس جلیل القدر عالم، زید بن علی (ع)، کی فضیلت میں ائمہ (ع) کے اقوال نقل کرنا ضروری ہو تاکہ کوئی بھی زید (ع) کے بارے میں بدگمانی نہ کرے:

---

[1] . مناقب آل ابی طالب ابن شہر آشوب، جلد 3، ص 352؛ مدینۃ المعاجز، جلد 6، صفحات 103 تا 105؛ بحار الانوار، جلد 47، ص 128۔

عیص بن قاسم کہتے ہیں: میں نے امام صادق (ع) کو فرماتے ہوئے سنا: (تم پر لازم ہے کہ اللہ واحد کی تقویٰ اختیار کرو، جس کا کوئی شریک نہیں۔ اپنے حال پر غور کرو۔ خدا کی قسم! جب کسی کے پاس کچھ بھیڑیں ہوں اور وہ ان کے لیے ایک چرواہا مقرر کرے، پھر وہ کسی ایسے شخص کو پائے جو موجودہ چرواہے سے اس کی بھیڑوں کے بارے میں زیادہ جاننے والا ہو، تو وہ اس چرواہے کو ہٹا دیتا ہے اور اس شخص کو لے آتا ہے جو پہلے والے کی نسبت ان بھیڑوں کے بارے میں زیادہ علم رکھتا ہو۔ خدا کی قسم! اگر تم میں سے کسی کے لیے دو جانیں ہوتیں کہ ایک کے ذریعے تجربہ حاصل کرے اور مر جائے، پھر اس کے پاس دوسری جان ہو اور وہ ان امور کے مطابق عمل کرے جو اس پر واضح ہو چکے ہوں، تو یہ بہت اچھا ہوتا؛ لیکن اس کے پاس تو صرف ایک ہی جان ہے۔ اگر وہ بھی چلی جائے۔ خدا کی قسم! توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ تم زیادہ حق دار ہو کہ جب ہماری طرف سے کوئی شخص آئے تو اپنے لیے خود انتخاب کرو۔ غور کرو کہ تم کس کے لیے خروج کرتے ہو اور یہ نہ کہو کہ زید نے خروج کیا تھا۔ زید ایک عالم اور سچے انسان تھے اور انہوں نے تمہیں اپنی طرف دعوت نہیں دی تھی، بلکہ تمہیں آلِ محمد (ص) کی رضا کی طرف بلاتے تھے۔ اور اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو جس چیز کی طرف تمہیں دعوت دی تھی، اس پر وفا کرتے۔ انہوں نے سلطنتِ معاشرہ کے خلاف خروج کیا تھا تاکہ اسے ختم کریں۔ آج اگر ہماری طرف سے کوئی شخص کسی امر کے لیے خروج کرے اور تمہیں آلِ محمد (ص) کی رضا کی طرف بلائے تو ہم گواہی دیتے ہیں کہ ہم اس پر راضی نہیں ہیں، اور وہ آج ہماری نافرمانی کر رہا ہے اور کوئی اس کی مدد نہیں کرے گا۔ جبکہ جب جھنڈے اور پرچم بلند ہوں گے تو وہ زیادہ حق دار ہے کہ ہم سے کچھ نہ سنے، سوائے اس شخص کے جس کے ساتھ اولادِ فاطمہ جمع ہو جائے۔ خدا کی قسم! تمہارا صاحب وہی ہے جس پر سب جمع ہوں۔ جب رجب کا مہینہ آئے تو اللہ کے نام پر متوجہ ہو جاؤ، اور اگر چاہو تو شعبان تک مؤخر کر دو، اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور اگر چاہو کہ اپنے گھر والوں کے درمیان روزہ رکھو تو شاید یہ تمہارے لیے زیادہ قوت کا سبب ہو۔ اور سفیانی تمہارے لیے بطور علامت و نشانی کافی ہے)[1]

ابن ابی عبدون اپنے والد سے نقل کرتے ہیں: جب زید بن موسیٰ بن جعفر کو مأمون کے پاس لایا گیا، اور اس نے بصرہ میں خروج کیا تھا اور بنی عباس کی اولاد کے گھروں کو آگ لگا دی تھی، تو مأمون نے اس کا جرم اس کے بھائی علی بن موسیٰ الرضا (ع) کی وجہ سے معاف کر دیا اور ان سے کہا: اے ابوالحسن! اگر تمہارے بھائی نے

---

[1] .کافی، کلینی، جلد 8، ص 264۔

خروج کیا ہے اور اس نے کچھ کام انجام دیے ہیں تو اس سے پہلے زید بن علی نے بھی خروج کیا تھا اور قتل کر دیے گئے تھے۔ اگر تمہارا مقام میرے نزدیک نہ ہوتا تو میں ضرور اسے قتل کر دیتا؛ کیونکہ جو کام اس نے کیا ہے وہ معمولی نہیں۔ امام رضا (ع) نے فرمایا۔ اے امیر المؤمنین! میرے بھائی زید کا موازنہ زید بن علی سے نہ کریں۔ وہ آلِ محمد کے علماء میں سے تھے، جو اللہ عزوجل کے لیے غضبناک ہوئے اور اس کے دشمنوں سے جنگ کی، یہاں تک کہ اسی کی راہ میں قتل کر دیے گئے۔ اور میرے والد موسیٰ بن جعفر (ع) نے مجھ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے اپنے والد جعفر بن محمد بن علی (ع) سے سنا، وہ فرماتے تھے: اللہ میرے چچا زید پر رحم کرے۔ وہ آلِ محمد (ص) کی رضا کی طرف دعوت دیتے تھے، اور اگر کامیاب ہو جاتے تو جس چیز کی طرف تمہیں دعوت دیتے تھے، اس پر وفا کرتے۔ انہوں نے اپنے خروج کے بارے میں مجھ سے مشورہ کیا تھا، تو میں نے ان سے کہا: اے چچا! اگر تم اس پر راضی ہو کہ قتل کیے جاؤ اور کُناسہ میں سولی پر لٹکائے جاؤ تو یہ تمہارا انتخاب ہے۔ جب انہوں نے قیام کیا تو جعفر بن محمد (ع) نے فرمایا: ہلاکت ہے اس کے لیے جو اس کی آواز سنے اور اس کا جواب نہ دے۔ مأمون نے کہا: اے ابوالحسن! کیا اس شخص کے بارے میں یہ بات نہیں آئی جو ناحق امامت کا دعویٰ کرے؟ امام رضا (ع) نے فرمایا: زید بن علی نے کسی ایسی چیز کا دعویٰ نہیں کیا جو ان کا حق نہ ہو، اور وہ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے: میں تمہیں آلِ محمد (ص) کی رضا کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ یہ بات اس شخص کے بارے میں آئی ہے جو یہ دعویٰ کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر نص فرمائی ہے، پھر وہ دینِ خدا کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف دعوت دے اور بغیر علم کے اس کے راستے سے گمراہ ہو جائے۔ خدا کی قسم! زید ان لوگوں میں سے ہیں جو اس آیت کے مخاطب ہیں: وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ (اور اللہ کی راہ میں ایسا جہاد کرو جیسا کہ اس کے لیے جہاد کرنے کا حق ہے، اسی نے تمہیں برگزیدہ کیا ہے)[1]

عبداللہ بن سیابہ کہتے ہیں: (ہم سات افراد تھے، ہم باہر نکلے اور جب ہم مدینہ پہنچے اور ابو عبداللہ صادق (ع) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ (ع) نے ہم سے فرمایا: کیا تمہارے پاس میرے چچا زید کی کوئی خبر ہے؟ ہم نے عرض کیا: انہوں نے خروج کیا ہے، یا وہ خروج کی تیاری میں ہیں۔ آپ (ع) نے فرمایا: جب تمہیں کوئی خبر ملے تو مجھے بھی آگاہ کرنا۔ چند دن ہم نے انتظار کیا، پھر سام صیرفی کا قاصد ان کا خط لے کر آیا: (اس میں لکھا تھا:) امابعد، زید بن علی (ع) نے بدھ کے دن، ماہِ صفر کی ابتدا میں خروج کیا، اور بدھ اور جمعرات تک قائم رہے، اور

---

[1] . عیون اخبار الرضا، جلد 2، ص 225۔

جمعہ کے دن قتل کر دیے گئے، اور فلاں اور فلاں بھی ان کے ساتھ قتل ہوئے۔ پھر ہم صادق (ع) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہ تحریر آپ کو دی۔ انہوں نے اسے پڑھا اور رو پڑے پھر فرمایا: «إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيهِ رَاجِعُونَ» (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں)۔ میں اپنے چچا کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ کتنے اچھے چچا تھے۔ میرے چچا ایسے شخص تھے جو ہماری دنیا اور ہماری آخرت کے لیے گزر گئے۔ خدا کی قسم! میرے چچا ایسے شہید ہیں جیسے وہ شہداء جو رسول اللہ (ص) اور علی اور حسن اور حسین صلوات اللہ علیہم کے ساتھ شہید ہوئے)[1]

دوسرا ملحقہ: خداوند کے خلیفہ کی صفات کے بارے میں بعض باطل عقائد کے فساد کا بیان

افسوس کہ اس زمانے میں کچھ نادان افراد موجود ہیں جو منبروں پر بیٹھ کر لوگوں کو دھوکا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں اور کسی ایک روایت یا ان روایات کی بنیاد پر جو جھوٹ کے ساتھ آلِ محمد (ص) کی طرف منسوب کی گئی ہیں، یا بعض روایات کے بارے میں اپنی بیمار فہم کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ حجت یا زمین میں خداوند کا خلیفہ یا نبی یا امام ایسی معجزہ نما خصوصیات رکھتا ہے جن کے ساتھ وہ ہمیشہ متصف ہوتا ہے۔ یہ ایسی خصوصیات ہیں جو ہر وقت اور ہر حال میں اس کے ساتھ رہتی ہیں، اور اسی طرح سے پہچانا جاتا ہے کہ وہ خداوند کی حجت ہے۔

اسی طرح وہ لوگوں کو اس دعوے کے ذریعے گمراہ کرتے ہیں کہ یہی دائمی خصوصیات امام کی پہچان ہیں اور انہی کے ذریعے وہ پہچانا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں وہ ان خصوصیات کو صرف چن کر ہی لوگوں کے سامنے بیان کر سکتے ہیں، کیونکہ ان میں سے بعض خصوصیات ایسی ہیں جو لوگوں میں نفرت پیدا کرتی ہیں اور کوئی انہیں قبول نہیں کرتا۔[2] اسی وجہ سے وہ صرف انہی صفات کو بیان کرتے ہیں جن کی کوئی تاویل کی جا سکتی ہو، اور باقی کو چھوڑ دیتے ہیں۔

---

1. عیون اخبار الرضا، جلد 2، ص 228۔

2. مثال کے طور پر یہ روایت نقل کی گئی ہے: (ہم اوصیاء کا خاندان پیٹوں میں حمل نہیں ٹھہرتا بلکہ سینوں میں حمل ٹھہرتا ہے، ہم رحم سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ اپنی ماں کی دائیں ران سے باہر آتے ہیں)۔ ان بے خرد لوگوں کے طریقے کے مطابق لازم ہے کہ وہ اس متن پر لفظ بہ لفظ ایمان رکھیں، حالانکہ خود انہی حضرات (ع) سے ایسی روایات اور دعائیں وارد ہوئی ہیں جو اس دعوے کے بطلان کو ثابت کرتی ہیں۔ مثلاً: (أَشْهَدُ أَنَّكَ كُنْتَ نُوراً فِي الْأَصْلَابِ الشَّامِخَةِ وَالْأَرْحَامِ الْمُطَهَّرَةِ لَمْ تُنَجِّسْكَ الْجَاهِلِيَّةُ بِأَنْجَاسِهَا) (میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ بلند و برتر صلبوں اور پاکیزہ رحموں میں نور تھے، اور جاہلیت نے آپ کو اپنی نجاستوں کے ذریعے ناپاک اور آلودہ نہیں کیا)۔

ان امور میں سے جنہیں وہ امام یا خداوند کے خلیفہ کی دائمی صفات میں شمار کرتے ہیں یہ ہے کہ خدا کے خلیفہ یا امام سے وہ فضلات خارج نہیں ہوتے جو باقی انسانوں سے خارج ہوتے ہیں، اس کا سایہ نہیں ہوتا، اس کے قدموں کے نشان پتھر پر باقی رہتے ہیں لیکن نرم مٹی پر باقی نہیں رہتے، اور درندے اس کا گوشت نہیں کھاتے!

یہاں میں تاکید کرتا ہوں کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ صفات امام کی دائمی خصوصیات ہیں جو ہمیشہ اور مسلسل ظاہر ہوتی رہتی ہیں، نہ کہ کوئی عارضی معجزہ جو کبھی کسی حجتِ الٰہی کے لیے ظاہر ہو اور کسی دوسرے وقت کسی اور حجت کے لیے ظاہر نہ ہو، جیسے کہ موسیٰ (ع) کا عصا سانپ بن گیا تھا۔

جیسا کہ واضح ہے، یہ مسئلہ ان کے لیے شبہ اور غلط فہمی کا باعث بن گیا ہے، اسی لیے اس کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ اس بارے میں سب سے اہم بات جس پر توجہ دینا ضروری ہے یہ ہے کہ اسلامی عقیدے کی اصل اور بنیاد قرآن ہے، اور روایات کو قرآن پر پیش کیا جاتا ہے۔ جب روایات کا ظاہر یا ان کی روایات کے بارے میں ان کی فہم نصِّ قرآنی کے خلاف ہو تو یا تو وہ روایات آلِ محمد (ص) کی طرف سے صادر نہیں ہوئیں - جیسا کہ انہوں نے تصریح فرمائی ہے کہ جو کچھ قرآن کے خلاف ہو وہ انہوں نے بیان نہیں کیا اور وہ ان کی طرف جھوٹ کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے- یا پھر وہ ایسی روایات ہیں جن کا ظاہری معنی مراد نہیں ہوتا بلکہ ان کی ایسی تاویل ہوتی ہے جو قرآن کے موافق ہو۔

ہم پہلے ان دائمی خصوصیات کو، جن کا وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہی کے ذریعے خداوند کا خلیفہ پہچانا جاتا ہے، حکمت اور اس حقیقت پر پیش کرتے ہیں جسے ان لاکھوں لوگوں نے جانا اور دیکھا جو خدا کے خلفاء کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے، تاکہ یہ دیکھا جائے کہ آیا ان کی فہم کے مطابق ان صفات کو دائرۂ حکمت میں شمار کیا جا سکتا ہے، اور کیا عملی طور پر یہ واقعی وہ صفات ہیں جو خدا کے خلفاء ہمیشہ رکھتے تھے اور جنہیں انہوں نے لاکھوں لوگوں کے سامنے ظاہر کیا اور لوگوں نے انہیں نسل در نسل نقل کیا؟ پھر ہم انہیں قرآن پر پیش کرتے ہیں:

معصوم کا سایہ نہیں ہوتا

اگر صرف خلیفۂ خدا کا جسم زمین پر سایہ نہ رکھتا ہو اور اس کے لباس سایہ رکھتے ہوں تو وہ بات جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں، یعنی یہ کہ امام کا سایہ نہیں ہوتا، ثابت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ صرف جسمِ امام کا سایہ نہ ہونا کسی فائدے کا نہیں۔ امام اپنے لباسوں کے ساتھ لوگوں کے سامنے چلتے پھرتے ہیں، اور اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ ان کے لباس بھی بے سایہ ہوں۔

اسی طرح یہ بھی کافی نہیں کہ ایک مرتبہ معصوم کے لباس بے سایہ ہوں، بلکہ امام جو بھی لباس پہنیں، سب میں یہ صفت پائی جانی چاہیے۔ یعنی جب بھی وہ اپنے لباس تبدیل کریں تو جو نئے لباس پہنیں وہ بھی سایہ نہ رکھتے ہوں۔

اسی طرح اس بات پر بھی توجہ کرنا ضروری ہے کہ ان کے نظریے کے مطابق چونکہ امام کے لباس مکمل طور پر بے سایہ ہیں، لہٰذا جب انہیں دھو کر سورج کی روشنی میں رکھا جائے تو اس وقت بھی وہ بے سایہ ہی ہونے چاہئیں، یا پھر کوئی نیا معجزہ رونما ہو اور ان سے "سایہ نہ ہونے" کی صفت سلب کر لی جائے۔ اس طرح ہمیں ایسے معجزات کی ضرورت پیش آتی ہے جو تعداد کے اعتبار سے لا محدود ہوں۔

اسی طرح اگر امام یہ لباس کسی دوسرے شخص کو ہبہ کر دیں یا امانت کے طور پر دے دیں تو انہیں سایہ دار ہو جانا چاہیے، اور یہ بات بھی اس امر کی محتاج ہے کہ "سایہ نہ ہونے" کی صفت ختم کرنے کے لیے ایک نیا معجزہ ظاہر ہو۔

اسی طرح معصوم کا عمامہ بھی بے سایہ ہونا چاہیے اور اس میں کوئی استثنا نہیں ہونا چاہیے، ورنہ وہ سایہ دار ہو گا اور ان کے عمامے کا سایہ ظاہر ہو جائے گا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، عرب عمامہ محض زینت کے لیے نہیں پہنتا، بلکہ اسے اس لیے پہنتا ہے کہ وہ صحرا کی مہلک گرمی سے بچاؤ کا ذریعہ بنے، خصوصاً گرمیوں میں۔ اگر عمامہ بے سایہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سورج کی شعاعیں اس میں سے گزر رہی ہیں، اور نتیجتاً جب ائمہ گرمیوں میں حجاز اور عراق کی جھلسا دینے والی دھوپ میں باہر نکلتے تھے تو اس دعوے کے مطابق کہ ان کا عمامہ بے سایہ تھا، عمامہ ان کے لیے کسی فائدے کا حامل نہ ہوتا۔ یعنی اگر وہ کچھ دیر سورج کی روشنی میں چلتے تو شعاعیں ان کے عمامے سے گزر کر شدید حرارت کے ساتھ ائمہ (ع) کو اذیت پہنچاتیں، جس کا اثر موت تک پہنچ سکتا تھا۔ جیسا کہ حسین (ع) حجاز سے عراق کی طرف روانہ ہوئے، لہٰذا اس نظریے کے مطابق ایک اور معجزے کی ضرورت پیش آتی ہے جو انہیں سورج کی اذیت اور اس کے نتیجے میں موت سے محفوظ رکھے۔

معصوم کے قدموں کے نشانات پتھر پر باقی رہ جاتے ہیں

وہ کہتے ہیں : خلیفۂ خدا کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا قدم ریت پر اثر نہیں چھوڑتا لیکن پتھر پر اثر چھوڑتا ہے۔ چونکہ ائمہ ہمیشہ ننگے پاؤں نہیں چلتے تھے، لہٰذا یہ کافی نہیں کہ یہی بات ان کی دائمی معجزاتی صفت ہو جس کے ذریعے لوگ انہیں پہچانیں۔ بلکہ یہ بھی کہنا پڑے گا کہ امام کے جوتے بھی نرم زمین پر کوئی اثر نہ چھوڑیں اور پتھر

پر اثر چھوڑیں۔ اس طرح یہ صفت سڑکوں کو بھی شامل ہو جائے گی۔ پھر اگر یہ بات، جیسا کہ وہ کہتے ہیں، امام کی دائمی اور ہمیشگی خصوصیت ہو تو یہ لوگوں کے گھروں اور عام مقامات کو بھی شامل کرے گی، جیسے وہ مساجد جن میں خلیفۂ خدا داخل ہوتا ہے اور جن کی زمین پتھر سے فرش کی ہوئی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب بھی امام کسی گھر میں داخل ہوں تو اپنے قدموں کے پتھروں پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے زمین کو خراب کر دیں، اور گھر والے اپنے گھر کی زمین کی مرمت پر مجبور ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ امام کو ان کے گھر کو نقصان پہنچانے کے بدلے اس کا خرچ ادا کرنا چاہیے، یا ممکن ہے اس نادر نظریے کے قائلین یہ کہیں کہ لوگوں کے گھروں کی وہ زمینیں جو پتھر سے ڈھکی ہوئی ہیں، اس خصوصیت سے مستثنیٰ ہیں جس سے امام کو متصف کیا جاتا ہے۔ یعنی معجزہ برعکس صورت میں واقع ہوتا ہے اور امام کی دائمی صفت بدل جاتی ہے، اور ان کے قدم لوگوں کے گھروں کے پتھروں پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

بہت سے ایسے امور پیش کیے جا سکتے ہیں جو ان لوگوں کی جہالت، بے خردی اور سادہ لوحی کو رسوا کر دیں جو اللہ سبحان کے دین کے بارے میں ان باطل اور گمراہ کن عقائد کے قائل ہیں۔ ایسے عقائد جو قرآن، حکمت اور عقل کے خلاف ہیں۔

وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ خصوصیات، حجتِ الٰہی کے عمل اور اخلاص کے ذریعے ارتقاء سے پہلے ہی ان کے ساتھ ہوتی ہیں اور یہ معجزاتی صفات ہمیشہ ان کے ساتھ وابستہ رہتی ہیں، یعنی حتیٰ کہ ان کی بعثت سے پہلے بھی۔ اگر وہ یہ کہیں کہ نہیں، تو انہوں نے اپنے دعوے کی خود تردید کر دی اور بات ختم ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ عارضی معجزہ بھی دوسرے معجزات کی طرح ہے جو کبھی ظاہر ہوتا ہے اور کبھی ظاہر نہیں ہوتا، اور یہ ان جسمانی صفات کی طرح نہیں ہے جو ان کے دعوے کے مطابق ہر حال اور ہر زمانے میں حجتوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ لہٰذا ان کے عقیدے کے مطابق یہ خصوصیت ان صفات میں سے ہے جو عالمِ جسمانی میں نزول کے بعد اور بدن کے پردے میں آنے کے ساتھ ہی، اس دنیا میں حجتوں کے امتحان سے پہلے اور ان کے اخلاص کے ثابت ہونے اور اس مقام تک ارتقاء سے قبل جو انہیں رسالت اور زمین میں خلافتِ الٰہی کے لیے آمادہ کرتا ہے، ان کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو پھر یہ حجتیں کس طرح آزمائی جاتی ہیں؟ جبکہ یہ لوگ ان دائمی معجزاتی نشانیوں کے ساتھ بغیر امتحان کے ہی برتری دیے گئے ہیں!

اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کو عدمِ عدالت کا موردِ الزام ٹھہراتے ہیں، کیونکہ جس خلیفہ کے ساتھ معجزات ہمراہ ہوں، اسے ابتدا ہی میں اجر و ثواب عطا کر دیا گیا ہے۔ وہ اس مؤمن کی طرح کیوں امتحان میں نہیں ڈالا جاتا جو خواہشات کے ذریعے آزمائش میں مبتلا ہوتا ہے اور آغاز میں اس کے ساتھ کوئی معجزہ نہیں ہوتا؟ خلیفۂ خدا کو اس مؤمن پر بغیر امتحان کے برتری کیوں حاصل ہے؟ پھر اللہ تعالیٰ کی عدالت کہاں رہی؟ اگر کوئی شخص امتحان میں اس حال میں داخل ہو کہ اس کے پاس سوالات کے جوابات پہلے سے موجود ہوں، جبکہ دوسرے لوگ خالی ہاتھ امتحان میں آئیں اور انہیں صرف سوالات دیے جائیں اور وہ خود جوابات تلاش کرنے پر مجبور ہوں، تو پھر امتحان میں ان کے درمیان انصاف کیسے قائم ہوگا؟

مصیبت یہ ہے کہ ان بے خردوں کے عقیدے کے مطابق وہ شخص جو جوابات اپنے ساتھ لے کر امتحان میں داخل ہوتا ہے، اس بے چارے شخص سے زیادہ اجر حاصل کرتا ہے جس پر ظلم ہوا اور جسے جوابات فراہم نہیں کیے گئے۔

درندے زمین میں خلیفۂ خدا کے جسد کو نہیں کھاتے

"اور اس لوٹ مار کی داستان کو، جو اپنے مقام پر انجام پائی، چھوڑ دو"[1] ... اور اس مصیبت کی طرف آؤ کہ یہ نادان لوگ امام حسین (ع) کی امامت کو مٹا رہے ہیں اور ان لوگوں کو جو حسین (ع) پر ایمان نہیں رکھتے، یہ عذر فراہم کرتے ہیں کہ وہ یہ کہیں: حسین اللہ تعالیٰ کے خلفاء میں سے نہیں ہیں اور امامِ معصوم نہیں ہیں؛ اس سبب کہ ان میں وہ صفت موجود نہیں جو اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کو زمین میں حاصل ہوتی ہے۔

گھوڑوں نے حسین (ع) کے سینے کو روند ڈالا؛ حالانکہ گھوڑا ایک پالتو جانور ہے۔ لہٰذا زیادہ مناسب تھا کہ درندے اس کے جسم سے کھاتے۔ حسین (ع) کے دشمنوں کا بھی ارادہ یہی تھا کہ وہ یہ کام انجام دیں۔ یہ کہ ان کے جسدِ مبارک کو گھوڑوں سے پامال کرایا جائے تاکہ ان بے وقوف لوگوں کے لیے، جو ان کی پیروی کرتے ہیں، یہ ظاہر کریں کہ حسین اللہ تعالیٰ کے خلفاء میں سے نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی حرمت نہیں رکھتے۔ اگر ان کی کوئی حرمت ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس بات سے روک دیتا کہ گھوڑے ان کے سینے اور جسدِ مبارک

---

[1]. نہج البلاغہ کی خطبہ 162 کا ایک فقرہ، اس بات کی کنایت ہے کہ خلافت کے غصب کی داستان گزر چکی۔ آج کے معاویہ کے ساتھ پیش آنے والے مسائل کو سمجھو۔ (مترجم)

کو روند ڈالیں۔ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کے انکار کے لیے ان کا قاعدہ وہی ہے جو ان بے خرد لوگوں کا ہے جو اس فاسد اور گمراہ عقیدے کے قائل ہیں۔

روایت میں واضح طور پر نقل ہوا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ بیابان کے درندے ان کے جسد سے کھائیں گے۔

حسین (ع) نے فرمایا:

(گویا میں نواویس اور کربلا کے میدانوں کے حریص بھیڑیوں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ میرے جسم کے جوڑ جوڑ کو چیر رہے ہیں اور اپنے خالی پیٹوں اور خالی مشکیزوں کو اس سے بھر رہے ہیں۔ جو کچھ قلم تقدیرِ الٰہی سے لکھا جا چکا ہے، اس سے کوئی فرار نہیں)۔

زینب بنت علی (ع) نے بھی فرمایا:

(... یہ ہاتھ ہمارے خون سے آلودہ ہیں اور یہ منہ ہمارے گوشت کو کھانے کے لیے رال ٹپکا رہے ہیں؛ اور بیابان کے درندے ان پاک و پاکیزہ بدنوں میں سے اپنا حصہ لے جائیں گے۔...)۔

کیا وہ ان روایات کی تاویل کا سہارا لیتے ہیں تاکہ اس تنگی سے نکل سکیں جس میں انہوں نے خود کو ڈال دیا ہے؟

اور اگر وہ روایات کی تاویل کریں تو کیا وہ مخالف، جو حسین (ع) کی امامت پر طعن کرنا چاہتا ہے، اس تاویل کو قبول کرے گا یا اس کا کلام حجت ہے؟ اس لیے کہ روایات کا ظاہر حجت ہے۔ اور کیا وہ کہیں گے کہ عقائد ان روایات سے اخذ نہیں کیے جاتے؟ جواب میں ان سے کہا جائے گا: پھر تم اس سے کیوں لیتے ہو اور اس سے کیوں نہیں لیتے؟!!

حقیقت میں یہ عقائد نہ صرف ان پر ایمان رکھنے والوں کی عقلوں کے خالی ہونے کو آشکار کرتے ہیں بلکہ ان کے قرآن اور اللہ تعالیٰ سبحان و متعال کی عدالت پر عدمِ ایمان کی بھی خبر دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حجج یا خلفاء، قرآن میں ایسے بشر ہیں جو جسمانی انسانی صفات میں دوسروں کے ساتھ شریک ہیں اور قرآن کے مطابق ان کے پاس کوئی مخصوص اور امتیازی صفات نہیں ہیں:

(قُلْ إِنَّما أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يوحَى إِلَى أَنَّما إِلهُكُمْ إِلَهٌ واحِدٌ فَمَنْ كَانَ يرْجُوا لِقاءَ رَبِّهِ فَلْيعْمَلْ عَمَلاً صالِحاً وَ لا يشْرِكْ بِعِبادَةِ رَبِّهِ أَحَداً)[1]

---

[1] . قرآن کریم، سورۂ کہف، آیت 110۔

(کہہ دیجئے: میں تو تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے۔ لہٰذا جو اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے)۔

لہٰذا ایک عاقل شخص کے لیے کیسے درست ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے باطل اور گمراہ عقائد کی بنیاد رکھے جو قرآن، حکمت، منطق اور عدلِ الٰہی کے خلاف ہوں؟ یہ عقائد حتیٰ کہ آلِ محمد (ع) کی ان روایات کے بھی مخالف ہیں جو قرآن کے موافق ہیں۔

صدوق امام رضا (ع) سے روایت کرتے ہیں: (امام روح القدس کی تائید سے مؤید ہوتا ہے اور اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان نور کا ایک ستون ہوتا ہے جس میں وہ بندوں کے اعمال کو دیکھتا ہے۔ اور جب بھی ہدایت کے لیے اسے اس کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اس سے آگاہ کر دیا جاتا ہے اور وہ اس کے لیے وسیع کر دیا جاتا ہے، لہٰذا وہ جان لیتا ہے؛ اور جب وہ اس سے لے لیا جاتا ہے تو وہ نہیں جانتا۔ امام پیدا ہوتا ہے اور اولاد رکھتا ہے اور تندرست رہتا ہے اور بیمار بھی ہوتا ہے اور کھاتا ہے اور پیتا ہے اور پیشاب اور پاخانہ کرتا ہے اور نکاح کرتا ہے اور سوتا ہے اور بھولتا ہے اور سہو اور غلطی کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے اور غمگیں ہوتا ہے اور ہنستا ہے اور روتا ہے اور زندہ کیا جاتا ہے اور وفات پاتا ہے اور قبر میں داخل کیا جاتا ہے اور اس کی زیارت کی جاتی ہے اور محشور کیا جاتا ہے اور کھڑا کیا جاتا ہے اور اس پر (اعمال) پیش کیے جاتے ہیں اور اس سے سوال کیا جاتا ہے اور اسے اجر دیا جاتا ہے اور اسے عزت بخشی جاتی ہے اور وہ شفاعت کرتا ہے؛ اور اس کی نشانی دو خصوصیات میں ہے: علم میں اور مستجاب الدعوہ ہونے میں)۔[1]

میں ہر اس شخص کو جو حقیقت کی تلاش میں ہے یہ نصیحت کرتا ہوں کہ وہ قرآنِ کریم میں غور و فکر کرے:

(أَلَمْ يأْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذينَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَ عادٍ وَ ثَمُودَ وَ الَّذينَ مِنْ بَعْدِهِمْ لا يعْلَمُهُمْ إِلاَّ اللَّهُ جاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَينناتِ فَرَدُّوا أَيدِيهُمْ فى أَفْواهِهِمْ وَ قالُوا إِنَّا كَفَرْنا بِما أُرْسِلْتُمْ بِهِ وَ إِنَّا لَفى شَكٍّ مِمَّا تَدْعُونَنا إِلَيهِ مُريبٍ * قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَ فِى اللَّهِ شَكٌّ فاطِرِ السَّماواتِ وَ الْأَرْضِ يدْعُوكُمْ لِيغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَ يؤَخِّرَكُمْ إِلى أَجَلٍ مُسَمًّى قالُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلاَّ بَشَرٌ مِثْلُنا تُريدُونَ أَنْ تَصُدُّونا عَمَّا كانَ يعْبُدُ آباؤُنا فَأْتُونا بِسُلْطانٍ مُبِينٍ *

---

[1]. عیون اخبار الرضا، صدوق، جلد 1، ص 193۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلاَّ بَشَرٌ مِثْلُكُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يمُنُّ عَلَى مَنْ يشاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَ مَا كَانَ لَنا أَنْ نَأْتِيكُمْ بِسُلْطانٍ إِلاَّ بِإِذْنِ اللَّهِ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ)[1]

(کیا تمہیں ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، نوح کی قوم اور عاد اور ثمود اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئے، جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا؟ ان کے پاس ان کے رسول کھلی نشانیاں لے کر آئے تو انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں ڈال لیے اور کہا: ہم اس کا انکار کرتے ہیں جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو اور جس چیز کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو اس میں ہم سخت شک میں ہیں۔ ان کے رسولوں نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟ وہ تمہیں بلاتا ہے تاکہ تمہارے بعض گناہوں کو تمہارے لیے بخش دے اور تمہیں ایک مقررہ مدت تک مہلت دے۔ انہوں نے کہا: تم تو ہمارے ہی جیسے بشر ہو، تم چاہتے ہو کہ ہمیں اس سے روک دو جس کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے، لہٰذا ہمارے پاس کوئی کھلی دلیل لے آؤ۔ ان کے رسولوں نے ان سے کہا: ہم تو تمہارے ہی جیسے بشر ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان فرماتا ہے، اور ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم تمہارے پاس کوئی دلیل لائیں مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے، اور ایمان والوں کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسا کریں)۔

جو لوگ زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلفاء (انبیاء، اوصیاء، رسولوں اور ائمہ) کے سامنے آتے تھے، وہ اللہ تعالیٰ کے خلفاء سے کہتے تھے: تم تو بس ہماری ہی طرح ایک بشر ہو، تمہارا سایہ ہے، تمہارے قدم پتھر پر کوئی اثر نہیں چھوڑتے اور تمہارے اندر کوئی ایسی ظاہری خصوصیت نہیں جو تمہیں ظاہری اعتبار سے ہم سے ممتاز کرے۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو تو ہمارے پاس غیر معمولی خصوصیات کے ساتھ آؤ، یعنی بغیر سائے کے آؤ اور تمہارے قدم پتھر پر نشان چھوڑیں۔ قَالُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلاَّ بَشَرٌ مِثْلُنا تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونا عَمَّا كانَ يعْبُدُ آباؤُنا فَأْتُونا بِسُلْطانٍ مُبِينٍ۔

(انہوں نے کہا: تم تو بس ہماری ہی طرح ایک بشر ہو، تم چاہتے ہو کہ ہمیں اُن چیزوں سے روک دو جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے، لہٰذا ہمارے پاس کوئی کھلی اور واضح دلیل لے آؤ)۔

اللہ تعالیٰ کے خلفاء نے بھی اُن سے یہ نہیں فرمایا کہ نہیں، ہم تمہاری طرح بشر نہیں ہیں۔ آؤ دیکھ لو کہ ہمارا سایہ نہیں ہوتا اور ہمارے قدم پتھر پر اثر چھوڑتے ہیں اور نرم زمین پر کوئی نشان نہیں بنتا۔ بلکہ انہوں نے

---

[1]. قرآن کریم، سورۂ ابراہیم، آیات 9 سے 11۔

فرمایا: إِنْ نَحْنُ إِلاَّ بَشَرٌ مِثْلُكُمْ (ہم تو بس تمہاری ہی طرح بشر ہیں) ہم تمہاری طرح ہیں، ہمارا سایہ ہوتا ہے، ہمارا ایک معین وزن ہے، ہمارے جسم تمہارے جسموں کی طرح ہیں؛ ہم نکاح کرتے ہیں اور ہم اولاد والے ہوتے ہیں اور ہم کھاتے اور پیتے ہیں اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں اور لوگ ہمیں دیکھتے ہیں۔

موسی (ع) کو دیکھیے، جو اولوالعزم پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر ہیں، کیا وہ اسی طرح معجزانہ صفات کے ساتھ پہچانے گئے تھے جیسا کہ یہ باطل لوگ دعویٰ کرتے ہیں:

(وَ ما تِلْكَ بِيمينِكَ يا مُوسى قالَ هِيَ عَصايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيها وَ أَهُشُّ بِها عَلى غَنَمي وَ لِيَ فيها مَآرِبُ أُخْرى قالَ أَلْقِها يا مُوسى فَأَلْقاها فَإِذا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعى قالَ خُذْها وَ لا تَخَفْ سَنُعيدُها سيرَتَهَا الْأُولى وَ اضْمُمْ يدَكَ إِلى جَناحِكَ تَخْرُجْ بَيضاءَ مِنْ غَيرِ سُوءٍ آيةً أُخْرى لِنُرِيكَ مِنْ آياتِنَا الْكُبْرَى)[1]

(اور اے موسی! تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟ عرض کیا: یہ میرا عصا ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اس کے ذریعے اپنی بھیڑیوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے لیے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ فرمایا: اے موسی! اسے ڈال دو۔ چنانچہ انہوں نے اسے ڈال دیا تو اچانک وہ ایک سانپ بن گیا جو تیزی سے چلنے لگا۔ فرمایا: اسے پکڑ لو اور خوف نہ کرو، ہم عنقریب اسے اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے؛ اور اپنا ہاتھ اپنے پہلو سے لگالو، وہ بغیر کسی عیب کے سفید نکل آئے گا، یہ ایک اور نشانی ہے، تاکہ ہم تمہیں اپنی بڑی نشانیاں دکھائیں)۔

اگر ان کے دعوے کے مطابق، موسی (ع) ہر حال میں سایہ نہ رکھتے ہوں اور ان کے قدم کا اثر پتھر پر پڑتا ہو، تو پھر موسی (ع) کو ان آیات اور معجزات کی کیا ضرورت تھی؟ حالانکہ یہ ایسے عظیم معجزاتی اوصاف ہیں کہ جن کی کسی طرح تاویل نہیں کی جاسکتی!

(وَ نَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّاظِرِينَ)[2]

(اور انہوں نے اپنا ہاتھ [گریبان سے] نکالا تو وہ اچانک دیکھنے والوں کے لیے سفید اور روشن ہو گیا)۔

(فَأَلْقَى عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُبِينٌ)[3]

(پھر انہوں [موسی] نے اپنی لاٹھی ڈال دی تو وہ فوراً ایک ظاہر و آشکار اژدہا بن گئی)۔

---

[1] . قرآنِ کریم، سورۂ طٰہٰ، آیات 17 - 23۔

[2] . قرآنِ کریم، سورۂ اعراف، آیت 108۔

[3] . قرآنِ کریم، سورۂ اعراف، آیت 107۔

ہم قرآن میں نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے موسی (ع) کے معجزات میں اس بات کا اضافہ کیا ہو کہ ان میں کوئی معجزہ نما صفت ہو، یعنی یہ کہ ان کے قدم کا اثر پتھر پر پڑتا ہو یا ان کا سایہ نہ ہو۔ اگر موسیٰ (ع) کے قدموں کا نشان پتھر میں باقی رہتا، تو کیا زیادہ سزاوار نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ موسیٰ (ع) کی نبوت پر ان کے اسی قدم کے ذریعے استدلال فرماتا جو پتھر میں اثر ڈالتا ہے؟ کیا اس کا باقی رہ جانے والا اثر ایک قطعی اور غیر قابلِ تاویل دلیل نہ ہوتا جس کے رد کرنے کی کوئی گنجائش نہ ہوتی؟ کیا وہ ان کی عصا سے بہتر نہ ہوتا جس کے بارے میں آسانی سے کہا گیا: یہ جادو ہے، اور وہ تمہارا بڑا ہے، اور یہ دونوں ظاہر ہونے والے جادو ہیں؟!!

اس میں کیا حکمت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں روشن ہاتھ اور ایسی لاٹھی کی نشانیاں عطا کیں جو سانپ میں بدل جاتی تھی، جبکہ اس عقیدے کے مطابق ان کے پاس ان عارضی معجزات سے بھی بڑی معجزہ نما خصوصیات موجود تھیں؟ اس اعتقاد کی بنا پر نہ ان کا سایہ تھا اور نہ ہی ان کے قدم نرم زمین پر اثر کرتے تھے، لیکن ان کے قدم پتھر پر اثر انداز ہوتے تھے۔ کیا ایسا قدم جو پتھر پر اثر ڈال دے اور فرعون کے محل کی سنگی زمین کو تباہ کر دے، اس کے لیے کافی نہ ہوتا کہ تمام لوگ موسی (ع) کا معجزہ دیکھتے اور اسے چھو کر محسوس کرتے؟!!

کیا یہ زیادہ مناسب نہ تھا کہ موسی (ع) ان سے کہتے: میرے قدم کو دیکھو جو پتھر پر اثر ڈال گیا ہے اور نرم زمین پر اثر نہیں ڈالتا، اور میرا کوئی سایہ نہیں ہے؛ یا کم از کم ان باتوں کو ان معجزات کے ساتھ شامل کر دیتے۔ کیا موسی (ع) نے ایسا بیان کیا؟ کیا انہوں نے اپنے اس معجزہ نما قدم سے استدلال کیا؟!

بسا اوقات ایسے لوگ جو قرآن کے مخالف ان فاسد عقائد کو رکھتے ہیں، موسیٰ کو ان صفات سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں؛ وہ صفات جن کا اللہ تعالیٰ کے زمین میں خلیفہ کے لیے ہر حال میں ہونا لازم سمجھتے ہیں!!!

آخر میں میں کہتا ہوں: اگر معاملہ ویسا ہی ہو جیسا یہ کم عقل لوگ گمان کرتے ہیں، تو پھر علی (ع) نے اپنے بارے میں رسول اللہ (ص) کی نص سے استدلال کیوں کیا؟ کیا ان کے لیے بہتر نہ تھا کہ وہ ان خصوصیات سے استدلال کرتے جو ان سے جدا نہیں ہوتیں؟ کیا علی (ع) کے لیے زیادہ مناسب نہ تھا کہ وہ ابو بکر سے کہتے: میرا سایہ نہیں ہے۔ اے مسلمانوں! آؤ اور مجھے دیکھو کہ میرا سایہ نہیں ہے۔ میں زمین میں اللہ کا خلیفہ ہوں، اس دلیل سے کہ میرا سایہ نہیں ہے؟! کیا علی (ع) کے لیے سزاوار نہ تھا کہ وہ انہیں اپنا قدم دکھاتے جو پتھر پر اثر ڈالتا ہے اور اسی خصوصیت کے ذریعے اپنی امامت کو ثابت کرتے؟!!

خدا کی قسم! اس شخص کو جو ان بے بنیاد باتوں پر ایمان رکھتا ہے، بے خردی اور حماقت سے متصف کرنا بھی بے خردوں اور احمقوں پر ظلم ہے؛ کیونکہ احمق وہ ہوتا ہے جس کے پاس عقل تو ہوتی ہے، لیکن اس کے بعض کام غیر حکیمانہ ہوتے ہیں؛ لیکن ان اعتقادات کو پیش کرنا، جو نامعلوم افریقی علاقوں کے ابتدائی قبائل کے عقائد اور جنات کی کہانیوں سے مشابہ ہیں، ایسے لوگوں کو بے عقل اور بے خرد افراد کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے، اور اس میں کوئی تعجب نہیں کہ وہ ایسے ہی ہوں۔ جو کوئی بھی اولیائے خدا کے ساتھ جنگ کی راہ اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی عقل سلب کر لیتا ہے، یہاں تک کہ اسے خود معلوم نہیں رہتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

تعجب کی کوئی حد نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بے عقل سفیہ لوگ اُن روایات سے روگردانی کرتے ہیں جو کہتی ہیں کہ معصوم کو پاخانہ نہیں ہوتا، حالانکہ اُن کے اپنے عقیدے کے مطابق معصوم کو اسی طرح کی خصوصیات سے پہچانا جاتا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ وہ اُن روایات سے کیوں منہ موڑتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ معصوم ران سے پیدا ہوتا ہے اور رحم میں پرورش نہیں پاتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس قسم کی روایات اُن کی موجودہ حالت کو، جو اِن ذلت آمیز عقائد کے سبب ہے، اس سے بھی بدتر بنا دیں گی؛ جیسے معصوم کے پاخانہ نہ ہونے کا عقیدہ۔ اللہ اُنہیں رسوا کرے۔ معصوم کی ران سے ولادت کے بارے میں بھی روایات نقل ہوئی ہیں، پھر وہ اُن پر ایمان کیوں نہیں رکھتے؟ ان روایات کے مطابق ماں اپنے رحم میں اُسے حمل نہیں کرتی، بلکہ وہ اُسے اپنی دائیں ران سے جنم دیتی ہے۔ شاید میں یہ بات اُنہیں اس لیے یاد دلا دوں کہ وہ اِن امور کو اُن ذلت آمیز عقائد کے سلسلے میں، جو وہ معصوم کے بارے میں رکھتے ہیں، دہرانا نہ بھولیں، اور ہمیشہ اور ہر لمحہ ان پر ایمان رکھتے رہیں۔

تیسرا ملحقہ: شمعون، یاسمعان، عیسی (ع) کے وصی

حضرت آدم (ع) کی وصیت کا باب:

امام صادق (ع) نے فرمایا: رسول اللہ (ص) نے فرمایا: (میں انبیا کا سردار ہوں اور میرا وصی اوصیا کا سردار ہے، اور اس کے اوصیا بھی اوصیا کے سردار ہیں۔ آدم (ع) نے اللہ عزوجل سے درخواست کی کہ ان کے لیے ایک شایستہ وصی مقرر کرے۔ اللہ عزوجل نے ان کی طرف وحی فرمائی: میں نے انبیا کو نبوت کے ذریعے عزت بخشی ہے، پھر اپنی مخلوقات میں سے کچھ کو منتخب کیا اور ان میں سے بہترین کو اوصیا قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی: اے آدم! شیث کو وصیت کرو۔ پھر آدم (ع) نے شیث کو وصیت کی، اور وہ ہبۃ اللہ، آدم

کے فرزند تھے؛ اور شیث نے اپنے فرزند شبان کو وصیت کی، اور وہ نزلۃ الحورائیہ کے بطن سے تھے جسے اللہ عزوجل نے آدم کے لیے جنت سے نازل کیا تھا، اور آدم نے اس کا نکاح اپنے فرزند شیث سے کر دیا تھا؛ اور شبان نے محلث کو وصیت کی، اور محلث نے محوق کو وصیت کی، اور محوق نے غشمیثا کو وصیت کی، اور غشمیثا نے اخنوخ کو وصیت کی، اور وہ ادریس نبی (ع) تھے؛ اور ادریس نے ناحور کو وصیت کی، اور ناحور نے اسے نوح (ع) کے سپرد کیا اور نوح (ع) نے سام کو وصیت کی، اور سام نے عثامر کو وصیت کی، اور عثامر نے برغیثاشا کو وصیت کی، اور برغیثاشا نے یافث کو وصیت کی، اور یافث نے برہ کو وصیت کی، اور برہ نے جفسیہ کو وصیت کی، اور جفسیہ نے عمران کو وصیت کی، اور عمران نے اسے ابراہیم خلیل (ع) کے سپرد کیا؛ اور ابراہیم نے اپنے فرزند اسماعیل کو وصیت کی، اور اسماعیل نے اسحاق کو وصیت کی، اور اسحاق نے یعقوب کو وصیت کی، اور یعقوب نے یوسف کو وصیت کی، اور یوسف نے بثریا کو وصیت کی، اور بثریا نے شعیب کو وصیت کی، اور شعیب نے موسی بن عمران (ع) کو وصیت کی، اور موسی بن عمران نے یوشع بن نون کو وصیت کی، اور یوشع بن نون نے داوود کو وصیت کی، اور داوود نے سلیمان کو وصیت کی، اور سلیمان نے آصف بن برخیا کو وصیت کی، اور آصف بن برخیا نے زکریا کو وصیت کی، اور زکریا نے اسے عیسی بن مریم (ع) کے سپرد کیا؛ اور عیسی بن مریم نے شمعون بن حمون صفا کو وصیت کی، اور شمعون نے یحییٰ بن زکریا کو وصیت کی، اور یحییٰ بن زکریا نے منذر کو وصیت کی، اور منذر نے سلیمہ کو وصیت کی، اور سلیمہ نے بردہ کو وصیت کی۔ پھر رسول اللہ (ص) نے فرمایا: اور بردہ نے اسے میرے سپرد کیا۔ اور اے علی! میں اسے تمہارے سپرد کرتا ہوں، اور تم اسے اپنے وصی کے حوالے کرنا، اور تمہارا وصی اسے تمہاری اولاد میں سے اوصیا کے حوالے کرتا رہے، ایک کے بعد ایک، یہاں تک کہ وہ تمہارے بعد زمین کے بہترین انسان تک پہنچ جائے۔ اور امت تمہارے ساتھ کفر کرے گی اور تمہارے بارے میں شدید اختلاف پیدا کرے گی۔ جو شخص تم پر ثابت قدم رہے گا، وہ اس شخص کی مانند ہے جو میرے ساتھ رہا؛ اور جو شخص تم سے جدا ہو جائے گا، وہ آگ میں ہوگا، اور آگ کافروں کا ٹھکانا ہے)[1]

رسول اللہ (ص) نے فرمایا: (... اللہ تعالیٰ نے عیسی بن مریم کو مبعوث فرمایا اور انہیں نور، علم، حکمت اور تمام سابقہ انبیا کا علم عطا کیا، اور اس پر انجیل کا اضافہ فرمایا، اور انہیں بیت المقدس اور بنی اسرائیل کی طرف بھیجا، اور وہ انہیں اپنی کتاب، اپنی حکمت اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کی دعوت دیتے تھے؛ مگر ان میں سے اکثر

---

[1] . من لایحضرہ الفقیہ، صدوق، جلد 4، ص 174۔

نے انکار کیا اور سرکشی اور کفر اختیار کیا۔ ۔۔۔جب اللہ نے چاہا کہ انہیں اٹھالے اور اپنی طرف بلند کرلے، تو ان کی طرف وحی فرمائی کہ اللہ کا نور، حکمت اور اپنی کتاب کا علم شمعون بن حمون صفا کے سپرد کر دیں، جو مؤمنین پر خلیفہ ہیں۔ پس انہوں نے ایسا ہی کیا۔ شمعون ہمیشہ اللہ عزوجل کے حکم پر قائم رہے اور بنی اسرائیل میں عیسی (ع) کی تمام باتوں کے مطابق عمل کرتے رہے اور کافروں سے جنگ کرتے رہے۔ جس نے ان کی اطاعت کی اور ان پر اور جو کچھ وہ لائے تھے اس پر ایمان لایا، وہ مؤمن ہے، اور جس نے ان کا انکار کیا اور ان کی نافرمانی کی، وہ کافر ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایک شخص کو منتخب کیا اور اپنے بندوں کے درمیان صالحین میں سے ایک نبی کو مبعوث فرمایا، اور وہ یحییٰ بن زکریا تھے۔ پھر شمعون دنیا سے رخصت ہوگئے...)[1]

علی (ع) کہتے ہیں: (ہم نبی اکرم (ص) کے پاس امِّ سلمہ کے گھر میں تھے کہ آپ کے چند اصحاب اندر آئے، جن میں سلمان، ابوذر، مقداد اور عبدالرحمان بن عوف شامل تھے۔ سلمان نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہر نبی کا ایک وصی اور ایک نسل ہوتی ہے، آپ کے وصی اور آپ کی نسل کون ہے؟ آپ نے کچھ دیر توقف فرمایا، پھر ارشاد فرمایا: اے سلمان! اللہ تعالیٰ نے 4000 نبی مبعوث فرمائے اور ان کے 4000 اوصیا اور 8000 سبط اور نسلیں تھیں۔ قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں سب سے افضل نبی ہوں اور میرے اوصیا سب سے افضل اوصیا ہیں، اور میرے دونوں بیٹے سب سے افضل بیٹے اور نسل ہیں۔ پھر فرمایا: اے سلمان! کیا تم جانتے ہو کہ آدم کے وصی کون تھے؟ سلمان نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپ (ص) نے فرمایا: اے ابا عبداللہ! میں تمہیں جانتا ہوں اور تم ہم اہل بیت میں سے ہو۔ آدم نے شیث کو وصیت کی، اور شیث نے اپنے بیٹے شبان کو وصیت کی، اور شبان نے مخلب کو وصیت کی، اور مخلب نے نحوق کو وصیت کی، اور نحوق نے عنشا کو وصیت کی اور عنشا نے اخنوخ کو وصیت کی، جو ادریس نبی (ع) ہیں؛ اور ادریس نے ناخورا کو وصیت کی، اور ناخورا نے نوح (ع) کو وصیت کی، اور نوح نے سام کو وصیت کی، اور سام نے عشام کو وصیت کی، اور عشام نے ترعشاثا کو وصیت کی، اور ترعشاثا نے یافث کو وصیت کی، اور یافث نے برہ کو وصیت کی، اور برہ نے خفسیہ کو وصیت کی، اور خفسیہ نے عمران کو وصیت کی، اور عمران نے ابراہیم کو وصیت کی، اور ابراہیم نے اپنے بیٹے اسماعیل کو وصیت کی، اور اسماعیل نے اسحاق کو وصیت کی، اور اسحاق نے یعقوب کو وصیت کی، اور یعقوب نے یوسف کو وصیت کی، اور یوسف نے برثیا کو وصیت کی، اور برثیا نے شعیب کو وصیت کی، اور شعیب

---

[1]. کمال الدین و تمام النعمۃ، صدوق، ص 225۔

نے موسی کو وصیت کی، اور موسی نے یوشع بن نون کو وصیت کی، اور یوشع نے داود کو وصیت کی، اور داود نے سلیمان کو وصیت کی، اور سلیمان نے آصف بن برخیا کو وصیت کی، اور آصف نے زکریا کو وصیت کی، اور زکریا نے عیسی بن مریم کو وصیت کی، اور عیسی بن مریم نے شمعون بن حمون صفا کو وصیت کی، اور شمعون نے یحییٰ بن زکریا کو وصیت کی، اور یحییٰ نے منذر کو وصیت کی، اور منذر نے سلمہ کو وصیت کی، اور سلمہ نے بردہ کو وصیت کی، اور بردہ نے مجھے وصیت کی، اور میں اسے علی کے سپرد کرتا ہوں۔ سلمان نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا ان کے درمیان دیگر انبیا اور اوصیا بھی تھے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، اتنے زیادہ کہ شمار میں نہیں آ سکتے...)[1]

مفضل بن عمر کہتے ہیں: (امام صادق (ع) مجھ سے گفتگو فرما رہے تھے۔ پھر آپ نے عیدِ غدیر کے دن کی فضیلت کے بارے میں ایک حدیث بیان کی، یہاں تک کہ میں نے عرض کیا: اے میرے آقا! کیا آپ مجھے اس دن روزہ رکھنے کا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، خدا کی قسم۔ ہاں، خدا کی قسم۔ ہاں، خدا کی قسم۔ یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے آدم (ع) کی توبہ قبول فرمائی، اور انہوں نے اللہ کے شکر کے طور پر اس دن روزہ رکھا۔ یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم (ع) کو آگ سے نجات دی، اور انہوں نے اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کے شکر میں اس دن روزہ رکھا۔ یہ وہ دن ہے جس میں موسی (ع) نے ہارون (ع) کو بطور عَلَم مقرر کیا، اور اس دن اللہ تعالیٰ کے شکر میں روزہ رکھا۔ یہ وہ دن ہے جس میں عیسی نے اپنے وصی شمعون صفا کو متعارف کرایا اور اس دن اللہ عزوجل کے شکر میں روزہ رکھا۔ یہ وہ دن ہے جس میں رسول اللہ (ص) نے علی (ع) کو لوگوں کے لیے عَلَم مقرر کیا اور اس دن ان کی فضیلت اور وصی ہونے کو آشکار کیا اور اللہ عزوجل کے شکر میں اس دن روزہ رکھا۔ یہ وہ دن ہے جس میں روزہ، شب بیداری، کھانا کھلانا، بھائیوں کے ساتھ صلہ رحمی اور خداوندِ رحمان کی رضا ہے، اور یہ شیطان کی ناک خاک میں رگڑنے کا سبب بنتا ہے)[2]

فضل بن ربیع کہتے ہیں: منصور اپنی حکومت سے پہلے، ایسے شخص کی طرح تھا جو صرف جعفر بن محمد (ع) کے پاس جایا کرتا تھا۔ وہ کہتے ہیں: میں نے مروان حمار کے زمانے میں جعفر بن محمد بن علی (ع) سے سجدۂ شکر کے بارے میں پوچھا جسے امیر المؤمنین (ع) نے انجام دیا تھا، اور میں نے پوچھا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ تو آپ نے

---

[1]. کفایۃ الاثر، خزاز قمی، ص 151۔

[2]. وسائل الشیعہ، حر عاملی، جلد 10، ص 445۔

اپنے والد محمد بن علی سے مجھے حدیث بیان کی کہ انہوں نے فرمایا: (میرے والد علی بن حسین نے مجھے حدیث بیان کی، اپنے والد حسین سے، اور انہوں نے اپنے والد علی بن ابی طالب (ع) سے کہ رسول اللہ (ص) نے انہیں اپنے بعض کاموں میں سے ایک کام کے لیے بھیجا تھا جس میں ان کی آزمائش عمدہ تھی اور اس کی سختی بہت بڑی تھی۔ جب اس امر کے آثار ان کے چہرے پر ظاہر ہوئے تو انہوں نے مسجد کا رخ کیا، اور رسول اللہ (ص) نماز ادا کرنے کے لیے باہر تشریف لے گئے تھے، چنانچہ انہوں نے آپ کے ساتھ نماز ادا کی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو رسول اللہ (ص) کی طرف متوجہ ہوئے اور رسول اللہ (ص) نے ان سے معانقہ فرمایا۔ پھر اس راستے اور کام کے بارے میں پوچھا جو انہوں نے اس سفر میں انجام دیا تھا۔ علی (ع) ان سے گفتگو کرتے رہے اور ان سے بات کرتے ہوئے ان کا چہرہ روشن ہو گیا۔ جب انہوں نے گفتگو مکمل کی تو رسول اللہ (ص) نے ان سے فرمایا: اے ابوالحسن! کیا میں تمہیں بشارت نہ دوں؟ عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ نے اب تک کتنی ہی بھلائیوں کی بشارت دی ہے۔ آپ (ص) نے فرمایا: جبرئیل (ع) دوپہر کے وقت میرے پاس نازل ہوئے اور مجھ سے عرض کیا: اے محمد، یہ آپ کے چچازاد بھائی علی ہیں جو آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں، اور اللہ عزوجل مسلمانوں کو ان کے ذریعے ایک اچھی آزمائش میں ڈالے گا، اور ان کا معاملہ یوں یوں ہے۔ مجھے اُس بات کی خبر بیان کرو جو تم نے مجھے دی ہے۔ انہوں نے مجھ سے عرض کیا: اے محمد، اولادِ آدم میں سے نجات وہی پاتا ہے جو شیث بن آدم کی ولایت رکھتا ہے۔ آدم نے شیث کو وصیت کی، اور شیث اپنے والد آدم کے ساتھ نجات پا گئے، اور آدم اللہ تعالیٰ کے سبب نجات پا گئے۔

اے محمد، جو شخص سام بن نوح کی پیروی کرتا ہے جو اپنے والد نوح کے وصی تھے، وہ سام کے ساتھ نجات پاتا ہے؛ اور سام نوح کے ساتھ نجات پاتے ہیں، اور نوح اللہ تعالیٰ کے سبب نجات پاتے ہیں۔

اے محمد، جو شخص اسماعیل بن ابراہیم خلیلِ خداوندِ رحمان کی پیروی کرتا ہے جو اپنے والد ابراہیم کے وصی تھے، وہ اسماعیل کے ساتھ نجات پاتا ہے، اور اسماعیل ابراہیم کے ساتھ نجات پاتے ہیں، اور ابراہیم اللہ تعالیٰ کے سبب نجات پاتے ہیں۔

اے محمد، جو شخص یوشع بن نون کی پیروی کرتا ہے جو موسی کے وصی تھے، وہ یوشع کے ساتھ نجات پاتا ہے؛ اور یوشع موسی کے ساتھ نجات پاتے ہیں، اور موسی اللہ تعالیٰ کے سبب نجات پاتے ہیں۔

اے محمد، جو شخص شمعون صفا کی پیروی کرتا ہے جو عیسی کے وصی تھے، وہ شمعون کے ساتھ نجات پاتا ہے؛ اور شمعون عیسی کے ساتھ نجات پاتے ہیں، اور عیسی اللہ تعالیٰ کے سبب نجات پاتے ہیں۔

اے محمد، جو شخص علی کی پیروی کرتا ہے جو آپ کی زندگی میں آپ کے وزیر اور آپ کی وفات کے وقت آپ کے وصی ہیں، وہ علی کے ساتھ نجات پاتا ہے؛ اور علی آپ کے ساتھ نجات پاتے ہیں، اور آپ اللہ عزوجل کے سبب نجات پاتے ہیں...)[1]

ہام کی حدیث جو ابلیس کی اولاد میں سے ہے۔

حسن (ع) نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا رسول اللہ (ص) سے روایت کیا ... کہ آپ نے فرمایا: (اے ہام، تم نے سچ کہا، انبیاء اور اوصیاء نے سچ کہا۔ پھر فرمایا: یعقوب کا وصی کون ہے؟ عرض کیا: یوسف۔ فرمایا: یوسف کا وصی کون ہے؟ فرمایا: یوشع بن نون، اور یوشع کا وصی شمعون ہے۔ فرمایا: شمعون کا وصی کون ہے؟ عرض کیا: داوود، اور داوود کا وصی سلیمان ہے، اور سلیمان کا وصی آصف بن برخیا ہے، اور عیسی کا وصی شمعون صفا ہے۔ نبی (ص) نے اس سے فرمایا: کیا تم میرے وصی کا نام جانتے ہو اور اسے کسی کتاب میں دیکھا ہے؟ عرض کیا: ہاں، اس ذات کی قسم جس نے آپ کو نبی بنا کر منتخب فرمایا ...)[2]

چوتھا ملحقہ: 313 افراد کی تیاری

عبدالعظیم حسنی کہتے ہیں: (میں نے محمد بن علی بن موسی (ع) کی خدمت میں عرض کیا: مجھے امید ہے کہ آپ ہی اہلِ بیت کے قائم ہیں جو زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے جس طرح وہ ظلم و ستم سے بھر چکی ہے۔ تو آپ (ع) نے فرمایا: اے ابوالقاسم! ہم میں سے کوئی ایسا نہیں مگر یہ کہ وہ اللہ عزوجل کے حکم سے قائم اور دینِ خدا کی طرف ہدایت کرنے والا ہے۔ لیکن وہ قائم جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ زمین کو اہلِ کفر و انکار سے پاک کرے گا اور اسے عدل سے بھر دے گا، وہ وہی ہے جس کی ولادت لوگوں پر مخفی ہو گی اور اس کی شخصیت ان پر پوشیدہ ہو گی اور اس کا نام لینا ان پر حرام ہو گا، اور وہ رسول اللہ (ص) کے ہم نام اور ہم کنیت ہو گا؛ اور وہی ہے جس کے لیے زمین سمیٹ دی جائے گی اور ہر سختی اس کے لیے نرم کر دی جائے گی، اور اس کے ساتھی جو اہلِ بدر کی تعداد کے برابر 313 مرد ہوں گے، اطراف سے اس کے پاس جمع ہوں گے، اور یہی اللہ عزوجل کا فرمان

---

[1] . دلائل الامامۃ، طبری، ص 57۔

[2] . الروضۃ فی فضائل امیر المؤمنین (ع)، ابن شاذان، ص 321۔

ہے: أَينَ ما تَكُونُوا يأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَميعاً إِنَّ اللَّهَ عَلىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (تم جہاں کہیں بھی ہو گے، اللہ تم سب کو جمع کر لائے گا، بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے)۔ جب اس کے لیے اہلِ اخلاص کی یہ تعداد جمع ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ اس کے امر کو ظاہر فرمادے گا۔ پھر جب اس کے لیے بیعت مکمل ہو جائے گی جو دس ہزار مرد ہوں گے تو وہ اللہ عزوجل کے اذن سے خروج کرے گا۔ وہ دشمنانِ خدا کو مسلسل قتل کرتا رہے گا یہاں تک کہ اللہ عزوجل راضی ہو جائے گا)[1]

ابوبصیر کہتے ہیں: (کوفہ کے ایک شخص نے امام صادق (ع) سے پوچھا: قائم (ع) کے ساتھ کتنے لوگ خروج کریں گے؟ لوگ کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ اہلِ بدر کی تعداد کے برابر 313 مرد خروج کریں گے۔ آپ نے فرمایا: وہ صرف طاقتوروں کی تعداد کے برابر خروج کرتے ہیں، اور طاقتور دس ہزار سے کم نہیں ہوتے)[2]

ایک شخص بیان کرتا ہے: (امام صادق (ع) کے اصحاب میں سے ایک آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میں آپ پر قربان جاؤں، اللہ کی قسم! میں آپ سے اور ان لوگوں سے محبت کرتا ہوں جو آپ سے محبت کرتے ہیں۔ میرے آقا! ہمارے شیعوں کی تعداد کتنی زیادہ ہے۔ آپ نے اس سے فرمایا: انہیں بیان کرو۔ اس نے عرض کیا: وہ بہت زیادہ ہیں۔ فرمایا: انہیں شمار کر کے بتاؤ۔ عرض کیا: وہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔ امام صادق (ع) نے فرمایا: جب وہ معین تعداد جو تین سو دس اور کچھ زائد ہے، پوری ہو جائے گی تو پھر ویسا ہی ہو گا جیسا تم چاہتے ہو؛ لیکن ہمارا شیعہ وہ ہے جس کی آواز اس کے کان سے آگے نہ بڑھے اور اس کے باطن کی کینہ اور ناراحتی اس کے جسم کی حد سے تجاوز نہیں کرتی، اور وہ ہمیں علانیہ نہ سراہتا ہو اور نہ ہمارے دشمنوں سے جھگڑتا ہو، اور نہ ہمارے عیب جوؤں کی مجلس میں بیٹھتا ہو، اور نہ ہمارے بارے میں بدگوئی کرنے والوں سے ہم کلام ہوتا ہو، اور نہ ان سے محبت رکھتا ہو جو ہم سے دشمنی رکھتے ہیں اور نہ ہمارے دوستوں سے دشمنی کرتا ہو۔ میں نے عرض کیا: تو میں ان مختلف شیعوں کے ساتھ کیا کروں جو کہتے ہیں کہ ہم تشیع کے راستے پر ہیں؟ فرمایا: یہ لوگ خود ہی جدائی اور آزمائش میں مبتلا ہوں گے، اور ان کے درمیان تبدیلی اور ادل بدل واقع ہو گا، اور وہ قحط اور کمی میں گرفتار ہوں گے جو انہیں ہلاک کر دے گی، اور ایک تلوار ان کا خون بہائے گی، اور ان پر ایسے اختلافات آئیں گے جو انہیں منتشر کر دیں گے۔ بے شک ہمارا شیعہ وہ ہے جو کتوں کی طرح بھونکتا نہیں اور کوّے کی طرح لالچ

---

[1] . کمال الدین و تمام النعمۃ، صدوق، ص 377۔

[2] . کمال الدین و تمام النعمۃ، صدوق، ص 654۔

نہیں کرتا اور لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا اگرچہ بھوک سے مر جائے۔ میں نے عرض کیا: میں آپ پر قربان جاؤں، ایسے لوگوں کو جو ان صفات سے موصوف ہوں کہاں تلاش کروں؟ فرمایا: انہیں زمین کے گوشوں اور کناروں میں تلاش کرو، وہ وہ لوگ ہیں جن کی زندگی سادہ ہوتی ہے اور وہ خانہ بدوش ہوتے ہیں۔ اگر حاضر ہوں تو پہچانے نہیں جاتے، اور اگر نظروں سے اوجھل ہو جائیں تو کوئی ان کی کمی محسوس نہیں کرتا، اور اگر بیمار ہو جائیں تو ان کی عیادت نہیں کی جاتی، اور اگر نکاح کا پیغام دیں تو ان سے شادی نہیں کی جاتی، اور اگر وفات پا جائیں تو ان کے جنازے میں کوئی حاضر نہیں ہوتا۔ وہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اموال میں ایک دوسرے کے ساتھ مواسات [ہمدردی] کرتے ہیں اور اپنی قبروں میں ایک دوسرے سے دیدار اور ملاقات کرتے ہیں، اور ان کی خواہشیں آپس میں ٹکراتی اور مختلف نہیں ہوتیں، اگرچہ وہ مختلف شہروں سے ہوں)[1]

سلیمان بن ہارون بجلی کہتے ہیں: میں نے امام صادق (ع) سے سنا کہ آپ نے فرمایا: صاحب الامر کے اصحاب اس کی خاطر محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ اگر تمام لوگ چلے جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کے اصحاب کو لے آئے گا۔ وہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ عزوجل نے فرمایا: فَإِنْ يَكْفُرْ بِها هؤُلاءِ فَقَدْ وَكَّلْنا بِهَا قَوْماً لَيسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ۔ (اور اگر یہ لوگ اس کا انکار کریں تو ہم نے اس کے لیے ایسے لوگوں کو مقرر کر رکھا ہے جو اس کا انکار کرنے والے نہیں ہیں)؛ اور وہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَسَوْفَ يأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يحِبُّهُمْ وَ يحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكافِرِينَ۔ (تو عنقریب اللہ ایسے لوگ لے آئے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے، وہ مؤمنوں کے لیے نرم دل اور کافروں پر سخت ہوں گے)۔

جابر نے محمد باقر (ع) سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: پھر مہدی مکہ میں عشاء کے وقت ظاہر ہوں گے، اور ان کے ساتھ رسول اللہ (ص) کا پرچم، لباس، تلوار، نشانیاں، نور اور بیان ہوگا۔ جب وہ عشاء کی نماز پڑھ لیں گے تو اپنی بلند آواز سے پکاریں گے: اے لوگو! میں تمہیں تمہارے پروردگار کی یاد دلاتا ہوں، جبکہ تم اپنے پروردگار کے سامنے ہو۔ بے شک اس نے حجت قائم کر دی ہے اور انبیاء کو مبعوث کیا ہے، اور کتاب نازل کی ہے۔ اس نے تمہیں حکم دیا ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو؛ اور اس کی اطاعت اور اس کے رسول (ص) کی اطاعت کی حفاظت کرو؛ اور جس چیز کو قرآن نے زندہ کیا ہے اسے زندہ کرو، اور جس چیز کو اس نے مٹا دیا ہے اسے مٹا دو؛ اور ہدایت کے لیے مددگار بنو اور تقویٰ کے لیے سہارا بنو۔ بے شک دنیا کی فنا اور اس کا ختم

---

1. الغیبۃ، نعمانی، ص 211۔

ہونا قریب آ چکا ہے اور رخصت کی اجازت دے دی گئی ہے۔ میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف، اس کے رسول (ص) کی طرف، اس کی کتاب پر عمل کرنے کی طرف، باطل کو مٹانے اور اس کی سنت کو زندہ کرنے کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ پھر اس کے درمیان تین سو تیرہ مرد ظاہر ہوں گے، بدر کے اہل کی تعداد کے برابر، بغیر کسی پیشگی وعدے کے، جیسے خزاں کے درختوں کے پتے جھڑتے ہیں۔ وہ رات کو عبادت گزار اور دن کو شیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ مہدی کے لیے سرزمینِ حجاز کو فتح کرے گا اور بنی ہاشم کے تمام قیدیوں کو آزاد کرے گا؛ اور سیاہ جھنڈے کوفہ میں اتریں گے اور بیعت کے لیے مہدی کی طرف روانہ ہوں گے؛ اور مہدی اپنے لشکروں کو مختلف سرزمینوں کی طرف بھیجے گا اور ظلم اور اس کے اہل کو مٹا دے گا، اور شہر اس کے لیے مضبوط ہو جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں فتح عطا کرے گا)[1]

پانچواں ملحقہ: فقہائے آخر الزمان

امیر المؤمنین علی (ع) نے فرمایا: رسول اللہ (ص) نے فرمایا: (لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ قرآن میں سے صرف اس کی تحریر باقی رہ جائے گی اور اسلام میں سے صرف اس کا نام باقی رہے گا۔ وہ اسی نام سے پکارے جائیں گے، حالانکہ وہ اس سے سب سے زیادہ دور ہوں گے۔ ان کی مساجد آباد ہوں گی مگر ہدایت سے خالی ہوں گی۔ اس زمانے کے فقہاء آسمان کے نیچے بدترین فقہاء ہوں گے۔ فتنہ انہی سے نکلے گا اور انہی کی طرف لوٹ جائے گا)[2]

امیر المؤمنین علی (ع) نے ایک خطبہ دیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: (... لیکن جان لو کہ میرے بعد جلد ہی تم پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ اس زمانے میں حق سے زیادہ پوشیدہ کوئی چیز نہیں ہو گی، اور باطل سے زیادہ ظاہر کوئی چیز نہیں ہو گی، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ص) پر جھوٹ باندھنے سے زیادہ کوئی چیز عام نہیں ہو گی۔ اور اس زمانے کے لوگوں کے نزدیک اللہ کی کتاب سے زیادہ بے قدر کوئی متاع نہیں ہو گی، اگر اسے اس طرح پڑھا جائے جیسے پڑھنے کا حق ہے؛ اور کوئی متاع بھی اللہ کی اسی کتاب سے زیادہ رائج اور قیمتی نہیں ہو گی، جب اس کی آیات کو اپنی جگہوں سے بدل دیا جائے اور ان میں تحریف کی جائے اور بندوں اور شہروں کے درمیان اس زمانے میں نیکی کے کام سے زیادہ کوئی چیز ناپسند اور قابلِ انکار نہیں ہو گی، اور منکر اور برے کام سے

---

1. الغیبۃ نعمانی، ص330۔
2. الکافی، کلینی، جلد8، ص 307۔

زیادہ کوئی چیز پسندیدہ نہیں ہو گی۔ اس زمانے میں گمراہی کے وقت ہدایت سے بڑھ کر کوئی زیادہ ناپسندیدہ چیز نہیں ہو گی، اور نہ ہی کوئی سزا اس سے زیادہ سخت ہو گی؛ کیونکہ قرآن اٹھانے والے اسے اپنے پیچھے ڈال دیں گے اور اس کے حافظ اسے بھلا دیں گے۔ یہاں تک کہ نفسانی خواہشات انہیں اپنے پیچھے کھینچ لے جائیں گی، اور وہ اس طریقے کو اپنے باپ دادا سے ورثے میں لیں گے، اور جھوٹ اور تکذیب کے ساتھ قرآن کی تحریف اور تفسیر کریں گے، اور اسے تھوڑی سی قیمت پر بیچ دیں گے اور اس سے بے رغبت ہوں گے۔

اسی زمان میں قرآن اور اس کے اہل معاشرے سے ٹھکرائے اور نکال دیے جائیں گے، اور دونوں ایک ہی راستے کے ساتھی ہوں گے جنہیں کوئی پناہ نہیں دے گا۔ ہائے! وہ دونوں کتنے وفادار اور پسندیدہ ساتھی ہیں، اور خوش نصیب ہیں وہ دونوں اور وہ کام جو وہ انجام دیتے ہیں۔

اس زمانے میں قرآن اور اہلِ قرآن بظاہر لوگوں کے درمیان ہوں گے، مگر حقیقت میں ان کے درمیان نہیں ہوں گے اور نہ ہی ان کے موافق ہوں گے، اور نہ ان کے ساتھ ہوں گے؛ یہ لوگ جدائی پر اکٹھے ہوں گے اور جماعت سے بکھر جائیں گے۔

ان لوگوں کے معاملات اور ان کے دین کا انتظام ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو گا جو ان کے درمیان فریب، بدکاری، رشوت اور قتل کے ساتھ برتاؤ کریں گے؛ گویا وہ خود کو قرآن کے پیشوا اور رہنما سمجھتے ہیں، حالانکہ قرآن ان کا پیشوا اور رہنما نہیں ہے۔

ان کے درمیان حق اور حقیقت میں سے صرف نام باقی رہ جائے گا، اور اس میں سے بھی صرف خط اور تحریر رہ جائے گی۔ کوئی ایسا ہو گا جس کے کانوں تک قرآن کی حکمتوں کی آواز پہنچے گی اور وہ اس کی پیروی اختیار کرے گا، مگر ابھی اس مجلس سے اٹھا بھی نہ ہو گا کہ دین سے نکل جائے گا، اور دین و طریقۂ سلطنت سے دوسری سلطنت کے طریقے میں داخل ہو جائے گا، اور ایک بادشاہ کی سرپرستی سے نکل کر دوسرے بادشاہ کی سرپرستی میں چلا جائے گا، اور ایک حاکم کی اطاعت چھوڑ کر دوسرے حاکم کی اطاعت اختیار کر لے گا، اور ایک سلطان کے عہد و پیمان سے نکل کر دوسرے سلطان کے عہد و پیمان کے تحت آ جائے گا۔ اور رفتہ رفتہ، بغیر اس کے کہ انہیں خبر ہو، اللہ تعالیٰ انہیں آرزو اور امید کے ذریعے ہلاکت کی طرف کھینچ لے گا، اور بے شک اللہ کا جال نہایت مضبوط اور سخت ہے، یہاں تک کہ وہ گناہ اور نافرمانی میں پیدا ہونے لگیں گے۔ اور وہ ظلم و ستم کے ساتھ دینداری کریں گے، حالانکہ قرآنِ کریم ظلم و ستم کو کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کرتا۔ وہ گمراہ لوگ ہوں گے جو سرگرداں

ہوں گے، جو اللہ عزوجل کے دین کے سوا کسی اور کے دین پر چلیں گے اور اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے سر تعظیم جھکائیں گے۔ اس زمانے میں ان کی مسجدیں گمراہی سے آباد اور ہدایت سے ویران ہوں گی۔ قرآن کے قاری اور مسجدوں کے آباد کرنے والے اس زمانے میں اللہ کی کی بدترین مخلوق اور اس کی مخلوقات میں سب سے زیادہ ناکام لوگ ہوں گے۔ انہی کی طرف سے گمراہی پھیلے گی اور انہی کی طرف لوٹ کر آئے گی، اور اسی وجہ سے ان کی مسجدوں میں حاضر ہونا اور ان کی طرف جانا اللہ عظیم کے ساتھ کفر ہے، مگر وہ شخص جو ان کی مسجدوں میں جائے اور ان کی گمراہی کو جانتا ہو۔

اپنے ایسے ہی طرزِ عمل اور کردار کے نتیجے میں ان کی مسجدیں ہدایت سے ویران اور گمراہی سے آباد ہوں گی، اللہ کی سنت بدل دی جائے گی اور اس کی حدود و قوانین پامال کیے جائیں گے۔ وہ ہدایت کی طرف دعوت نہیں دیں گے، نہ ہی غنیمت کو اس کے مستحقین میں تقسیم کریں گے، اور نہ اپنے عہد و پیمان کے وفادار ہوں گے۔ وہ اپنے ان مقتولوں کو جو جنگوں میں اس طرح مارے جائیں شہید کہیں گے، اور جھوٹ اور انکار کے ساتھ اللہ کے پاس حاضر ہوں گے۔ جہالت اور نادانی کے ذریعے علم سے بے نیازی اختیار کریں گے، اور یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس سے پہلے نیک اور صالح لوگوں کو طرح طرح کی اذیتیں دیں، ان کی سچی باتوں کو اللہ پر بہتان قرار دیا، اور ان کے نیک کاموں کا بدی سے بدلہ دیا۔

اور بے شک اللہ عزوجل نے تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا ہے جس پر تمہارا تکلیف پہنچنا گراں گزرتا ہے، جو تمہاری بھلائی کا حریص ہے، اور مؤمنوں کے ساتھ نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے)۔[1]

امام باقر (ع) نے فرمایا: (آخری زمانے میں ایک گروہ ہوگا جس کی پیروی کی جائے گی۔ ان میں ایسے لوگ ہوں گے جو جھگڑا کریں گے، قرآن کی تلاوت کریں گے اور عبادت کریں گے۔ وہ نئے لوگ ہوں گے اور بے عقل ہوں گے۔ وہ امر بالمعروف کو واجب نہیں سمجھیں گے اور نہ ہی نہی عن المنکر کو واجب سمجھیں گے، مگر اس صورت میں کہ جب وہ نقصان سے محفوظ رہیں۔ وہ اپنے لیے گھٹیا باتیں اور عذر و بہانے تلاش کریں گے۔ وہ علما کی لغزشوں اور ان کے فاسد اعمال کی پیروی کریں گے۔ وہ نماز اور روزے اور ان اعمال کی طرف متوجہ ہوں گے جن سے ان کے نفس اور مال کو کوئی ضرر نہ پہنچے۔ اور اگر نماز ان کاموں میں رکاوٹ بنے جو وہ اپنے مال اور جسموں کے بارے میں کرتے ہیں تو وہ یقیناً اسے چھوڑ دیں گے، جس طرح انہوں نے سب سے بڑے اور سب

---

[1]. کافی، کلینی، ج8، ص391۔

سے باعزت واجبات کو چھوڑ دیا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک عظیم واجب ہے جس کے ذریعے دوسرے واجبات قائم رہتے ہیں۔ یہی وہ وقت ہے جب اللہ تعالیٰ کا غضب ان پر کامل ہو جاتا ہے۔ عذاب سب کو گھیر لیتا ہے اور نیک لوگ بدکاروں کی سرزمین میں ہلاک ہو جاتے ہیں اور بچے بڑوں کی سرزمین میں ہلاک ہو جاتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انبیاء کا راستہ اور صالح لوگوں کا طریقہ ہے۔ یہ ایک عظیم فریضہ ہے جس کے ذریعے دوسرے فرائض قائم ہوتے ہیں، راستے محفوظ ہوتے ہیں، کمائی حلال ہوتی ہے، مظالم واپس کیے جاتے ہیں، زمین آباد ہوتی ہے، دشمنوں سے انصاف لیا جاتا ہے اور امور درست ہوتے ہیں۔ لہٰذا تم انہیں اپنے دلوں سے ناپسند کرو اور اپنی زبانوں سے انکار کرو اور ان کی پیشانیوں پر مارو (ان کی رسوائی کو ظاہر کرو)، اور اللہ کی راہ میں ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہ ڈرو۔ اگر وہ نصیحت قبول کریں اور حق کی طرف لوٹ آئیں تو پھر ان پر کوئی راستہ نہیں: إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (راہِ ملامت تو صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں، انہی کے لیے دردناک عذاب ہے)۔ اس موقع پر اپنے بدنوں کے ساتھ جہاد کرو اور اپنے دلوں میں ان سے بغض رکھو، اور نہ سلطنت کے طلب گار بنو اور نہ مال حاصل کرنے کے خواہاں، اور نہ ظلم اور غلبہ کی نیت رکھو، یہاں تک کہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آؤ اور اس کی اطاعت پر خاتمہ کرو)[1]

رسول اللہ (ص) نے فرمایا: (جب میرے پروردگار جل جلالہ نے مجھے معراج پر لے گیا، ۔۔۔میں نے عرض کیا: اے میرے خدا اور میرے آقا! یہ امر کب ہوگا؟ اللہ عزوجل نے وحی فرمائی: یہ وہ زمانہ ہوگا جب علم اٹھالیا جائے گا اور جہالت ظاہر ہو جائے گی، قاری بہت ہو جائیں گے اور عمل کم ہو جائے گا، قتل و غارت بہت ہو جائے گی، ہدایت دینے والے فقہا کم ہو جائیں گے اور گمراہ اور خیانت کرنے والے فقہا زیادہ ہو جائیں گے، شاعر بہت ہو جائیں گے، اور تمہاری امت اپنی قبروں کو مسجدیں بنالے گی، مصحفوں کو آراستہ کیا جائے گا اور مسجدوں کو مزین کیا جائے گا، ظلم اور فساد بہت ہو جائے گا، منکر ظاہر ہو جائے گا، اور تمہاری امت اس کا حکم دے گی اور معروف سے روکے گی، اور مرد مردوں پر اکتفا کریں گے اور عورتیں عورتوں پر اور ان کے امیر کافر ہو جائیں گے اور ان کے اولیا فاجر ہو جائیں گے اور ان کے مددگار ظالم ہو جائیں گے اور ان کے صاحبِ نظر لوگ فاسق ہو جائیں گے۔ اس وقت تین خسف ہوں گے: ایک خسف مشرق میں، ایک خسف مغرب میں اور ایک خسف جزیرۂ

---

1. کافی، کلینی، جلد 5، ص 56۔

عرب میں۔ اور بصرہ ایک ایسے شخص کے ہاتھوں تباہ کیا جائے گا جو تمہاری اولاد میں سے ہوگا اور سیاہ فام لوگ[1] اس کی پیروی کریں گے۔ اور حسین بن علی کی اولاد میں سے ایک شخص خروج کرے گا، اور ایک دجال ظاہر ہوگا جو مشرق کی جانب سیستان سے خروج کرے گا، اور سفیانی ظاہر ہوگا...)[2]

مالک بن ضمرہ کہتے ہیں: امیر المؤمنین (ع) نے فرمایا: (اے مالک بن ضمرہ! تم کیسے ہو گے جب شیعہ اس طرح اختلاف کریں گے؟ اور آپ نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کیا۔ میں نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! کیا اس زمانے میں کوئی بھلائی نہیں ہوگی؟ آپ نے فرمایا: اے مالک! اس زمانے میں تمام بھلائی ہوگی۔ اسی وقت ہمارا قائم قیام کرے گا اور ستر آدمیوں کو، جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر جھوٹ باندھتے ہیں، لے آئے گا اور انہیں قتل کرے گا۔ پھر وہ لوگوں کو ایک امر پر جمع کرے گا)[3]

امام صادق (ع) نے فرمایا: (قائم (ع) اپنی جنگ میں ایسی سختیاں دیکھیں گے جو رسول اللہ (ص) نے نہیں دیکھیں، کیونکہ رسول اللہ (ص) ان لوگوں کے پاس آئے تھے جب وہ تراشے ہوئے پتھروں اور تراشے ہوئے لکڑی (کے بتوں) کی عبادت کرتے تھے، اور قائم ان پر اس حال میں خروج کریں گے کہ وہ ان کے مقابلے میں کتابِ اللہ کی تاویل کریں گے)[4]

عبد اللہ بن مسعود کہتے ہیں: میں اور ہمارے پانچ ساتھیوں کا ایک گروہ رسول اللہ (ص) کی خدمت میں حاضر ہوا۔۔۔رسول اللہ (ص) نے فرمایا: اے ابن مسعود! اسلام غریبی کے ساتھ شروع ہوا تھا اور جس طرح شروع ہوا تھا اسی طرح دوبارہ لوٹ آئے گا۔ پس خوشخبری ہے غریبوں کے لیے۔ تمہاری اولاد میں سے جو شخص اس زمانے کو پائے وہ انہیں ان کی جگہوں پر سلام نہ کرے، ان کے جنازوں میں شریک نہ ہو، اور ان کے بیماروں کی عیادت نہ کرے۔ وہ تمہاری سنت پر عمل کریں گے اور تمہارا دعویٰ ظاہر کریں گے، لیکن اپنے اعمال میں تمہارے خلاف ہوں گے اور تمہارے دین کے علاوہ کسی اور دین پر مریں گے۔ وہ مجھ سے نہیں ہیں اور میں ان

---

[1] .اس حدیث کے عربی متن میں یہاں «زنوج» کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ غالباً یہ لفظ «زنج» یا «زنجی» کی جمع ہے، جس کا معنی زنگی یا سیاہ فام ہے، یا مصر، سوڈان اور حبشہ کے لوگوں کی ایک خاص نسل کے لیے بولا جاتا ہے جن کی جلد سیاہ، بال گھنگریالے، ہونٹ چوڑے اور ناکیں دبی ہوئی ہوتی ہیں۔ واللہ اعلم۔ مترجم۔

[2] .کمال الدین و تمام النعمۃ، صدوق، ص 251۔

[3] .الغیبۃ، نعمانی، ص 214۔

[4] .الغیبۃ، نعمانی، ص 308۔

سے نہیں ہوں۔ اے ابن مسعود! اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِكْكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُشَيَّدَةٍ۔ (تم جہاں کہیں بھی ہو، موت تمہیں آ پکڑے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں ہی میں کیوں نہ ہو) اور فرمایا: يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انْظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ یہاں تک کہ فرماتا ہے وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے کہیں گے: ہمیں مہلت دو تاکہ ہم تمہارے نور سے کچھ روشنی حاصل کر لیں ۔۔۔اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے)۔

اے ابنِ مسعود! ان پر میری لعنت ہو اور تمام رسولوں اور میرے مقرب فرشتوں کی لعنت ہو، اور دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کا غضب اور برا حساب ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ یہاں تک کہ فرماتا ہے وَلَكِنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ فَاسِقُونَ۔ (بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر لعنت کی گئی... لیکن ان میں سے بہت سے لوگ نافرمان ہیں)۔

اے ابنِ مسعود! وہ کھلی حرص اور کھلا حسد ظاہر کرتے ہیں اور رشتوں کو کاٹتے ہیں، اور نیکی کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ (اور وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو اس کے باندھے جانے کے بعد توڑ دیتے ہیں، اور اس چیز کو کاٹتے ہیں جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اور زمین میں فساد کرتے ہیں، انہی کے لیے لعنت ہے اور انہی کے لیے برا انجام ہے)۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا (ان لوگوں کی مثال جن پر تورات کا بوجھ رکھا گیا پھر انہوں نے اسے نہ اٹھایا، اس گدھے کی مانند ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو)۔

اے ابنِ مسعود! لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ جو شخص اپنے دین پر صبر کرے گا وہ اس شخص کی مانند ہو گا جس کے ہاتھ کی ہتھیلی میں آگ ہو۔ اگر اس زمانے میں وہ بھیڑیا ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ بھیڑیے اسے کھا جائیں گے۔

اے ابنِ مسعود! ان کے علماء اور فقہاء خائن اور فاجر ہیں۔ آگاہ رہو! وہ اللہ تعالیٰ کی بدترین مخلوق ہیں، اور اسی طرح ان کے پیروکار بھی، اور وہ لوگ بھی جو ان کے پاس جاتے ہیں، ان سے لیتے ہیں، ان سے محبت رکھتے ہیں، ان کے ساتھ نشست و برخاست کرتے ہیں اور ان سے مشورہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی بدترین مخلوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جہنم کی آگ میں داخل کرے گا۔ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ (وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، لہٰذا وہ واپس نہیں لوٹتے)۔ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُمْيًا وَبُكْمًا وَصُمًّا مَأْوَاهُمْ

جَهَنَّمُ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنَاهُمْ سَعِيرًا (اور قیامت کے دن ہم انہیں اندھا، گونگا اور بہرا کر کے ان کے چہروں کے بل اٹھائیں گے۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ جب بھی اس کی آگ مدھم پڑے گی ہم ان کے لیے اس کی تیزی اور بڑھادیں گے) كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ (جب بھی ان کی کھالیں جل جائیں گی ہم ان کی جگہ دوسری کھالیں بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں) إِذَا أُلْقُوا فِيهَا سَمِعُوا لَهَا شَهِيقًا وَهِيَ تَفُورُ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ (جب انہیں اس میں پھینکا جائے گا تو وہ اس کی زور دار آواز سنیں گے جبکہ وہ جوش مار رہی ہو گی، قریب ہو گا کہ وہ غصے سے پھٹ پڑے) كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ أُعِيدُوا فِيهَا وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ (جب بھی وہ غم کی شدت سے اس سے نکلنا چاہیں گے انہیں اسی میں واپس لوٹا دیا جائے گا اور کہا جائے گا: جلانے والے عذاب کا مزہ چکھو) لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَهُمْ فِيهَا لَا يَسْمَعُونَ (ان کے لیے اس میں آہیں اور چیخیں ہوں گی اور وہ اس میں کچھ نہیں سنیں گے)۔

اے ابنِ مسعود! وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ میرے دین، میری سنت، میرے طریقے اور میری شریعت پر ہیں۔ وہ مجھ سے بیزار ہیں اور میں بھی ان سے بیزار ہوں۔

اے ابنِ مسعود! علانیہ ان کے ساتھ نہ بیٹھو، اور بازاروں میں ان کے ساتھ بیعت نہ کرو، اور انہیں راستہ نہ دکھاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ) (جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتے ہیں ہم ان کے اعمال کا پورا بدلہ اسی میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ) (جو شخص آخرت کی کھیتی چاہتا ہے ہم اس کی کھیتی میں اضافہ کر دیتے ہیں، اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے ہم اسے اس میں سے دے دیتے ہیں اور آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ نہیں ہو گا)۔

اے ابنِ مسعود! جو کچھ ان کی طرف سے میری امت کو پہنچے گا وہ دشمنی، غصہ اور جھگڑا ہو گا۔ وہ اس امت کے دنیا میں پست لوگ ہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے، اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں دھنسا دے گا اور انہیں بندروں اور خنزیروں میں مسخ کر دے گا۔

راوی کہتا ہے: رسول اللہ (ص) رو پڑے اور ہم بھی آپ کے رونے کی وجہ سے رو پڑے۔ ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ کے رونے کا سبب کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: بدبخت لوگوں پر مہربانی کی وجہ سے۔ پھر اللہ تعالیٰ

نے فرمایا: وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ فَزِعُوا فَلَا فَوْتَ وَأُخِذُوا مِنْ مَكَانٍ قَرِيبٍ (اور کسی طرح تم دیکھتے جب وہ گھبرائے ہوئے ہوں گے پھر بچ کر نکلنا ممکن نہ ہوگااور ایک قریب کی جگہ سے انہیں پکڑ لیا جائے گا)یعنی علماء اور فقہاء۔[1]

امام باقر(ع) نے فرمایا: (...وہ کوفہ کی طرف جائیں گے۔ وہاں سے بتریہ کے سولہ ہزار افراد ہتھیاروں سے لیس ہو کر نکلیں گے، جو قرآن کے قاری اور دین کے فقہاء ہوں گے۔ ان کی پیشانیاں (کثرتِ سجدہ سے) پینہ دار ہوں گی۔ وہ اپنے لباسوں میں تکبر اور غرور کے ساتھ چلیں گے اور نفاق نے انہیں گھیر رکھا ہوگا۔ سب کے سب کہیں گے: اے فرزندِ فاطمہ! واپس لوٹ جاؤ، ہمیں تمہاری ضرورت نہیں۔ لہٰذا وہ نجف کے پیچھے پیر کے دن عصر سے عشاء تک ان پر تلوار چلادیں گے اور وہ انہیں قربانی کے جانور کو ذبح کرنے سے بھی زیادہ تیزی سے قتل کرے گا۔ ان میں سے کسی مرد کو باقی نہیں چھوڑیں گے اور ان کے اصحاب میں سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ ان کے خون بہانا اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا سبب ہوگا۔ پھر وہ کوفہ میں داخل ہوں گے اور اس کے جنگجوؤں کو قتل کریں گے یہاں تک کہ اللہ عزوجل راضی ہو جائے گا...)[2]

کون لوگ مہدی (ع) کی مدد کریں گے؟

(ایک شخص بیان کرتا ہے: امام صادق (ع) کے اصحاب میں سے ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میں آپ پر قربان ہو جاؤں، اللہ کی قسم! میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور ان لوگوں سے بھی محبت کرتا ہوں جو آپ سے محبت رکھتے ہیں۔ میرے آقا! ہمارے شیعوں کی تعداد کتنی زیادہ ہے۔ امام (ع) نے فرمایا: ان کا ذکر کرو۔ اس نے عرض کیا: وہ بہت زیادہ ہیں۔ آپ نے فرمایا: انہیں شمار کرو۔ اس نے عرض کیا: وہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔ امام صادق (ع) نے فرمایا: جب وہ بیان کی گئی تعداد، یعنی تین سو دس اور کچھ افراد، پوری ہو جائے گی تو پھر وہی ہوگا جو تم چاہتے ہو۔ لیکن ہمارا شیعہ وہ ہے جس کی آواز اس کے کان سے آگے نہیں جاتی، اور اس کے باطن کی کینہ اور ناراضی اس کے جسم کی حد سے تجاوز نہیں کرتی، اور وہ ہماری کھلے عام تعریف نہیں کرتا، اور ہمارے دشمنوں سے جھگڑا نہیں کرتا، اور ہمارے عیب نکالنے والوں کے ساتھ نہیں بیٹھتا، اور ہمارے بارے میں بدگوئی کرنے والوں سے گفتگو نہیں کرتا، اور جو ہم سے دشمنی رکھتے ہیں انہیں دوست نہیں رکھتا، اور

---

[1] . مکارم الاخلاق، طبرسی، ص 454۔

[2] . دلائل الامامۃ، طبری، ص 455۔

ہمارے دوستوں سے دشمنی نہیں کرتا۔ میں نے عرض کیا: پھر میں ان مختلف شیعوں کے بارے میں کیا کروں جو کہتے ہیں کہ ہم طریقِ تشیع پر ہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ لوگ خود جدائی اور آزمائش میں گرفتار ہوں گے، اور ان کے درمیان تبدیلی اور ادل بدل واقع ہوگا، اور وہ قحط اور کمی میں مبتلا ہوں گے جو انہیں ہلاک کر دے گی، اور ایک تلوار ان کا خون بہائے گی، اور اختلافات پیدا ہوں گے جو انہیں منتشر کر دیں گے۔ بے شک ہمارا شیعہ وہ ہے جو کتوں کی طرح نہیں بھونکتا اور کوّے کی طرح حرص نہیں کرتا، اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر سوال نہیں کرتا اگرچہ بھوک سے مر ہی کیوں نہ جائے۔ میں نے عرض کیا: میں آپ پر قربان ہو جاؤں، ایسے لوگ جو ان صفات کے حامل ہوں کہاں تلاش کیے جائیں؟ آپ نے فرمایا: انہیں زمین کے گوشہ و کنار میں تلاش کرو۔ وہ ایسے لوگ ہیں جن کی زندگی سادہ ہوتی ہے اور وہ خانہ بدوش ہوتے ہیں۔ اگر وہ حاضر ہوں تو پہچانے نہیں جاتے، اور اگر نظروں سے اوجھل ہو جائیں تو کسی کو ان کی خبر نہیں ہوتی۔ اگر بیمار ہو جائیں تو کوئی ان کی عیادت نہیں کرتا، اور اگر نکاح کا پیغام بھیجیں تو ان سے نکاح نہیں کیا جاتا، اور اگر وفات پا جائیں تو ان کے جنازے میں کوئی حاضر نہیں ہوتا۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے مال میں ایک دوسرے کے ساتھ مواسات کرتے ہیں، اور اپنی قبروں میں ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں۔ ان کی خواہشات ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتیں اور اختلاف پیدا نہیں کرتیں، اگرچہ وہ مختلف شہروں سے ہوں)[1]

امام صادق (ع) نے فرمایا: (اس امر سے وہ شخص نکل جائے گا جس کے بارے میں گمان کیا جاتا تھا کہ وہ اس کے اہل میں سے ہے، اور اس میں ایسے لوگ داخل ہوں گے جو سورج پرستوں اور چاند پرستوں کی مانند ہوں گے)[2]

عبداللہ ابی یعفور کہتے ہیں: امام صادق (ع) نے فرمایا: (عرب کے طاغوتیوں کے لیے ہلاکت ہے اس شر کی وجہ سے جو قریب آ رہا ہے۔ میں نے عرض کیا: میں آپ پر قربان ہو جاؤں، عربوں میں سے کتنے لوگ قائم کے ساتھ ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: بہت کم۔ میں نے عرض کیا: اللہ کی قسم! ان میں سے جو لوگ اس امر کو

---

1. الغیبۃ، نعمانی، ص 211۔
2. الغیبۃ، نعمانی، ص 332۔

بیان کرتے ہیں وہ بہت زیادہ ہیں۔ آپ نے فرمایا: لوگوں کو خالص ہونا چاہیے، اور جدا ہونا چاہیے، اور چھانا جانا چاہیے، اور چھاننے سے بہت سے لوگ باہر نکل جائیں گے)[1]

امام صادق (ع) نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ اس امر کی مدد ایسے لوگوں کے ذریعے کرے گا جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں، اور جب ہمارا امر ظاہر ہوگا تو یقیناً ہمارے امر سے ایسے لوگ باہر نکل جائیں گے جو آج بتوں کی پرستش پر تھے)[2]

زید کہتے ہیں: (میں نے امام صادق (ع) سے عرض کیا: (ہمیں خوف ہے کہ شاید ہم مومن نہ ہوں۔ آپ نے فرمایا: کیوں؟ میں نے عرض کیا: ہم اپنے درمیان کسی ایسے شخص کو نہیں پاتے کہ اس کے نزدیک اس کا بھائی اس کے درہم و دینار سے زیادہ عزیز ہو، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے نزدیک درہم و دینار اس کے بھائی سے زیادہ عزیز ہیں، حالانکہ ولایتِ امیر المؤمنین نے ہمیں اور اسے ایک ساتھ جمع کر رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا: ایسا نہیں ہے۔ لیکن تمہارا ایمان کامل نہیں ہوگا یہاں تک کہ ہمارا قائم قیام کرے۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ تمہاری عقلوں کو جمع کرے گا اور تم کامل مؤمن بن جاؤ گے۔ اور اگر زمین میں کامل مؤمن موجود نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی طرف اٹھالے گا اور تم زمین و آسمان کا انکار کرو گے۔ بلکہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! زمین کے اطراف میں ایسے مؤمن موجود ہیں جن کے نزدیک پوری دنیا کی قدر مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں۔ اگر دنیا اور اس میں جو کچھ ہے سب سرخ سونا بن جائے اور ان میں سے کسی ایک کے گلے میں ڈال دیا جائے، پھر وہ اس کے گلے سے گر پڑے تو وہ کچھ محسوس نہیں کرتا، گویا اس کے گلے میں کچھ تھا ہی نہیں اور اس سے کچھ گرا ہی نہیں، کیونکہ دنیا ان کے نزدیک بہت حقیر ہے۔ وہی لوگ ہیں جن کی زندگی پوشیدہ ہوتی ہے اور ان کے گھر ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے پیٹ روزے کی وجہ سے اندر دھنسے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے ہونٹ تسبیح کی وجہ سے خشک ہیں۔ ان کی آنکھیں رونے سے کمزور ہو گئی ہیں۔ ان کے چہرے شب بیداری کے سبب زرد ہو گئے ہیں۔ یہی ان کا چہرہ ہے جس کی مثال اللہ تعالیٰ نے انجیل میں بیان کی ہے، اور تورات، فرقان، زبور اور صحفِ اولیٰ میں ان کی توصیف کی ہے اور فرمایا ہے: سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ (ان کی علامت ان کے چہروں پر سجدوں

---

[1] .الغیبۃ، نعمانی، ص 212۔

[2] .الغیبۃ، طوسی، ص 450۔

کے اثر سے ظاہر ہے۔ یہی ان کی مثال تورات میں ہے اور یہی ان کی مثال انجیل میں ہے)۔ مراد شب بیداری کے سبب چہرے کی زردی ہے۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو آسانی اور تنگی دونوں حالتوں میں اپنے بھائیوں کے ساتھ نیکی کرتے ہیں، اور تنگی میں بھی دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توصیف کی ہے اور فرمایا ہے: وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (اگرچہ خود انہیں سخت ضرورت ہی کیوں نہ ہو، وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، اور جو شخص اپنے نفس کی بخیلی سے بچا لیا جائے وہی لوگ کامیاب ہیں)۔ خدا کی قسم! وہ کامیاب ہوئے اور نجات پا گئے۔ اگر وہ کسی مؤمن کو دیکھتے ہیں تو اس کا احترام کرتے ہیں اور اگر کسی منافق کو دیکھتے ہیں تو اس سے دوری اختیار کرتے ہیں۔ جب رات انہیں گھیر لیتی ہے تو زمین کو اپنا بستر بنا لیتے ہیں اور مٹی کو اپنا تکیہ بناتے ہیں، اور اپنی پیشانی زمین کی طرف رکھ دیتے ہیں۔ وہ اپنے رب کے حضور آگ سے نجات کے لیے عاجزی کے ساتھ دعا کرتے ہیں۔ جب وہ رات کو صبح تک پہنچاتے ہیں تو لوگوں کے درمیان آتے جاتے ہیں اور لوگ ان کی طرف انگلیوں سے اشارہ نہیں کرتے۔ وہ راستوں کے کنارے اختیار کرتے ہیں اور پانی کو پاک اور پاک کرنے والا قرار دیتے ہیں۔ وہ خود تنگی میں ہوتے ہیں اور ان کے بدن ٹوٹے ہوئے ہیں، مگر لوگ ان کی وجہ سے راحت میں ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں کے نزدیک بدترین لوگ ہوتے ہیں اور اللہ کے نزدیک بہترین لوگ ہوتے ہیں۔ اگر وہ بات کریں تو انہیں سچا نہیں سمجھا جاتا، اور اگر نکاح کا پیغام بھیجیں تو انہیں عورت نہیں دی جاتی۔ اگر وہ حاضر ہوں تو پہچانے نہیں جاتے اور اگر چھپ جائیں تو ان کی کمی محسوس نہیں کی جاتی۔ ان کے دل اللہ سے خوفزدہ اور لرزاں ہوتے ہیں۔ ان کی زبانیں قید میں ہوتی ہیں اور ان کے سینے اللہ کے رازوں کی پناہ گاہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ اس کے اہل لوگوں کو پائیں تو اس میں سے کچھ انہیں بتا دیتے ہیں اور اگر اس کے اہل نہ پائیں تو اپنی زبانوں پر قفل لگا لیتے ہیں اور ان کے قفلوں کو چھپا لیتے ہیں۔ ان کے سینوں پر مشک کی تھیلی کی طرح ایک نہایت مضبوط بند ہوتا ہے جس سے کچھ بھی باہر نہیں نکلتا۔ وہ علم کے نگہبان، صبر اور حکمت کے معدن اور انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے پیروکار ہوتے ہیں۔ یہ وہ ہوشیار لوگ ہیں جنہیں منافقین بہرا، اندھا اور بے عقل سمجھتے ہیں، حالانکہ ان میں نہ بہرہ پن ہے، نہ اندھا پن اور نہ ہی بے عقلی۔ وہ چالاک، فصیح، صابر، حکیم، متقی، نیکوکار اور اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ اللہ کے خوف نے انہیں ٹھہراؤ دے دیا ہے اور ان کی زبانیں اللہ کے خوف اور اس کے راز کو چھپانے کی وجہ سے خاموش ہیں۔ ہائے! مجھے ان کے ساتھ بیٹھنے اور ان سے گفتگو کرنے کا کتنا شوق ہے۔ ہائے! ان کے کھو جانے پر

افسوس، اور ہائے! ان کے ساتھ بیٹھنے کی آرزو۔ اگر تم انہیں پالو اور ان کے نور سے کچھ حاصل کر لو تو ان کے ذریعے دنیا اور آخرت میں ہدایت پاؤ گے اور کامیاب ہو جاؤ گے۔ وہ لوگوں کے درمیان سرخ گندھک سے بھی زیادہ نایاب ہیں۔ ان کی زینت راز کو چھپانے کے لیے طویل خاموشی ہے، اور نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ اور آسانی و تنگی دونوں حالتوں میں بھائیوں کے ساتھ مواسات کرنا ہے۔ یہی ان کی زینت اور ان کی محبت ہے۔ خوشا ان کے حال پر، اور کیا ہی خوب انجام ہے۔ وہ فردوس کے وارث ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اہلِ جنت میں ان کی مثال ایسی ہے جیسے جنتوں میں فردوس[1] کی مثال۔ وہی لوگ ہیں جنہیں دوزخ میں ڈھونڈا جائے گا جبکہ انہیں جنت میں نعمت میں پائیں گے۔ یہ اہلِ جہنم کا قول ہے: وَقَالُوا مَا لَنَا لَا نَرَىٰ رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِنَ الْأَشْرَارِ (اور وہ کہیں گے: ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ ہم ان مردوں کو نہیں دیکھتے جنہیں ہم بدکاروں میں شمار کرتے تھے؟) وہی افراد ان کے نزدیک لوگوں میں بدترین سمجھے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کا مقام بلند کرے گا تاکہ وہ انہیں دیکھ سکیں۔ یہ بات آگ میں ان کے لیے حسرت کا سبب بنے گی اور وہ کہیں گے: يَا لَيْتَنَا نُرَدُّ (کاش ہمیں واپس لوٹا دیا جاتا)، تاکہ ہم بھی ان جیسے ہو جاتے۔ وہ برتر تھے اور ہم بدکار ہیں، اور یہ اہلِ آتش کے لیے حسرت ہو گی)[2]

امیر المؤمنین (ع) نے فرمایا: (پرندوں کے درمیان شہد کی مکھی کی مانند رہو۔ پرندوں میں کوئی ایسا پرندہ نہیں مگر یہ کہ وہ شہد کی مکھی کو کمزور سمجھتا ہے، اور اگر پرندے اس برکت کو جان لیتے جو اس کے اندر ہے تو اس کے ساتھ ایسا نہ کرتے۔ لوگوں کے ساتھ اپنی زبانوں اور جسموں کے ذریعے میل جول رکھو اور اپنے دلوں اور اعمال کے ذریعے ان کی مخالفت کرو۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم وہ چیز نہیں دیکھو گے جسے تم پسند کرتے ہو، یہاں تک کہ تم میں سے بعض بعض کے چہروں پر تھوکیں گے اور بعض بعض کو جھوٹا کہیں گے، اور تم میں سے (یا فرمایا: میرے شیعوں میں سے) صرف اتنے باقی رہ جائیں گے جیسے آنکھ میں سرمہ اور کھانے میں نمک رہ جاتا ہے۔ میں تمہارے لیے ایک ایسے آدمی کی مثال بیان کرتا ہوں جس کے پاس کھانا ہے۔ وہ اسے صاف کرتا ہے اور پاک کرتا ہے۔ پھر وہ اسے ایک جگہ لے جاتا ہے اور اسے اتنی مدت تک چھوڑ دیتا ہے جتنی اللہ چاہے۔ پھر اس کے پاس واپس آتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس میں کیڑا پڑ گیا ہے۔ وہ اسے نکال دیتا ہے اور

---

[1] . اہلِ بیت علیہم السلام کی روایات کے مطابق فردوس جنت کا سب سے بلند درجہ ہے۔ امیر المؤمنین (ع) نے فرمایا: (ہر چیز کا ایک اعلیٰ مقام ہوتا ہے اور جنت کا اعلیٰ مقام فردوس ہے، اور وہ محمد اور آلِ محمد علیہم السلام کے لیے ہے)۔ (بحار الانوار، مجلسی، جلد 24، ص 269) مترجم۔

[2] . اصول شانزدہ گانہ، اصل زید زرّاد، چند محدثین، ص 7۔

اسے صاف اور پاک کر دیتا ہے۔ پھر اس کھانے کو گھر لے آتا ہے اور جتنی اللہ چاہے اسے چھوڑ دیتا ہے۔ پھر دوبارہ اس کے پاس آتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس میں کیڑے پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ انہیں نکال دیتا ہے اور اسے صاف اور پاک کر دیتا ہے اور اسے واپس رکھ دیتا ہے۔ یہ اسی طرح جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اس میں سے تھوڑا سا باقی رہ جاتا ہے جسے کیڑا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اسی طرح تم بھی جدا کیے جاؤ گے یہاں تک کہ تم میں سے صرف ایک تھوڑی جماعت باقی رہ جائے گی جسے آزمائش کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی)[1]

امام صادق (ع) نے فرمایا: (جب قائم قیام کریں گے تو لوگ انہیں انکار کریں گے۔ وہ ان کے پاس ایک کامیاب جوان کی صورت میں واپس آئیں گے۔ ان پر صرف وہی مؤمن ثابت قدم رہیں گے جن سے اللہ تعالیٰ نے پہلے عالمِ ذر اول میں عہد لیا تھا)[2]

جابر کہتے ہیں: مجھے مسیب بن نجبہ نے حدیث بیان کی کہ (ایک شخص امیر المؤمنین (ع) کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے ساتھ ایک آدمی تھا جسے ابنِ سوداء (سیاہ فام عورت کا بیٹا) کہا جاتا تھا۔ اس نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! یہ شخص اللہ اور اس کے رسول پر جھوٹ باندھتا ہے اور آپ کو گواہ بناتا ہے۔ امیر المؤمنین (ع) نے فرمایا: یہ بہت لمبی چوڑی باتیں کرتا ہے۔ وہ کیا کہتا ہے؟ اس نے عرض کیا: وہ (جیشِ غضب) یعنی غضب کے لشکر کا ذکر کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا: اس شخص کو چھوڑ دو۔ وہ ایک ایسی قوم ہیں جو آخر الزمان میں ہوں گے اور خزاں کے درخت کے پتوں کی مانند ہوں گے، اور ہر قبیلے سے ایک مرد، دو مرد اور تین مرد ہوں گے، یہاں تک کہ وہ نو تک پہنچ جائیں گے۔ اللہ کی قسم! میں ان کے امیر کو جانتا ہوں اور اس کا نام اور ان کی فوج کے اترنے کی جگہ بھی جانتا ہوں)۔ پھر آپ کھڑے ہوئے اور فرمایا: "شگاف کرنے والا، شگاف کرنے والا، شگاف کرنے والا"۔ پھر فرمایا: یہ میرے فرزندوں میں سے ایک مرد ہے جو حدیث کو کھول کر بیان کرے گا)[3]

اور امیر المؤمنین (ع) نے فرمایا: (مہدی کے اصحاب جوان ہوں گے اور ان میں کوئی بوڑھا نہ ہوگا، مگر اتنا جیسے آنکھ میں سرمہ اور زادِ راہ میں نمک، اور زادِ راہ میں سب سے کم چیز نمک ہوتی ہے)[4]

---

1. الغیبۃ، نعمانی، ص 218۔
2. الغیبۃ، نعمانی، ص 420۔
3. الغیبۃ، نعمانی، ص 325۔
4. الغیبۃ، طوسی، ص 476۔